ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2020
بانی
معراج رسول
pklibrary.com

07
چینی نکتہ چینی
مدیراعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

14
انا گیر
امجد جاوید
صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ
ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

49
نفرت کی آگ
تنویر ریاض
باپ اور بیٹے کے درمیان حائل
نفرت و محبت کا امتحان

59
بساط
جمال دستی
بساط پر بکھرے مہروں کی ترتیب
اور قتل کی واردات کا سنگین امتزاج

67
محبت کی طاقت
سیریناراض
محبت کی طاقت پر یقین رکھنے
والے شخص کے تجربات و سانحات

77
وجہ
اعتزاز سلیم وصلی
نگاہوں سے اوجھل زمین پر بسنے
والوں کی پُراسرار نقل و حرکت

86
الاؤ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
انسان نما درندوں کی داستان دو جیتے جاگتے
ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

115
ناقابلِ اعتبار
عکس فاطمہ
ایک ناقابلِ فہم صورتِ حال.....
ایک شکاری کا تیار کردہ موت کا جال

125
بھیڑیا
منظر امام
احساسات کے جذبولے
گندمی انسان نما حیوان کی مسیحائی

132
باغ سے باغ تک
طاہر جاوید مغل
کشمیر کی آزادی.....اور جدوجہد کے گرد گھومتی
خون رنگ داستان محبت کے نشیب و فراز

181
جعلی مقابلہ
تمکین رضا
اپنے دیس سے دور بسنے والے
تارکینِ وطن کی کٹھن مجبوریاں

190
مرحوم قاتل
سرور اکرام
مرنے کے بعد خود کو کارآمد ثابت
کرنے والے شخص کی پراسراریت

198
پیش بیں
ماہ رخ ارباب
بھسم کرنے والی چنگاریوں کو بجھانے میں
ناکام ہو جانے والے خون گزیدہ کے کارنامے

219
ناکردہ
احمد جیلری
ایک آوارہ نوجوان کا جذبۂ بے مثال.....
گم کردہ راہوں کا عبرت اثر احوال

232
بچھڑے خواب
غلام قادر
جوانی کے جوش اور بے خوفی کی
ترنگ میں ڈوبی دل گداز داستاں

253
خون آشام
روبینہ رشید
جاسوسی کے مخصوص انداز میں ڈوبی
سنسنی خیز واقعات میں الجھی تیکھی کہانی

انا گیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو انا گیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جا سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل نگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

صحرائے چولستان میں شام ڈھل چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے مغربی اُفق خوں رنگ تھا۔ سارے منظر اترتی رات کے اندھیرے میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔ ٹیلوں کے درمیان سے دور تک جاتی ہوئی سیاہ تارکول کی پتلی سڑک بھی اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔ اب بھوری ریت کو دیکھا نہیں، صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میں اسی سڑک کے کنارے پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے وہ کچا راستہ بھی دھندلا گیا تھا جو بستی چراغ شاہ تک جاتا تھا۔ کچے راستے کے بائیں جانب ایک اونٹ گاڑی موجود تھی۔ جس کے اردگرد چند لوگ مجسموں کے مانند خاموش کھڑے منتظر تھے۔ اُن کا سامان اونٹ گاڑی پر دھرا ہوا تھا۔ میری طرح وہ بھی اس انتظار میں تھے کہ کب اونٹ گاڑی چلے تو ہمارا سفر کٹے۔ پختہ سڑک سے بستی چراغ شاہ تک کا فاصلہ کوئی تین کلومیٹر سے زیادہ تھا۔ یہ سفر اسی اونٹ گاڑی پر کرنا تھا۔ ساربان کسی سواری کا منتظر تھا۔ چونکہ اندھیرا لحہ بہ لحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس لیے وہاں کبھی لوگ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔

صحرا کی شام جادو اثر ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ شام کے وقت دن بھر چلنے والی ہوا بھی رُک جاتی ہے۔ ان دنوں چونکہ موسم بدل رہا تھا، گرمی کا

زور ٹوٹ گیا تھا اور سردیوں کی آمد آمد تھی... اس لیے فضا میں نہ حبس تھا اور نہ ہی گرمی تھی۔ وہاں موجود لوگوں میں مختلف عمر کی تین عورتیں تھیں، جبکہ مرد کوئی آٹھ تھے۔ وہ سب اپنے لباس سے صحرائی دکھائی دے رہے تھے۔ سبھی مردوں نے دھوتی باندھی ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ کسی کی قمیص تھی اور کسی نے کرتہ پہنا ہوا تھا۔ ہر مرد نے مختلف رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی عورت نے گہرے نیلے رنگ کا گھاگرا اور کرتی پہنی ہوئی تھی۔ جبکہ دو جوان عورتوں نے شلوار اور قمیص پہن رکھی تھی۔ میں ان سب میں الگ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی اجنبی ان کے درمیان... آ گیا ہو۔ میں نے نیلی جین کے ساتھ سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں ضروری کاغذات تھے۔ کچھ دیر پہلے جب ڈھلتی ہوئی شام کی روشنی تھی، تب میں نے محسوس کیا کہ سبھی حیرت اور اجنبیت سے میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ ایسا فطری طور پر تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر یہی لگ رہا تھا کہ جدید دنیا کی ترقی نے ابھی تک اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ جس طرح سو برس پہلے جی رہے تھے' آج بھی ویسے ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسا کیوں تھا، یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب ضرور تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ اس سوال کی سمجھ نہ آسکے۔

مجھے بستی چراغ شاہ پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے بڑے اطمینان سے ایک جانب کھڑا گاڑی چلنے کا منتظر تھا۔ ساربان نے لالٹین جلالی تھی۔ پیلی سی روشنی ایک محدود سے دائرے میں پھیل گئی تھی۔ وہاں موجود لوگ جو ہیولوں کی صورت میں لگ رہے تھے، اب کافی حد تک صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ لوگوں میں بے چینی بھی بڑھنے لگی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے گاڑی بان سے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کب چلنا ہے بھائی، مزید کتنی دیر ہے؟''

''بس ایک بندے کا انتظار ہے، تھوڑی دیر انتظار کر لیں پھر چلتے ہیں۔'' اس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا تو وہ عورت بے چین ہوگئی۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ اس ایک سواری کے جو پیسے بنتے ہیں' میں اسے دے دوں اور اسے چلنے کا کہوں لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ نجانے وہ سواری اس گاڑی بان کے لیے کتنی اہم ہوگی، جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ میرے یوں کہنے سے وہ کہیں ناراض ہی نہ ہو جائے۔ اس وقت وہی ایک گاڑی تھی جس پر بستی چراغ شاہ جایا جا سکتا تھا۔ ورنہ پھر پیدل جانا پڑتا۔ دن ہوتا تو شاید کوئی ساربان، کوئی گدھے والا مجھے لفٹ دے دیتا' اس وقت تو ایسی کوئی سواری ملنا ہی محال تھا۔ سو میں خاموشی سے ایک جانب ہی کھڑا رہا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا ایک ہانپتا ہوا نوجوان ہمارے پاس آن پہنچا۔ وہ اندھیرے میں سے برآمد ہوا تھا۔ یوں جیسے ایک دم سے ہمارے درمیان آ گیا ہو۔ اسے دیکھتے ہی ساربان نے گاڑی پر بیٹھ جانے کی صدا لگائی تو اس آواز کے ساتھ جیسے ان سب میں زندگی آ گئی ہو۔ سب سے پہلے عورتوں کو سوار کرایا گیا، پھر سارے مرد اپنے اپنے سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر وہ نوجوان بیٹھا۔ میں سب سے آخر میں بیٹھا تو اونٹ گاڑی چل پڑی۔ وہ نوجوان میرے سامنے ہی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اندھیرے میں وہی ایک لالٹین ہمارے ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ صحرا کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ صرف اونٹ گاڑی کی چوں چاں سنائی دے رہی تھی یا پھر کبھی کبھار اونٹ بول پڑتا تھا۔ اونٹ گاڑی پر سوار بھی لوگ خاموش تھے۔ یوں جیسے وہ بولنا بھول گئے ہوں۔ میرے خیال میں انہیں گھر پہنچنے کی فکر نے ستایا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے انہیں میری طرح بھوک بھی لگی ہوئی ہو۔ سارے دن کے تھکے ہوئے ہوں گے۔ وہ جو قریبی قصبے سے خریداری کر کے لوٹے تھے۔ ان کے لیے یہ بھی کوئی آسان نہیں تھا۔ تارکول والی اس سڑک سے قصبے تک کا فاصلہ کافی تھا۔ سفری سہولتیں نہ ہونے کے باعث یہ بھی ان کے لیے مصیبت ہی تھی۔

ایسے ہی ایک سفر کا دھندلا سا منظر میری یادوں میں لہرا گیا تھا۔ اس دن سورج چڑھتے ہی بستی میں ڈھول کی تھاپ گونجنے لگی تھی۔ ایک اونٹ گاڑی تیار تھی جس کے اردگرد رنگ برنگے کپڑے پہنے بچے کھڑے دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اونٹ کو مختلف رنگوں کے کپڑوں سے سجایا ہوا تھا۔ بستی کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ڈھول والے کے پاس جمع ہو رہے تھے۔ کھانے پینے کے سامان کے ساتھ دو بکرے اور مینڈھے بھی وہاں لے آئے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد مردوں کے علاوہ چند عورتیں اور بچیاں بھی وہاں آ گئی تھیں۔ ان بچیوں میں ساوری بھی تھی۔ اس نے بڑے سرخ اور پیلے رنگ کی گوٹا لگی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سبز رنگ کا بھوچھن تھا، جس کے کناروں پر سنہرا گوٹا چمک رہا تھا۔ اس نے اپنے سفید گالوں پر سرخ رنگ کے دائرے بنائے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک تھی،

آنکھوں میں گہرا کاجل لگایا ہوا تھا۔ مجھے اسی سے دلچسپی تھی۔ عورتوں نے طرح طرح کے رنگین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ بھوری ریت کے بھدے پن کو انہی عورتوں نے رنگین اور خوشنما کر دیا تھا۔

صحرا میں سفر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی میلے پر جانا ہوتا یا پھر کہیں کسی برات کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہو تو صحرائی باشندے اسے بڑا پُرلطف بنا دیتے ہیں۔ کسی بھی سواری پر عورتیں اکٹھی ہو کر بیٹھ جاتیں، اسی طرح مرد ایک جانب ہو کر بیٹھ جاتے۔ ڈھول والا ساتھ میں ضرور ہوتا۔ ڈھول کی تھاپ پر گیت گاتے، ہنسی مذاق کرتے ہوئے سفر کرتے۔ صحرائی باشندوں کا سب سے اہم سفر چنن پیر کے میلے کا ہوتا۔ یہ میلا سات جمعرات تک چلتا رہتا۔ پورے چولستان سے لوگ اس میلے میں شامل ہوتے۔

وہ سفر بھی چنن پیر کے میلے ہی کے لیے تھا۔ بھی خوش اور پُرجوش تھے۔ ایک جانب کھڑی عورتیں چنن پیر سے منسوب گیت الاپنے لگی تھیں۔ ایک ایک کر کے سارے لوگ بیٹھ گئے۔ میں اور ساوری ایک جانب بیٹھ گئے تھے۔ اونٹ گاڑی چلی تو اس کے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے اونٹوں پر سوار ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ٹیلوں کے درمیان بنے کچے راستوں پر سفر جاری تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر گیت گائے جا رہے تھے۔ لوگ خوش تھے۔ ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں سفر کے ساتھ جاری تھیں۔ یہ منظر میرے سامنے تھا کہ ساوری نے مجھے ٹہوکا دیا۔ اس نے اپنے بھوچھن کے پلو میں بتاشے اور مکھانے باندھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بتاشا اٹھانا چاہا تو اس نے تیزی سے مجھے روک دیا۔

''نہ، ابھی نہیں کھانے۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں، ابھی کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جھوٹے ہو جائیں گے، وہاں چنن پیر کے پاس جا کر کھانے ہیں۔'' اس نے معصومیت سے کہا تو میں ہنس دیا۔ میں نے اسے بڑا سمجھانا چاہا کہ کچھ نہیں ہوتا مگر وہ مانی ہی نہیں تھی۔ ایک بتاشا تو کیا مکھانا تک نہ دیا۔

اچانک مجھے لگا اونٹ گاڑی رک گئی ہے۔ میں اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ ہم تیز سفید روشنی کی زد میں تھے۔ سامنے اندھیرے میں تھوڑے سے فاصلے پر تیز روشنی والی دو ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ گاڑی پر موجود عورتوں اور مردوں کے چہرے پر خوف پھیل گیا تھا۔ وہ تیز روشنی ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ میری ساری توجہ اس طرف تھی۔ مگر اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ سب سے آخر میں آنے والا نوجوان گاڑی پر لیٹ گیا ہے۔ سارے سہمے ہوئے لوگ روشنی کی جانب متوجہ تھے لیکن میرے ساتھ بیٹھے نوجوان نے تیزی سے کروٹ لی اور گاڑی کے آخر میں چلا گیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ وہ کہاں گیا؟ اسے دیکھنے کی شدید خواہش اس وقت غائب ہو گئی جب ہمارے بالکل قریب دو فائر ہوئے۔ وہ گن سے کیے گئے فائر تھے۔ اس کے ساتھ ہی مقامی زبان میں للکارتے ہوئے کہا گیا۔

''خبردار اگر کوئی ہلا تو، ورنہ جان سے مار دیں گے۔''

وہاں موجود سب لوگ سہم گئے۔ میں بھی اس اچانک افتاد سے پریشان تھا۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان اس لیے بھی تھا کہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا وہ نوجوان جس طرح صحرائی سانپ کے مانند آنکھوں کے سامنے ہی غائب ہو گیا تھا، اس کا اور ان حملہ آوروں کا آپس میں کوئی تعلق ضرور ہے۔ ٹارچ روشن ہو گئی۔ ایک حملہ آور آگے بڑھا، اس نے وہاں موجود ہر بندے کے چہرے کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ ہم سب خاموش تھے۔ بھی سہمے ہوئے اور خوف زدہ تھے۔ میں نے حملہ آوروں کی جانب دیکھا۔ وہ چھ افراد تھے۔ چار کے ہاتھوں میں گنز تھیں۔ ایک ٹارچ لیے ہوئے تھا اور خالی ہاتھ سب کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ ملا کہ نہیں؟'' ایک آواز ابھری۔

''ان میں تو نہیں ہے۔'' خالی ہاتھ حملہ آور نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

''ایسا ہو نہیں سکتا۔ وہ اسی ریہڑھے پر سوار ہوا ہے۔'' اندھیرے میں سے آواز ابھری تو خالی ہاتھ حملہ آور نے گاڑی بان سے پوچھا۔

''اوئے، جو سب سے آخر میں سوار ہوا ہے' وہ کون ہے؟''

''یہ بندہ آخر میں سوار ہوا ہے۔'' اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ایک لمحے کو میں سناٹے میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا دو ہاتھ میری جانب بڑھے اور مجھے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا گیا۔ میں سیدھا ریت پر جا گرا۔ مجھے چوٹ تو نہیں آئی لیکن میں نے اپنے وزن کی وجہ سے پورے بدن میں تھرتھراہٹ ضرور محسوس کی تھی۔ میں نے لاشعوری طور پر ہر طرف دیکھا۔ وہ نوجوان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے نیچے گرتے ہوئے دیکھا تھا، اس

کے بعد وہ اتنی سرعت سے کہاں غائب ہوسکتا ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ حملہ آور اسی نوجوان کو تلاش کررہے تھے۔ اس نے اپنی جان بچانے کی ممکن حد تک کوشش کرلی تھی۔ وہ مجرم تھا یا معصوم، وہ لمحات یہ فیصلہ کرنے کے لیے نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور مجھے اٹھانے کو جھکتے' میں خود ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اُوئے سجان اُوئے دیکھ، یہی ہے؟'' ایک بندے نے مجھے گریبان سے پکڑتے ہوئے کسی سے پوچھا۔

''لے آ اسے ادھر۔'' اندھیرے میں سے آواز ابھری تو میں نے اپنے قریب کھڑے بندے سے سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی وجہ تو بتاؤ، اس طرح مجھے کیوں پکڑا ہوا ہے، کون ہو تم لوگ؟''

''اُوئے ہمارے ساتھ زبان چلاتا ہے، چل ادھر۔'' یہ کہتے ہی اس نے مجھے دھکا دیا، اس کے ساتھ ہی میری پشت پر گھونسا مارتے ہوئے دھکیلا۔ میں اس وقت تک خود پر قابو پا رہا تھا۔

میرے سامنے دو آدمی گنز لیے کھڑے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا تو ایک نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

''کیا یہی بھاگ کر ریبڑھے پر سوار ہوا تھا؟''

''مجھے تو یہی لگتا ہے۔'' انہی میں سے ایک نے جواب دیا۔

''تم لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا تو اچانک میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ ایک زوردار گھونسا میری گردن پر پڑا تھا۔ میرے پیچھے کھڑے بندے نے یہ وار کیا تھا۔ میں ایک دم سے بھنا گیا۔ میں نے لاشعوری طور پر پلٹ کر اس کے منہ پر مکا دے مارا۔ شاید وہ اس طرح کی حرکت کی امید نہیں کررہا تھا اس لیے اُوغ کی آواز کے ساتھ ریت پر جا پڑا۔ مجھ سے غلطی ہوچکی تھی اور میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے بھی تیار ہوچکا تھا۔ بلاشبہ میری یہ مزاحمت ان کے لیے حیران کن تھی۔ اس لیے میرے سامنے کھڑے شخص نے مجھ پر گن تانتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''اوئے کون ہو تم؟''

''میں میرن شاہ کا مہمان ہوں، اس کی بستی چراغ شاہ .... جارہا ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا تو ساتھ کھڑے شخص نے حیرت اور غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''بکواس کرتا ہے، میرن شاہ کا مہمان ہو اور ہمیں پتا نہ ہو۔''

''یہ مشکوک بندہ ہے، پکڑ لو اسے۔'' سامنے کھڑے بندے نے دھاڑتے ہوئے کہا تو پیچھے کھڑے بندوں نے مجھے قابو کرلیا تو سامنے والے نے قریب آکر گن کا بٹ میرے بازو پر مارا۔ درد کی شدید لہر میرے بدن میں تھرتھرا گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بازو سُن ہوگیا ہو۔ درد قابلِ برداشت تھا لیکن میں یہی ظاہر کررہا تھا کہ میرا بازو جیسے ٹوٹ گیا ہے۔ میں بے حال سا ہوکر ایک جانب لڑھک گیا۔ انہوں نے مجھے چھوڑا نہیں بلکہ مجھے تھام کر کھڑا رکھنے کے لیے زور لگانے لگے...اور مجھے مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''بول اوئے کون ہو تم؟ تمہیں ضرور اس بندے کے بارے میں پتا ہوگا، ورنہ پھر تمہی ہو۔'' سامنے کھڑے بندے نے اپنے پنجے سے میری گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ وہ بالکل میرے سامنے تھا۔ اس کا چہرہ ذرا سے فاصلے پر تھا۔ اس کی سفید چھوٹی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں خضاب زدہ تھیں، موٹے نین نقش اور وحشت زدہ آنکھوں والا وہ شخص مجھے کافی خطرناک لگا تھا۔ میں نے مشکل سے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔

''میں کہہ رہا ہوں، میں میرن شاہ کا مہمان ہوں۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

''مجھے لے چلو اس کے پاس، اگر جھوٹ ہوا تو کیا اکیلا بھاگ جاؤں گا؟'' میں نے بھی اعتماد سے کہا تو وہ تذبذب کا شکار ہوگئے۔

''لے تو ہم تجھے ویسے بھی جائیں گے۔'' اس نے میری گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔

''تو پھر دیر کس بات کی ہے، چل تیرے میرن شاہ کے پاس چلتے ہیں۔'' میں نے جان بوجھ کر 'تیرے' پر زور دیتے ہوئے کہا تا کہ مجھے اطمینان ہوجائے کہ وہ اسی کے بندے ہیں۔ ممکن ہے وہ کسی دوسرے سردار کے آدمی ہوں اور میں انجانے میں وہاں جا پہنچوں۔

''اگر یہ میرن شاہ کا مہمان ہے تو پھر وہ کدھر گیا؟'' ایک ساتھی نے ریبڑھے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ویسے ہی ساکت کھڑے تھے۔

''انہیں جانے دے، ہم اسے لے چلتے ہیں۔'' سامنے

کھڑے شخص نے کہا۔

''اگر وہ مشکوک تھا تو یہ بھی مشکوک ہی ہے۔ وہ بندہ بھی ہے یا اسے پتا ہوگا، پوچھو اس سے۔'' دوسرے نے کہا۔

''یار وہ ہماری نظروں کے سامنے سے کہاں نکل کر جا سکتا ہے؟'' پہلے بندے نے اکتاہٹ سے کہا۔

''اسے ڈیرے پر لے چلو۔ وہاں جا کر یہ سب کچھ بک دے گا۔'' سامنے کھڑے شخص نے نفرت سے کہا۔

''ڈیرے پر کیوں یہیں اس......'' پہلے بندے نے جوش سے کہا۔

''اب یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سائیں کا مہمان ہے تو؟''

''پھر تو وہیں لے جا کر سارا سچ جھوٹ نکالو۔'' پہلے بندے نے پھر اسی اکتاہٹ سے کہا تو سامنے کھڑے شخص نے گاڑی والوں کو اونچی آواز میں جانے کا کہا۔ وہ تو اسی انتظار میں تھے۔ ساربان نے فوراً ہی اونٹ گاڑی آگے بڑھا دی۔

''دیکھ تو اپنے بارے میں سچ سچ ابھی بتا دے، اگر ڈیرے پر جا کر تیرا جھوٹ پکڑا گیا تو بڑی اذیت سے ماروں گا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم مجھے ڈیرے پر ہی لے جاؤ، میں تو خود ہی ادھر ہی جا رہا تھا۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں بتا کر اچھا کیا تھا یا کسی دشمن کے نرغے میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے دھکے مارتے ہوئے جیپ تک لے گئے۔ تبھی ان میں سے کسی نے کہا۔ ''اس کے ہاتھ باندھ لو، کہیں رستے میں گڑبڑ ہی نہ کرے۔''

کچھ دیر بعد میں بندھے ہاتھوں اس جیپ میں تھا۔

جیپ چل پڑی تھی۔ وہ میری طرف سے بے پروا انجن کی پُرشور آواز میں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

ان کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ انہیں کسی شخص کے آنے کی اطلاع تھی، جو ان کا دشمن تھا۔ یہ اسے مارنا چاہتے تھے۔ ان کی دشمنی کیا تھی مجھے اس بارے تو پتا نہ چل سکا لیکن ان کی نفرت سے لگتا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہی ہے۔ اس بندے کی انہیں اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بالکل درست وقت پر پہنچے تھے۔ انہوں نے گھیرا بھی ٹھیک تھا۔ یہ اس نوجوان کی پھرتی تھی کہ وہ خود کو بچا گیا۔ تاہم حیرت کی بات تھی کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا؟ وہ کوئی سانپ تھا جو صحرا میں غائب ہو گیا۔ آخر وہ اتنی جلدی گیا کہاں؟

☆☆☆

ہم بستی چراغ شاہ جا پہنچے تھے۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی کچے راستے، اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بستی اور وہی ہُو کا عالم تھا۔ بستی سے باہر بنے ڈیرے کا لکڑی والا پھاٹک بند تھا۔ جیپ رکتے ہی پھاٹک کھل گیا۔ ایک بوڑھا پھاٹک کے پار کھڑا تھا۔ جیپ ڈیرے کے صحن میں جا رکی جہاں پہلے ہی سے ایک جیپ اور کار کھڑی تھی۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ مجھے نیچے اتار لیا گیا۔

وہ ڈیرا ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہی مشرقی جانب بنے کچے کمرے، جن کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبی دیوار تھی جس کے پار سائیں میرن شاہ کا گھر تھا۔ وہ گھر بھی چند کچے کمروں پر مشتمل تھا۔ جس کے آگے بڑا صحن تھا، جس کا پھاٹک مخالف سمت میں تھا۔ ڈیرے کے شمال کی جانب دیوار کے پار باڑا تھا۔ جس میں مویشی رکھے جاتے تھے۔

ان صحرائی علاقوں میں کسی کی امارت کا اندازہ اس کے پاس جانوروں کی تعداد سے ہوتا ہے۔ جس کے پاس زیادہ مویشی، وہ زیادہ امیر مانا جاتا ہے۔ میرن شاہ چونکہ اس علاقے کا سب سے معزز بندہ تھا اس لیے اس کے پاس مویشی سب سے زیادہ ہونا لازمی تھا۔ صحرا کے ان باشندوں میں بڑی شدت پائی جاتی تھی۔ علاقے پر اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے لیے لوگوں پر ظلم کرنا ان کا وتیرہ تھا۔ ایک کمرے میں دیے کی روشنی تھی۔ باقی سب بند تھے اور کسی بھی کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ ہیڈ لائٹس بند ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ تبھی ایک آواز اُبھری۔

''پتا کرو سائیں جاگ رہے ہیں تو اس کا بتاؤ......''

''پوچھ اس سے یہ کون ہے؟'' دوسری آواز اُبھری۔

''اب تو اس کا سائیں ہی فیصلہ کریں گے۔ اگر اس کا کہا جھوٹ ہوا تو سسکا سسکا کر مار دیں گے۔'' پہلی آواز میں کہا گیا۔

''چل میں پتا کرتا ہوں، اسے بٹھا ادھر۔'' دوسری آواز نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹارچ روشن ہو گئی۔ وہ ٹارچ لیے ایک دیوار کی جانب بڑھ گیا جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ میرن شاہ کے گھر میں کھلتا تھا۔ ایک شخص مجھے کالر سے پکڑ کر ادھر لے جانے لگا جہاں چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ تاروں کی روشنی میں ہیولے واضح ہونے لگے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی وجہ سے آنکھیں ابھی اندھیرے کی عادی نہیں ہوئی تھیں۔ وہ سب ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ پہلے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا پھر نجانے کیا خیال آیا کہ مجھے

چار پائی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد دیوار کے پار ٹارچ کی روشنی ہوئی۔ وہی شخص دوبارہ نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''سائیں تو سو گئے ہیں۔''

''چل پھینک اسے ادھر کسی کمرے میں، صبح دیکھ لیں گے۔''

''اب ساری رات اس کی رکھوالی کرنی پڑے گی۔''

ان کی باتیں سن کر میں نے کہا۔ ''اُو، مجھے یہیں اس چار پائی پر رہنے دو۔ میں یہیں سو جاؤں گا۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''تم بھاگ کر جانے کی ذرا ہمت تو دکھاؤ۔'' ایک نے غراتے ہوئے کہا تو میں کراہتا ہوا وہیں چار پائی پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ بھی اردگرد پھیل گئے۔ مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی مگر اب مجھے صبر ہی کرنا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک صراحی رکھی تھی جس سے وہ پانی پی رہے تھے۔ مجھے بھی پیاس لگی تھی' میں نے پانی مانگا۔

''اٹھ کر پی لو۔''

''میرے ہاتھ کھولو گے تو پیوں گا۔'' میں نے کہا۔ چند لمحے وہ سوچتے رہے پھر ایک نے میرے ہاتھ کھول دیے۔ میں نے صراحی کے پاس پڑے پیالے میں پانی بھرا پھر پانی پی گیا۔ وہ ذرا سا نمکین تھا لیکن غنیمت تھا۔ میں پانی پی کر لیٹ گیا۔

میں بہت تھک گیا تھا لیکن..... نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے بازو میں درد مچل کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ چاروں جانب سناٹا تھا۔ آدھی رات ہونے کو آ گئی تھی۔ رکی ہوئی ہوا دھیرے دھیرے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ تاروں کی روشنی میں اندھیرا کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

انسان جہاں رہتا ہے، وہاں اپنے نشان ضرور ثبت کرتا ہے۔ اس کے وہاں ہونے کا احساس رہتا ہے۔ وہ چاہے کچھ وقت کے لیے یا تادیر نشانیاں چھوڑ جائے۔ یہی تاریخ ہوتی ہے۔ یہ ڈیرا بھی اپنے اندر بڑی تلخ یادوں کو سموئے ہوئے تھا۔ اس چار دیواری کے اندر کتنے انسانوں کی چیخیں گونجی تھیں۔ یہ خاموش در و دیوار گواہ تھے کہ کس کے ساتھ ظلم ہوا اور کسے سزا دی گئی تھی۔

میرے سامنے جیسے منظر اُگ پڑا تھا۔ وہ گرم موسم کی سہ پہر تھی جب بستی کے دو افراد کو یہاں ڈیرے پر لایا گیا تھا۔ ان کا قصور یہی تھا کہ انہوں نے میرن شاہ کے باپ سیدن شاہ کی حکم عدولی کی تھی۔ اس نے اپنا ریوڑ چرانے کا حکم دیا تھا۔ ان دو افراد نے سیدن شاہ کا حکم نہیں مانا تھا۔ یہ بہت بڑا جرم کیا تھا انہوں نے۔ جب وہ دونوں ڈیرے پر لائے گئے تو وہ لہولہان تھے۔ سیدن شاہ کے کارندے انہیں ان کے گھروں سے مار پیٹ کر یہاں لائے تھے۔ ان کی آہیں اور سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔ سب جانتے تھے کی ان کا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں کے بارے میں کہا یہ جاتا تھا کہ وہ سیدن شاہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

جہاں میں چار پائی پر پڑا تھا، اس سے تھوڑے فاصلے پر سیدن شاہ ایک چار پائی پر بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے لا کر کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ایک کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسرے کی سینے کے پاس خون سے قمیص بھیگی ہوئی تھی۔ دونوں ہی تکلیف کی شدت سے کراہ رہے تھے۔ سیدن شاہ نے انتہائی نفرت اور غصے میں ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم دونوں کی ہمت کیسے ہوئی میرا ریوڑ نہ لے جانے کی؟''

''سائیں، میری ماں بیمار ہے، میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔'' ایک نے احتجاج بھرے لہجے میں کہا تو سیدن شاہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی ماں کس قدر بیمار ہے، وہ کیوں نہیں جا سکتا، اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ اسے لمبا کر کے چھتر ماریں جائیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے بندوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے زمین پر الٹا لٹا دیا۔ پھر زور زور سے جوتے مارنے لگے۔ نیچے پڑے ہوئے اس بندے کی چیخیں نکلنے لگیں۔ سیدن شاہ نے دوسرے سے کچھ نہیں پوچھا، بلکہ ویسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بندے پہلے والے کو چھوڑ کر اسے بھی لمبا لٹا کر مارنے لگے۔ اس کی چیخیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک یہ ظلم چلتا رہا۔ وہ مارنے سے زیادہ انہیں ذلیل کر رہے تھے۔ ایسی ایسی گالیاں دی جا رہی تھیں کہ عام حالات میں کسی کو دی جائیں تو وہ مرنے مارنے پر اُتر آئے۔ وہ دونوں مار کھاتے رہے، چیختے رہے یہاں تک کہ وہ معافی تلافی کرنے لگے۔ ریوڑ نہ چرانا تو بہانہ تھا اصل بات یہی رہی ہوگی کہ وہ سیدن شاہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی بھی ظالم حاکم اپنی رعیت میں کسی باغی کو پسند نہیں کرتا۔ یہی تاریخ ہے۔

شاید وہ بھی کوئی ایسا ہی باغی تھا۔ وہ بھی اسی ڈیرے کے صحن میں رسیوں سے بندھا پڑا تھا، وہ لہولہان تھا۔ وہ بستی کا نہیں تھا۔ کہاں کا تھا یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ بڑا گبرو جوان تھا۔ وہ اس حالت میں بھی سیدن شاہ کے بندوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا جرم کیا تھا۔ سیدن شاہ کے ساتھ اس کی بڑی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ سیدن شاہ نے اپنی کلہاڑی کا وار کیا تو اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ یہ منظر بڑا خوف ناک تھا۔ پتا نہیں وہ بندہ مر گیا تھا یا زندہ تھا، کیا ہوا تھا اس کے ساتھ۔

تاروں کی روشنی میں ملگجا اندھیرا پھر میرے اردگرد چھا گیا تھا۔ باقی سب سو گئے تھے۔ مجھ سے فاصلے پر بیٹھا ایک بندہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ بوڑھا جس نے پھاٹک کھولا تھا، اب اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ میں سو جانا چاہتا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس ڈیرے پر ہونے والے کئی منظر لہرائے تھے۔ کچھ ادھورے، کچھ نامکمل سے، کسی میں کوئی چہرہ شناسا تھا، کوئی اجنبی تھا، کوئی بات ادھوری تھی، کوئی جملہ کانوں میں گونجا تھا۔ پھر منظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔

☆☆☆

صبح کی نیلگوں روشنی ہر جانب پھیل چکی تھی۔ میں نے کروٹ لی تو میرے بازو میں درد کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ میں ڈیرے کی ایک کھری چارپائی پر پڑا تھا۔ صحن میں کسی دوسری چارپائی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ابھی کسلمندی سے پڑا تھا کہ دیوار کے چھوٹے دروازے سے ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر شخص نکل کر ڈیرے میں آ گیا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی دھوتی اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سفید رنگ کی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ اس کے بھاری چہرے پر خضاب زدہ سیاہ مونچھیں اور ہلکی ہلکی سفید داڑھی تھی۔ وہ میری جانب شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے صحن میں آتے ہی تین چار بندے کسی طرف سے نکل کر وہاں آ گئے۔ اس کے پیچھے بھی دو آدمی تھے جن کے ہاتھوں میں گنز تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ میرن شاہ ہو سکتا ہے۔ میں اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ وہ بالکل میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو ایک بندے نے کہا۔

"سائیں یہ بندہ رات ہمارے ہاتھ لگا تھا، کہہ رہا ہے کہ یہ آپ کا مہمان ہے۔"

مجھے یقین ہو گیا کہ یہی میرن شاہ ہے۔ اس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے مجھ سے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟ میرے مہمان کیسے ہو؟"

مجھے اس کا لہجہ بُرا لگا تھا۔ اس کے اس جواب سے میں سمجھ گیا کہ اسے اب تک پتا ہی نہیں ہے اور اگر پتا ہے تو یہ انتہائی بیہودہ انسان ہے... اس لیے میں نے بھی کوئی لحاظ کیے بنا کہا۔

"میں سرکاری اہلکار ہوں اور لاہور سے یہاں آیا ہوں۔ اس علاقے کے ایم پی اے نے مجھے منتیں کر کے یہاں بھیجا ہے، کیا تم جانتے نہیں ہو۔" نا چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں اکتاہٹ اور غصہ چھلک پڑا تھا۔ اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا، شاید اسے گمان بھی نہیں تھا کہ میں اس سے اس طرح بدتمیزی سے بات کروں گا۔

"اس نے بتایا تو تھا کہ کوئی سروے کے لیے آنے والا ہے لیکن یہ تو دو مہینے پہلے کی بات تھی اور تم اب آئے ہو؟" اس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پوچھو اپنے ایم پی اے سے، کس کس کی منت نہیں کی اس نے یہاں آنے کے لیے۔ مجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہمارا تو کام ہے ہی ویرانوں میں جانے کا لیکن یہاں جیسے اجڈ اور بدتمیز لوگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔" میں نے غصے میں کہا تو اس نے تحمل سے میری جانب دیکھا پھر میرے سامنے پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا

"یہ دراصل ایک بندے کے پیچھے......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"او شاہ جی، یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا، میں نے انہیں بتایا بھی کہ میں کون ہوں مگر یہ اپنی ناکامی کا غصہ مجھ پر اتارنے لگے۔"

"کیا کیا انہوں نے؟" اس نے دھیمے سے پوچھا۔

"میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں میرن شاہ کا مہمان ہوں لیکن ان میں سے کسی نے میرے کندھے پر گن کا بٹ مار دیا، مجھے ذلیل کرنے کے لیے باندھ کر یہاں لایا گیا۔ جب میں یہاں خود آنا چاہ رہا ہوں تو یوں قیدی بنا کر لانے کا کیا مطلب ہے؟ اتنے ڈرپوک اور بزدل بندے رکھے ہوئے ہیں تم نے۔ ایک بندہ بھی باندھ کر لائے ہیں یہ۔" میں نے جان بوجھ کر ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

"خیر یہ اچھا نہیں ہوا۔" اس نے اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر لمحہ بھر بعد بولا۔ "اب تمہارے ماتھے پر تھوڑا لکھا ہوا ہے کہ تم کو یہاں آنا ہے یا تم سرکاری ملازم ہو۔"

’’میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میرے بارے میں اگر تصدیق کرنی ہے تو اپنے ایم پی اے سے پوچھ لو۔ دوسرا میرے سارے کاغذ اس بیگ میں تھے، جو ریہڑھے پر رہ گیا ہے۔ ورنہ میں اپنی شناخت ابھی دکھا دیتا۔‘‘ میرے کہنے پر میرن شاہ کے چہرے پر سختی کم ہو گئی۔ اس نے اپنے ایک بندے سے کہا۔

’’وہ کون تھا ریہڑھے والا؟‘‘

’’وسو تھا خیرو والے ٹوبے کا۔‘‘ اس بندے نے فوراً جواب دیا۔

’’جاؤ، اس سے بیگ لے کر آؤ۔‘‘ اس نے حکمیہ لہجے میں کہا تو وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ میرن شاہ نے کچھ دیر میری طرف دیکھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’کچھ دیر بعد تمہارا بیگ آ جائے گا۔ فکر نہیں کرو۔ تم اٹھ کر نہالو، میں تمہارے لیے نئے کپڑے بھیجتا ہوں، وہ پہن لینا۔ مجھے پتا ہے تم نے رات سے کچھ نہیں کھایا، وہ بھی......‘‘

’’نہیں، میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ میرا بیگ آ جائے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اپنے ایم پی اے سے کہنا، وہ میری جگہ کوئی دوسرا بندہ یہاں بھیج دے گا۔‘‘ میں نے کہا تو وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

’’تم پڑھے لکھے ہو، بات کو سمجھ سکتے ہو، یہ واقعی... اجڈ ہیں، انہیں کون سمجھائے۔ ان کی یہ غلطی نظر انداز کر دو۔ آئندہ یہ خیال رکھیں گے۔‘‘

’’مجھے یہاں سروے کرنا ہے، اس علاقے میں مجھے پھرنا ہے، دیکھنا ہے یہ علاقہ، یوں تو کوئی بھی مجھے پکڑ کر اپنا قیدی بنا لے گا۔ لگتا ہے شاہ جی تمہارا رعب نہیں اس علاقے پر۔‘‘ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ بے اختیار ہنس دیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

’’او نہیں، میرے حکم کے بغیر یہاں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ تم آزاد ہو کر اپنا کام کرنا، کوئی انگلی کا اشارہ بھی نہیں کرے گا۔‘‘

’’مجھے بتاؤ، اتنی ذلت کے بعد بھی کوئی یہاں ٹھہرے گا؟‘‘ میں پھر سے اَڑ گیا۔ میرے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

’’او نہیں، اب کچھ نہیں ہوتا، ویسے نام کیا ہے تمہارا؟‘‘ اس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا تو میں نے دھیمے سے کہا۔

’’علی زین نام ہے میرا۔‘‘

’’ٹھیک ہے علی، تم تازہ دم ہو جاؤ۔ ناشتا کرو۔ اتنے میں بیگ آ جائے گا، پھر جو فیصلہ کرنا ہو کر لینا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس پر میں خاموش رہا تو وہ بولا۔

’’ایک بات تو بتاؤ۔‘‘

’’پوچھو......‘‘ میں نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا۔

’’تم لاہور سے یوں خالی ہاتھ نکل آئے تھے۔ صرف بیگ تھا تمہارے پاس؟‘‘ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ اس نے بالکل درست سوال کیا تھا اور اس سوال کی مجھے پوری توقع تھی۔ سو میں نے کہا۔

’’میں اپنی سرکاری جیپ پر آیا تھا۔ لیکن یہاں قریب جو قصبہ ہے مانا والا، وہاں پر خراب ہو گئی۔ میں نے وہیں کے ایک مستری کو دکھائی۔ اس نے بتایا کہ صبح تک ٹھیک ہو گی۔ جیپ میں نے اس کے پاس چھوڑ دی کہ صبح لے لوں گا، میرا سامان اسی میں ہے۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا تھا کہ میں میرن شاہ کا مہمان ہوں۔ مستری شاید اسی وجہ سے مجھے موٹر سائیکل پر وہاں چھوڑ گیا، جہاں سے ریہڑھے والا ملا تھا۔ آگے جو ہوا......‘‘

’’خیر کوئی بات نہیں، اب تم ہمارے مہمان ہو۔‘‘ اس نے بڑے سکون سے نرم لہجے میں کہا۔

’’مہمان......‘‘ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

’’یہ سامنے والا کمرا لے لو، اس میں رہو، یہ بابا خیر دین یہیں رہتا ہے ڈیرے پر۔ یہ تمہارا خیال رکھے گا۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو اسے کہہ دینا۔ یہ حاضر کر دے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں ایک دو دن۔‘‘ میں نے اپنی نیم رضامندی ظاہر کر دی تو اس نے میری جانب سے رُخ پھیر کر سامنے کھڑے اپنے بندوں سے کہا۔

’’اوئے بے غیرتو، وہ بندہ کدھر گیا جسے تم پکڑنے گئے تھے؟‘‘

سامنے کھڑے سبھی لوگ خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ چند لمحوں بعد ایک بندے نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

’’سائیں، یقین جانیں، ہم موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ہمیں پتا چل گیا تھا کہ وہ ریہڑھے پر سوار ہے۔ ہم نے گھوم کر آگے سے اسے گھیرا تھا۔ وہ......‘‘

’’کہانی مت سنا بے غیرت۔‘‘ اس نے غصے میں کہا۔

’’وہ ہمیں دکھائی ہی نہیں دیا۔ ریہڑھے پر یہی ملا تو ہم اسے پکڑ کر لے آئے۔ وہ......‘‘

’’وہ اب تک اسی علاقے میں ہوگا، اگر وہ نکل گیا سمجھو تم سب کی خیر نہیں، ابھی نکلو اور پتا کرو، وہ کدھر گیا، کس کے

پاس ہے؟ ڈھونڈ واسے۔'' اس نے.... دہاڑتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر واپس اسی دیوار کی جانب بڑھ گیا جس میں چھوٹا دروازہ تھا۔

میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ وہ سب لوگ وہاں سے جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں اکیلا وہاں رہ گیا۔ رات کے قیدی ہونے اور اب مہمان بن جانے میں بڑا فرق تھا۔ بھوک سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ بازو میں ہلکا ہلکا درد بے چین کر رہا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ ایک حقیقت تھی لیکن میں کچھ اور ہی سوچتے ہوئے لاشعوری طور پر ان باتوں کو ثانوی حیثیت دے رہا تھا۔

''یہ لو کپڑے۔'' بوڑھا خیر دین میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا نام بڑا جانا پہچانا تھا۔ تب سے تجسس تھا کہ اسے غور سے دیکھوں۔ میں نے دیکھا، وقت نے اس کے چہرے پر بڑے گہرے نقش چھوڑے تھے لیکن وہی نقش اس کی پوری شناخت رکھتے تھے۔ میں صرف بوڑھے خیر دین ہی کو نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کے ساتھ جڑی اس ساوری کو بھی محسوس کر رہا تھا جو اپنے پلو میں کھانے کی چیزیں باندھا کرتی تھی۔ ''او بھائی، یہ لو کپڑے۔'' اس نے دوبارہ کہا تو میں اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ میں نے وہ کپڑے لے لیے۔ وہ ایک نئی دھوتی تھی اور اسی رنگ کی ایک قمیص تھی۔

''میں نہاؤں گا کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سامنے۔'' اس نے ایک نکڑ کی طرف اشارہ کیا جہاں چھوٹی چھوٹی دیواریں کر کے اوٹ بنا دی گئی تھی۔ ''میں پانی رکھ دیتا ہوں۔''

ایک بار تو میرا دل چاہا کہ اس سے یہ خدمت نہ لوں مگر پھر میں نے دل پکا کر لیا۔ کپڑے ایک طرف رکھ کر میں پھر لیٹ گیا تاکہ وہ پانی بھر لے تو میں نہاؤں۔

میں نہا کر پلٹا تو سورج نکل آیا تھا۔ برآمدے میں پڑی چارپائی پر ناشتے سے بھری ٹرے رکھی تھی۔ پراٹھے، مکھن اور لسی کی مہک نے میری اشتہا بڑھا دی تھی۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور وہیں چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں جی بھر کے سونا چاہتا تھا۔

☆☆☆

سہ پہر ہونے کو تھی جب میری آنکھ کھلی۔ پہلی نگاہ اس سرکاری جیپ پر پڑی، جس پر میں ماناوالا تک آ گیا تھا۔ میرن شاہ نے وہ جیپ منگوالی تھی یا مستری وہاں چھوڑ گیا تھا۔ میں اٹھا اور جیپ تک گیا۔ اس میں سے اپنا سوٹ کیس

اور بیگ نکالا اور کمرے تک لے آیا۔ مجھے دھوتی میں الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے شلوار قمیص پہن کر خود کو پُرسکون کیا۔ پھر پین کلر لیں تا کہ میرے بازو کا درد کم ہو جائے۔ گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن کمرے میں حبس تھا۔ میں برآمدے میں آ کر لیٹ گیا۔

مجھے ساوری یاد آنے لگی۔ گوری چٹی، تیکھے نین نقش والی۔ بھورے سے بال، جو تیل میں چپڑے رہتے تھے۔ اس سے اپنا بھوچھن نہیں سنبھالا جاتا تھا۔ ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کندھے پر ٹکائی رہتی تھی۔ بچپن سے جوانی تک اگرچہ چہرے کے نقوش وہی رہتے ہیں لیکن اتنی تبدیلی آ جاتی ہے کہ بندہ پہچانا ہی نہیں جاتا۔ اس کا تجربہ مجھے ہو گیا تھا۔ اب ساوری نجانے کیسی ہو گی؟ وہ پرانا بچپن تو نجانے کب سے پیچھے چھوڑ چکی ہو گی۔ اگر وہ اچانک سامنے آ گئی تو کیا وہ پہچانی جا سکے گی؟ یہ سوچتے ہی دل اتنا تیز تیز دھڑکنے لگا جیسے ابھی بے قابو ہو جائے گا۔

''بیٹا کوئی شے چاہیے؟'' بابا دین کی آواز پر میں چونک گیا۔ وہ میری چارپائی کی پائینتی کی جانب کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''بھوک تو لگی ہو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں تھوڑی بہت۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم سو رہے تھے اس لیے میں نے تمہیں جگایا نہیں، دوپہر کی روٹی تو تیار تھی۔ ویسے دوپہر کو لوگ ادھر کھاتے نہیں ہیں۔'' اس نے مجھے وہاں کے معمول کے بارے میں بتایا۔

''کوئی بات نہیں، میں شام کو کھا لوں گا، بابا تم پریشان نہ ہو۔ کم از کم میری وجہ سے پریشان نہ ہونا۔''

''نہیں جی، میں نے کیا پریشان ہونا، اب سائیں نے خدمت پر لگا دیا ہے تو مہمان کی خدمت تو کرنی ہے نا۔'' اس نے بڑی بے چارگی سے کہا تو میرا دل بھر آیا۔ میں اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اپنے لفظوں کو ہونٹوں تلے دبا لیا۔ تبھی میں نے اسے کہا۔

''آؤ بابا، ادھر میرے پاس بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

میرے کہنے پر وہ سامنے پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں پوچھو۔''

''تم اسی بستی کے ہی ہو نا، مطلب یہیں رہتے ہو؟'' یہ ایک فضول سا سوال تھا لیکن یہ پوچھے بنا چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے جھریوں بھرے چہرے سے میری طرف دیکھا اور دھیمے سے بولا۔

''ہاں میں یہیں پیدا ہوا، تب سے یہیں اسی بستی میں رہتا ہوں۔''

''مطلب شادی بھی یہیں ہوئی اور بچے بھی......'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں، میری بیوی تو اب نہیں رہی، ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ بیٹے کی شادی ہو گئی ہے لیکن بیٹی کی ابھی نہیں ہوئی۔'' اس نے بتایا تو نجانے مجھے کیوں خوشی محسوس ہوئی، ساوری کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہاں تھی، یہ میں پوچھ نہیں سکتا تھا اس لیے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔

''اگر میں یہ پوچھوں کہ اتنی زندگی میں تمہارے نزدیک یہاں سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟''

میرے پوچھنے پر اس نے ایک بار میری طرف دیکھا، جیسے بہت کچھ کہنا چاہتا ہو، پھر جیسے اس کے چہرے پر ٹھہراؤ آ گیا ہو۔ وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

''ظلم، یہاں سب سے بڑا مسئلہ ظلم ہے۔''

''کیسا ظلم بابا؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''یہی ظلم کہ یہاں انسان اور جانور ایک ہی ٹوبے سے پانی پیتے ہیں۔ ایک جانب انسان پانی بھر رہا ہوتا ہے تو دوسری جانب کتا اپنی پیاس بجھا رہا ہوتا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟''

اس نے بڑی خوبصورتی سے بات کو موڑ دیا تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ میرن شاہ یا اس کے باپ سیدن شاہ کے مظالم گنوائے گا۔ وہ بتائے گا کہ یہاں خون کس قدر ارزاں ہے۔

''ہاں، پانی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے یہاں، یہاں ٹوبے بھی میرا خیال ابھی کچے ہیں؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''ہاں، کچے ہیں۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''اچھا بابا، کوئی نوجوان لڑکا یہاں مل جائے گا جو اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو، مجھے اس سارے علاقے میں پھرنا ہے۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ بات تم سائیں میرن شاہ سے کہنا، وہ تمہارے ساتھ کوئی بندہ بھیج دے گا۔ اب بتاؤ اگر کچھ کھانا پینا ہے تو؟'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا تو مجھے یاد آ گیا، تب میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''بابا وہ میرا بیگ جو ریڑھے پر رہ گیا

تھا؟"

"وہ ابھی نہیں آیا۔" اس نے کہا اور میرن شاہ کی رہائش کی جانب بڑھ گیا۔ میں پھر سے لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں ایک اور تصویر ابھرنے لگی تھی۔

بستی میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد تھی۔ صبح کی نیلگوں روشنی میں سب بچے مسجد میں جاتے تھے۔ نماز ہو جاتی تو وہ سپارے لے کر بیٹھ جاتے۔ کچھ دیر بعد بچیاں بھی آنا شروع ہو جاتیں۔ ساوری کے ساتھ ایک اور لڑکی ہوتی تھی۔ وہ ساوری کی طرح چہکتی نہیں تھی۔ بڑی خاموش رہتی تھی۔ پتا نہیں وہ کون تھی، اس کا چہرہ ہیولے کے مانند نگاہوں میں تھا۔ گول سا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، سرخ سرخ ننھے منے ہونٹ۔ بس اتنا وہ ذہن میں آ رہی تھی، کون تھی یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک سانول بھی تھا، بڑے غصے والا۔ رنگ تو اس کا سانولا تھا ہی لیکن نین نقش بڑے تیکھے تھے۔ بڑا تیز تھا، سب کو ہرا دیا کرتا تھا۔ یہیں ڈیرے سے ذرا فاصلے پر ایک کیکر کا درخت ہوتا تھا، اس کے پاس بڑا کھیلتے تھے۔ وہ کیکر اب وہاں تھا کہ نہیں۔ میں ایک دم سے اٹھ گیا۔ میرے پاؤں میں ہلکے پھلکے جوتے تھے۔ میں اٹھا اور لکڑی کے پھاٹک کی جانب بڑھ گیا۔ میں ڈیرے سے باہر آ گیا۔ جنوب مغرب سے چلنے والی ہوا اب کافی حد تک تھم چکی تھی۔ میں اس جانب بڑھ گیا جدھر وہ کیکر ہو سکتا تھا۔

وہ کیکر کا درخت دور ہی سے دکھائی دے گیا۔ بہت بڑا ہو چکا تھا۔ بڑی عجیب بات ہے، برگد جتنا پرانا ہوتا ہے، وہ اتنی زیادہ اور گھنی چھاؤں دینے لگتا ہے لیکن یہ کیکر پرانا ہو کر بھی اتنی زیادہ چھاؤں نہیں دے سکتا۔ ہاں اس کے کانٹے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس جانب بڑھتا گیا۔ کیکر کے نیچے بہت ساری بکریاں بیٹھی تھیں ...... کچھ ادھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ ایک نوجوان نیلی قمیص اور سفید دھوتی پہنے سفید رنگ کی پگڑی باندھے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے اس کے نقوش میں بچپن کا سانول تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یوں لگا کہ شاید وہی ہو۔ وہ ایک اجنبی کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے پاس جا کر علیک سلیک کی اور بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اسی بستی کے ہو نا؟"

"ہاں، میں ادھر ہی رہتا ہوں۔" اس نے مقامی زبان میں کہا۔

"یہ ریوڑ تمہارا ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں شک بھرا سوال کر دیا۔

"میرا ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ایسے ہی، بس میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اسی تیز لہجے میں پھر سے سوال کر دیا۔

"تم کیوں باتیں کرنا چاہتے ہو، تم بتاؤ تم کون ہو؟"

"تم تو لڑنے لگے ہو یار، میرا نام علی ہے اور میں یہاں میرن شاہ کا مہمان ہوں، اب بتاؤ، تمہارا نام کیا ہے۔" میں نے جان بوجھ کر میرن شاہ کا نام لیا تھا، جس کا میں نے واضح اثر دیکھا۔ وہ تھوڑا ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے میری جانب غور سے دیکھا پھر بولا۔

"سانول ہے میرا نام، یہ ریوڑ میرا اپنا ہے۔ اب بولو۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے اپنے اندر کی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل بچپن جیسا تھا۔ لڑاکا، تیز اور شک کرنے والا۔

"تو پھر پوچھ کیوں رہے تھے؟" اس نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس یار یہاں کے لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا، تمہیں برا لگا تو کوئی بات نہیں، میں کسی دوسرے سے بات کر لوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے، جاؤ کر لو۔" اس نے اکھڑ لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔ اس پر سانول نے مجھے غور سے دیکھا، اس کا چہرہ تن گیا تھا۔ بلاشبہ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اس کا مذاق اُڑا رہا ہوں۔ اس نے چند لمحے میری طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر اپنے ریوڑ کو ہانکنے لگا۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ اب وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ بالکل انہی لمحوں میں مجھے وہ چہرہ یاد آنے لگا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کا ہیولا، نیلی شلوار، سنہری قمیص، سرخ آنچل، ماتھے پر جھومر، سفید گالوں پر سرخ غازہ لگائے، وہ بھی ماتھے پر تیوریاں ڈال کر بات کرتی تھی، وہ کون تھی، اس کا نام کیا تھا، وہ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی یاد نہیں آ رہا تھا، اس کی بھی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ میں اس ہیولے کے خیال میں کھو گیا تو سانول اپنا ریوڑ لے جا چکا تھا۔ میں وہیں خیالوں میں الجھا کھڑا رہا تھا۔

میں واپس ڈیرے پر آ گیا تھا۔ وہاں سوائے بوڑھے خیردین کے دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ چارپائیاں بچھا رہا تھا۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر

کہا۔
''بیٹا، تم یہاں کس لیے آئے ہو؟''
''بابا، میں یہاں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تم لوگوں کی زندگی میں کیا سہولت دی جا سکتی ہے اور یہ سہولت کیسے مل سکتی ہے؟'' میں نے بہت آسان کر کے اسے بتانا چاہا تو وہ ایک لمحے کو ساکت ہو گیا، پھر سوچتے ہوئے بولا۔
''تم کوئی قسمت بدلنے والے ہو یا تقدیر بنانے والے؟''
بوڑھے خیر دین کے لہجے میں جو تلخی، احتجاج اور طنز تھا، میں اس سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ایسی سچائی تھی جس نے زندگیوں کو نگل لیا تھا۔ صدیوں سے یہاں رہنے والے لوگوں کی وہی زندگی تھی، وہی قسمت، وہی تقدیر، وہ یہاں سے نکل کر جاتے بھی کہاں؟ یہ تلخ حقیقت تھی کہ یہاں انسان بھی جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔
''نہیں بابا، میں انسان ہوں، نہ قسمت بدل سکتا ہوں اور نہ تقدیر میرے ہاتھ میں ہے لیکن شاید تقدیر بنانے والے نے قسمت لکھنے والے نے مجھے یہاں بھیج دیا۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''تم کیا کر لو گے؟'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''جو ہنر میں جانتا ہوں، اس کی وجہ سے یہاں سہولیات مل جائیں تو شاید آپ سب اپنی قسمت بدلتی ہوئی محسوس کریں۔ شاید آپ لوگوں کی تقدیر بدل جائے۔''
''ایسا ہونا ہوتا تو کب کا ہو چکا ہوتا، خیر تم بھی دیکھ لو۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ میرن شاہ کے گھر کی طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری۔
''بابا، یہ کھانا لے جا۔''
لاشعوری طور پر میں نے اس طرف دیکھا۔ وہ چھوٹے سے دروازے کی اوٹ میں تھی۔ میرون رنگ کا زنانہ لباس ذرا سا دکھائی دے رہا تھا۔ بابے خیر دین نے ایک بار ادھر دیکھا، پھر بولا۔ ''لے آؤ۔''
اس کی آواز کی بازگشت میں ایک درمیانے سے قد کی صحت مند لڑکی میرے سامنے نمودار ہوئی۔ اس نے میرون رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا، اسی رنگ کا آنچل یوں سر پر لیا ہوا تھا کہ اس میں سے اس کا گول چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ تیکھے نین نقش، وہی ستواں نخرے بھری ناک، وہی شرارتی گہری نیلی آنکھیں۔ وہی سرخ گال، ذرا سی خمیدہ ٹھوڑی، وہی چوڑا ماتھا اور دائیں جانب ہلکا سا زخم کا نشان، وہ ساوری تھی۔ وہی ساوری جو بچپن میں بتاشے، مکھانے اور مٹھائی اپنے بھوچھن میں چھپا کر رکھتی تھی۔
''یہ میری بیٹی ہے ساوری۔'' بابا خیر دین نے کہا تو میں ہڑبڑا گیا۔ میں نے بس ایک لمحہ اسے دیکھا تھا اور پھر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ وہ دونوں میری کیفیت سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی میں انہیں اپنے اندر کی کیفیات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ دکھ اور خوشی کی ملی جلی کیفیات، جسے میں بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ جھکی نظروں سے میں نے اس طرف دیکھا، اس کے پاؤں دکھائی دیے جس میں ہلکی سی پائل تھی اور پھٹا ہوا پرانے چمڑے کا جوتا۔
''بابا میں تجھے بھی کھانا لا دوں؟'' ساوری نے پوچھا۔
''ہاں مجھے بھی یہیں لا دو۔'' اس نے کہا۔
ساوری پلٹ گئی تھی۔ بابا خیر دین وہیں میرے ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کھانا اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔
''آؤ بابا مل کر کھاتے ہیں۔''
''نا پتر، تم کھاؤ، ساوری لے آتی ہے میرے لیے۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
''پھر کیا ہوا، اکٹھے......''
''حرج تو نہیں ہے لیکن اگر سائیں نے دیکھ لیا تو...... تم اس کے مہمان ہو نا، تم کھاؤ۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا۔ میں کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ساوری اپنے بابا کے لیے بھی کھانا لے آئی۔ اس بار ساوری کے بدن میں تناؤ نہیں تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے ہمارے قریب آ گئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے سامنے کھانا رکھا، لمحہ بھر کو کھڑی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ مگر میرے اندر اسے بڑے غور سے دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ بچپن کا وہ بھولا بھالا چہرہ، اس وقت کس قدر آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ وہ دلوں پر راج کر سکتا تھا۔ شاید تیکھے نین نقش والا چہرہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ میری ہی کیفیات مجھے ورغلا رہی تھیں۔ ساوری کھانا رکھ کر جا چکی تھی۔
میں کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں وہی سانول، ساوری اور کیکر آ بسے۔ وقت نجانے کتنی تیزی سے پیچھے چلا گیا۔ کیکر کے ارد گرد کتنے ہی سارے لڑکے تھے۔ ذرا فاصلے پر کچھ لڑکیاں بھی یہ کھیل دیکھ رہی تھیں۔ ان میں ساوری بھی تھی۔ ایک اور لڑکی بھی تھی، جس کا چہرہ ہیولے کی طرح میرے دماغ میں تو آ رہا تھا لیکن وہ چہرہ واضح نہیں

تھا۔ وہ کون تھی یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ اب سانول کی باری آ گئی تھی۔ تنے کے اردگرد ایک گول دائرہ بنایا گیا تھا۔ جس کے اندر کچی زمین پر جوتے رکھے ہوئے تھے۔ تنے کے ساتھ ایک چھوٹی سی رسی تھی۔ جسے سانول نے پکڑا ہوا تھا۔ لڑکے دائرے میں سے جوتے اٹھا رہے تھے۔ سانول رسی پکڑے پکڑے انہیں ہاتھ لگانے کی کوشش میں تھا لیکن کوئی بھی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ جوتے کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اگر سارے جوتے اس دائرے میں سے اٹھا لیے جاتے تو سانول کو بھاگنا پڑتا۔ اسے تھوڑے سے فاصلے پر موجود ڈیرے کے گیٹ لگانا تھا۔ اس دوران اس پر جوتوں کی بارش ہو جاتی تھی۔ یہی اس کھیل کا سب سے اہم، دلچسپ اور مزیدار حصہ ہوتا تھا۔ جوتے کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سانول کی جھنجھناہٹ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لڑکے پُرجوش ہو کر جوتے اٹھانے کی کوشش میں تھے۔ چند جوتے رہ گئے تھے۔ سانول رسی پکڑے تیزی سے گھوم رہا تھا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ سانول کو بھاگنا پڑے گا۔ لڑکیاں بھی شور کر رہی تھیں اور پھر مجھے نجانے کب نیند آ گئی۔ میں سو گیا تھا۔

☆☆☆

صبح کا نور پھیلا ہوا تھا۔ میں بیدار ہو گیا تھا۔ صحرا کی شام کا جادو تو ہوتا ہی ہے لیکن ابھرتے ہوئے سورج سے پہلے کا سماں بھی سحر انگیز ہوتا ہے۔ میں بہت دور تک نکل گیا تھا۔ دور تک کھیت بن گئے تھے۔ ان میں پانی نہ ہونے کے باعث اجاڑ پن کا تاثر بکھرا ہوا تھا۔ سامنے اونچے ٹیلوں کی قطار تھی جس کے دوسری جانب راستہ تھا۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اونچی جگہ سے بستی کی طرف دیکھا تو لگا بستی بھی اتنی ہی تھی، شاید چند گھر بڑھے تھے یا کچھ جھونپڑوں کا اضافہ ہوا اتھا۔ اس منظر میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر پلٹ کر واپس ڈیرے تک چلا آیا۔

ڈیرے پر بہت سے لوگوں کے درمیان میرن شاہ ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں ڈیرے میں داخل ہوا تو سبھی کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ ایک لمحے کو وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے ان کے قریب جا کر سلام کیا تو میرن شاہ نے اپنے قریب کھڑے منشی مہر خان سے پوچھا۔

''اوئے اس کا بیگ لانا تھا، وہ لائے ہو؟''

''وہ بیگ تو محفوظ ہے لیکن اسے لانے کے لیے تمہیں خود جانا پڑے گا۔'' مہر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں خود چلا جاؤں گا۔ وہ اسی ریہڑھے والے کے پاس ہے نا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اسی کے پاس ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تمہارا بیگ، تمہیں ہی واپس کرے۔'' منشی نے تلخی سے کہا۔

''ایسا کہتا ہے وہ؟'' میرن شاہ نے غصے بھرے لہجے میں کہا پھر لحہ بھر بعد ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا، ''چل ٹھیک ہے، خود ہی لے آئے یہ جا کر، اسے راستہ سمجھا دینا بلکہ خیر دین کو بھیج دینا ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔'' مہر خان نے میری جانب دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے میرے متعلق بات ختم ہو گئی ہو۔ مجھے اس کا لہجہ اور انداز بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا انداز یوں تھا جیسے وہ کسی ملازم یا اپنے کسی کمین سے بات کر رہا ہو۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

جب تک میں نہا دھو کر تیار ہوا، وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔ میرے پاس خیر دین رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل میں گدگدی ہونے لگی تھی۔ ابھی ساوری ناشتا لے کر آئے گی۔ ایک عجیب سی مدھ بھری کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی تھی۔ نجانے کیوں مجھے خواجہ غلام فرید کی کافی کے بول یاد آنے لگے تھے۔ اس کا ترجمہ تھا۔ روہی میں ایسی نازک اور ناز ادا لڑکیاں رہتی ہیں جو رات کو دلوں کا شکار کھیلتی ہیں اور دن کے وقت چھاچھ کے مٹکے بلوتی ہیں...... یہ نازنین اس طرح چھپ کر نینوں کے تیروں وار کرتی ہیں کہ جن سے سیکڑوں دل گھائل ہو جاتے ہیں۔

ہوا کا جھونکا بھی آواز پیدا کرتا تو میں اس دیوار کی جانب دیکھتا جہاں سے ساوری نے آنا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ خیر دین خود ہی ادھر گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ناشتا لے آیا۔ مجھ پر اوس پڑ گئی۔ میرا دل جو اسے دیکھنے کو ہمک رہا تھا، ایک دم سے بجھ گیا۔ میں نے بے دلی سے ناشتا کیا اور اٹھ گیا۔

خیر دین میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بستی سے نکلتے ہی مجھے راستہ سمجھایا۔ اس کے ساتھ ہی بولا۔

''ابھی وہ گھر میں مل جائے، یا پھر ممکن ہے وہ اپنا ریہڑھا لے کر نکل گیا ہوا، دن خاصا چڑھ آیا ہے نا۔''

''مل گیا تو ٹھیک ورنہ ہم سیر تو کر لیں گے۔ علاقہ ہی دیکھ لیں گے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تو وہ کافی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''تم یہاں کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں علاقہ دیکھنے کے بعد اپنے افسروں کو یہ بتا سکتا

ہوں کہ یہاں کون کون سی سہولت دی جا سکتی ہے۔ جیسے کہ تم نے پانی کی سہولت کہا تھا، تو یہ دیکھنا ہوگا کہ بارش کا پانی ہی اکٹھا کیا جائے اور اسے صاف کیا جائے، کسی نہر کا پانی مل جانے کی امید ہو، یا کوئی کنواں، یا جیسے بھی۔'' میں نے اسے اپنی طرف سے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ بس جہاں ضرورت پڑتی، مجھے راستہ بتا دیتا۔ میں کچے راستے میں سے جیپ لے جاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

ہم ایک بستی کے سامنے آ رکے۔ وہاں چند کچے گھر تھے۔ روہی میں گھروں کی چار دیواریاں بنانے کا رواج ہی نہیں ہوتا، بس کمروں سے ذرا فاصلے پر چھپر ڈال کر ان کے نیچے بیٹھے رہتے۔ جتنا لیپ پوت کر بنا لیا جاتا، اتنا ہی ان کا صحن ہوتا ہے۔ بڑی بڑی گلیوں کے درمیان بھربھری ریت بکھری ہوئی تھی۔ میں نے خیر دین کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔

''یہیں آ گئے، اس کا گھر ہے۔''

''جیپ سمیت چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے مرضی، جیپ بھی چلے جائے گی۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ دو گلیاں پار کرنے کے بعد مجھے وہ ریڑھا دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ اونٹ بندھا ہوا تھا۔ میں نے جیپ وہیں روک دی۔ وہ لوگ سامنے ہی چھپر تلے بیٹھے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ریڑھے والا اٹھ کر آ گیا۔ اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور خیر دین کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ جس پر مجھے کافی حیرت ہوئی۔ تبھی میں نے کہا۔

''یار وہ میرا بیگ......''

''ہاں ہاں میرے پاس پڑا ہے، لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اندر کمرے میں گیا، کچھ ثانیے بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں میرا بیگ تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے بیگ میری جانب بڑھایا تو میں نے مروت میں کہا۔

''بہت شکریہ یار۔''

''دیکھ لو کوئی چیز کم تو نہیں ہے، میں بعد میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔'' اس نے کھردرے سے لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس بیگ میں اس کے کام کی کوئی چیز نہیں تھی سو میں نے پلٹتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، پھر بھی شکریہ تمہارا۔'' یہ کہتے ہوئے

اچانک میرے ذہن میں سوال در آیا۔ وہ نوجوان جو میرے قریب بیٹھا تھا اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بارے میں وہ ریڑھے والا ضرور جانتا ہوگا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی اس سے یہ سوال نہیں پوچھ سکا۔ اس کی وجہ صرف اس کا کھردرا رویہ تھا۔

ہم واپس پلٹ کر جیپ میں آ بیٹھے تو میں نے خیر دین سے پوچھا۔ ''کتنا بدتہذیب بندہ تھا، تم سے سلام بھی نہیں لیا؟''

''اس کا قصور نہیں ہے، اس کو ایسا کرنا ہی تھا، ان بستی والوں کی ہم سے دشمنی چل رہی ہے۔ یہ ہمارے تین بندے مار چکے ہیں اور ہم نے اب تک دو مارے ہیں۔ تیسرا مارنا......''

''مطلب اس رات جس بندے کی تلاش میں یہ میرن شاہ کے لوگ گئے تھے وہ ان کا بندہ تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، وہ ہی تھا جس نے ہمارے دو بندے مارے ہوئے ہیں، اس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ آ رہا ہے۔'' خیر دین نے بتایا۔

''اوہ، مطلب وہ بندہ ان کے ہتھے نہیں چڑھا اب تک؟'' میں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، اب وہ کہاں ہاتھ آتا ہے، وہ تو غائب ہو گیا، پتا نہیں اب کدھر ہے، واپس پلٹ گیا ہے یا پھر بارڈر ہی پار کر گیا ہو۔'' خیر دین نے اپنی رو میں کہہ دیا۔

''بارڈر یہاں سے کتنی دور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نقشے تیرے پاس ہیں، پوچھ مجھ سے رہا ہے۔'' خیر دین نے طنزیہ انداز میں کہا تو مجھے کافی سبکی محسوس ہوئی۔ بات تو وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تبھی میں نے اپنی خجالت دور کرتے ہوئے کہا۔

''یہی میرا خیال ہے دو تین کلو میٹر تک ہوگا؟''

''اس سے بھی کم ہے، سدھائے ہوئے اونٹوں سے تو مزید کم۔'' اس نے دور ریتیلے راستے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔ میرے دماغ میں یہ سوال آیا کہ خیر دین سے پوچھوں، کبھی بارڈر پار گیا ہے؟ لیکن مصلحت کے تحت میں نے وہ سوال دبا دیا۔ شاید اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی یا پھر اسے یقین تھا کہ میں ایسا ہی کوئی سوال کروں گا۔ اس لیے خود ہی بولا۔

''میں کئی بار گیا ہوں بارڈر کے پار، وہاں بھی ہمارے

جیسا ہی حال ہے۔ ایسی ہی غربت، وہ بھی پیاسے اور حاکموں کے تابع۔“ اس کے لہجے میں انجانا درد تھا۔

واپسی پر خیردین پھر خاموش تھا۔ میں اب خود اس سے باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ابھی ان لوگوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے میری کوئی بات انہیں بری لگ جائے۔ واپسی پر وہی صحرا کا سناٹا اور جیپ کی مخصوص آواز تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا ہی خاموش ہوگئی ہو۔ صرف میں خود اپنے ہونے کے احساس کے لیے گاڑی کا شور کر رہا ہوں۔ یوں فطری طور پر رفتار تیز تھی۔ جلد ہی ہم بستی کے پاس پہنچ گئے۔

میرے سامنے بستی تھی۔ میرا دل ہمک رہا تھا کہ میں اندر جاؤں، دیکھوں لیکن ایک انجانی قوت میرے دماغ سے اس خیال کو نوچ رہی تھی۔ وہ خیال پھیل کر میرے جذبات میں ہلچل مچانے لگا تھا، وہی قوت اسے سمیٹ کر میرے دماغ سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں اسی کشمکش میں بستی کے پاس پہنچا۔ میں رکنا چاہتا تھا لیکن نہیں رُکا اور پھر سیدھا ڈیرے پر جا رُکا۔ مجھے لگا میرا بستی کے قریب سے گزر کر آنا مجھے بے بس کر رہا تھا۔

دوپہر ہوگئی تھی۔ میں بیگ لے کر کمرے میں چلا گیا۔ صحرا میں بنے ان کچے کمروں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ گرمیوں میں ٹھنڈے اور ہوادار ہوتے ہیں۔ دیواروں میں چھوٹے چھوٹے جھروکے بنے ہوتے ہیں۔ ان سے ہوا ایک طرف سے آتی اور دوسری جانب نکل جاتی تھی۔ یہی جھروکے جب سردیوں میں بند کر دیے جاتے تو رات کے وقت یہی کمرے گرم ہو جاتے۔ میں نے اپنا بیگ چارپائی پر رکھا اور اسے کھول لیا۔ ساری چیزیں ویسی ہی تھیں۔ میں نے اپنے مطلب کی چیزیں اور کاغذات نکال لیے۔ میرے سامنے اس علاقے کا نقشہ پھیل گیا تھا۔ یہ نقشہ تھوڑا پرانا تھا لیکن میری ضرورت کے لیے بہت تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلنے کو تھی لیکن خیردین کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے ایک طرح سے خوشی ہو رہی تھی۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی نہ آئے۔ بھوک سے زیادہ مجھے ساوری کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ کسی بھی وقت آسکتی تھی یا شاید خیردین کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی نہ آتی۔ میں اس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان اُلجھ رہا تھا۔ انہی لمحات میں دیوار میں موجود دروازہ بجا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ دروازہ پھر بجا،

چند لمحوں کے بعد ساوری نے سر نکال کر دیکھا۔ اس کا آنچل اور گیسو گڈمڈ ہو کر اس کا چہرہ چھپا رہے تھے۔ ذرا سا آنچل اس نے اپنے دانتوں میں دبایا ہوا تھا۔ اسے جب خیردین نظر نہیں آیا تو اس نے مجھے آواز دی۔

”اے بھائی، یہ کھانا لے لو۔“

میں نے اس کی آواز سن لی تھی لیکن جان بوجھ کر اس کی طرف سے انجان بن گیا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں میری چارپائی تک آجائے۔ تبھی پائل کی آواز میرے قریب آنے لگی۔ بالکل قریب آکر پائل کی آواز تھم گئی اور وہ غصے میں بولی۔

”تجھے سنتا نہیں، بہرا ہے؟“

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بڑے سکون سے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح سنتا ہے۔“

”پھر یہ کھانا لینے کیوں نہیں آئے۔“ اس نے مزید گرمی دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گالوں سے تو لگتا تھا ابھی خون پھوٹ پڑے گا۔

”میں کوئی فقیر نہیں ہوں کہ خود جا کر کھانا لے کر آؤں۔“ میں نے اسی اطمینان سے جواب دیا تو وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”یہاں ڈیرے پر پڑے لوگ تو خود کھانا مانگتے ہیں۔“

”میں لوگ نہیں ہوں۔ مجھے کھانا دینا ہے تو یہاں لا کر دیا کرو۔“ میں نے بڑے سکون سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بوکھلائی نہیں بلکہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”بابا نے اگر مجھے یہاں آنے کا کہا نہ ہوتا نا، تم یونہی بھوکے رہتے۔ میں یہاں نہ آتی۔“

”چلو اب آگئی ہو تو کھانا یہاں لا کر رکھا کرو۔ اور ہاں میرے ہاتھ بھی دھلوایا کرو۔“ میں نے قدرے رعب سے کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

”دیکھ تو میرے ساتھ زیادہ باتیں نہ کر، زیادہ باتیں کرے گا، تو تیری خیر نہیں ہوگی۔“ اس نے اپنے لہجے کو سخت کرتے ہوئے کہا

”کیا ہوگا؟“ میں نے سکون سے پوچھا۔

”یہاں کی عورتوں کی طرف ذرا سی بھی میلی آنکھ سے دیکھا نا تو آنکھیں نکال لیتے ہیں، مار دیتے ہیں بندے کو۔“ اس نے ڈرا دینے والے انداز میں کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

"میری آنکھوں میں دیکھو، کیا ہے ان آنکھوں میں۔"
میرے یوں کہنے پر وہ پہلے حیرت زدہ ہوئی، پھر اس کی آنکھوں میں شوخی لپکی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بات اپنے لبوں میں دبا کر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ بہار بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔ میں اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ عجیب بات میرے ساتھ ہو رہی تھی کہ میں جب بھی ساوری کے بارے میں سوچتا، ایک اور چہرہ میرے دماغ میں اپنا احساس ضرور منواتا۔ نہ تو مجھے اس چہرے کے خدوخال یاد تھے اور نہ ہی یہ پتا کہ وہ کس کا چہرہ ہے، بس ایک ہیولا سا میرے دماغ میں اٹھتا اور مجھے قابو میں کر لیتا۔ میں ساوری کے بجائے اسے سوچنے لگتا۔ یہ کیا تھا، پہلی بار مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟
میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بابا خیر دین گیٹ کی طرف سے آہستہ آہستہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ ڈیرے کے بالکل سامنے دور کہیں مجھے ایک الاؤ دکھائی دیا۔ یہ روہی کی ایک پرانی روایت تھی۔ چند یار لوگ بستی سے نکل کر دور کسی ٹیلے پر جا بیٹھتے تھے۔ وہاں جا کر الاؤ روشن کرتے اور اس کے گرد بیٹھ کر باتیں کرتے، گیت گاتے وقت گزار کر واپس آجاتے۔ یہ ایک عام سی تفریح تھی۔ میں چارپائی پر پڑا تھا، مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر بابا خیر دین لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اسے دھیمے سے آواز دی۔ اس نے میری آواز کا جواب نہیں دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سویا ہوا ہے۔ میں اٹھا اور جوتے پہن کر باہر کی جانب چل دیا۔
میں کوئی آدھا کلومیٹر چل کر ان کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے الاؤ کے گرد چادریں بچھائی ہوئی تھیں۔ قریب کی روہی میں موجود جھاڑی 'لانا' کی لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہر ایک نے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر باہر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ان کے پاس جا کر علیک سلیک کی تو ایک بندے نے مجھے پہچان کر سب کو بتا دیا۔ تبھی مجھے وہاں بیٹھنے کی دعوت دی گئی تو میں ایک جانب چادر پر خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے دیکھا، بستی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان یونہی باتیں چل نکلیں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ میں ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ میں ان میں سے کوئی ایسا بندہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں جو میرے کام آسکتا ہو۔ وہ مجھے علاقے کے بارے میں بتاتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔
"یار معذرت چاہتا ہوں، میں تم لوگوں کی محفل میں مخل ہوا۔ میں یہاں دو دنوں میں ہی گھبرا کر رہ گیا ہوں۔"
"نہ نہ سائیں ہم بھی تو یونہی باتیں کرتے ہیں، گھوگپ شپ لگاتے ہیں یہی ہماری تفریح ہے۔" ایک نوجوان نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔ وہ تیکھے نین نقش کا لمبے بالوں والا نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور اس پر بھاری مونچھیں تھیں۔ پھر اس نے اپنے سامنے موجود ایک بندے سے اونچی آواز میں کہا، "اوئے بخشو، سنا کچھ......"
بخشو نے اپنے پیچھے پڑی بڑی سی ڈف اٹھالی۔ کچھ ہی دیر اس نے الاپ چھیڑا اور بڑی درد بھری آواز میں ایک گیت کا مکھڑا کہا۔ ترجمہ:
اے میرے چاند، تیرے سارے وعدوں کے مانند تیرا پیار بھی جھوٹا ہے۔ پرندوں کے مانند اُڑ جانے والوں کا کیا اعتبار کیا جائے۔
اس کی آواز میں درد تھا۔ رات کے سناٹے میں ساز و آواز دور تک پھیل گئے تھے۔ وہ سب دن بخود ہو کر گیت سن رہے تھے۔ جیسے ہی اس نے یہ مصرعے کہے۔ ترجمہ:
میں ہجر کی آگ میں جل گئی ہوں۔ میرے نصیب اچھے نہیں، میں تجھے یاد کر کے زاروزار روتی ہوں۔
اس پر اسی تیکھے نین نقش والے نوجوان نے اونچی آواز میں ایک نعرۂ مستانہ لگایا۔ جیسے یہ لفظ اس کے دل پر اثر کر گئے ہوں۔ ایک بار میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے سر ہلا رہا تھا۔ نجانے درد میں ڈوبے ہوئے وہ لفظ مجھ پر بھی اثر کرنے لگے تھے۔ میں نے ایک بار گھوم کر بستی کی جانب دیکھا۔ وہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرے سامنے الاؤ روشن تھا۔ ماحول ایسا بن گیا تھا کہ میں کھو سا گیا۔ میرے سامنے آگ روشن تھی۔ ہماری جھونپڑی جل رہی تھی۔ میں ہونق بنا اپنے باپ کی آوازیں سن رہا تھا۔ کبھی میں اپنے لہولہان باپ کی جانب دیکھتا اور کبھی اس کے کہے لفظوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہے چلے جا رہا تھا۔
"بھاگ جا...... تجھے بھی مار دیں گے...... یہاں سے بھاگ جا...... جا جلدی کر بھاگ جا......"
اندھیری رات میں جلتا ہوا گھر، باپ کی بے بسی میں چلاتی ہوئی درد بھری آواز، موت کا خوف، چیخنے چلانے کی

صدائیں، ماؤف دماغ کے ساتھ میں نے جلتی ہوئی جھونپڑی کو دیکھا پھر اندھیرے کی جانب نظر کی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے صرف اپنے باپ پر اعتماد تھا۔ اس نے کہا تھا بھاگ جا تو میں بھاگ گیا تھا۔ مجھے اندھیرے سے بھی خوف نہیں رہا تھا۔ بس باپ کا حکم تھا اور میں بھاگ رہا تھا۔

''سائیں کیا ہو گیا، اتنے خاموش کیوں ہو؟'' ایک آواز نے مجھے حال میں پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا، ان سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ میں کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔ تبھی ایک دوسرے نوجوان نے کہا۔

''گیت میں کھو گئے، کوئی اپنی یاد آ گئی ہو گی۔''

''ہاں ہم یہاں اپنی یادوں کے لیے ہی تو بیٹھتے ہیں۔'' اسی نوجوان نے کہا تو مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں اٹھ گیا تو اسی لمبے بالوں والے جوان نے پوچھا۔

''سائیں کوئی غلطی ہو گئی، یوں جا رہے ہو؟''

''نہیں بس، اتنا ہی کافی ہے، سوتا ہوں اب جا کر۔'' میں نے کہا۔

''میرا نام محمد زمان موہل ہے۔ کبھی کبھی ادھر آ کر بیٹھتے ہیں۔ آ جایا کریں جب تک یہاں ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے وہ مضبوط بندہ دکھائی دیا۔

میں انہیں وہیں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ میں لکڑی والا پھاٹک پار کر کے جیسے ہی چارپائی پر لیٹا تو بابا خیر دین بولا۔

''دو چار گیت مزید سن لیتے۔''

''بس دل بھر گیا تو اٹھ کر واپس آ گیا۔'' میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔

''چل ٹھیک ہے سو جا۔'' اس نے کہا تو میں نے پہلو بدل لیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے مجھے جس خیال نے ڈسٹرب کر دیا تھا، وہی خیال پھر سے میرے دماغ میں بھونچال مچانے لگا تھا۔ میں نے ذہن بدلا تو مجھے وہ ہیولا دکھائی دینے لگا جس کے نین نقش تو واضح طور پر مجھے یاد آ رہے تھے مگر وہ کون تھی، یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن میں اس اُلجھن کو دور کرنے کے لیے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ دیر تک اسے سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنا خیال ساوری کی جانب موڑ دیا۔ کیا بھرپور جوان نکلی تھی وہ۔ وہ بھی ہوا کے جھونکے کے مانند آئی تھی اور پھر دکھائی ہی نہیں دی تھی۔

اگلی صبح میری آنکھ انجانے شور سے کھلی۔ میں نے دیکھا میرن شاہ کے کارندے ایک آدمی کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ وہ لہولہان ہونے کے باعث بے سدھ ہو رہا تھا۔ کارندے اسے مارتے، غلیظ گالیاں دیتے ہوئے لا رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے میری چارپائی سے ذرا فاصلے پر اُسے لا پھینکا۔ وہ کارندے مجھے یوں نظرانداز کر رہے تھے جیسے میرا وہاں ہونا اور نہ ہونا ایک برابر ہے۔ وہ زخمی کچے فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں شاید چوٹیں سہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کارندے چھ سے زیادہ ہی تھے۔ انہوں نے اس زخمی کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ جس کا دل چاہتا اسے غلیظ گالی دے کر ٹھوکر مار دیتا۔ یہاں تک کہ وہ زخمی بے سدھ ہو گیا۔

''سائیں کو بلا لیں۔'' ایک کارندے نے سجان سے پوچھا۔ میں نے تین دنوں میں سمجھ لیا تھا کہ یہی ان کارندوں کا بڑا ہے۔ اسی نے گن کا بٹ میرے کاندھے پر مارا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بُلالو۔''

اسی لمحے ایک بندہ رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ اس نے چھوٹے دروازے کو بجایا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ شاید کسی کو پیغام دے کر لوٹ آیا۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

میں واپس آیا تو میرن شاہ آ چکا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا اسی بے ہوش شخص کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بندہ اس کے منہ پر پانی ڈال کر اسے ہوش میں لا رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ اس منظر کو دیکھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں انہیں یہی باور کرانا چاہتا تھا کہ مجھے ان کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمرے میں حبس تھا لیکن میں کمرے میں بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ زخمی ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے مدہوشی میں اردگرد دیکھا تو سامنے میرن شاہ کو پا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑا کر بولا۔

''سائیں، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ میں انہیں بتا چکا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے وہ رات تیرے پاس رہا تھا۔'' میرن شاہ نے کہا۔

''رات رہا تھا، یہ تو میں مانتا ہوں، پر صبح ہوتے ہی وہ چلا گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اسے آپ سائیں تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''تجھے پتا نہیں ہے کہ وہ ہمارا دشمن ہے؟'' میرن شاہ نے پوچھا۔

''سائیں، مجھے مرشد کی قسم، ایسا مجھے پتا ہی نہیں تھا،

مجھے پتا ہوتا تو میں خود اسے آپ کے پاس لے آتا۔ کچھ نہ ہوتا تو آپ کو بتا ہی دیتا۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دوہائی دینے والے انداز میں کہا۔

''دیکھ، بتا دے اگر تجھے پتا ہے تو، میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔'' میرن شاہ نے پھر کوشش کی۔

''سائیں، مرشد کی قسم ہے سائیں، مجھے نہیں معلوم، میری ہمت نہیں ہے کہ میں آپ کے دشمن کو پناہ دوں۔'' اس نے پھر اسی طرح گڑگڑاتے ہوئے کہا تو میرن شاہ نے چند لمحے سوچا اور پھر سرد سے لہجے میں کہا۔

''دیکھ لے، سوچ سمجھ کر بول۔''

''میں سوچ سمجھ کر بول رہا ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میرن شاہ نے سجان کو اشارہ کیا، وہ ذرا سا آگے بڑھ کر بولا۔

''سائیں یہ جھوٹ بولتا ہے۔ رات اس نے بختاور کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے بارڈر پر چھوڑ کر آیا ہے، بختاور بارڈر پار کر گیا ہے۔ اپنے آدمیوں نے دیکھا ہے تو انہوں نے بتایا۔''

سجان نے اتنا کہا ہی تھا کہ زخمی کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ وہ یوں ہو گیا جیسے موت دکھائی دینے لگی ہو۔ میرن شاہ غضب ناک انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر بولا۔

''اب کہو، یہ غلط کہہ رہا ہے؟''

''سائیں میں بارڈر پر گیا تھا مال لے کر، لیکن میرے ساتھ بختاور نہیں تھا۔'' اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''تو پھر کون تھا؟'' میرن شاہ نے پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ چند لمحے اسی خاموشی میں گزر گئے تو میرن شاہ نے ہاتھ بڑھایا اور سجان سے گن لے لی۔ اس کا میگزین چیک کیا پھر کچے فرش پر پڑے ہوئے زخمی کی طرف نال کر کے دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''سچ بتا دے۔''

''سائیں وہ بارڈر پار کر گیا ہے۔'' زخمی نے تیزی سے کہا تو اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا۔ وہ زخمی کچے فرش پر تڑپنے لگا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ میرن شاہ نے اپنی شکست کا بدلہ اس سے لے لیا تھا۔ اس نے گن سجان کو واپس کی اور چند لمحے ساکت سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اسے وہاں سے اٹھانے کا اشارہ کیا۔ کارندوں نے اس تڑپتے ہوئے نوجوان کو اٹھایا اور باہر کی جانب چل دیے۔ چارپائی پر اکیلا میرن شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کمرے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔

''اوئے علی بھائی، باہر آ جا، اب کوئی نہیں ہے۔''

میں اٹھا اور باہر آ گیا۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔

''اوئے تم تو بہت زیادہ ہی ڈر گئے ہو یار۔''

''میں نے ایسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' میں نے پوری کوشش کر کے اپنی آواز میں خوف پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ایسے ہوتا ہی رہتا ہے یہاں پر۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ ''جس رات تم یہاں آئے تھے، جس کی جگہ میرے آدمی تمہیں پکڑ لائے تھے، وہی بختاور تھا۔ وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر بارڈر پار کر گیا ہے۔ اس بے غیرت نے اسے بھگایا ہے۔ سزا تو بنتی ہے نا۔''

''سائیں تم جانو اور تمہارا کام۔'' میں نے خوف زدہ انداز میں کہا تو اس نے پوچھا۔

''یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا، کام شروع کب کرنا ہے؟''

''سائیں میں نے کہا تھا کہ اس علاقے کو جاننے والا کوئی بندہ دے دیں..... مجھے لوگوں سے ملنا ہے۔ علاقے کو دیکھنا ہے۔''

''اچھا، دیتے ہیں تمہیں کوئی بندہ۔'' اس نے کہا اور اٹھ گیا پھر یوں رک گیا جیسے کوئی خیال آ گیا ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولا، ''آج خرگوش کے شکار پر جانا ہے، چل ہمارے ساتھ، علاقہ بھی دیکھ لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً ہی ہاں کر دی۔

''چل پھر تیار ہو جا، اپنی جیپ لے لینا ساتھ، کچھ دیر بعد چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

میں ڈیرے سے باہر آیا تو وہاں تین جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کھلی جیپ میں چند لوگ شکاری کتوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پتلے منہ اور پتلی کمر.......... شکاری کتے بڑے مہنگے اور قیمتی تھے۔ دوسری جیپ میں دو آدمی تھے۔ ایک جیپ ابھی خالی تھی، اس میں میرن شاہ کو... آ کر بیٹھنا تھا۔ میں نے ان کے پیچھے اپنی جیپ لگائی، کچھ ہی دیر بعد میرن شاہ باہر آ گیا۔ اس کے ساتھ چند گارڈ نما لوگ تھے۔ وہ آ کر جیپوں میں بیٹھ گئے۔ انہیں لمحات میں دو نوجوان موٹر سائیکل پر آئے تو پیچھے بیٹھا ہوا نوجوان اتر آیا۔ میرن شاہ

نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ میری جیپ کی جانب بڑھ آیا۔ مجھے بھی وہ جانا پہچانا لگا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے ساتھ بیٹھا، میں اسے پہچان گیا۔ یہ وہی لمبے بالوں والا نوجوان تھا، جس سے رات ہی ٹیلے پر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ زمان سوہل تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا لگا تم بھی ساتھ جا رہے ہو۔''

''تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔'' میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں گاڑیاں چل پڑیں۔ جیسے ہی کچے راستے پر آئے تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں تک جانا ہے؟''

''بارڈر کے پاس......ادھر کافی شکار ملتا ہے۔''

''ویسے یار یہ خرگوش بڑا بے ضرر سا جانور ہے۔ اس کا شکار کیا کرنا؟'' میں نے یونہی بات بڑھائی۔

''سائیں شکار ہوتا ہی اس کا ہے جو کمزور ہو۔'' اس نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''دلچسپ بات کہی تم نے۔'' میں نے اس کی تعریف کی تو وہ بولا۔

''یہ جو شکاری ہوتا ہے نا، اس کی سوچ بڑی عجیب سی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے شکار سے ڈر جائے تو اس کا شکار ہی نہ کرے۔''

''لیکن ایک بات یہ بھی تو ہے نا زمان، شکار کی نوعیت دیکھ کر شکاری کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہاں خرگوش کا شکار اور کہاں شیر کا شکار۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کمزور جانور پر کتے چھوڑ جاتے ہیں، جیسے کسی کمزور انسان پر کتوں جیسے لوگ بھونکتے ہیں، انہیں کاٹتے ہیں۔ جتنا طاقت ور شکار ہوگا، اس پر محنت بھی اتنی ہی کرنا پڑتی ہے۔'' زمان سوہل نے کہا۔

''جیسے کہ......'' میں نے اس کی بات کو بڑھاوا دیا۔

''دیکھو، ایک کمزور انسان پر ایک کتے کی خصلت جیسا بندہ بھی جا کر بھونک سکتا ہے، دو لوگ جا کر اسے کاٹ سکتے ہیں، لیکن جتنا بڑا بندہ ہوگا، اتنے ہی لوگ مل کر محنت کریں گے اسے گرانے کی۔ مقابلہ اور سازش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مقابلہ مرد کرتے ہیں اور سازش بے غیرت۔'' وہ کہتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

''تم بھی میرن شاہ کے آدمی ہو، مطلب اس کے لیے کام کرتے ہو؟'' میں نے اس کی بات سن کر کہا تو وہ ہنس دیا پھر بولا۔

''تم ایسا سمجھ سکتے ہو، اب میں خود کو اس کا حصے دار تو نہیں کہہ سکتا، ہاں مگر کام ایک ہی کرتے ہیں بلکہ مل کر کرتے ہیں۔''

''پھر کوئی قانونی دھندا تو نہیں ہوگا نا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ چند لمحے پُرسکون رہنے کے بعد بولا۔

''یہاں کون قانونی دھندا کرتا ہے۔ کوئی قانون کے مطابق اور کوئی قانون کے بغیر، بہرحال دھندا ضرور کرتا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ہم کچی سڑک پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ دھول اتنی زیادہ نہیں اُڑ رہی تھی۔ زمان سوہل خاموش تھا۔ ایک جگہ ذرا گڑھا آیا تو وہ ایک دم سے محتاط ہو گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ذرا سنبھل کے......''

''کچھ پڑھے لکھے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے ایم اے کیا ہے وہ بھی سیاسیات میں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم بھی وہی کہانی سناؤ گے، نوکری نہیں ملی، در در ٹھوکریں کھا تا رہا ہوں، میرٹ نہیں ہے اور......'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے، میں نے نوکری تلاش ہی نہیں کی بلکہ میں یونیورسٹی پڑھنے جاتا ہی نہیں تھا، بس یونہی......'' وہ بھی کہتے کہتے رک گیا۔

''پھر تو امتحان بھی خود نہیں دیا ہوگا، کسی دوسرے نے پیپر دیے ہوں، ویسے پاس کر لیا تھا سیاسیات؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ایسا ہی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک خوب انجوائے کیا۔ بس آخری دنوں میں مجھ سے ایک قتل ہو گیا تھا۔ پھر نہیں گیا یونیورسٹی۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''کوئی مقدمہ کوئی ایف آئی آر......؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسے ہی شور شرابے میں، نامعلوم بندے پر پرچہ ہوا تھا۔ سیاسی بغل بچہ تنظیمیں ایسے واقعات کو کیش کرتی ہیں۔ کوئی پکڑا جائے پھر تو بات ہی ختم ہو گئی نا۔'' اس نے کھوئے

ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہاں، ممکن ہے ایسا ہی ہو، مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں۔''
میں نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔
''واپس ادھر گھر آ گیا تو میرن شاہ کے ساتھ لگ گیا، بس دھندا یہی ہے، آر پار جانا آنا۔'' اس نے کہا۔
''تو اب سمجھا، یہ خرگوش کا شکار نہیں مقصد کوئی اور ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''ہاں، ویسے تو ہمیشہ خطرہ رہتا ہے لیکن آج کل کچھ زیادہ ہی ٹینشن چل رہی ہے۔'' اس نے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم کوئی پسٹل وسٹل چلا لیتے ہو، مطلب کوئی ہتھیار چلانا؟''
''تم سکھا دو۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔
کچی سڑک کے دونوں اطراف میں صحرا میں ایسی کچی زمین تھی جس پر ریت نہیں ہوتی، اسے مقامی زبان میں 'پک' کہا جاتا تھا۔ یہاں گاڑیاں تیز چل رہی تھیں۔ میں زمان موہل کو سمجھانے لگا کہ میں یہاں سردے کے لیے آیا ہوں۔ ہم کچھ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک جھونپڑی کے پاس آ رکے۔ مقامی زبان میں اسے 'گوپا' کہتے ہیں۔
ایک اونچے ٹیلے پر کافی ساری زمین کو لیپ پوت کو صحن سا بنایا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چاردیواری تھی۔ اس کے بالکل درمیان میں مٹی اور گھاس پھوس سے گول گول بنایا ہوا وہ گوپا تھا۔ ایک آدمی وہاں پر موجود تھا۔ ہم اندر چلے گئے۔ وہ کافی ہوادار اور ٹھنڈا تھا۔
وہاں کچھ دیر آرام کے بعد ہم صحرا کی طرف پیدل نکل پڑے۔ چند آدمی کتے لیے ہمارے آگے آگے تھے۔ ہمارے پیچھے ایک گاڑی بھی آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بظاہر کہیں بھی کوئی خرگوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتے کبھی ادھر منہ اٹھاتے اور کبھی دوسری جانب منہ کر کے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کے کان کسی ایریل کی طرح حرکت میں تھے۔ میرے ساتھ زمان موہل کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں دور کچھ دیکھنے میں مصروف تھیں۔ میرے خیال کے مطابق ہم بارڈر کے بالکل سامنے نہیں بلکہ بارڈر ہماری بائیں جانب تھا۔
اچانک ایک طرف منہ کر کے کتے بھونکنے لگے۔ وہ زور لگا کر خود کو چھڑوا رہے تھے۔ میرن شاہ نے اشارہ کیا تو کتوں کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ گولی کی طرح نکلے اور بھاگنے لگے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے، چھوٹی جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے نظروں کے سامنے ہی غائب ہو گئے۔ میرن شاہ نے فوراً دوربین نکالی اور انہیں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو کتے اپنے منہ میں دو خرگوش پکڑے ہوئے آ گئے۔ وہ خرگوش لہولہان تھے۔ ایک ان میں مر گیا تھا۔ دو کتے ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی سامنے آ گئے۔
سہ پہر تک یہی کھیل چلتا رہا۔ کوئی آٹھ دس خرگوش آ گئے تھے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ زمان موہل غائب ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بندے سے اس کے بارے میں پوچھا بھی تو اس نے یہی جواب دیا کہ گوپے پر گیا ہوا ہے۔ شاید روٹی پانی کا بندوبست کر رہا ہو۔ دن تھوڑا سا رہ گیا تھا جب ہم واپس گوپے پر آ گئے۔ زمان موہل وہیں تھا۔ چارپائیوں پر بیٹھتے ہی میرن شاہ نے کہا۔
''ہاں بھئی کیا پکایا ہے؟''
''بکرا، اب یہاں ہرن تو ملنے سے رہا۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔
''چل ٹھیک ہے۔ لا پھر۔''
وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ ایک چارپائی پر میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا۔
''کچھ اچھا لگا، لطف آیا شکار کا؟''
''بالکل نہیں، میں تو تھک گیا ہوں۔'' میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہاں تم نے کہاں ایسا ماحول دیکھا ہوگا۔ خیر ہم تو رات رہیں گے یہاں۔ تم کھانا پینا انجوائے کرو۔'' اس نے لیٹتے ہوئے کہا۔
''یہ بھی دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔
رات کا پہلا پہر ختم ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کہاں پر جنریٹر لگا ہوا تھا، اس کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ اس سے گوپے کے صحن کو ایک بڑی سی لائٹ نے روشن کیا ہوا تھا۔ سب چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بھی کو وہیں کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔ بھنا ہوا بکرے کا گوشت اور تنوری گرم روٹی کے ساتھ ٹھنڈا پانی۔ وہ خرگوش بھی پکائے گئے تھے لیکن وہ ان لوگوں نے ہی کھائے جنہوں نے کتوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ زمان میرے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ خوب سیر ہو کر اس نے کہا۔
''لے بھئی علی، رج گیا میں تو، تم چاہو تو......''
''نہیں بس میں بھی۔'' میں نے کلی کرتے ہوئے کہا تو

ایک بندے نے برتن سمیٹ لیے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ گوپے کے صحن سے باہر کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر اس کے بعد چند لوگ آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے۔ سب سے آخر میں ایک کامنی سی لڑکی دکھائی دی۔ وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ انہوں نے میرن شاہ کو سلام کیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھنے لگی۔ میں سمجھ گیا، وہ ناچنے گانے والے لوگ تھے۔ چار پائیوں کے بیچوں بیچ ترپال بچھا دی گئی۔ سازندے وہاں بیٹھ گئے۔ ان کے پاس دف، چمٹا، گھڑا، ڈھولک اور چھینٹی تھی۔ ادھیڑ عمر عورت انہی سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ گوپے کے اندر سے ایک قالین کا ٹکڑا لایا گیا۔ وہ لا کر درمیان میں بچھایا گیا تو اس کامنی سی لڑکی نے اوڑھی ہوئی چادر ہٹا دی۔ ایک دم بجلی کا لپکا ہوا۔ سیاہ چولی اور گھاگرا میں لڑکی کی اوپر تک دکھائی دے رہی تھی۔ کسی ہوئی چولی کا گریبان کھلا تھا۔ اس نے گیسو کھلے چھوڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ اس کا ہلکا سا آنچل بندھا ہوا تھا۔ اس سیاہ لباس میں اس کا سفید رنگ گویا دمک رہا تھا۔ اس نے دونوں بازوؤں پر کہنیوں تک سفید روایتی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ تیکھے سے نین نقش والی اس لڑکی نے اتنا تیز میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس نے پاؤں میں سیاہ کھسا پہنا ہوا تھا، جس پر پیتل کے گھنگھرو تھے۔ وہ چھن چھن کرتی ہوئی قالین کے درمیان ... آ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرن شاہ کو جھک کر سلام کیا تو سازندوں نے ساز چھیڑ دیا۔

وہ تھرکنے لگی تو یوں لگا جیسے ہوا تھم گئی ہو۔ لحہ بہ لحہ ساز تیز ہونے لگا۔ ایک بار تو یوں لگا کہ سازندے پیچھے رہ گئے ہیں، اس کے تھرکنے کا انداز تیز تھا۔ اس کے بدن کی لچک کمال کی تھی۔ وہ مچلتی، تھرکتی ناچ رہی تھی۔ ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ سبھی اس کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ انہیں لحات میں گوپے کے صحن کے باہر کسی کی آمد کا احساس ہوا۔ چند لوگ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرن شاہ نے ہاتھ سے ناچ روک دینے کا اشارہ کیا۔ لڑکی رک کر ایک جانب ہٹ گئی۔ وہ گنتی کے تین آدمی تھے۔ ان میں دو میانے قد کے تھے اور ایک لمبے قد والا تھا۔ انہوں نے کھلے گھیر کی شلوار اور کھلی کھلی قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کی مونچھیں بڑی بڑی اور سر پر بڑے پگڑ تھے۔ ان کے کاندھے پر سیاہ چادریں تھیں۔ ممکن ہے اندھیرے میں کچھ مزید لوگ بھی ہوں۔ انہوں نے آتے ہی میرن شاہ سے مصافحہ کیا۔

''آؤ بیٹھو......'' میرن شاہ نے بڑے خلوص سے کہا تو لمبے سے شخص نے بڑے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''نہ...... نہ میرن شاہ، ہم ناہیں بیٹھاں گے۔ بس تیرے سے تھوڑی بات کرنی اے۔''

''ایسی بھی کیا بات ہے، تم اتنی دور سے آئے ہو، کھانا کھاؤ، بیٹھو، یہ ناچ دیکھو، پھر بات بھی ہو جائے گی۔'' میرن شاہ نے حیرت سے کہا۔

''نہ نہ، تم کام ہی ایسا کرو ہو، ہمیں بیٹھن جوگا چھوڑا ای نہیں۔'' لمبے قد والے نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''ہوا کیا ہے؟'' میرن شاہ نے پوچھا۔

''تمہارے علاقے میں ہمارے دو بندے قتل ہو گئے، اور تم یہاں ناچ گانا دیکھ رہے ہو۔'' اس نے شکوہ بھرے انداز میں اکھڑے لہجے میں کہا۔

''کب، کب ہوا ایسا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جس بندے کو اپنے علاقے کی خبر نہیں، وہ ہمارا دوست کیسے ہو سکتا ہے، دشمن ہوتا ہے وہ۔'' اس نے آخری لفظ دبے دبے غصے میں کہے تھے۔ تبھی اس کے ساتھ والا ایک بندہ بولا۔

''میرن شاہ اگر تمہیں نہیں پتا تو پھر تمہارے جیسا نااہل بندہ کوئی نہیں، یا فیر تم جھوٹ بول رہے ہو، بولو، کیا جواب ہے تمہارے پاس؟''

میرن شاہ حیرت اور خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ہماری طرف دیکھا پھر سامنے کھڑے ان تینوں سے پوچھا۔

''مجھے پوری بات بتاؤ، ہوا کیا ہے؟''

''بتا تو رہے ہیں، مارے دو بندے قتل ہو گئے ہیں تھارے علاقے میں۔'' لمبے قد والے نے غصے میں کہا۔

''اب تم بیٹھ بھی نہیں رہے، بات بھی نہیں سن رہے، اب میں کیا کہوں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم اپنا فیصلہ سناؤ جو مجھے کہنے آئے ہو۔'' اس بار میرن شاہ بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''دیکھ میرن شاہ، ہم سے دشمنی کا مطلب کیا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم مر جاویں ہیں پر غلط بات ناہیں بولے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ غلط کر رہے ہو، یہی بتانے کے لیے یہاں تک آیا ہوں۔'' لمبے قد والے نے کہا۔

''جب مجھے پوری بات کا نہیں پتا تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میرن شاہ نے کہا۔

''تو پھر سن لو تم اس علاقے میں اب تیری ساکھ نہیں بچی پھر۔ مارا ایک بندہ مرے گا تو ہم دو ماریں گے۔ کل شام

تک منے قاتل دے دو، یا پھر ماری دشمنی کے لیے تیار ہو جا۔"

"دیکھ تو ادھر بیٹھ، میں ساری بات کا پتا کرتا ہوں، پھر بتاتا ہوں۔" میرن شاہ نے حتمی انداز میں کہا۔

"میں جارہا ہوں، شام تک کا وقت ہے۔ دشمنی یا دوستی......" اس نے کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میرن شاہ چند لمحے تذبذب میں سوچتا رہا پھر اس نے ہاتھ ملا لیا۔ وہ لوگ جیسے آئے تھے، ویسے ہی واپس چلے گئے۔ وہ گوپے سے اترے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

ماحول میں ایک دم سے تناؤ آگیا تھا۔ میرن شاہ نے ناچنے والی اس لڑکی کو بھی جانے کا اشارہ کیا تو وہ بھی چل دیے۔ جس وقت وہ جا رہے تھے، اس نے زمان کی جانب دیکھ کر کہا۔ "مجھے سمجھ نہیں آئی ان لوگوں کی۔"

"لیکن مجھے تھوڑی آگئی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا......؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"لگتا ہے بختاور اپنا کام دکھا گیا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"جب تک کوئی پکی بات سامنے نہیں آجاتی' میں نہیں مانتا۔ معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "اچھا فون کرو، بندے یہاں منگواؤ۔ شاید ضرورت پڑے۔"

"میں ابھی کہتا ہوں۔" اس نے جیب سے فون نکالتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا، "یار علی، تم یہاں کیا کر رہے ہو، جاؤ ادھر ڈیرے پر جا کر آرام کرو۔ اگر کسی کو گاڑی کی ضرورت ہوئی تو اسے دے دینا۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔" میرن شاہ نے کہا۔

میرے ساتھ ایک بندہ کر دیا گیا۔ میں نے اپنی جیپ کچے راستے پر ڈالی اور چل دیا۔ اگرچہ میرا بڑا دل چاہ رہا تھا کہ میں وہیں رہوں۔ ایک تجسس تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی، جس سے وہ لوگ مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔ میرن شاہ کے چہرے پر فکرمندی آگئی تھی۔ وہ اُن تین افراد کے سامنے بولا نہیں۔ وہ کون لوگ تھے؟ یہی سوال میں نے گھما پھرا کر ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے کیا تو اس نے جواب دیا۔

"یہ بارڈر پار سے آئے تھے۔ اب انہوں نے واپس بھی چلے جانا ہے۔" اس نے کہا تو ایک بار مجھے حیرت ہوئی، اتنی سی بات کہنے کے لیے وہ تین بندے یہاں تک آگئے تھے۔ اس کا مطلب ہے معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔ ایسا کیا ہونے والا ہے، یہ سمجھ میں آجائے گا۔

رات کا دوسرا پہر تھا جب ہم ڈیرے پر آ گئے۔ وہاں کچھ لوگ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے جیپ بند ہی نہیں کرنے دی۔ میری گاڑی لی اور چند منٹ بعد ہی ڈیرے پر سکوت چھا گیا۔ میں اکیلا ہی وہاں رہ گیا، مجھے بابا خیردین بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی چارپائی بھی خالی تھی۔ ڈیرے کا بڑا سا صحن خالی تھا۔ میران شاہ کی رہائش گاہ کی جانب بھی خاموشی تھی۔ ہر جانب سناٹا چھا گیا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔

میں اسی الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ بارڈر پار سے آئے لوگ میران شاہ سے کس طرح بات کر رہے تھے؟ کیا میران شاہ کا کوئی قصور تھا؟ کیا واقعی اس نے بندے قتل کروا دیے تھے یا پھر وہ کسی سازش کا شکار ہو گیا تھا؟ اچانک میرے ذہن میں بختاور کا خیال آیا۔ وہی بختاور جو ریڑھے پر سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں بھی زمان بتا چکا تھا کہ وہ بارڈر پار کر گیا تھا۔ کیا یہ قتل اس نے کیے؟ میران شاہ نے بھی تو آج صبح میرے سامنے ہی ایک بندے کو قتل کیا تھا۔ جس نے بختاور کو ایک رات کے لیے اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی اور پھر اسے بارڈر پر چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے ان واقعات کے پیچھے طوفان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ طوفان کیا ہو سکتا تھا؟ میں اس کے بارے میں نہ کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہی اندازے قیافے لگاتے میری آنکھ لگ گئی۔

نجانے رات کا وہ کون سا پہر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں روشنی کے کسی سمندر میں ڈوب گیا ہوں۔ اتنی تیز روشنی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تھا۔ میرے سامنے اتنی تیز روشنی تھی کہ میں برداشت نہ کر سکا۔ میری آنکھیں چندھیا جانے سے بند ہو گئیں۔ لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ کوئی میرے نزدیک کھڑا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا تو مجھے سوائے گھمبیر اندھیرے کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ سفید دودھیا روشنی میں کچھ بھی نہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے روشنی ختم ہو گئی۔ میری آنکھیں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اندھیرے میں مجھے احساس ضرور تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا مجھ سے دور جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے اردگرد کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں روشنی کی الجھن کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ کیسی روشنی تھی؟ فوری طور پر مجھے اس کی ذرا بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور اندر کمرے میں اپنے سامان میں سے

ٹارچ نکال کر لے آیا۔ ٹارچ روشن کر کے دیکھا تو مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے روشنی کی لکیر کو چاروں طرف گھمایا۔ تبھی میری نگاہ ایک جوتے پر پڑی جو رہائش گاہ کی دیوار پر لگے دروازے کی جانب کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ میں نے جا کر وہ جوتا اٹھایا اور اپنی چارپائی تک آ گیا۔ جوتے کو دیکھتے ہوئے ٹارچ کی روشنی میری آنکھوں میں پڑی تو میری آنکھیں ایک بار پھر سے چندھیا گئیں۔ تب مجھے پتا چلا کہ میری آنکھوں میں پڑنے والی روشنی کسی ٹارچ ہی کی تھی۔ کوئی یہاں تک ضرور آیا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں مجھے دیکھا۔ میری آنکھیں کھلنے پر واپس بھاگ گیا۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہی میں نے جوتے کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک مہنگا زنانہ نازک سا سلیپر تھا۔ جوتے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال کوندا۔ کیا ساوری یہاں تک آ کر واپس بھاگ گئی تھی؟ کیا اسے میرے بارے میں پتا چل گیا؟ کیا وہ مجھے جان گئی؟ اگر ایسا نہیں تو وہ میرے پاس یہاں کیوں آئی تھی؟ کیا وہ اتنا مہنگا نازک جوتا پہن سکتی تھی۔ ایسا مہنگا جوتا جس پر ذرا سی بھی دھول مٹی نہ ہوئی ہو۔ یہاں پر کام کرنے والی عورتیں تو ایسا جوتا نہیں پہنتی تھیں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر جوتا اندر کمرے میں چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ میری آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے اتنا سمجھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ساوری آئی تھی، اس نے کسی ٹارچ سے میرا چہرہ دیکھا پھر میرے اچانک جاگ جانے سے وہ بھاگ گئی۔ اسے ایک طرح سے شرارت سمجھ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کئی سارے سوال میرے ذہن میں اُبھر آئے تھے۔ ان سوالوں کے جواب میرے پاس نہ تھے۔ یہ محض دماغی کسرت ہو سکتی تھی۔ اس کا حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے سب کچھ ذہن سے نکالا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ دھوپ کی شدت سے میری آنکھ کھلی تھی۔

میں نہا کر فریش ہوا اور کمرے میں آ گیا۔ وہاں رکھا ناشتا دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا، جس کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دوبارہ بابا خیر دین کو دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے ناشتا کیا اور برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون نے باہر سے آواز دی پھر سامنے آ گئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھی، اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں ایک چائے کا مگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ پلیٹ ایک جانب رکھ دی اور برتن اٹھا کر جانے لگی تب میں نے پوچھا۔

"بابا خیر دین کہاں ہے؟"

"پتر وہ تو کل شام سے یہاں پر نہیں ہے۔" اس نے مجھے بتایا۔

"کہاں گیا وہ؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"پتر وہ ساتھ والی بستی میں گیا ہے۔ وہاں اس کے کسی رشتے داری کی شادی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ گیا ہے، شاید آج شام تک آ جائے یا پھر کل صبح آ جائے گا۔" اس خاتون نے کہا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اگر وہ ساوری نہیں تھی تو پھر کون تھی؟

میں نے ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا تھا۔ سچی بات تو یہی تھی کہ میں خود ہی کوئی کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میرا من ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ میں جو کچھ بھی لکھ کر حکومت کو دے دوں گا، اس رپورٹ کو سرد خانے میں ہی ڈال دیا جاتا تھا۔ میں یہ سب کچھ اپنے دفتر کی میز پر بیٹھ کر بھی لکھ سکتا تھا لیکن مجھے یہاں آنا تھا۔ اس کے لیے میں نے طویل انتظار کیا تھا۔

میں کمرے کے باہر چھپر تلے آ کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے نقشے کھلے ہوئے تھے۔ یہی میرا دفتر تھا۔ اپنے طریقہ کار کے مطابق میں نے چند جگہوں کی نشاندہی کر لی تھی تاکہ روزانہ کے اعتبار سے اس کا سروے کر سکوں۔ وہیں بیٹھے مجھے دوپہر ہو گئی۔ ڈیرے میں کوئی نہیں آیا تھا۔ دوپہر کے بعد کچھ لوگ میری گاڑی لے کر آ گئے۔ میں نے ان سے بات کرنا چاہی لیکن کسی نے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ شاید انہوں نے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ انہوں نے گاڑی چھوڑی اور واپس چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد پتا چلا کہ میرن شاہ آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ بھی آئے تھے۔ وہ سب پلٹ کر چلے گئے۔ مجھے اس وقت تھوڑی خوشی محسوس ہوئی جب میرے پاس زمان آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے نا، بڑے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

میرے کہنے پر اس نے پہلے تو میری طرف دیکھا۔ وہ بالکل بھی تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے تو ایسے ہی بات بڑھانے کے لیے کہا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "شکار پر جانے سے تھکن تو ہو جاتی ہے۔"

"زیادہ ہی بھاگ دوڑ ہوئی تم لوگوں کی؟" میں نے پھر بات بڑھاتے ہوئے پوچھا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"نہیں شکار کا پروگرام تو سمجھو کل تک ہی ختم ہو گیا تھا۔

رات بھر اور پھر آج سارا دن، ہم ان قاتلوں کی ٹوہ میں لگے رہے۔ شاید کہیں سے کوئی سراغ مل جائے۔''
''پھر ملا کوئی سراغ؟'' میں نے اپنا تجسس پوری طرح دباتے ہوئے پوچھا۔
نہیں، سراغ تو نہیں ملا مگر میرن شاہ پر لگا الزام کافی حد تک کم ہو گیا۔ کچھ باتیں ایسی سامنے آئی ہیں۔ اس پر الزام محض اس لیے لگایا جا رہا ہے کہ یہ علاقہ میرن شاہ کا ہے۔ خیر پتا چل جائے گا۔''
''ایک بندے کو یہاں ڈیرے پر مارا گیا تھا، کہیں وہ تو نہیں تھا؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
''نہیں، وہ معاملہ دوسرا ہے۔ وہ سائیں کی خاندانی دشمنی میں مارا گیا تھا۔ اس نے بختاور کو پناہ دی تھی۔ یہاں یہی طریقہ ہے۔ پناہ دینے والا بھی اتنا ہی مجرم سمجھا جاتا ہے۔'' زمان نے بتایا۔
''ویسے مجھے تو یہاں عجیب سا لگ رہا ہے۔ جب سے آیا ہوں یہی مرنے مارنے کی باتیں چل رہی ہیں۔ میرن شاہ سے ایک بندے کے لیے کہا تھا، وہی نہیں دے رہا۔'' میں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
''اوہاں، سائیں نے مجھے کہا تھا۔ میں تیرے ساتھ رہوں گا۔ ویسے تم اکیلے نکل جایا کرو، کیا ضرورت ہے بندے کی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔
''کسی نے مجھے میرن شاہ کا بندہ سمجھ کر مار دیا تو؟''
''ہاں یہ تو ہے۔ خیر، میں صبح سویرے آجایا کروں گا پھر نکل جایا کریں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے کام کا بندہ نہیں تھا۔ میں نے سارے کاغذات اندر کمرے میں رکھے اور ڈیرے سے باہر نکل گیا۔ میری نگاہ دور کیکر کے درخت پر پڑی۔ اس کے اردگرد کافی ساری بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ بلاشبہ سانول بھی وہیں ہوگا۔ میں یہی سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ میں درخت کے پاس پہنچا۔ وہ تنے سے ٹیک لگائے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ میری آہٹ پا کر اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ہم کچھ دیر خاموش رہے پھر میں بولا۔
''میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تم بات کرنے کے بجائے ناراض ہو گئے ہو۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا۔''
''کیوں بات کروں میں تم سے؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔
''یار میں یہاں تیری بستی میں اجنبی ہوں۔ یہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ تم اچھے لگے ہو تو بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اسی روکھے پن سے بولا۔
''لیکن میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔''
''یار کوئی وجہ تو ہوگی نا؟'' میں نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔
اس نے ایک طویل سانس لی اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں ایک غریب آدمی ہوں۔ سائیں سے میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم اس کے مہمان ہو۔ میں تم سے کیا بات چیت کروں گا۔ مجھے معاف کرو اور چلے جاؤ یہاں سے۔'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا تو مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ مجھے سانول سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ مجھے اس وجہ سے دکھ ہوا جس وجہ سے وہ مجھ سے بات نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ وجہ میرن شاہ کا خوف تھا، اس کا جبر تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ کوئی بات کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔ میں ڈیرے کی جانب چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے۔ جب یہی سانول مجھ پر اپنا دل کھول دے گا۔
شام ڈھل رہی تھی۔ میں ڈیرے پر واپس آگیا۔ کچھ دیر بعد جھٹ پٹا سا ہو گیا۔ وہی ادھیڑ عمر خاتون کھانا لے کر آگئی۔ اس نے کھانا اور پانی چارپائی پر رکھا اور واپس چلی گئی۔ میں نے گرم گرم کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ میرے پاس سوچنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سانول کا خوف دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ میں اس پر جتنا سوچتا، اتنا یہ دکھ بڑھ رہا تھا۔ اتنا ہی میرے اندر میرن شاہ کے خلاف نفرت اور غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہ وہ چھوٹے فرعون ہیں جنھوں نے خلقِ خدا پر جبر مسلط کیا ہوا تھا۔ ایسا جبر، ایسا خوف کہ کوئی بندہ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ یہ خاندان پشت در پشت لوگوں پر جبر مسلط کیے ہوئے تھا۔ ایسے لوگ اس وقت اپنا جبر مسلط کرتے ہیں جب جبر سہنے والے لوگ موجود ہوں۔
یہی ایک خیال پھیلتا چلا گیا۔ میرے اندر درد کا دھواں پھیلنے لگا۔ میں رونا چاہتا تھا لیکن میرے آنسو نہ جانے کب سے خشک ہو گئے تھے۔ شاید میرے اندر آگ ہی اتنی ہو گئی تھی، جس نے میرے خوابوں کو نہ صرف جلا دیا تھا بلکہ میرے آنسو بھی خشک کر دیے تھے۔ میں نے اپنا سر جھٹک دیا۔ میں ایسی سوچ کو خود پر تسلط جمانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ یہی وقت کا تقاضا تھا۔ میں نے پھر سے

ساوری کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس کی دھیمی دھیمی مسکراتی ہوئی آنکھیں، زور سے بھینچے ہوئے لبوں کی مسکان، ٹھوڑی پر ذرا سا خم، سڈول بدن پر میلے اور پرانے کپڑوں میں اس کا چھلکتا حسن میں یاد کر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کب مجھ سے بات کرے گی۔ وہ کب مجھ پر اپنی میٹھی میٹھی باتوں کا سحر طاری کرے گی۔ وہ سمجھدار ہو چکی تھی یا ویسے ہی پُرخلوص اور دوسروں کا دکھ درد سمجھنے والی ہو گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ساوری کا چہرہ میرے ذہن سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ اس کی جگہ وہی چہرہ ابھرتا چلا آیا، جسے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے میٹھے سے درد اور انجانی پریشانی میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ معصوم سا چہرہ میری نگاہوں میں ابھرتا تو میں سب کچھ بھول جاتا۔ میرا تجسس انتہا کو پہنچ جاتا۔ ایک میٹھی سی کسک مجھے بے چین کر دیتی تھی کہ وہ کون تھی؟ اب بستی میں کہاں تھی؟ بستی میں تھی بھی یا اس کی شادی ہو چکی تھی؟ اس کے بارے میں ساوری یا سانول بتا سکتے تھے۔ دونوں سے ابھی میری بات نہیں ہوئی تھی۔ میں اُن سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ سوچوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ میں یاس، امید اور خواہش میں گھرا غنودگی کے عالم میں تھا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ میں ڈیرے پر اکیلا تھا۔ بابا خیر دین بھی نہیں لوٹا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک میرے بائیں جانب کچھ فاصلے پر آہٹ ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی دیوار سے کود کر اندر آ گیا ہو۔ میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ تاروں کی ملگجی روشنی میں دو ہیولے مجھے دکھائی دیے جو بڑے محتاط انداز میں چلتے ہوئے صحن کے درمیان کھڑی جیپ کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ چند لمحے وہیں چھپے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔ میں پوری طرح محتاط ہو چکا تھا۔ میں آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی احتیاط سے میرن شاہ کی رہائش گاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ تبھی دائیں جانب دیوار کی طرف پھر آہٹ ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مزید لوگ بھی دیوار پھلانگ کر اندر آ گئے ہیں۔ وہ ایک ہی شخص تھا۔ وہ بھی آ کر جیپ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ان تینوں نے ہاتھوں میں گنز پکڑی ہوئی تھیں، ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ لیکن چلتی ہوئی گن یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی خطرناک صورتِ حال میں بھی جسیں بیدار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ ایک لاشعوری عمل تھا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر بائیں دیوار پھاند کر آئے تھے۔ رہائش گاہ کے سامنے بندے موجود رہتے تھے۔ پچھلی جانب مویشیوں کا باڑا تھا۔ جہاں پہرے داروں کے علاوہ کتے بھی موجود ہوتے تھے۔ اگرچہ یہاں ڈیرے پر لوگ موجود رہتے تھے لیکن آج اتفاق سے میں اکیلا ہی تھا۔ وہ لوگ ڈیرے میں سے گزر کر بہ آسانی رہائش گاہ کی طرف جا سکتے تھے۔ اس وقت ایک آدمی رہائش گاہ کی دیوار میں موجود چھوٹے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے پیچھے تھا جبکہ تیسرا ابھی تک جیپ کی آڑ میں تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھ پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میری معمولی سی حرکت پر انہوں نے مجھے ہی قابو کرنا تھا۔ وہیں ساکت پڑے رہنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کے مشکوک انداز سے یہ طے تھا کہ وہ اچھی نیت سے یہاں نہیں آئے تھے۔ وہ کیا چاہتے تھے؟ اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہاں مگر موجودہ حالات کے تناظر میں یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ میرن شاہ کو مارنے کے لیے اس کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہاں آتے ہی میرے سامان کی تلاشی ضرور لی جائے گی۔ اگر میرے سامان میں سے کسی بھی قسم کا کوئی اسلحہ نکل آیا تو میں اسی وقت مشکوک سمجھ لیا جاتا۔ میں انتہائی محتاط تھا۔ سامنے کی صورتِ حال پر میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ پہلی صورت تو یہی تھی کہ میں خاموشی سے لیٹا رہا ہوں اور آنے والے جو مرضی کرتے رہے ہیں اور میں دیکھتا رہوں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں ان کا سامنا کروں۔ مجھے دیوار کے ساتھ کھڑے لوگوں سے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا جیپ کی آڑ میں موجود بندے سے تھا۔ میری ذرا سی حرکت کرنے پر وہ مجھ پہ فائر کر سکتا تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں بھی چھپ سکتا تھا۔ میرے اور کمرے کے دروازے کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن میں کسی بھی طرح کی حرکت کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

میں ان تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ یوں ہی گزر گئے۔ میری طرف سے کسی بھی قسم کی کوئی حرکت نہ پا کر وہ تیسرا جیپ کی آڑ سے نکلا اور دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔ خطرہ میری جانب بڑھنے لگا تھا۔ میرا دورانِ خون ایک دم سے تیز ہو گیا۔ میں نے پوری طرح چوکنا ہو کر مزاحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ کیا کرتا، میں اس کے بارے میں کچھ

نہیں کہہ سکتا تھا لیکن میں اس کے گن پکڑنے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ پر فائر نہیں کرنا چاہتا بلکہ مجھے بے ہوش کرنا ... چاہتا تھا۔ میں وزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب آجانے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میرے پائینتی آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر میرے بائیں جانب آ کر اس نے مجھے دیکھا پھر گن کو نال سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سر پر گن کا بٹ مارے گا۔ میں اگلے ہی لمحے اسپرنگ کے مانند اچھلا اور اسے لیتے ہوئے کچے فرش پر آ رہا۔ میری گرفت اس کی گن پر تھی جس کا بٹ میں نے اپنی بغل میں دبایا اور ایک جھٹکے سے گن میرے ہاتھوں میں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا میں نے اس کی ٹانگوں پر فائر کر دیا۔ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ فائر کرتے ہی میں نے وہ جگہ چھوڑی اور جیپ کی طرف بھاگا۔ انہی لمحات میں مجھ پر دو فائر ہوئے۔ تب تک میں جیپ کی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے وہیں سے دیوار کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ میرے سامنے سے بھی ویسا ہی فائر ہوا۔ ڈیرے میں انسانی چیخیں گونج رہی تھیں۔ اچانک سامنے والوں میں کسی ایک نے پورا برسٹ ہی مجھ پر جھونک دیا۔ وہ میرے بجائے جیپ میں لگا۔ بلاشبہ کوئی ایک گولی جیپ کی فیول ٹینکی میں لگی تھی۔ ایک دم سے شعلہ اٹھا اور پھر ہلکا سا دھماکا ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی آگ بھڑکنے لگی۔ اب میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں پیچھے ہٹا اور ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

جلتی ہوئی جیپ کی روشنی جتنی مجھ پہ پڑ رہی تھی، اتنی ہی دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگوں پر بھی پڑ رہی تھی۔ وہ مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ بلاشبہ وہ بھی کسی آڑ میں ہونا چاہتے تھے مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر ہوں۔ میں نے دائیں جانب کھڑے ہوئے شخص پر فائر کر دیا۔ اسی لمحے سامنے والے نے بھی فائر کر دیا۔ ایک شخص پورا برسٹ جھونک چکا تھا۔ شاید اس کے پاس نیا میگزین نہیں تھا یا اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ فائر نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس بندے پر فائر کر دیا جو مجھ پر فائر کر رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی فائر کر دیے تھے۔ سامنے کھڑے بندوں میں سے کسی کی چیخ بلند ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے فائر لگ گیا تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید فائر کرتا، اچانک میرے پیچھے دیوار سے فائر ہونے لگے۔ میں الجھ گیا۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی فائر مجھے لگ سکتا تھا۔ اچانک سامنے کی دیوار سے چھوٹا دروازہ کھلا اور کسی نے پکارتے ہوئے پوچھا۔

"اوئے علی تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں ایک دم سے نیچے بیٹھ گیا لیکن کوئی فائر نہیں ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے کی دیوار پر موجود شخص رینگ کر گیٹ کی جانب بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ جیسے ہی اس نے قدم بڑھایا میں نے فائر کر دیا۔ یہاں تک فائر کرتا رہا کہ ایک فائر اس کی ٹانگ میں لگا۔ وہ گیٹ کی طرف بھاگتے ہوئے آدھے رستے میں تھا۔ وہ وہیں لحہ بھر کے لیے ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی تو گر پڑا۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل کر دور جا پڑی تھی۔ وہ پھر سے اٹھ کر بھاگنے لگا تو میں نے پھر فائر کر دیا۔ ایسے میں دیواروں سے کئی ٹارچ روشن ہو گئیں۔ چند لمحوں میں انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ اندر کی صورتِ حال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ بھاگتے ہوئے ڈیرے کے صحن میں آ گئے۔ اتنے میں ایک گاڑی بھی پھاٹک کے پار آ رکی تھی۔

خوش قسمتی سے میں پوری طرح محفوظ تھا۔ اگلے چند منٹوں میں تینوں حملہ آور ایک جگہ اکٹھے کر دیے گئے تھے۔ وہ پہلا شخص جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا اس میں اب زندگی کی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ وہ یہ جہاں چھوڑ چکا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگیں بیکار کرنا چاہی تھیں لیکن بدحواسی میں بد احتیاطی ہوئی، گولیاں اس کے سینے اور پیٹ پر لگی تھیں۔ دوسرے کی ٹانگیں بے کار ہو گئی تھیں۔ ان سے خون بہہ رہا تھا۔ تیسرا بھی ایسی ہی صورت حال میں تھا۔ جلتی ہوئی جیپ کے شعلے مدھم پڑ چکے تھے۔ اب شعلے بجھانا بیکار تھا۔ ساری جیپ جل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میرن شاہ وہاں آ گیا۔ اس نے پھولی سانس میں مجھ سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو نا علی......؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اختصار سے سب کچھ بتا دیا۔ میری روداد سن کر وہ زخمیوں کی جانب بڑھا۔ وہ تینوں کئی ٹارچ کی روشنی میں پڑے تھے۔ اس نے جاتے ہی ایک زخمی کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟ کس نے بھیجا ہے؟"

تبھی وہ شخص کراہتے ہوئے نفرت سے بولا۔ "تمہارے

کو مارنے آئے تھے۔"

"بارڈر پار سے ہو گیا؟" میرن شاہ نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، اب ادھر سے تمہاری موت ہی آئے گی۔" وہ پھر اسی نفرت سے بولا تو میرن شاہ نے سر اٹھا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

"یہ دونوں زخمی ہیں۔ انہیں مرنا نہیں چاہیے۔ ان کا فوری علاج کراؤ، اٹھاؤ انہیں یہاں سے جلدی۔"

اس کے حکم پر کئی لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے دونوں کو اٹھایا اور وہاں آئی گاڑی میں ڈال کر تیزی سے چلے گئے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی میرن شاہ ذرا دیر تک وہاں رہا، پھر پھاٹک سے نکل کر باہر چلا گیا۔ بلاشبہ فائرنگ کی آواز دور دور تک گئی تھی۔ بہت سارے لوگوں نے وہ آواز ضرور سنی ہو گی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے جیپ اب تک جل رہی تھی۔ لیکن اب شعلے بہت کم رہ گئے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح میں بیدار ہوا تو دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نگاہ صحن میں کھڑی جلی ہوئی جیپ پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی رات ہونے والا ہنگامہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ایک ایک کر کے منظر میرے سامنے آئے تو میں سوچنے لگا۔ اگر میں سو گیا ہوتا تو نجانے اب تک کیا ہو گیا ہوتا۔ میرا دماغ مجھے کئی تصویر دکھانے لگا۔ لمحوں ہی میں کئی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے آ کر گزر گئیں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر میں نے سارے خیال اپنے دماغ سے نکال باہر کیے اور فریش ہونے کے لیے اٹھ گیا۔

اس وقت میں کپڑے تبدیل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ بابا خیر دین آ گیا۔ وہ میری طرف بڑی حسرت سے تک رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا خیر تو ہے نا یوں مجھے دیکھ رہے ہو؟"

"بس ایویں ہی پتر......" یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا۔ اس نے پہلی بار مجھے "پتر" کہا تھا۔ اس کے لہجے میں اتنا کچھ تھا جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے اتنا جذباتی ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ میرے اندر ایک دم سے تجسس ابھرا لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔ میں اگر اس وقت کچھ پوچھتا تو شک کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔ تبھی وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا، "تمہیں سائیں نے اپنے گھر میں بلایا ہے۔"

"مجھے...... گھر...... کیوں......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے تو صرف اتنا کہا کہ تمہیں گھر بلا لاؤں۔" بابا خیر دین نے دھیمے سے کہا اور واپس پلٹ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے سوچا تو تھا کہ ایک دن ایسا ہو جائے گا لیکن اتنی جلدی ایسا ہو جائے گا، یہ امید نہیں تھی۔ میں مسکرا دیا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو بابا خیر دین میرے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے آتا ہوا دیکھ کر وہ بھی چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

رہائش گاہ والی دیوار کے چھوٹے دروازے سے پہلے بابا خیر دین گزرا اور اس کے بعد میں نے پار کیا۔ میرے سامنے ایسے ہی بڑا سا گھر تھا جیسے عام طور پر رودھی میں ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک طرف پختہ کمرے بنے ہوئے تھے، جن کے آگے برآمدہ تھا۔ اس میں میرن شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک گورے رنگ والی بوڑھی عورت کرسی پر براجمان تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ نیلے رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ سر پر چادر تھی جس سے برف کے مانند بال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ میری جانب بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، بابا خیر دین کے پیچھے چلتے ہوئے ان کے پاس جا پہنچا۔ میرے سلام کے جواب میں میرن شاہ نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ تبھی میرن شاہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں اس بوڑھی خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری ماں ہیں اور تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

لفظ اس کے لبوں میں ہی تھے کہ بوڑھی عورت نے اپنے دونوں ہاتھ یوں میری طرف بڑھائے جیسے وہ میرے سر پر پیار دینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی ہو۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سر پر پھیر دیے۔ میں واپس کرسی پر آ بیٹھا تو وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"تم نے رات ہمیں بڑی تباہی سے بچا لیا۔ تیرا بڑا بڑا شکریہ پتر۔ تم نہ ہوتے ڈیرے میں تو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ دشمن آئے تو میرن کو مارنے کے لیے تھے مگر ممکن ہے کوئی اور نقصان بھی کر دیتے۔ رب سائیں نے تیرے وسیلے سے ہمیں بڑی تباہی سے بچا لیا ہے۔"

وہ خاموش ہوئی تو میرن شاہ نے دھیمے لہجے میں مجھ سے

کہا۔

''تیری جیپ کا نقصان ہوا، وہ میں تجھے نئی جیپ لے دوں گا۔''

''وہ میری جیپ نہیں، سرکاری تھی۔ اب محکمے کو بتانا پڑے گا۔'' میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری بات وہ فوراً سمجھ جائے گا۔ اس لیے وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''ہم اس پر پھر بات کرتے ہیں۔'' وہ سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے مجھے بات کرنے سے روک دیا تھا۔ اسی دوران اماں نے پوچھا۔

''تم کہاں سے ہو پُتر؟''

اس سوال پر میرا دل ہمک اٹھا۔ ایک آندھی میرے دماغ میں چلی، میرے اندر شعلے بھڑک اٹھے، میرے من کی کیفیات سے مجھے یوں لگا جیسے میں پھٹ جاؤں گا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پایا اور بڑے سکون سے بتایا۔

''لاہور سے ہوں، قریب ایک گاؤں ہے۔''

''اچھا۔ تم پنجاب سے ہو۔ یہاں رہتے ہوئے مشکل تو ہوتی ہوگی؟'' اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''اماں، پردیس میں مشکل تو ہوتی ہے۔ اب نوکری کرنی ہے تو پردیس کاٹنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا تو میرن شاہ نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ ممکن ہے مجھ سے مزید کوئی بات کرتا لیکن انہی لمحات میں ساوری آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ساوری کو دیکھ کر یوں لگا جیسے ایک دم سے موسم بدل جائے۔ چھائے ہوئے بادلوں کے درمیان سے جیسے اچانک سورج کی کرنیں زمین پر نچھاور ہو جائیں۔ اس نے انتہائی سنجیدگی سے ہمارے درمیان پڑی میز پر ٹرے رکھی اور پیچھے ہٹ گئی۔ اماں نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا تو سامنے گرم گرم پراٹھے، بھنا ہوا گوشت اور مکھن دھرا ہوا تھا۔

میں ناشا کر چکا تو ساوری چائے لے آئی۔ اس دوران اماں ہمارے پاس خاموش بیٹھی رہی۔ چائے کا ایک ہی مگ تھا۔ میں نے اٹھا کر لبوں سے لگایا تو اماں بولیں۔

''پُتر جب بھی اپنے گھر واپس جاؤ تو مجھے ضرور بتا کر جانا، مجھے ملے بغیر نہیں جانا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا تو وہ اٹھ کر چل دی۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ تنہائی پاتے ہی میرن شاہ نے پوچھا۔ ''وہ جیپ کا

مسئلہ کیسے حل ہو گا؟''

میں نے سمجھایا کہ محکمے کو بتانے کا مقصد یہی ہے کہ جیپ جلنے کی وجہ بتانی پڑے گی۔ اگر سچائی بیان کی جاتی ہے تو سب سے پہلے ایف آئی آر درج ہو گی۔ پولیس اس میں دخل انداز ہو جائے گی اور ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''

''کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے؟'' اس نے وہ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''یہی ہو سکتا ہے کہ اسی کو یوں ٹھیک کروا دیا جائے کہ پتا ہی نہ چلے۔ بڑے بڑے کاریگر پڑے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی کرتے ہیں، آج ہی مستری بلواتا ہوں۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا پھر ایک دم سے پوچھا، ''ایک بات تو بتاؤ؟''

''پوچھو؟'' میں نے کہا۔

''تین گن بردار لوگ اور تم نہتے...... ایک عام آدمی تو حوصلہ ہی چھوڑ دیتا ہے۔ تم نے کیسے یہ سب......'' وہ کہتے ہوئے رک گیا تو میں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''جب موت سر پر سوار ہو تو ایسے ہی ہوتا ہے۔''

''تمہیں گن چلانا آتی ہے...... اتنا حوصلہ بھی ہے کہ تم اتنے لوگوں کا سامنا بھی کر سکتے ہو...... میں نے تمہیں ایک عام آدمی سمجھا تھا۔'' اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔

''میرن شاہ جی، میرا کام ہی ان اجاڑ، ویران، بیابانوں اور جنگلوں میں ہے۔ یہ پسٹل اور گن چلانا سیکھا نہ ہوتا تو ہمیں جانور ہی چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟''

''میرا لائسنس والا پسٹل ہے لیکن وہ اُدھر گھر میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں لانے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں......؟''

''میں انسانوں کی بستی میں آیا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ایسے لمحات میں گھر کے ایک بوڑھے ملازم نے آ کر بتایا کہ منشی مہر خان آیا ہے۔ اس کا نام سنتے ہی میرن شاہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے اسے بلانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس نے غصے میں منشی سے پوچھا۔

''تم ایک دن کا کہہ کر گئے تھے، آج چار دن ہو گئے ہیں۔''

''سائیں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے رشتے داری کے معاملات بڑے اُلجھے ہوئے تھے۔ کوئی بات سرے چڑھ ہی نہیں رہی تھی۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''پھر کوئی مسئلہ طے ہوا کہ ایسے ہی آ گئے ہو؟'' میرن شاہ نے پوچھا۔

''نہیں سائیں، مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سانس لیا پھر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ رات......''

''اس کہانی کو چھوڑو۔ ڈیرے پر علی کی جیپ دیکھی ہے کیا تم نے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں سائیں، وہ تو ساری جل گئی ہے۔''

''بس اسے ٹرالی میں ڈالو اور شہر لے جاؤ۔ باقی میں اس مستری کو ساری بات سمجھا دوں گا۔'' میرن شاہ نے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سائیں اب اجازت دیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو میں اور منشی ڈیرے میں آ گئے۔ اگلے دو گھنٹوں میں جیپ وہاں سے اٹھا لی گئی۔

☆☆☆

میرن شاہ نے میرے بارے میں جس شک کا اظہار کیا تھا، وہ درست تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں جانتا تھا کہ ایسی باتیں ہوں گی۔ مجھ پر سوال بھی اٹھائے جائیں گے۔ سو میں نے ان سوالوں کا جواب قبل از وقت ہی سوچ رکھا تھا۔ میں نے اس کا شک دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ مطمئن ہوا تھا یا نہیں، اس وقت میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی صورتِ حال کو اپنے فائدے کے لیے کس طرح استعمال کر سکتا ہوں۔ میں انہی سوچوں میں تھا کہ ڈیرے کے گیٹ سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ صحن کے درمیان...... رک گئی۔ چند لمحوں بعد اس میں سے زمان نکل کر میری طرف آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے چابیوں کا ایک گچھا میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری جیپ تو اب پتا نہیں کب تک واپس آئے گی۔ سائیں نے تمہارے لیے جیپ کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ لو چابیاں۔''

''کیا تم نہیں جایا کرو گے میرے ساتھ؟'' میں نے

چابیاں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اسی لیے تو آیا ہوں، تمہارے ساتھ ہی تو جانا ہے۔'' وہ یہ کہتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''پھر بیٹھو نہیں، چلو نکلتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یار کر لیں گے کام بھی۔ تم مجھے کوئی سرکاری نہیں پرائیویٹ کمپنی کے ملازم لگتے ہو۔''

''میں جتنی جلدی کام ختم کروں گا نا، اتنی جلدی واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے کام کرنا ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا چلو، گوپے پر چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر گپ لگاتے ہیں، کام بھی ہوتا رہے گا۔''

''ہاں، ڈیرے پر رہتے ہوئے میں بھی اکتا گیا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ڈیرے سے نکل گئے تھے۔

علاقے سے متعلق باتیں کرتے ہوئے ہم گوپے تک جا پہنچے۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اور زمان باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر تک گوپے سے باہر کھڑے رہے پھر پچھلی جانب چلے گئے۔ عقب میں خاصا نشیب تھا۔ کوئی فوری طور پر پیچھے سے نہیں آسکتا تھا۔ اگر کوئی آنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے چڑھنے کے لیے تھوڑا وقت لگتا۔ روشن دن کی دھوپ میں پھیلا ہوا صحرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس چولستان میں روہی کا صحرا سرسبز تھا۔ جھاڑیاں، پودے اور درخت کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ تھر کے مانند بالکل ویران اور بے آب و گیاہ نہیں۔ روہی میں کئی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں چراگاہوں کا سماں ہے۔ ہرن اور دوسرے چوپائے وہاں چرتے رہتے ہیں۔ میرے سامنے کا منظر ایسا ہی تھا۔ دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

''کتنی ویرانی ہے یار۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کچھ انسان اس ویرانی سے بھی بڑا فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ یوں کہہ لو یہی ویرانی ان کے فائدے کا باعث بن رہی ہے۔'' زمان نے بے پروا انداز میں کہا۔

''یہ انسان ہے نا، چاہے تو زمین پر بیٹھ کر تاروں پر کمند ڈال لے یا پھر اسی زمین کا بوجھ بن جائے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک کہا تم نے، یہ انسان بھی بڑی عجیب چیز ہے، نہ سمجھ میں آنے والی مخلوق۔ چاہے تو انسانیت کو بڑا فائدہ دے دے اور چاہے تو اسی انسانیت کو ختم کرنے کے درپے ہو جائے۔'' زمان نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے اندازہ تو ہے، ان ویرانوں میں کیا کچھ ممکن ہوتا ہے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ابھی تک۔'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات سمجھ میں نہیں آئی تمہارے؟'' زمان نے تجسس سے پوچھا۔

''پرسوں رات جب ہم یہاں تھے، بارڈر پار سے آئے لوگ یہاں آئے تھے۔ تم نے بتایا کہ وہ آج ہی واپس چلے جائیں گے۔ رات بھی تین حملہ آور ڈیرے پر آدھمکے۔ کیا بارڈر پار کرنا اتنا ہی آسان ہے، جس کا دل چاہے پار کر کے آجائے؟'' میں نے الجھن بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں یار بارڈر پار کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ مہینے دو مہینے میں جب موقع ملتا ہے تو اِدھر اُدھر سے آتے جاتے ہیں یہ لوگ۔ یہاں آکر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں۔ رات جو لوگ آئے تھے وہ پہلے ہی یہاں پر تھے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا دھندا کرتے ہیں، منشیات وغیرہ؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ ہوتا ہے یہاں پر، منشیات تو بہت چھوٹی سی چیز ہے۔'' اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''خیر وہ جانیں اور ان کا کام، مگر یہ قتل و غارت گری کیوں ہو رہی ہے؟ اصل سوال تو یہی ہے۔'' میں نے پھر پوچھا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ تب میں نے گوپے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا گوپے کے اندر آ گیا۔ اندر کا ماحول کافی خوشگوار تھا۔ شاید ہوا کی آمد و رفت کے باعث ماحول اچھا تھا۔

''علی، جیسا کام ہوتا ہے نا ویسا ہی فائدہ اور نقصان ہونے کا اندیشہ بھی موجود رہتا ہے۔ میرن شاہ کا مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس دھندے میں ملوث ہے بلکہ اس علاقے پر اس کی حاکمیت بھی ہے۔ ایک تو اس کے دھندے کی وجہ سے کافی دشمن ہو چکے ہیں۔ جب تک وہ اس دھندے میں رہے گا، یہ دشمنیاں چلتی رہیں گی۔ کبھی یہ ان کے بندے مار دیتے ہیں اور کبھی وہ اس کے بندے قتل کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے بتایا تو میں نے

کریدتے ہوئے پوچھا۔
"بختاور بھی اسی دھندے میں ملوث ہے۔"
"نہیں، اس بستی کا کوئی بندہ بھی اس دھندے میں نہیں ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ان سے میرن شاہ کی خاندانی دشمنی چل رہی ہے۔ یہ دشمنی تین پشتوں سے چلی آرہی ہے۔ جس کا داؤ لگتا ہے وہ کسی نہ کسی کا بندہ مار دیتا ہے۔" اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔
"چلو یہ تو ایک الگ بات ہے۔ میں موجودہ حالات کی بات کر رہا ہوں۔ میرن شاہ کہہ رہا ہے کہ اسے پتا ہی نہیں اور......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔
"ہاں یہ الجھن ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ سائیں کے خلاف سازش ہے اور کبھی گمان ہوتا ہے کہ میرن شاہ جھوٹ بول رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بندے قتل ہوئے ہیں۔" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔
"پھر تو بارڈر پار والے بندوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل درست ہے کہ اس علاقے پر حاکمیت میرن شاہ کی ہے تو اسے کیوں نہیں معلوم؟ کیا میرن شاہ نے ان قاتلوں کو تلاش نہیں کیا یا اسے پتا ہے اور وہ بتا نہیں رہا؟" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔
"اچھا میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں، ممکن ہے کوئی نئی بات سامنے آجائے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش رہا۔ وہ چند لمحے یوں ہی ساکت بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا۔ "تقریباً دو برس پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں نیا نیا یونیورسٹی سے یہاں آیا تھا۔ میرا گھر یہاں سے کچھ فاصلے پر موجود ایک بستی میں ہے۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں میرن شاہ کے پاس آ گیا۔"
"نوکری کے لیے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں کوئی باقاعدہ تنخواہ والی بات نہیں، بس کام دھندا تھا جس میں کچھ طے ہو جاتا۔" اس نے کہا۔
"اچھا پھر......" میں نے ہنکارا دیتے ہوئے کہا۔
"میرا کام یہ طے ہوا کہ میں بارڈر پار سے آنے والے لوگوں کو چند دن اپنے ہاں رکھوں۔ ان کے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کروں اور پھر جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں، انہیں اپنے پاس رکھوں۔ حالات سازگار سے مراد یہ ہے کہ انہیں یہاں سے کسی بھی دوسرے شہر میں چھوڑنا ہوتا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر آنا تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک بڑی رقم ملنا تھی۔ میں نے اس کام کی ہامی بھر لی۔ چند دن بعد مجھے بتایا گیا کہ بارڈر سے کچھ لوگ لینے ہیں۔ میں وہاں چلا گیا۔ میں نے رات کے اندھیرے میں تین افراد کو لیا۔ ان میں جوان مرد تھا، ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک بالکل نوجوان لڑکی تھی، بڑی ہلکی عمر کی۔ میں نے انہیں جیپ میں بٹھایا اور اپنے گھر لے آ کر گیا۔ وہ راجھستان کے ایک علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک جھونپڑا ان کے لیے مختص کر دیا، وہ وہاں رہنے لگے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے پوچھا۔
"کیا وہ سب ایک ہی خاندان سے تھے؟"
"ہاں وہ جوان اور ادھیڑ عمر عورت ماں بیٹا تھے۔ لڑکی اس جوان کی بیوی تھی جو اس کے ساتھ بھاگ کے آئی تھی۔ اس نوجوان کے ہمارے جیسے لوگوں سے تعلقات تھے سو اس نے اپنے علاقے میں رہنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جانے کو ترجیح دی۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہاں ان کے لیے بہتر ماحول ہے، وہ یہاں آ گئے۔ وہ میرے پاس چند دن رہے۔ تھوڑے دنوں بعد میرن شاہ نے کہا کہ میں انہیں ملتان کے قریب ایک جگہ تک پہنچا دوں۔ اگلی ہی صبح میں نے انہیں اٹھایا اور بتائی گئی جگہ پر پہنچا دیا۔ مجھے اچھی خاصی رقم مل گئی اور میں بھول بھال گیا۔"
"وہ یہاں غیر قانونی طور پر بس گئے تھے۔" میں نے تصدیق کی۔
"ظاہر ہے وہ یہاں غیر قانونی تھے لیکن چند ماہ بعد مجھے پتا چلا کہ وہ تینوں ہی قتل ہو گئے تھے۔" اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔
"وہ کیسے......" میں نے تیزی سے پوچھا۔
"بارڈر پار سے لڑکی والے آئے تھے۔ انہوں نے صلح کر کے لڑکی کو واپس لے جانا چاہا تھا لیکن ان میں کچھ بھی طے نہ ہو سکا۔ یہاں پر جو ضمانتی تھا اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جب لڑکی واپس نہیں جانا چاہتی پھر کیوں لے کر جانا چاہتے ہو۔ خیر اس وقت وہ لوگ واپس چلے گئے مگر وہ رہے ادھر ہی۔ دو دن گزرے تھے کہ وہ تینوں قتل ہو گئے۔ بارڈر سے پار آئے ہوئے لوگ دوبارہ نہیں ملے۔"
"اب یہ جو دو قتل ہوئے تھے، کیا ان کا بھی انہی لوگوں سے کوئی تعلق تھا؟" میں نے پوچھا۔
"میرے خیال میں تھا۔ یہ دونوں اسی طرف سے آئے تھے۔ ان کے درمیان کیا تنازع تھا، اس بارے میں گمان یہی ہے کہ ان کا تعلق ان تین مقتول سے ضرور تھا۔" زمان نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بقول چھ قتل ہوئے۔ تین پہلے اور دو اب ہوئے۔ وہ چھٹا کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی ضمانتی جس نے لڑکی واپس جانے نہیں دی تھی۔'' زمان نے بتایا لیکن پھر ثانیے بھر میں تیزی سے بولا، ''یہ پوری تصدیق ہے کہ یہ دونوں بارڈر پار سے آئے تھے۔ یہاں انہیں کس نے قتل کیا؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ پتا چلے تو معاملہ سامنے آئے۔ اب وہ تو سارا معاملہ میرن شاہ پر ڈال رہے ہیں۔''

''یار ایویں کون کسی پر یوں یہ کچھ ڈال سکتا ہے؟ وہ بھی قتل کا۔ آخر وہ بارڈر پار والے کوئی نہ کوئی موقف تو رکھتے ہوں گے۔'' میں نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

''بارڈر پار والوں کا موقف تم نے بھی سنا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ سائیں اس علاقے میں حاکیت رکھتا ہے، اسے ضرور پتا ہونا چاہیے۔ یار کچھ وارداتوں کا پتا نہیں بھی چلتا۔'' اس نے بتانا چاہا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''جب تک کوئی فیصلہ کن بات نہیں ہو جاتی جب تک کوئی یوں قتل کرنے کے لیے یونہی نہیں چڑھ دوڑتے۔ وہ تو سیدھے گھر پر حملہ کرنے آ پہنچے تھے۔ یہاں سے کسی نے بارڈر کے پار کوئی بندہ قتل کیا ہے۔ یہ حملہ آور اس کا انتقام لینے آئے تھے، مجھے تو یوں لگتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے، دل بھی مانتا ہے۔''

''خیر، مجھے کیا یہ ان کی دشمنی ہے، وہ لڑتے رہیں۔ مجھے۔ چار دن رہنا ہے اور واپس چلے جانا ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تو زمان کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان جیسا تاثر ابھرا۔ میں بھانپ گیا۔ یہ فطری سی بات تھی۔ اسے تجسس ہوا تھا کہ میں اتنی دلچسپی سے کیوں پوچھ رہا ہوں۔ تبھی میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اصل میں جب میں یہاں آیا تو مجھ پر بڑا ہی غلط تاثر ہوا۔ سجان اور اس کے ساتھیوں نے مجھے بختاور سمجھ کر نہ صرف مارا پیٹا بلکہ وہ مجھے باندھ کر یہاں لے کے آئے تھے۔ یہاں آتے ہی قتل و غارتگری کی باتیں ہونا شروع ہو گئیں اور اب ایسا حملہ ہوا ہے کہ میرا تو دل دہل کر رہ گیا ہے۔ ان حملہ آوروں کو گولیاں بھی میں نے ہی ماری ہیں۔ اب پتا نہیں کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوتا یار، ان بارڈر پار والوں کا ہم نے بندوبست کر لیا ہے بلکہ آج شام اس کا سدِباب ہو جائے گا۔'' اس نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیسا سدِباب'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''یہی کہ وہ لوگ یہ ثبوت دیں کہ یہ قتل میرن شاہ کی ایما پر ہوا ہے۔ اگر نہیں ہوا تو جرمانہ کے طور پر بختاور کو واپس کریں۔ ورنہ یہ دشمنی بہت بڑھ جائے گی۔'' اس نے بتایا۔

''مطلب بختاور ان کے پاس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل، وہ اسی کے پاس ہے۔'' زمان نے کہا تو میں ساری کہانی سمجھ گیا۔ زمان یونہی مجھ سے باتیں کیے چلا جا رہا تھا۔

''دھندے کا کیا بنے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب تک یہ جنگ ختم نہیں ہوگی بارڈر پار والوں کو بھی تو دھندے میں نقصان ہی ہوگا۔ کوئی تو فیصلہ کن بات ہو گی۔'' اس نے کہا۔

''یار یہ جنگ ختم ہونی چاہیے ورنہ ہر طرف نقصان ہی نقصان ہے۔'' میں نے اپنی رائے دی۔

''ہونی چاہیے، آج یہ الجھن دور ہو جائے گی۔'' اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔

ہمیں باتیں کرتے ہوئے دوپہر ڈھل ہو چکی تھی۔ گوپے کے اندر کا ماحول بھی حبس زدہ ہو گیا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ کچھ دیر وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے پھر ہم ڈیرے کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

سہ پہر ہو چکی تھی۔ میں ڈیرے پر تھا اور کمرے سے باہر چارپائی پر نقشے پھیلائے ...... بیٹھا تھا۔ میں ایک نقشے پر کچھ نشان لگائے سوچ رہا تھا کہ یہاں لوگوں کی تقدیر خود ان سے روٹھی ہوئی ہے۔ اصل میں وہ خود نہیں بدلنا چاہ رہے تھے۔ وہ وقت اور حالات کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر چکے تھے۔ میں ایک اکیلا ان کی کیا قسمت تبدیل کر سکتا تھا۔ جب تک وہ خود اپنے آپ کو بدلنے کا نہ سوچ لیں۔

کچھ دیر پہلے بابا خیر دین میرے پاس تھا۔ وہ بھی نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایسے میں رہائش گاہ کی دیوار والا چھوٹا دروازہ کھلا۔ میں نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ ساوری دروازہ پار کر کے میری جانب آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی، جس پر چائے کا مگ رکھا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے احتیاط سے چائے رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ چائے پی لیں، سنا ہے شہریوں کو چائے بہت پسند ہوتی ہے۔''

’’تم نے کس سے سُن لیا کہ مجھے چائے پسند ہے؟‘‘ میں نے جان بوجھ کر نرم سے لہجے میں پوچھا۔
’’بس سنا ہے۔‘‘ اس نے اپنا آنچل ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا۔
’’نہیں، مجھے چائے نہیں پسند، مجھے دودھ پسند ہے۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔
’’اب پی لیں، آج کے بعد دودھ ہی ملا کرے گا۔‘‘ اس نے کہا۔
’’ویسے یہ چائے آج ہی کیوں؟‘‘ میں نے یونہی بات بڑھائی۔
’’بڑی بی بی سئیں نے کہا ہے کہ تمہارا کمرا صاف کر آؤں۔ میں نے سوچا چائے بھی لیتی جاؤں۔‘‘ اس نے کہا اور کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ایک دوسرے کمرے میں جھاڑو پڑی تھی۔ اس نے وہ وہاں سے لی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ وہ اندر صفائی کرنے لگی اور میں چائے پیتے ہوئے ساوری کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس وقت اسے پتا چلا کہ میں کون ہوں تب اس کی حیرت کی انتہا کیا ہوگی؟ یہ سوچ کر ہی میرے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ ممکن ہے وہ یہی سوچ چکی ہو کہ میں مر چکا ہوں گا۔ ایسا بندہ جس کے بارے میں یہ گمان ہو چکا ہو کہ وہ زندہ نہیں رہا ہوگا، اچانک سامنے آجائے تو کیا حالت ہوتی ہوگی۔
’’علی یہ کیا ہے؟‘‘ اچانک کمرے میں سے ساوری کی آواز آئی۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ساوری اپنے ہاتھوں میں وہی زنانہ جوتا پکڑے حیرت زدہ کھڑی تھی۔ اس کا رنگ فق تھا۔ وہ یوں ہولے ہولے کانپ رہی تھی، جیسے اس نے کوئی جن یا بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں اس کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ساوری کا چہرہ کسی بہت بڑے خوف کا عندیہ دے رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی ایسی حالت کیوں ہوگئی ہے۔ تبھی میں نے بڑے نرم سے انداز میں کہا۔
’’تم بھی دیکھ رہی ہو، یہ ایک زنانہ جوتا ہے؟‘‘
’’یہ یہاں کیسے آگیا؟‘‘ اس نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔
’’ساوری تم ٹھیک تو ہو، کیا ہوگیا ہے تمہیں؟‘‘ میں نے جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔
’’نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے بتاؤ، یہ یہاں کیسے آیا؟‘‘
’’یہ کوئی خوفناک بات ہے کیا؟‘‘ میں نے تجسس سے پوچھا۔
’’میں پوچھ رہی ہوں، مجھے بتاؤ، یہ یہاں کیسے آیا؟‘‘ اس بار اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ مجھے لگا کوئی بہت ہی اہم بات ہے۔ اس لیے میں نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔
’’تم ایسا کرو، اس جوتے کو وہیں رکھ دو۔ پھر میرے پاس آؤ، میں تمہیں ساری بات بتادوں گا۔‘‘
’’علی، خدا کے لیے مجھے بتاؤ، یہ تمہارے لیے خطرے والی بات ہے۔‘‘ اس بار اس نے رو دینے والے انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ تبھی میں نے کہا۔
’’میں ایک رات یہاں سو رہا تھا، تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی میرے پاس تھا۔ جب تک مجھے کچھ دکھائی دیتا وہ بھاگ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ جوتا یہاں پڑا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا اور لا کر یہاں چارپائی کے نیچے پھینک دیا۔ اتنی سی بات ہے۔‘‘
’’وہ...... دوبارہ تو نہیں...... مطلب وہ دکھائی تو نہیں دی۔‘‘ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔
’’نہیں تو۔‘‘ میں نے سکون سے کہا تو اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔
’’یہ میرن شاہ کی بڑی بہن پیروزاں کا جوتا ہے۔ اس سے بچ کے رہنا، وہ بڑی بندے مار قسم کی عورت ہے۔‘‘
’’بندے مار......؟‘‘
’’ہاں، وہ ایسی ہی ایک چڑیل ہے۔‘‘ اس نے جوتا یوں پھینکا جیسے وہ کوئی بہت ہی خطرناک شے ہو، اس کے ساتھ ہی اس نے جھاڑو وہیں رکھی اور جانے لگی۔
’’مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟‘‘
’’بچ جانا اس ڈائن سے......‘‘
یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے رہائش گاہ کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دیوار میں لگے چھوٹے دروازے میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے کمرے میں پڑے جوتے کو دیکھا، مجھے لگا جیسے وہ بہت ہی خطرناک قسم کی چیز ہو۔ میرن شاہ کی بڑی بہن، بندے مار، چڑیل، ڈائن...... ساوری کی حالت، یہ سب کیا تھا، جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

حالات کی تندو تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

کچھ واقعات کی بازگشت زندگی بھر ساتھ رہتی ہے... وہ بھی اس بات کو نہیں بھولا تھا... اس نے انتظار کی طویل اننگز کھیلی تھی... بالآخر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا سبب وقت نے پیدا کر دیا تھا... ماضی کی محبت کا قرض اور حال کی محبت کا فرض اس نے نہایت عقلمندی سے ادا کیا تھا...

باپ اور بیٹے کے درمیان حائل نفرت و محبت کا امتحان

نفرت کی آگ

تنویر ریاض

"کیا تم کسی آدمی کو قتل کر سکتے ہو؟"

وہ میرے ساتھ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور صبح سویرے ہی اس نے یہ سوال داغ دیا تھا۔ ابھی تو میں نے اپنا پہلا سگریٹ بھی نہیں سلگایا تھا۔ بہرحال میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہے۔

میں نے اپنے معمول کے مطابق جواب دینے میں وقت لیا۔

ٹینا نے کروٹ بدلی اور کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے خود ہی جواب دے دیا۔ "تم ایسا کر سکتے ہو۔"

میں جانتا تھا کہ وہ اس نتیجے پر کیسے پہنچی یا اس نے ایسا کیوں سوچا۔ میری آنکھوں میں ایک ایسی بھوک تھی جس سے لوگ یہ فرض کر لیتے تھے کہ آپ ایک ڈالر کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ وہ مجھ سے اس طرح کے کسی بھی کام کے لیے کہہ سکتے ہیں اور میں اپنا ہاتھ پھیلا کر کہوں گا کہ کیا دو گے؟ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں ایک ڈپٹی ہوں۔ اس کے باوجود اس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

"میں نہیں جانتا کہ تم نے صبح سویرے یہ سوال کیوں کیا ہے؟"

"اب تم انکساری سے کام لے رہے ہو۔"

"اس سے پہلے میں نے کب ایسا نہیں کیا؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے دوبارہ کروٹ لی اور کمر کے بل سیدھی لیٹ کر چھت کو دیکھنے لگی۔ اس کا پرانا میٹرس بُری طرح چرمرایا۔ اس کے کمرے میں لگا ہوا پنکھا بھی برائے نام ہی ہوا پھینک رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی تھیں۔ ٹینا کا کہنا تھا کہ وہ اکتیس سال کی ہے لیکن لائسنس میں اس کی عمر چھتیس سال لکھی ہوئی تھی اور جب کبھی مسکراتی تو لگتا تھا کہ وہ پچیس سال کی ہے۔ لمبے سیاہ بال، سفید نرم جلد اور خوب صورت چہرے کی وجہ سے اس کی کشش میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے اس کی سبز آنکھوں نے متاثر کیا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ کنٹیکٹ لینس لگاتی ہے۔

میں نے برابر میں رکھے ہوئے نائٹ اسٹینڈ پر ہاتھ پھیرا لیکن سگریٹ نہیں مل سکے۔ مجھے ہلکی ہلکی بھوک لگ رہی تھی لیکن اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود میں نہیں جانتا تھا کہ ٹینا کھانا بنا سکتی ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ اس طرح کی عورت نہیں تھی کہ اس سے ناشتا بنانے کے لیے کہا جائے۔

میرے سر میں درد ہو رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ مزید کچھ دیر بستر میں لیٹا رہوں لیکن میں پہلے ہی سڑک کے پار سویابین کے کھیتوں میں لوگوں کے چلنے کی آواز سن چکا تھا جس کا مطلب تھا کہ کوئی بھی شخص باہر کھڑی ہوئی میری پیٹرول کار دیکھ سکتا ہے۔ گو کہ مجھ میں بالکل ہمت نہیں تھی تاہم میں بڑی مشکل سے اٹھا اور ٹانگیں نیچے لٹکا کر اپنے کپڑے اور سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ٹینا نے کہا۔ "ڈینی، تم نے کبھی یہاں سے جانے کے بارے میں سوچا؟"

"کیا میں پہلے اپنے کپڑے پہن سکتا ہوں؟"

"تمہارے کپڑے اور جوتے کچن میں میز کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔"

"کچن میں؟ وہاں کس طرح پہنچ گئے؟ خیر کوئی بات نہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ کبھی تم نے کسی ایسی جگہ جانے کے بارے میں سوچا جو یہاں سے بہتر ہو؟"

میں نے سگریٹ کی تلاش ترک کر دی اور دروازے کی جانب بڑھا۔ ٹینا نے کوئی جنبش نہیں کی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کا اگلا جملہ کیا ہوگا لیکن مجھے ہمیشہ اس کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔

میں نے ٹینا کو وہیں چھوڑا اور باہر پورچ میں آ گیا۔ میری پیٹرول کار فرنٹ ڈور پر کھڑی ہوئی تھی اور اسے مرغیوں نے گھیر رکھا تھا۔ لیکن میں نے پہلے ہی رات میں کار کے دروازے مقفل کر دیے تھے اس لیے مجھے ان کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ باہر موسم گرم اور ہوا میں نمی کا تناسب بھی زیادہ تھا۔ اس موسم میں زیادہ دور پیدل چلنا ممکن نہیں تھا۔

میں اور ٹینا گزشتہ چھ ماہ سے کئی راتیں ساتھ گزار رہے تھے اور اس کی قیمت مجھے اپنی نیند پوری نہ ہونے کی صورت میں ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بستر میں ہی نیند آتی تھی لیکن مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ٹینا ایسی عورت نہیں تھی جسے آپ اپنے ذہن سے نکال سکیں۔

مجھے اب بھی وہ ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں لیکن میں انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے وہاں جنگل اور سویابین کے کھیتوں کے علاوہ کوئی مکان یا کار نظر نہیں آئی۔ شاید دن بھر میں ٹینا کے گھر کے آگے سے دو یا تین کاریں ہی گزرتی ہوں۔ میں جانتا تھا کہ ٹینا چرس بیچتی تھی اور اسے پتا تھا کہ مجھے یہ معلوم ہے لیکن ہمارے درمیان کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ میرا کام مجرموں کو روکنا تھا تاکہ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچا سکیں اور ٹینا نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی لیکن شیرف شاید اسے مختلف انداز میں دیکھتا اس لیے میں نے ٹینا کے معاملے میں اپنی زبان بند رکھی تھی۔

میں نہانے اور دھلی ہوئی وردی پہننے کے لیے گھر گیا اور اپنے لیے ناشتا بنایا جو اُبلے ہوئے انڈوں اور آلو کے چپس پر مشتمل تھا۔ مجھے دن میں تین وقت یہی کھانے کو ملتا تھا اور کبھی کبھی میں سوچتا کہ کتنے لوگ بہتر مینو کے لیے شادی کرتے ہوں گے۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے ڈسپیچ کو ریڈیو پر پیغام دیا کہ میں گشت پر جا رہا ہوں۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ایک بار آپ کا اعتبار قائم ہو جائے تو پھر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔

اوہیو میں کئی ایسی مضافاتی سڑکیں ہیں جن پر میلوں چلنے کے باوجود سویابین اور مکئی کے کھیتوں، درختوں کے جھنڈ اور اِکا دُکا گوداموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان سڑکوں پر گاڑی چلاتے ہوئے تنہائی کا پورا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے ان میں سے ایک سڑک کا انتخاب کیا اور اس پر چل

پڑا۔ راستے میں دو افراد کو تیز رفتار گاڑی چلانے پر روکا اور تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ میں کبھی لوگوں پر جرمانہ نہیں کرتا جب تک کہ اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دوسرا ڈرائیور میرے باپ کو جانتا تھا اور وہ مجھے اس وردی میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نہ جانے کیوں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں قانون کا محافظ ہو سکتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ اسے ٹکٹ دے ہی دوں لیکن میں نے محض اپنا چہرہ سخت کرنے پر اکتفا کیا۔ اس نے میرے باپ کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں جو سوالات کیے، ان کا مختصر جواب دے کر اسے ٹالنے کی کوشش کی اور آگے بڑھ گیا۔

دوپہر ہونے والی تھی اور میں لنچ کرنے کے لیے قصبے کی طرف جانے کا سوچ رہا تھا۔ تبھی میں نے سڑک پر ٹائروں کے پھسلنے کے سیاہ نشانات دیکھے گو کہ وہ میری گاڑی کے سامنے نہیں تھے لیکن نہ جانے کیسے میری نظر اُن پر چلی گئی۔ شاید اس لیے کہ میں آئے دن ان سڑکوں پر گاڑی چلاتا تھا اور کوئی بھی نئی چیز میری توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔ میں نے گاڑی روکی اور باہر آ کر پہاڑی سے نیچے آ کر دیکھنے لگا۔ وہاں مجھے ایک کیڈی لیک کار کا پچھلا حصہ نظر آیا جو دو بڑے درختوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔

لمحہ بھر کے لیے میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ وہ کار میری جانی پہچانی تھی جیسے وہ میرے ہی نام پر ہو۔ میں واپس اپنی گاڑی پر آیا اور سڑک کے دونوں جانب دیکھا، وہ بالکل خالی تھی۔ میں نے ایک میل گاڑی چلائی اور ایک چھوٹی سی کچی سڑک پر مڑ گیا جو مکئی کے کھیت کی طرف جا رہی تھی۔ کوئی بھی میری گاڑی کے پاس سے گزرتا تو یہی سمجھتا کہ میں اونگھ رہا ہوں۔

میں کچی سڑک پر اتر کر جنگل کی طرف گیا اور وہاں سے واپس چلتا ہوا کیڈی لیک کی طرف آیا۔ اس وقت تک میرا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ کار کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ وہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اندر دیکھا وہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی جسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اور یہ اسی شخص کی لاش تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔

میں نے مزید چند منٹ کار کے اندر اور اردگرد دیکھنے میں لگائے اور واپس اپنی گاڑی پر آ گیا لیکن میں نے شیرف کو فون نہیں کیا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا۔

میرا سوتیلا بھائی ڈیوڈ قصبے کے باہر لکڑی کے بنے ہوئے ایک کیبن میں رہتا تھا جو چاروں طرف سے درختوں اور لمبی گھاس سے گھرا ہوا تھا۔ عملی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے یہی جگہ مناسب تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے کافی دیر بعد جواب دیا۔

''کیا شور مچا رکھا ہے؟'' اس نے کہا۔

''ابھی تمہاری صبح نہیں ہوئی؟'' میں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

وہ دروازے سے نہیں ہلا۔ اس نے میری پٹرول کار کو دیکھا پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

ڈیوڈ بھی چرس، گولیاں اور پاؤڈر بیچتا تھا اور شاید اس کے علاوہ کچھ دوسری غیر قانونی چیزیں بھی لیکن وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ کتراتا تھا۔ ہمارے درمیان بچپن سے ہی دوستی نہیں تھی۔

''تم نے مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔'' میں بولا۔

''کیا تم مجھ سے اسی طرح کی باتیں کرنے کے لیے آئے ہو؟''

''ایسا ہو سکتا ہے۔''

ڈیوڈ نے ٹھنڈی سانس بھری اور واپس اندر چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اندر جگہ جگہ وسکی اور بیئر کی خالی بوتلیں اور گندی پلیٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ صاف کرنے میں ایک منٹ لگ گیا۔

وہ میرے سامنے ایک بوسیدہ اور ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ کر اورنج سوڈے کی بوتل سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ اس کے لمبے سنہرے بال تھے اور اس نے شکن آلود کپڑے پہن رکھے تھے۔

''تم نے اورنج سوڈے میں کیا ملایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''کافی دنوں سے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''سوچا کہ تم سے مل کر معلوم کروں کہ ان دنوں تم کیا کر رہے ہو؟''

''وہی جو ہمیشہ کرتا ہوں۔ کسی ایسی خوب صورت لڑکی کی تلاش جس کی لمبی ٹانگیں ہوں۔''

''اور جو مختصر اسکرٹ پہنتی ہو۔''

''اس وقت میں مذاق کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''بہتر ہوگا کہ تم واضح انداز میں گفتگو کرو۔''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس وقت بھائی ہو یا پولیس والے؟''

ہمارے درمیان یہ ایک خاموش معاہدہ تھا کہ میں اس کے معاملات میں دخل نہیں دوں گا اور اس کے عوض وہ وقتاً فوقتاً مجھے تھوڑی بہت معلومات فراہم کرتا رہے گا۔

''اس وقت ایک پولیس والا تم سے مخاطب ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایک منٹ سوچنے دو کہ تم کیا جاننا چاہ رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ لوویل ایڈمزاپنی چارے کی دکان پر نشہ آور گولیاں بیچ رہا ہے۔''

''اب نہیں، دو دن پہلے اسے گولی ماردی گئی۔''

''کیا واقعی؟''

میں نہیں کہہ سکتا کہ ڈیوڈ کو واقعی اس بارے میں معلوم نہیں تھا یا وہ مجھے پرانی بات بتا رہا ہے۔ ''ہاں واقعی۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس کچھ کارآمد معلومات ہیں یا نہیں؟''

''ایک منٹ رکو۔'' وہ بولا۔ ''اتنی جلدی مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دو۔'' ایک لمحے بعد وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ لوری ڈیلمار، ہوریک آرہا ہے؟''

''یہ تم مجھے کیوں بتارہے ہو؟''

''میں سب لوگوں کو بتا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ذرا سوچو کہ اس کے آنے کے بعد یہاں کیا ہوگا؟''

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''بڑے شرم کی بات ہے کہ تمہیں کوئی بھی کارآمد بات معلوم نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مجھے تمہارے ٹرکوں اور گودام کی تلاشی لینی ہوگی۔''

''میں نہیں جانتا کہ تمہیں کیسے بتاؤں۔ ان دنوں میرا کام مندا ہے۔ پہلے والی بات نہیں۔ چھوٹا سا کام ہے جس سے بمشکل کرایہ ادا ہوتا ہے۔''

''تم یقین کرو یا نہیں۔ میں نے اس سے بھی زیادہ دردناک کہانیاں سنی ہوئی ہیں۔ تم کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے؟''

''میں کام تلاش کر رہا ہوں۔''

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ''اگر حالات اتنے ہی خراب ہیں تو تم سلی کاٹن کے لیے کام کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے اسے چارا ڈالا تھا لیکن وہ اس میں نہیں پھنسا اور بولا۔ ''میں ابھی اتنا مایوس نہیں ہوا ہوں۔''

یہ وہ جواب نہیں تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر میں ہمیشہ اداس ہو جاتا ہوں کیونکہ یہ ان گھروں سے مختلف نہیں تھا جہاں ہماری پرورش ہوئی تھی۔ اس وقت ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ میں یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ کیا اسے کیڈی لیگ میں مرے ہوئے آدمی کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ اس پر یہ ظاہر کیے بغیر کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے مزید کریدتا، میری نظر ایک چیز پر گئی۔

ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر چیسٹر فیلڈ سگریٹ کا آدھا پیک رکھا ہوا تھا۔ میں چلتا ہوا وہاں تک گیا اور اپنے پین کی مدد سے اسے اٹھا لیا۔ یہاں صرف ایک شخص ہی یہ سگریٹ پیتا تھا۔

''تم تو جانتے ہو کہ ڈیڈی کا ہمیشہ سے مخصوص برانڈ رہا ہے۔ وہ چند روز قبل یہاں آئے تھے۔ تبھی یہ یہاں غلطی سے رہ گیا ہوگا۔''

''کیا ڈیڈی واپس آگئے؟'' میں نے کہا۔ ''کب؟''

ڈیوڈ نے اپنے پاؤں کافی کی میز پر رکھے اور بولا۔ ''کیا تمہیں ان کی واپسی کے بارے میں معلوم نہیں جبکہ تم یہاں کے ڈپٹی ہو۔''

''ہم ہر وقت اُس کے آنے جانے پر نظر نہیں رکھتے۔ ویسے بھی اب وہ اتنی بڑی چیز نہیں رہے۔''

''ممکن ہے کہ دوسروں کے لیے نہ ہو لیکن تمہارے لیے تو ہے۔''

''میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ انہیں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم کیا کر رہے ہو؟''

''اسے واپس آئے دو تین ہفتے ہو گئے ہیں لیکن وہ میرے پاس گزشتہ ہفتے آیا تھا کیونکہ اسے بڑا فرنیچر شفٹ کروانے کے لیے میری مدد درکار تھی جہاں وہ رہ رہا ہے۔''

''کیا مجھے فرنیچر کی دکانوں پر مسلح ڈکیتی کی رپورٹیں چیک کرنی چاہئیں؟''

''نہیں۔ اس نے یہ فرنیچر خریدا ہے۔ اپنی جائز کمائی سے۔''

''کیا یہ حقیقت ہے؟'' میں نے اپنی جرح جاری رکھی۔

''ہاں۔''

میں نے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اس پر یقین ہے؟''

ڈیوڈ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''پھر بھی تم اس کا نام نہیں لے سکتے، جانتے ہو کہ لوگ اس سے کیا سمجھیں گے؟''

''جب تم جیسا جوان شخص اپنے باپ کو ڈیڈی کہے گا تو اس سے لوگ کیا سمجھیں گے؟''

ڈیوڈ کی مسکراہٹ فوراً ہی غائب ہو گئی۔ ''میں اس طرح کی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم میری چیزوں کی تلاشی لینا چاہتے ہو تو وارنٹ لے کر آؤ تب تک میں اپنی نیند پوری کرلوں۔''

''یہ کھانے کا وقت ہے۔''

''میرا اور تمہارا ٹائم ٹیبل الگ الگ ہے۔''

''واپس آنے کے بعد اب اس کا کیا پروگرام ہے؟''

''اگر مجھے معلوم ہوتا تب بھی تمہیں نہیں بتاتا۔''

''مجھے امید ہے کہ وہ اپنا سب کچھ واپس لینا چاہے گا۔'' میں نے کہا۔

میں نے سگریٹ کا پیکٹ اپنے پاس رکھ لیا گو کہ وہ میرا برانڈ نہیں تھا۔ البتہ اسے اپنے برابر والی نشست پر دیکھ کر مجھے بھی طلب ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنا برانڈ خریدنے کے لیے ایک گیس اسٹیشن پر گاڑی روکی اور صرف چیک کرنے کی غرض سے ڈیوڈ کو فون کیا، اس کی لائن مصروف تھی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہوگا؟

میرا باپ مارٹن اس کاؤنٹی میں منشیات کا کاروبار کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے یہی کام کرتے دیکھا تھا پھر اسے ایک بدزبان کالج بوائے پر تشدد کرنے کے الزام میں دو سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اس لڑکے نے ضرورت سے زیادہ شراب پی رکھی تھی۔ وہ چھ ماہ قبل رہا ہوا تھا اور اپنے ہوم ٹاؤن میں ایک رات گزارے بغیر وہ غائب ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ البتہ میرے اپنے کچھ اندازے تھے۔

جس طرح مارٹن نے اس لڑکے پر تشدد کیا، اسی طرح وہ مجھے بھی مارنے کا عادی تھا۔ اس کے کاروبار یا سب سے اوپر رہنے کے لیے اس نے جو ہتھکنڈے استعمال کیے، اس سے ہمیں اتنی تکلیف نہیں ہوئی۔ البتہ اس کا ایک جرم میرے لیے واقعی اہمیت رکھتا تھا۔ جب میں چھ سال کا تھا تو میری ماں غائب ہو گئی۔ میرے باپ کا کہنا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ سرکاری رپورٹوں میں جو کچھ لکھا گیا، وہ سب جھوٹ تھا۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں شرمندگی ہوتی ہے کہ مارٹن کی وجہ سے ہی میں ڈپٹی بنا۔ ابھی میں بچہ ہی تھا اور بندوق پکڑنے کے قابل بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے دماغ میں اسے گرفتار کرنے اور ہتھکڑی لگانے کا احمقانہ خیال سر اٹھانے لگا اس لیے نہیں کہ میں جانتا تھا، اس نے میری ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ کیس تو عرصہ ہوا سرد خانے کی نذر ہو چکا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی اس کے جرائم کی فہرست بڑی طویل تھی۔ ناجائز کاروبار، لوگوں پر تشدد اور وہ تمام شیطانی کام جو وہ ہر روز کیا کرتا تھا۔ میں نے ان کے بارے میں بھی کسی کو نہیں بتایا لیکن وہ سب کچھ میرے دل میں محفوظ تھا۔ ڈپٹی بننے کے بعد میں اسی انتظار میں تھا کہ مجھے اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع ملے حالانکہ میں جانتا تھا کہ لوگ کیا سوچیں گے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کے خلاف تحقیقات کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک مذاق ہی ہوتا۔

جب چند ماہ قبل مارٹن رہا ہونے کے بعد غائب ہو گیا اور قصبے میں واپس نہیں آیا تو لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس کا ڈیوڈ کے علاوہ کوئی حقیقی جانشین نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے اختیارات میں کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ جب وہ دو سال کے لیے جیل چلا گیا تو ڈیوڈ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ اس کا کام سنبھال سکے۔ اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

لہٰذا مارٹن کی غیر موجودگی میں ایک بدتمیز اور بدمعاش شخص سیلی کاٹن کو موقع مل گیا اور اس نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی لالچی اور خود غرض نچلے درجے کا ڈیلر تھا جسے میرے باپ نے کبھی آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ یہ شخص کسی وقت بھی اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے لیکن مارٹن کی غیر موجودگی میں اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹینا بھی سیلی کے لیے کام کرتی تھی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ سیلی جیسا بدمعاش ہی مارٹن کو واپس آنے سے روک سکتا ہے لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ مارٹن واپس آنے سے خوف زدہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ سیلی سے ڈرتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ مارٹن اسے نظر انداز نہیں کر رہا۔ وہ صرف کچھ عرصے کے لیے ریاست سے باہر تھا تا کہ پرانے تعلقات بحال کر سکے جس کی اسے منشیات کی باقاعدہ فراہمی کے لیے ضرورت تھی۔ وہ جلد یا بدیر واپس آ کر اپنا اقتدار سنبھال لے گا۔ اگر لوگوں کے پاس مزید معلومات ہوتیں اور جو کچھ میں دیکھ چکا تھا، وہ انہیں بھی معلوم ہوتا تو وہ یقین کر لیتے کہ وہ وقت آ گیا ہے کیونکہ سیلی کاٹن اپنی کار میں مردہ پڑا ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ شیرف کا اسٹیشن پچاس سال پہلے متاثر کن

رہا ہو جب وہ تعمیر ہوا تھا لیکن اب اس کی حالت کافی خستہ ہو چکی تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی یہ عمارت گرمیوں میں بہت گرم اور سردیوں میں بہت ٹھنڈی رہتی تھی۔ میں حتی الامکان اس عمارت سے دور رہنے کی کوشش کرتا لیکن اس وقت میرے پاس یہ آپشن نہیں تھا۔ اندر بلی پرائس اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی لمبی ٹانگیں میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ عہدے کے لحاظ سے ڈپٹی تھا لیکن اسے کبھی کبھار ہی گن رکھنے یا فیلڈ میں جانے کی اجازت ملتی۔ صرف شیرف ہی اس کی وجہ جانتا تھا لیکن بلی کے جاننے والے سمجھتے تھے کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔

بلی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم دن بھر کہاں رہے؟''

''دنیا کو مجرموں اور شرپسندوں سے بچا رہا تھا۔''

بلی نے قہقہہ لگایا جیسے وہ ثابت کرنا چاہ رہا ہو کہ مذاق کو سمجھتا ہے۔

''شیرف اندر ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اگر مجھے سیلی کے قتل کے سلسلے میں کچھ کرنا تھا تو جلدی کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی لاش دریافت ہو جائے۔ کوئی بھی شخص مچھلی پکڑنے یا ہرن کے شکار پر جاتے ہوئے اسے دیکھ سکتا تھا پھر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے مجھے اس واردات کا رخ مارٹن کی طرف موڑنا تھا اور یہ سب کچھ مجھے کسی کو لاش کے بارے میں بتائے بغیر کرنا تھا۔

''شیرف اپنے دفتر میں ہے۔''

شیرف واقعی اپنی میز پر رکھے کاغذوں کے ڈھیر تلے چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک اچھا آدمی ضرور تھا لیکن ہمیشہ پریشان نظر آتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے میری بات سننے کے بعد کہا۔ ''تمہارا باپ واپس آ گیا ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''یہ تو جلد یا بدیر ہونا ہی تھا۔''

میں نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے میں نہیں چاہ رہا تھا کہ کوئی میری بات سنے۔ ''جو بات مجھے پریشان کر رہی ہے، وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو بحالی پروگرام کے بعد سدھر جائیں۔''

''تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہم کسی کو اس مفروضے پر گرفتار نہیں کر سکتے کہ شاید وہ کچھ کرنے والا ہے۔''

''ہم اس کا تعاقب کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح وہ ہماری نظروں میں رہے گا۔''

''یہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟ اور میں کس کو ایسا کرنے کے بارے میں کہوں؟''

''بلی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ڈپٹی پرائس جو کر رہا ہے، وہی ٹھیک ہے یعنی اپنی میز پر بیٹھ کر ہر روز پورا اخبار پڑھنا۔ ہمیں کوئی زیادہ مشکل کام دے کر اس کے ذہن پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔''

جس انداز میں شیرف نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی، اس سے میں سمجھ گیا کہ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا لیکن مجھے ہر حال میں اپنا رول ادا کرنا تھا۔

''مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اپنی حرکتیں شروع کر دے۔''

''جب وہ ایسا کرے گا تو ہم اس کی تحقیقات کریں گے۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں کہ تم یہ سب مجھے بتا رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہے اور تم اسے کسی بھی پریشانی سے دور رکھنا چاہتے ہو لیکن ہم بمشکل تمام ان جرائم سے نمٹ سکتے ہیں جو ہو چکے ہیں۔''

شیرف نے کچھ چبانا شروع کیا اور کاغذات کا ڈھیر اپنی طرف کر لیا۔ یہ اس کا خدا حافظ کہنے کا طریقہ تھا۔ اگر مارٹن کا پیچھا نہ کیا گیا تو میرا کام اور مشکل ہو جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے میرے اعصاب کھنچ اٹھے اور میں سوچنے لگا کہ کہیں شیرف بھی مارٹن کی جیب میں نہ ہو...... لیکن وہ محتاط اور ذمے دار شخص تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی سے ایک ڈالر بھی رشوت لیتا ہوگا۔

اس نے اپنے کام پر سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا جیسے حیران ہو رہا ہو کہ میں ابھی تک وہاں سے کیوں نہیں گیا۔ میں نے جلدی سے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور خالی ہال میں چند لمحے کھڑا ہو کر سوچتا رہا کہ یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آ جائے گی کہ مارٹن نے سیلی کو قتل کیا ہے۔ اس کے لیے کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اندازے تو لگا سکتے تھے لیکن اس سے کسی کا مجرم ہونا ثابت نہیں ہوتا جبکہ معاملہ مارٹن جیسے ہوشیار شخص کا ہو جس نے پچاس سال میں ہر طرح کا جرم کیا جبکہ صرف ایک بار جیوری نے اسے مجرم قرار دیا جب اس نے ایک کالج بوائے کو مارا تھا، وہ بھی اس لیے کہ ایک گشت کرنے والے سپاہی نے بار میں بیٹھے ہوئے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اب بھی اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے، اس کا اعتراف، ثبوت اور موقع کے گواہ درکار تھے جبکہ اس وقت

میرے پاس ان میں سے کچھ نہیں تھا۔ اگر مارٹن کا پیچھا نہ کیا گیا تو وہ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں۔

میں نے باہر آ کر بلی کو جگانے کے لیے اس کی میز پر ہاتھ مارا۔ ''میرے ساتھ آؤ ڈپٹی۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں ایک نیا کام مل گیا ہے۔''

بلی خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے قتل کا تذکرہ کیے بغیر اپنی بات کی وضاحت کی۔

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے پیچھے رہو۔'' میں نے اسے بتایا۔ ہم بلی کی مستعار لی ہوئی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے جبکہ میری اپنی پٹرول کار چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ ''اس میں تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر یہ کامیاب ہوگیا تو اس کا سہرا تمہارے سر جائے گا۔ اگر نہیں تو کسی کو بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔''

''ہاں، لیکن......''

''تم مہینے میں ایک سے زیادہ مرتبہ فیلڈ میں جانا چاہتے ہو؟ تم کسی کی اجازت کے بغیر اپنے ساتھ گن رکھنا چاہتے ہو؟ تب پھر تمہیں شیرف کو کوئی وجہ بتانی ہوگی تاکہ وہ تم پر بھروسا کر سکے۔''

''ہاں لیکن......''

''اس کے علاوہ شاید وہ زیادہ عرصہ شیرف نہ رہے۔ نہ جانے اگلا شیرف کون ہوگا۔ یہ کام کر کے تم اسے بھی متاثر کر سکتے ہو اور دیکھو اس میں تمہیں زیادہ محنت بھی نہیں کرنی ہے۔ اگر تم کچھ دیکھو تو مدد کے لیے فون کر دو ورنہ خاموشی سے گھر چلے جاؤ، یہ کام مٹر چھیلنے کی طرح آسان ہے۔ تم اپنی مما کے لیے یہ کرتے رہے ہو۔''

بلی نے زوردار قہقہہ لگایا جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں گاڑی سے اتر آیا۔ اب مجھے مارٹن کو ڈھونڈنے جانا تھا۔

آج کل وہ لڑکی جو میرے باپ کے ساتھ رہ رہی تھی، اس کی آنکھیں نیلی اور وہ بہت آہستہ آواز میں بات کرتی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے قریب تھی اور اس نے ایک پرانی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے اپنا بیج اسے دکھایا تو اس نے اپنا منہ ایسے کر لیا جیسے اپنی لائنیں یاد کر رہی ہو۔

''مارٹن؟'' اس نے کہا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''پریشان مت ہو۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اس نے مجھے یہ کہنے کی تربیت اس وقت دی تھی جب تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔'' یہ کہہ کر میں گھر میں داخل ہوگیا۔

میرا اندازہ تھا کہ اگر مارٹن قصبے میں واپس آیا اور اس نے خود کو پوشیدہ رکھنا چاہا تو وہ قصبے کے شمال میں واقع اس کیبن میں قیام کرے گا جو اس نے دس سال قبل خریدا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔

مارٹن کچن کی میز پر بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک قلم تھا اور وہ کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے صرف ایک لمحے کے لیے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا جیسے میں مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آ گیا ہوں حالانکہ میں اس سے دو سال بعد مل رہا تھا جب جج نے اسے دو سال کی سزا سنائی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عدالت میں موجود ہر شخص کو توقع تھی کہ اسے کم از کم پانچ سال کی سزا ہوگی لیکن جج نے زیادہ سنجیدہ الزامات مسترد کر دیے اور اسے کم سے کم سزا سنائی۔

میں نے اپنا ہیٹ میز پر رکھا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنا پسینا صاف کرنے لگا۔ ''بہت گرمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر جلد بارش نہ ہوئی تو سارے درخت سوکھ جائیں گے۔''

مارٹن نے کام پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''تم موسم پر بات کرنے آئے ہو؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے کہا۔

کمرے میں ایک چھوٹا سا پنکھا چل رہا تھا جس کا رخ مارٹن کی طرف تھا۔ وہ مسلسل مجھے نظرانداز کر رہا تھا۔ میں نے غصے میں آ کر اپنے ناخن چبانا شروع کر دیے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ آپ ایک ایسے شخص کے ساتھ کتنا عرصہ رہ سکتے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہے کہ اس نے آپ کی ماں کو قتل کیا تھا۔ ایک دن؟ ایک ہفتہ؟ میں نے اس کے ساتھ بارہ سال گزارے......

میں نے باہر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام کیا ہے؟''

''کون، کیلی؟''

''ہاں، کیلی۔ تم نے اسے اپنے بارے میں کیا بتایا؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ ایسی عورتیں تو زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔'' مارٹن نے کہا۔ ''اب تم بتاؤ کہ یہاں کس لیے آئے ہو ورنہ فوراً واپس چلے جاؤ۔'' اس نے بے حسی سے کہا۔

میں اس کے منہ پر گھونسا مارنا چاہ رہا تھا لیکن اس طرح سب کچھ برباد ہو جاتا۔ میں نے پُرسکون نظر آنے کی کوشش کی۔ مجھے بہت احتیاط سے کام لینا تھا۔ وہ بہت ہوشیار تھا۔

''تم اس قصبے میں کب سے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔''

ڈیوڈ نے مجھے اس سے مختلف بات بتائی تھی لیکن میں مارٹن سے جھوٹ کی توقع کر رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ سیلی کا قتل کب ہوا لیکن اس کی لاش دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ چند روز پہلے کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دوسرے لوگوں کو اس میں ملوث کرتا۔ مجھے یہ اطمینان کرنا تھا کہ مارٹن نے اپنی آستین میں کوئی اور کارڈ تو نہیں چھپایا ہوا۔

''واپس آنے کے بعد تم کیا کرتے رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کیبن کو ٹھیک کر رہا تھا۔ ڈیوڈ کو خیال رکھنا چاہیے لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ اتنا قابلِ اعتبار نہیں جیسا کہ مجھے توقع تھی۔''

''یعنی تم صرف ایک کاریگر کی طرح کام کرتے رہے ہو؟''

''ڈیوڈ، کیلی اور میں، ہم تینوں یہاں تقریباً ہر روز کام کرتے رہے ہیں۔''

''کسی نے تمہیں چھ ماہ سے نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''لوگ سمجھ رہے تھے کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے گئے۔''

مارٹن طنزیہ انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تمہاری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ میں یہاں سے دور رہوں۔''

''تمہارے جانے پر کوئی نہیں روئے گا۔ جیسا کہ میں بھی جانتا ہوں کہ تم کوئی منصوبہ بندی کر رہے ہو۔''

''کیا یہ سچ ہے؟'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''بہت سے لوگ میرے بارے میں ایسا ہی سوچتے تھے لیکن میں اب بھی یہاں موجود ہوں اور وہ نہیں ہیں۔''

یہ سچ تھا اور یہی بات مجھے پریشان کر رہی تھی۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہارا کیا پروگرام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں لیکن میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ آج رات ہی یہ قصبہ چھوڑ دو اور واپس مت آنا۔ اس کاؤنٹی کے دروازے تم پر بند ہو چکے ہیں۔''

''اس قصبے کو چھوڑ دوں جہاں میں برسوں سے کاروبار کر رہا ہوں؟''

''کل تمہارے تمام گوداموں پر چھاپا پڑنے والا ہے اور اس کی ابتدا ڈیوڈ کے گودام سے ہوگی۔ یہاں تمہارا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں تمہیں فرار کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ بجائے اس کے کہ تم لمبے عرصے کے لیے جیل چلے جاؤ۔ اس موقع کو ضائع مت کرو۔''

''تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

''کیونکہ تم میرے باپ ہو۔''

مارٹن نے قہقہہ لگایا۔ ''باپ کے جانے کے بعد تمہارے دل میں اس کے لیے محبت بڑھ گئی ہے؟''

''نہیں بلکہ مجھے اس کاؤنٹی کا شیرف بننا ہے اور اگر باپ منشیات کے الزام میں جیل میں بند ہو تو میں یہ مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں منتخب کر لیں گے؟ جبکہ تمہارے ووٹرز جانتے ہیں کہ تمہاری رگوں میں کس کا خون دوڑ رہا ہے۔''

''میں موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور اگر تم یہاں سے میلوں دور چلے گئے تو یہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔''

مارٹن نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ ''مجھے کب نکل جانا چاہیے؟''

''ان کا پروگرام صبح سورج نکلنے پر چھاپا مارنے کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب ان کے خیال میں تم سو رہے ہو گے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں آج رات چلے جانا چاہیے۔''

مارٹن نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم نے اپنی بات کہہ دی۔ اب میں جو بہتر سمجھوں گا، وہ ہوگا۔''

وہاں سے نکلنے کے بعد میں ٹینا سے ملنے چلا گیا۔ وہ کہیں باہر جا رہی تھی۔ ہم باہر پورچ میں ہی بیٹھ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ٹینا پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''سیلی کاٹن مر گیا ہے۔''

ٹینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ''میں نے آج سہ پہر اس کی لاش پینٹ کریک روڈ کے کنارے دیکھی۔ ابھی میں نے صرف تمہیں یہ بات بتائی ہے لیکن شیرف کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا۔''

''تم نے شیرف کو کیوں نہیں بتایا؟''

''لوگ یہی سمجھیں گے کہ میرے باپ نے اُسے قتل کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ میری مدد کے بغیر اسے ثابت نہیں کر سکتے لیکن مجھے اس کے لیے وقت چاہیے۔''

میں ٹینا کا ردِعمل جاننا چاہ رہا تھا لیکن اس نے پلک بھی نہیں جھپکی۔ ''کیا مارٹن واپس آ گیا؟'' اس نے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لگتا ہے کہ اب بہت کچھ ہونے والا ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم کچھ عرصہ گھر سے باہر مت جاؤ جب تک معاملہ دب نہ جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کوئی خطرہ ہے لیکن احتیاط ضروری ہے۔''

"میرے گاہک انتظار کررہے ہوں گے۔ اگر میں نہ گئی......"

"وہ ایک دو دن صبر کر سکتے ہیں۔ نشے کے بغیر وہ مر نہیں جائیں گے۔ اس شخص کی موت بہت سے لوگوں کو ہلا کر رکھ دے گی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا ردِعمل کیا ہوگا یا مارٹن اب کیا کرے گا۔"

ٹینا کھڑی ہوگئی اور سگریٹ کا پیکٹ اپنی جینز میں رکھ لیا۔ اس کی فطرت میں نہیں تھا کہ وہ کسی پر انحصار کرتی۔ "اگر یہ بُری بات ہے تو مجھے گولی ماردو شاید مجھے یہ قصبہ چھوڑنا پڑ جائے۔" اس نے کہا۔

"ابھی یہ نوبت نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "اور اگر کبھی ایسا ہوا تو میں بھی تمہارے پیچھے دوڑتا ہوا آجاؤں گا لیکن ابھی تم اپنی ماں کے پرانے گھر چلی جاؤ۔ وہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

ٹینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بھی کھڑا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ کسی عورت کو مرد پر بھروسا کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے بالآخر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے سامان باندھنے میں دیر نہیں لگائی اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ میں اسی گھر میں اس کی یادوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن اس طرح میں اپنے مقصد سے دور ہوجاتا لہٰذا اس کے بجائے میں واپس اس جگہ کی جانب روانہ ہوگیا جہاں چند گھنٹے قبل میری بلی سے ملاقات ہوئی تھی۔

اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا اور بہت زیادہ ڈرائیونگ کرنے کی وجہ سے میرا دماغ بھی تھک چکا تھا لیکن فی الحال میرے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا لہٰذا مجھے کچھ سوچنے اور یاد کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔ مجھے ڈونلڈ رے ویلس نامی ڈیلر کا خیال آیا۔ کئی سال قبل جب میں چھوٹا تھا۔ ڈونلڈ رے میرے باپ کے لیے کام کر کے اتنا تنگ آگیا کہ اس نے پولیس اسٹیشن جا کر پیشکش کی کہ وہ میرے باپ کے خلاف ہیروئن کی خریداری کے ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ وہاں موجود پولیس آفیسر نے اس سے کہا کہ وہ کچھ دن انتظار کرے تاکہ وارنٹ اور ضروری کارروائی مکمل ہوجائے۔ چند روز بعد اس آفیسر نے ڈونلڈ کو فون کر کے ملک کریک مائنز پر ملنے کو کہا۔ جب ڈونلڈ وہاں پہنچا تو آفیسر کی جگہ وہاں مارٹن موجود تھا۔ اس کے بعد ڈونلڈ دوبارہ نظر نہیں آیا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری کار کا ریڈیو جاگ اٹھا۔ بلی مجھے بلا رہا تھا۔ میں نے گیس اسٹیشن سے ٹینکی فل کروائی۔ کار کی فلیش لائٹس آن کیں اور منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوگیا۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اپنی کار کراس کریک روڈ پر موڑ دی اور ایک کچے راستے کے ذریعے جنگل کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے آخری بڑی پہاڑی عبور کی اور میں نے وہاں ایک دو نہیں بلکہ چار پٹرول کاروں کی روشنیاں دیکھیں اور دعا مانگنے لگا کہ بلی پرائس مجھے نظر آجائے۔

میں نے اپنی گاڑی ایک مناسب جگہ پر کھڑی کی اور کار سے اتر آیا۔ میں نے احتیاطاً اپنا ہاتھ گن پر رکھ لیا تھا۔ بلی دوڑتا ہوا آیا جیسے وہ میرا ہی انتظار کررہا تھا۔

"سب کچھ ویسا ہی ہے جو تم نے بتایا تھا۔" اس نے کہا۔

اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی جیسے اس نے کسی کھیل میں کامیابی حاصل کی ہو لیکن اس کے باوجود میں نے پستول پر سے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔

"مجھے پوری بات بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں اس پہاڑی پر بیٹھا ہوا تھا کہ نصف شب کے قریب تمہارا باپ دو ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آیا اور ٹرک سے سامان نکال کر اس بنکر میں رکھنے لگا۔ میں نے ڈسپیچ کو فون کر کے دو آدمی بھیجنے کے لیے کہا اور گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ لوگ بنکر سے باہر آئے ہم نے تمہارے باپ کو ڈیوڈ اور اس لڑکی سمیت پکڑ لیا۔ یہ اتنا ہی آسان تھا جیسا کہ تم نے بتایا۔"

"تم جانتے ہو کہ لوگوں کو کیا بتانا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ سب سے آسان ہے۔" بلی نے کہا۔ "میں اسے اسی طرح لکھوں گا جیسے تم نے بتایا تھا یعنی یہ کہ میں گھر جارہا تھا کہ میں نے ایک مشکوک شخص کو مقررہ راستے سے ہٹ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ ان پہاڑیوں میں غائب ہوگیا پھر مجھے کچھ فاصلے پر روشنیاں نظر آئیں تو میں نے اس کا پتا لگانے کی کوشش کی تب میں نے دیکھا کہ تمہارا باپ، ڈیوڈ اور ایک لڑکی کے ساتھ مل کر اس پرانے بم شیلٹر میں منشیات رکھ رہا تھا۔"

یہ بم شیلٹر مارٹن کا سب سے پرانا خفیہ گودام تھا۔ میں یہاں بچپن میں ایک مرتبہ آچکا تھا جب مارٹن کو ہنگامی طور پر کوئی سامان یہاں رکھنا تھا۔ میں کئی برسوں سے یہ راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے

دوسرے گودام کہاں ہیں لیکن مجھے شک تھا کہ وہ چھاپا پڑنے کے ڈر سے اپنا تمام سامان یہاں منتقل کر دے گا۔ لگتا تھا کہ میرا اندازہ درست نکلا۔

"شو۔" بلی نے کہا۔ "میں تمہاری قدر کرتا ہوں کہ تم نے مجھے یہ سب بتایا۔ جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے آسان نہیں تھا۔ بہرحال وہ تمہارا باپ ہے۔"

میں نے کندھے اُچکا دیے اور بولا۔ "میں نے جو مناسب سمجھا، وہی کیا۔ کوئی بھی شخص اس کاؤنٹی میں منشیات فروخت نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے اپنے باپ کو حوالات میں پہنچایا ہے۔"

بلی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ایک پٹرول کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ وہاں بیٹھا ہے اگر تم چاہو تو اس سے بات کر لو۔"

مارٹن پٹرول کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کار کی کھڑکی میں جھانک کر دیکھا۔ اس کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے سینے پر غیر معمولی بوجھ آ گیا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کیونکہ میری وجہ سے ہی وہ اس حال کو پہنچا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ تم قصبے سے چلے جاؤ گے؟"

"مجھے امید نہیں تھی کہ چھاپے والی بات سچ ہو گی۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ اس طرح شیرف بن جاؤ گے۔ تم اتنے بے وقوف ہو۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ کیلی اور ڈیوڈ سب کو بتا دیں گے کہ یہ ان کا سامان ہے۔ مجھے پیرول کی خلاف ورزی پر زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی سزا ہو گی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا پھر اس کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ "اولڈ مین یہ معاملہ منشیات کے علاوہ کچھ اور ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں پریشان ہونا چاہیے۔"

میں نے بلی کو کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لیے وہیں چھوڑا۔ اب مجھے دو خطرناک کام کرنے تھے۔ پہلے میں سیلی کی کیڈی لیک کار کی طرف گیا اور اس کی لاش کو ایک بار پھر دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کسی کی نظر میں نہ آ جاؤں لیکن کسی نے مجھے نہیں دیکھا، میں نے اپنا کام نمٹایا اور ٹینا سے ملنے چل دیا۔

وہ اپنی ماں کے پرانے گھر میں ہی تھی اور پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہر رات میرا انتظار کرتی رہی ہو۔ اس وقت وہ میک اَپ میں نہیں تھی اور نہ ہی اس نے رنگین لینس لگائے ہوئے تھے اور وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

"مارٹن منشیات منتقل کرتے ہوئے پکڑا گیا۔" میں نے کہا۔ "اب وہ حوالات میں ہے جہاں وہ کم از کم دو مہینے رہے گا۔ جیل میں رہ کر جج اور گواہوں کو خریدنا بہت مشکل ہے اور انہیں اتنا ہی وقت چاہیے۔"

"کس لیے؟"

میں نے اس کا نیکلس اس کے ہاتھ پر رکھا۔ وہ ٹوٹا ہوا نیکلس مجھے سیلی کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے سیلی کو گولی کیوں ماری یا اس کا نیکلس کیسے ٹوٹ کر وہاں گر گیا۔ دماغ پر زور دینے یا اس کی وضاحت مانگنے میں خطرہ تھا۔

"کل صبح تم شیرف کے دفتر جا کر ڈپٹی پرائس سے ملو گی۔" میں نے کہا۔ "اسے بتانا کہ سیلی کاٹن لاپتا ہے اور تم نے اسے دو دن سے نہیں دیکھا۔ آخری ملاقات میں اس نے کہا تھا کہ وہ مارٹن سے کچھ معاملات طے کرنے جا رہا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لینے کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ "اگر انہیں دو دن میں سیلی کی لاش نہیں ملی تو میں انہیں ایک گمنام کال کر کے بتاؤں گا کہ میں نے اس کی کیڈی لیک کارپینٹ کریک روڈ کے ساتھ دیکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں وہاں سے تمہاری کوئی چیز نہیں ملے گی۔ البتہ ڈیش بورڈ پر مارٹن کے چیسٹر فیلڈ سگریٹ کا پیکٹ ضرور مل جائے گا۔"

ٹینا نے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن ایک لمحے بعد وہ مسکرا دی۔

ٹینا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں کسی کو قتل کر سکتا ہوں۔ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن اب میں اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ ایک شخص کو اس جرم کی پاداش میں جیل بھجوا سکتا ہوں جو اس نے نہیں کیا۔ اس طرح میں نے اس عورت کا انتقام لے لیا جس سے میں نے ہمیشہ محبت کی اور دوسری عورت کو بھی بچا لیا جس سے میں محبت کرنے لگا ہوں۔ مارٹن کو بھی میرے بارے میں بہت جلد معلوم ہو جائے گا لیکن وہ شکایت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ وہ میری ماں کا قاتل تھا۔ میں نے اسے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی اور میں نے موقع ملنے پر اس سے انتقام لے ہی لیا۔

❖❖❖

بساط

جمال دستی

شطرنج کا کھیل دلچسپ ہی نہیں پیچیدہ بھی ہوتا ہے... ہر شخص اسے کھیلنے کا متحمل نہیں ہو سکتا... اس کے کھلاڑی شطرنج کی بساط کے بھی شوقین ہوتے ہیں۔ منفرد اور انوکھے ڈائزائن ان کی کمزوری ہوتے ہیں... ایک ایسے ہی شخص کی رُوداد... تنہائی نے اسے انسانوں سے دور کر کے شطرنج کا کھلاڑی بنا دیا تھا...

بساط پر بکھرے مہروں کی ترتیب اور قتل کی واردات کا سنگین امتزاج

کیری ہومز بُری طرح کپکپا رہی تھی گو کہ صبح کا وقت تھا لیکن اندھیرے اور سرد طوفانی ہواؤں کی وجہ سے رات کا گماں ہو رہا تھا۔ گھرے بادلوں نے سورج کا راستہ روک لیا تھا اور صرف کھمبوں پر لگی ہوئی زرد لائٹوں کی وجہ سے کچھ روشنی ہو رہی تھی۔ کیری نے اسکارف کو اپنی گردن کے گرد مضبوطی سے باندھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے کی وجہ سے بس اسٹاپ اور اس کی منزل کے درمیان چھ بلاک کا فاصلہ پہلے کبھی اتنا زیادہ محسوس نہیں ہوا۔

چھ ماہ پہلے اس کے لیے کافی روشن امکانات تھے۔

ایک ایجنسی میں دو سال غلامی کرنے کے بعد جہاں اسے بہت کم تنخواہ ملتی تھی، اس نے کلینر کی ملازمت کے لیے ہینوور میں درخواست دے دی۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس میں بہت شاندار اعلیٰ درجے کے اٹھارہ سوئٹ تھے۔ یہ عمارت 1940ء میں تعمیر ہوئی تھی اور دیکھنے میں اتنی پرانی نہیں لگتی تھی جتنے کہ اس کے چاروں طرف قدیم مکانات تھے۔ یہ ان کئی عمارتوں میں سے ایک تھی جن کا مالک جیکب رسل تھا۔ اس کی عمر اسّی سال تھی اور وہ سابق کونسلر تھا تاہم اب وہ وہیل چیئر کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔

جیکب ایک پُرتعیش کارنر سوئٹ میں رہتا تھا۔ وہ نازک مزاج نہیں البتہ اپنی رہائش گاہ میں اعلیٰ ترین معیار قائم رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرے کرائے داروں سے بھی صفائی کی مد میں ایک معقول رقم وصول کی جاتی تھی جو ان کے کرائے میں شامل تھی۔ عمارت کی صفائی ستھرائی کی ذمّے داری ایک درمیانی عمر کی عورت میری ڈیک کے سپرد تھی جس کی مدد کے لیے دو کل وقتی صفائی کرنے والی عورتیں رکھی گئی تھیں۔ جب ان میں سے ایک بہتر موقع ملنے پر ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تو اس کی جگہ کیری کو رکھ لیا گیا۔ یہاں تنخواہ اچھی تھی اور ایجنسی کی فیس بھی نہیں دینا پڑ رہی تھی۔ اسے مختلف لوگوں سے ملنے کے لیے بسوں میں نہیں گھومنا پڑ رہا تھا۔ اب وہ اسکائی ٹرین سے ہینوور آتی۔ اسے ہفتے میں پینتیس گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا اور اس کا ویک اینڈ فری ہوتا۔ اس کی ساتھی ورکر جل گرین ایک خوش مزاج اور ہنس مکھ عورت تھی جو دن بھر اپنی باتوں سے ہنساتی رہتی تھی۔

کیری بڑی محنت سے کام کرتی تھی۔ ہمیشہ وقت پر آتی اور تمام کرائے دار اس سے خوش تھے۔ خاص طور پر وہ جیک رسل سے بڑی شائستگی اور محتاط طریقے سے پیش آتی، جیکب بھی اسے پسند کرتا تھا کیونکہ وہ خوش مزاج، ہوشیار اور بہت محنتی تھی۔ وہ اس کی باتیں سنتی جب وہ سٹی کونسل کے زمانے کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ اس کے لطیفوں پر ہنستی۔ اسے تازہ خبروں اور حالات سے باخبر رکھتی اور بخوشی وہ کام بھی کر دیتی جو اس کے فرائض میں شامل نہیں تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے چیس روم کی دل کھول کر تعریف کرتی تھی۔

وہ خود شطرنج کی کھلاڑی نہیں تھی لیکن اس نے کام کے دوران ایسے عجیب سیٹ دیکھے تھے۔ ایک کرائے دار کے لڑکے کے پاس پلاسٹک کا سیٹ تھا جبکہ دوسرے گھر میں وہ ایک لکڑی سے بنے ہوئے سیٹ کی صفائی کرتی تھی۔ جب وہ پہلی بار جیکب کے سوئٹ میں داخل ہوئی اور جو کچھ اس نے وہاں دیکھا وہ بے حد حیران کن تھا۔

ہال اور لیونگ روم کے درمیان ایک شیشے کی کھڑکی تھی جہاں سے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ دیوار پر ایک طویل قامت سور ما زرہ بکتر پہنے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے چوکور خانے تھے جن میں پادریوں، بادشاہوں، ملکاؤں اور قلعے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں لیکن جب وہ کھڑکی سے گزر کر کمرے میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ سب سے پہلے اس کی نظر ایک موٹے اونی کپڑے پر گئی جس پر سفید اور سیاہ خانوں میں درباریوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

اسے محسوس ہوا کہ پورے کمرے میں شطرنج کے مہرے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سیٹ پوری دنیا سے منگوائے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ سوپ اسٹون اور کچھ دھاتوں یا جست سے بنائے گئے تھے جبکہ دوسرے مہروں کی تیاری میں ٹیک اور اخروٹ کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ایک گول میز پر مختلف سیٹ رکھے ہوئے تھے لیکن ان میں سب سے سادہ سیٹ کمرے کے وسط میں ایک میز پر رکھا ہوا تھا اور اسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ جیکب اپنی وہیل چیئر پر بیٹھ کر شطرنج کھیل سکے۔ وہ ہر ہفتے اپنے دوست اور پڑوسی جوناتھن کے ساتھ کھیلتا تھا لیکن جوناتھن کی موت کے بعد اس سیٹ کو کسی نے استعمال نہیں کیا۔

ایک قریب آتی گاڑی کی آواز سن کر کیری اپنے خیالوں سے باہر آ گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ اس عمارت کی طرف جا رہی تھی جہاں جیکب کا دوست رہتا تھا۔ جب وہ اوک اسٹیٹ کے کونے پر پہنچی تو بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ کیری نے اپنی چھتری کھول لی۔ جب اس نے ایک جانے پہچانے شخص کو بلاک کے آخری سرے پر سڑک پار کرتے دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ وہ جیکب رسل کا بیٹا ڈیوڈ تھا۔ وہ حیران تھی کہ جب وہ کام پر پہنچے گی تو اس کا کس طرح استقبال ہو گا۔ جل گرین اسے خبردار کر چکی تھی کہ ڈیوڈ، میری ڈیک سے اس کی شکایت کرنے والا ہے کہ وہ کس طرح اس کے باپ پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ جل اس عمارت میں ہونے والی ہر بات سے آگاہی رکھتی تھی۔ اس نے شروع میں ہی کیری کو اس عمارت میں رہنے والوں کی عادات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ خاص طور پر ڈیوڈ رسل پر نظر رکھتی تھی۔ وہ صرف اس لیے یہاں آتا تھا کہ اسے اپنی وراثت

کی فکر تھی۔ وہ ہر جمعرات کو اپنے باپ سے ملنے آتا اور بعض اوقات چھوٹے موٹے مرمت کے کام بھی کر دیتا۔ جیکب کسی باہر کے آدمی کو پیسے کیوں دے جب وہ اپنے بیٹے سے یہ کام کروا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جیکب کے لیے ضروری سامان کی خریداری بھی کرتا، بہر حال وہ ضرورت سے زیادہ وہاں بھی نہیں رکا۔ اپنے باپ کے اپارٹمنٹ کا کام نمٹانے کے بعد وہ ایک کاروباری خاتون کے ساتھ کافی پینے اسٹاربک جاتا جس کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ اسے شادی کرنے کے لیے پھنسا رہا ہے پھر وہ ہینوور واپس آتا اور دو گھنٹے میں چھوٹے موٹے کام نمٹاتا۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ کی فیکٹری میں کام کرنے چلا جاتا جہاں آرڈر پر دروازے بنتے تھے۔ جل نے پہلے ہی کیری کو خبردار کر دیا تھا کہ ڈیوڈ فلرٹ کرنے والا شخص ہے۔ وہ کئی عورتوں کے ساتھ تعلق قائم کر چکا ہے لیکن کسی کے ساتھ شادی کے لیے سنجیدہ نہیں ہوا۔ وہ کسی امیر خاندان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے پاس اس کے باپ جتنی جائداد ہو۔ جل نے کیری کو اس سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔

کیری کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان محبت کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ ڈیوڈ رسل نے اپنے باپ کو نظر انداز نہیں کیا لیکن اس نے اپنی سہولت کے کچھ انتظامات ضرور کیے تھے۔ اس نے اپنے باپ کے لیے ایک آئی فون خریدا تاکہ پیغامات کے ذریعے اس سے رابطے میں رہے اور لمبی فون کال سے پرہیز کرے۔ بہر حال کیری نے ہی جیکب کو فون استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ اس کے باوجود کہ ڈیوڈ کو اپنے باپ کی ضروریات کا احساس نہیں تھا۔ کیری اس میں کشش محسوس کرنے لگی۔ جل نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ڈیوڈ کے خلاف مزاحمت کرنا بہت مشکل ہے۔ کیری نے سوچ لیا تھا کہ اگر ڈیوڈ نے فلرٹ کیا تو وہ اس کے ساتھ باوقار رویہ رکھے گی۔ وہ جانتی تھی کہ جیکب اپنے بیٹے کی پیش قدمی کو پسند نہیں کرے گا۔ ڈیوڈ اسے روک کر ہنسی مذاق کر لیتا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور جیکب کا جھکاؤ اس کی طرف بڑھا تو ان تینوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔

بہت جلد ڈیوڈ رسل نے اپنی اصلی فطرت ظاہر کر دی اور اس کے بعد سنگین نوعیت کے واقعات پیش آنے لگے اور کیری کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ جیکب اسے روزانہ پیغام بھیجنے کے لیے آئی فون کا استعمال کر رہا تھا اور ہینوور میں یہ ایک افواہ پھیل گئی کہ وہ ڈیوڈ کی وراثت کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔ ڈیوڈ اس کے ساتھ کھلی دشمنی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور دوسرے اسٹاف ممبرز کے سامنے اس کی بے عزتی کر دیتا۔ وہ جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کر رہا تھا جس سے کام کا ماحول خراب ہو۔ اس کشیدگی اور اضطراب کی وجہ سے کیری کے اعصاب متاثر ہونے لگے۔

جب وہ بلاک کے آخری سرے پر پہنچی تو ڈیوڈ رسل غائب ہو چکا تھا۔ کیری اپنے خیالوں میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اس نے ایک اور آواز پر توجہ نہیں دی لیکن قریب پہنچ کر وہ اس آواز کو پہچان گئی۔ کچھ لوگ فٹ پاتھ پر ڈرل کر رہے تھے اور وہیل چیئر کے لیے ہینوور کے ساتھ ریمپ نصب کر رہے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس طوفان میں بھی انہوں نے کام جاری رکھا ہوا ہے۔

ہینوور پہنچ کر اس نے جلدی سے پورٹیکو میں قدم رکھا اور چھتری کو بند کر کے اندر چلی گئی۔ جیکب نے آج اپنا پیغام نہیں بھیجا تھا جس کا مطلب تھا کہ گزشتہ چند ہفتوں سے جاری فساد اور تنازع اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔ کون جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

کیری کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ اسے ہینوور میں آتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے۔ میری ویک دوسرے مین فلور کے کارنر سوئٹ میں رہتی تھی اور وہ اپنے سامنے والی کھڑکی سے کیری کو دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے اسے سامنے والی فٹ پاتھ سے آتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنے دروازے کے ہک میں لگی ہوئی ماسٹر کی نکالی اور نیچے لابی میں آ گئی۔ اس کے آنے سے پہلے کیری اپنا کوٹ اتار کر ڈانگری پہن چکی تھی اور کام شروع کرنے کے لیے تیار تھی تاہم اس وقت وہ اپنے سیل فون میں مصروف تھی۔

میری نے گلا صاف کر کے اسے اپنی جانب متوجہ کیا اور بولی۔ ”کیری! اس سے پہلے کہ تم کام شروع کرو، میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

کیری نے سیل فون جیب میں رکھ لیا اور بولی۔ ”میں مسٹر رسل کو پیغام بھیج رہی تھی۔ وہ عام طور پر مجھے میسج کرتے ہیں جب میں راستے میں ہوتی ہوں لیکن آج ان کا پیغام نہیں آیا۔“

”اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔“ میری نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ کیری ایک اچھی ورکر تھی اور وہ اس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم وہ جیکب اور اس کے درمیان بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے پہلے کہ کیری کوئی جواب دیتی، اس کی جیب

سے گھنٹی جیسی آواز آئی۔ اس نے فوراً ہی جیب سے فون نکال لیا لیکن میری نے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ بعد میں دیکھ لینا۔

''لیکن یہ مسٹر رسل کا بھی ہو سکتا ہے۔ کیا مجھے اسے نہیں دیکھنا چاہیے؟''

''تم اسے ایک منٹ میں پڑھ سکتی ہو۔ یہی پیغامات اس مسئلے کا حصہ ہیں۔ دیکھو کیری، ڈیوڈ رسل آج صبح میرے سوئٹ پر آیا تھا صرف یہ بتانے کے لیے کہ وہ ان طریقوں کی وجہ سے بہت ناراض ہے جو تم اس کے باپ کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اختیار کر رہی ہو۔ اس نے تمہارے لیے گولڈ ڈگر، کی اصطلاح استعمال کی یعنی ایسی عورت جو صرف پیسوں یا تحائف کے لیے مردوں سے تعلقات استوار کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں صرف ان سے ہمدردی ہے۔ بہر حال تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسٹر رسل بوڑھے شخص ہیں اور ان کا بیٹا محسوس کرتا ہے کہ مسٹر جیکب سے دوستی کر کے تم فائدہ اٹھانا چاہ رہی ہو۔ تمہیں مستقبل میں محتاط رویہ اختیار کرنا ہوگا۔''

کیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہاری نیت صاف ہے لیکن تم باپ اور بیٹے کے درمیان دوری پیدا کر رہی ہو۔ آج صبح کا منظر بہت خوفناک تھا اور جیکب بہت زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے تمہیں پیغام نہیں بھیجا۔''

وہ اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ یہ صورتِ حال مشکل ہو گئی ہے۔ میں پریشان تھی جب تم نے یہاں کام شروع کیا کیونکہ میں نے دیکھا کہ ڈیوڈ رسل کس طرح تمہاری خوب صورتی پر مر مٹا اور مجھے شبہ ہے کہ وہ اسی لیے تمہارے خلاف ہو گیا کیونکہ تم نے اسے منہ نہیں لگایا اس کے باوجود اس کی پریشانی جائز ہے۔ تمہیں اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔''

کیری اپنا سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں مسٹر رسل کے پیغام کا جواب دے دوں؟''

میری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ''بہتر ہے کہ تم دیکھ لو، وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

کیری نے اپنا فون نکال کر پیغام پڑھا اور ایک دم ہی اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے فون میری کو پکڑا دیا۔ اس پیغام کو پڑھتے ہی میری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس میں لکھا تھا۔ ''تم آج مت آنا کیری۔ مجھے افسوس ہے ڈیئر، جانتا ہوں کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' کیری کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''ایسا لگتا ہے کہ مسٹر رسل نے فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے ان کے بیٹے کے ساتھ تعلقات متاثر ہوں۔ میں نیچے جا کر دیکھتی ہوں کہ کیا مسئلہ ہے۔ آج میں جل کو اس کے اپارٹمنٹ کی صفائی کے لیے بھیج دوں گی اور تم مارٹن کے سوئٹ میں کام کرو۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی تاکہ اس سے سوری کہہ سکوں؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں یا کم از کم اتنا انتظار کر لو کہ میں اس سے بات کر لوں۔ میں ابھی نیچے جا رہی ہوں۔''

میری نیچے ہال میں چلی گئی۔ کیری بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چل دی اور جب میری جیکب کے دروازے پر پہنچی تو وہ اس کے پیچھے رک گئی۔ میری نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جیکب کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر کیری کی طرف دیکھا۔

''شاید وہ واش روم میں ہو۔ میں تھوڑا انتظار کر لیتی ہوں۔''

کیری بھی اس کے پاس آ گئی اور دروازے سے کان لگا دیے۔

''اس کے واش روم میں ایک آٹومیٹک پنکھا ہے جب وہ اندر ہو تو وہ خود بخود چل پڑتا ہے لیکن مجھے اس کی آواز نہیں آ رہی۔''

میری نے دوبارہ دروازے پر دستک دی اور اونچی آواز میں اسے پکارا۔

''ممکن ہے کہ وہ بیمار ہو۔'' کیری نے کہا۔ ''کیوں نہ اندر جا کر دیکھیں؟''

''ہاں، بہتر ہے کہ میں اندر جاؤں۔''

میری نے دروازے کا قفل کھولا اور جیسے ہی اس نے ہینڈل گھمایا اندر سے ایک آواز آئی۔ اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور سوئٹ میں داخل ہو گئی پھر اس نے لمبی سانس بھری۔ کیری اس کے پیچھے اندر داخل ہوئی اور اس کے کندھوں پر سے دیکھنے لگی اور لیونگ روم کے وسط میں خون منجمد کرنے والا منظر دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔

جیکب کی وہیل چیئر میز کے ساتھ رکھی ہوئی تھی اور وہ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ایک طرف مڑ گیا تھا اور میز کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں

مہروں کی قطار پر جمی ہوئی تھیں جنہیں ترتیب سے بورڈ پر رکھا گیا تھا۔

کیری کو اس کی کنپٹی میں ایک سیاہ سوراخ نظر آیا جس میں سے خون کی دھار بہہ کر جیکب کے ماتھے اور میز پر جا رہی تھی۔ اچانک ہی کیری اپنے آپ کو بیمار محسوس کرنے لگی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے دماغ میں مختلف خیالات آنے لگے۔ ڈیوڈ رسل کو اپنی وراثت کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب کوئی بھی بوڑھے جیکب اور اس کے درمیان دوری پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

جیکب رسل کے سوئٹ میں داخل ہونے والے دوسرے لوگوں کی طرح سراغ رساں کانسٹیبل اینی بلیک بھی شطرنج کے مہروں کی صف بندی دیکھ کر حیران رہ گئی جنہوں نے پورے کمرے پر غلبہ کیا ہوا تھا۔ اس نے لاش کو دیکھنے سے پہلے پورے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔ ابتدائی پوچھ گچھ سے معلوم ہو رہا تھا کہ جیکب نے خود اپنی زندگی کا خاتمہ کیا ہے۔ جب میری اور کیری کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئیں تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ جیکب کی موت کنپٹی میں گولی لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ پستول اس کے دائیں طرف فرش پر پڑا ہوا تھا جبکہ اس کا فون میز پر موجود تھا۔

اس کے آخری پیغام سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جیکب نے اپنے بیٹے کی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیے لیکن اب اس کی نوعیت نوجوان خادمہ کے نام خودکشی سے پہلے لکھے گئے خط کی ہو گئی جسے وہ بہت چاہتا تھا۔ سوئٹ کا دروازہ مقفل تھا اور اسے جیکب کے علاوہ صرف میری کھول سکتی تھی جس کے پاس تمام اپارٹمنٹ کی ماسٹر کی تھی۔ یہاں تک کہ جیکب کے بیٹے کو بھی اس سوئٹ کی چابی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ گارڈن ڈور سے بھی اندر داخل ہوا جا سکتا تھا اور وہ بھی مقفل تھا۔

''اس نے خودکشی کی ہے۔'' کورونر اینڈریو بریڈ نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد اینی سے کہا جو بڑے غور سے گارڈن ڈور کو دیکھ رہی تھی۔

''ضروری نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اس دروازے میں بٹن لاک لگا ہوا ہے۔ کوئی بھی اس راستے سے باہر جا سکتا ہے۔''

''اگر کوئی اس طرف سے اندر آیا ہو تو اسے باہر کام کرنے والے مزدوروں نے ضرور دیکھا ہو گا۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ اس کے باوجود یہ سب بڑی صفائی سے ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر تم مطمئن ہو تو ونسٹن کو بلاؤ تاکہ پستول اور دروازے کے ہینڈل چیک کر سکے۔''

''ہاں، میرا بھی یہی ارادہ ہے۔'' اینی نے کہا۔

کورونر نے کندھے اچکائے، اپنا بیگ بند کیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اینی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی پھر وہ مڑی اور غور سے پیڈسٹل میز کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے باپ سے شطرنج کھیلنا سیکھی تھی گو کہ اسے کبھی کبھار ہی کھیلنے کے لیے وقت ملتا لیکن وہ اس کھیل کے قوانین سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لیے جیکب کے کمرے میں ایک بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اگر جیکب جنون کی حد تک شطرنج سے محبت کرتا تھا جس کا اسے یقین ہے تو اپنے سیٹ کی حالت پر توجہ دینی چاہیے تھی۔ بالخصوص اس سیٹ پر جو صرف دیکھنے نہیں بلکہ کھیلنے کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اس کیس میں اپنی میز پر رکھے ہوئے مہروں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ سیاہ کوئین سفید خانے میں کیوں رکھی ہوئی ہے؟

بادشاہ اور ملکہ کا دوسرے خانوں میں ہونا ایک معمولی بات تھی لیکن اس نے اینی کو مسلسل مضطرب رکھا۔ اس کے باپ نے یہی سکھایا تھا کہ اصولاً کوئین کا مہرہ اپنے رنگ کے خانے میں ہونا چاہیے۔ جیکب رسل چاہے کتنا مایوس اور دل شکستہ کیوں نہ ہو وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ خودکشی کرنے والا تھا تو اس نے اپنی شطرنج کی بساط کو اس بے ترتیبی کی حالت میں کیوں چھوڑا؟ کیا اس الٹ پھیر میں بھی کوئی پیغام پوشیدہ تھا؟ یا جب وہ گرا تو مہرے اپنی جگہ سے ہٹ گئے جنہیں بعد میں کسی اور نے دوبارہ بساط پر رکھ دیا۔

میری اور کیری دونوں نے ہی سختی سے اس بات کی تردید کی کہ انہوں نے شطرنج کی بساط کو ہاتھ لگایا تھا بلکہ یہاں تک کہا کہ انہوں نے کمرے میں کسی چیز کو نہیں چھوا۔ کیری نے پہلے سے ہی صفائی کرنے کے لیے دستانے پہن رکھے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب میری نے نو گیارہ کو فون کیا تو وہ دونوں کمرے میں موجود تھیں۔ میری وہاں سے نہیں گئی جب تک اس نے باہر ایمبولینس کو رکتے ہوئے نہیں دیکھ لیا اور کیری پہلے کانسٹیبل کے آنے تک دروازے پر موجود رہی۔

دونوں خواتین نے اس ہتھیار کو شناخت کر لیا جس سے جیکب کی موت ہوئی تھی۔ وہ اس کا اعشاریہ بائیس کا پستول تھا جو وہ نوعمری میں نشانے بازی کی مشق کے لیے

استعمال کیا کرتا تھا۔ اس نے وہ پستول اپنی میز کی دراز میں رکھا ہوا تھا اور وہ اپنے مہمانوں کو اسے دکھایا کرتا تھا لہٰذا اس کے اپارٹمنٹ میں آنے والے ہر شخص کو معلوم تھا کہ وہ کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ عمر کے ساتھ بڑھتی ہوئی کمزوری سے خائف تھا۔ اس لیے اس نے اپنی حفاظت کے لیے کئی احتیاطی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔ اس کے سوئٹ میں الارم لگا ہوا تھا اور صرف تین ہفتے قبل اس کے بیٹے نے دونوں داخلی راستوں پر مضبوط لوہے کے دروازے لگوائے تھے۔

میری اور کیری دونوں کو ہی جیکب کی موت کا صدمہ تھا لیکن انہوں نے تسلیم کیا کہ جیکب اپنے گہرے دوست کی موت پر بہت افسردہ تھا جو اس کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا اور اس کا یہ شوق جیکب کے لیے بہت اہم تھا کیونکہ اس کے بیٹے کو اس کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔ صبح اور شام میں اس کی دیکھ بھال کرنے والے کارکن بہت مستعد اور مہربان تھے لیکن انہیں دوسرے لوگوں کو بھی دیکھنا ہوتا تھا۔ اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ اس کے پاس نہیں رکتے تھے۔

دوسری منزل پر رہنے والی بیوہ سے جیکب کی بہت دوستی تھی اور وہ اس کے لیے باقاعدگی سے گھر کی بنی ہوئی چیزیں لاتی تھی لیکن اس نے بھی صاف کہہ دیا کہ اسے شطرنج کھیلنا نہیں آتی۔ میری ویک نے اعتراف کیا کہ اس کمرے میں رکھے ہوئے سیٹ پر گرد جمی رہتی تھی جس کی وجہ سے صفائی کرنے والے عملے کی کوششوں میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ صرف کیری ہی وہ واحد شخصیت تھی جو ان سیٹ کے بارے میں اس کے جوش وجذبے کی حمایت کرتی تھی لیکن اس کے لیے جیکب کی چاہت کی وجہ سے باپ بیٹے میں اختلافات ہو رہے تھے جن کا اس کی موت کے ساتھ اختتام ہوا۔

ڈیوڈ رسل نے اپنے باپ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ اس کا باپ جس موڈ میں بھی رہا ہو، اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ اس عمارت میں صبح ساڑھے سات بجے پہنچا اور اپنی کار اس جگہ کھڑی کی جہاں مزدور فٹ پاتھ کے ساتھ ڈرلنگ کر رہے تھے۔ اس نے اپنے اوزار اندر رکھے۔ اس کے ساتھ ایک بڑے باکس میں نیا باتھ روم کیبنٹ بھی تھا جو وہ اپنے باپ کے لیے لگانے آیا تھا۔ چنانچہ اس نے گارڈن والا دروازہ استعمال کیا کیونکہ وہاں سے باتھ روم قریب تھا۔ اس کے پاس دروازے کی چابی نہیں تھی لیکن صبح میں آنے والی کیئر ورکر ابھی موجود تھی۔ اس نے اسے اندر آنے دیا۔

جیکب لباس تبدیل کر کے ناشتا ختم کر چکا تھا۔ کیئر ورکر کے جانے کے بعد ڈیوڈ نے کیری کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا جس پر اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ ڈیوڈ اسے اس حال میں چھوڑ کر واپس گارڈن والے دروازے سے باہر گیا اور اسے بند کر کے اطمینان کر لیا کہ وہ مقفل ہو گیا ہے۔ وہ کافی پینے اسٹاربک جا رہا تھا لیکن پھر وہ تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ باپ کو دوبارہ ڈسٹرب کرنے کے بجائے وہ میری سے شکایت کرے گا۔

وہ سامنے والے دروازے سے عمارت کے اندر گیا اور میری سے بات کرنے کے بعد اسی راستے سے باہر چلا گیا۔ اس نے ایک مزدور سے مختصر بات کی جو وقفے میں سگریٹ پی رہا تھا پھر وہ کافی شاپ کی طرف چل دیا۔ ہاں اس کے باپ کی موت افسوسناک تھی لیکن اس پر اسے پریشان کرنے کا الزام لگانا ٹھیک نہیں۔ اس بوڑھے بے وقوف کو یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ اس نوجوان خادمہ سے ایسا برتاؤ کرے جو عمر میں اس سے ایک تہائی چھوٹی ہے اور کسی نہ کسی کو اسے سیدھے راستے پر لانا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے باپ کے دماغ کو صرف یہ ثابت کرنے کے لیے جھنجوڑا تھا کہ وہ کتنا بوڑھا اور نامعقول ہو گیا ہے۔

پہلی شخصیت جس نے انتہائی غصے سے خودکشی کے نظریے کو مسترد کیا وہ دوسری منزل پر رہنے والی بیوہ انگرڈ جیسن تھی۔ اس نے ہال میں اپنی کو مخاطب کرتے ہوئے معلومات کا دریا بہا دیا۔ پہلی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ جیکب اپنی بیماریوں اور بڑھتی ہوئی اشتعال انگیزی کے باوجود زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ مطالعے کا شوقین اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہتا تھا اور اپنے مالی معاملات کے بارے میں کافی ہوشیار تھا۔ جب سے اس نے نوجوان خادمہ میں دلچسپی لینا شروع کی تو وہ خاصا جوشیلا ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے جیکب اور اس کے بیٹے کے درمیان اختلافات ہو گئے تھے لیکن صرف اس وجہ سے وہ اپنے سر پر پستول نہیں رکھ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے بجائے اپنے بیٹے کے سر کا نشانہ لیتا۔

ڈیوڈ رسل کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس نے تفصیل سے بتایا کہ ڈیوڈ اپنے باپ کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں جیکب اپنی وصیت میں سے اس کا نام نہ نکال دے۔ اس کی کوئی امیر گرل فرینڈ نہیں تھی اور یہ محض ایک افسانہ تھا۔

وہ صبح کو یہاں آیا اور سڑک پر ہونے والے کام کی خوفناک آواز کی وجہ سے کسی کو بھی فائر کی آواز نہیں سنائی دی ہوگی، اگر اس نے عمارت سے باہر جانے سے پہلے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہو۔ وہ پستول اور اس احمقانہ پیغام کے بارے میں جانتا تھا اگر پولیس میں ذرا سی بھی عقل ہے تو وہ اس کا مفہوم سمجھ سکتی ہے۔ آج کل ٹیکنالوجی اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ اس کے ذریعے کوئی بھی نقلی کام ہو سکتا ہے۔ انگرڈ نے اپنا بیان ختم کیا اور ہال سے باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میری معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائی۔ ”میں اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتی۔“ اس نے اینی سے کہا۔ ”وہ ہر روز دوپہر میں مرڈر شی روٹ دیکھتی ہے۔“

اینی نے کچھ نہیں کہا لیکن وہ اپنے دماغ سے انگرڈ کی باتوں کو نہیں نکال سکی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈیوڈ کو ناپسند کرتی ہو۔ کیا اس کی بات میں وزن تھا؟ کیا ڈیوڈ اپنے باپ کو قتل کر سکتا تھا؟ جب فائر ہوا تو وہ آٹھ بلاک دور ایک معروف کافی شاپ میں تھا۔ کیا جیکب رسل کی موت کے وقت کوئی شعبدہ بازی ہوئی تھی؟

کسی نے جیکب رسل کو اس کے بیٹے کے جانے کے بعد نہیں دیکھا اور اس کے سوئٹ کا ٹمپریچر کم ہونے کی وجہ سے یقیناً خون جمنے کا عمل سست پڑ گیا ہوگا لیکن اگر میری اور کیری نے جو آواز سنی وہ کسی اور چیز کی تھی تو وہ کیا ہو سکتی ہے؟ جیکب کو موسیقی کا شوق نہیں تھا اور وہ ریڈیو یا ٹی وی کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے سوئٹ میں ریکارڈنگ ڈیوائس یا کوئی ایسا آلہ نہیں تھا جو فائر کی آواز کی نقل تیار کر سکے۔ اس کے علاوہ کیری اور میری نے پورے یقین سے کہا تھا کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو انہیں پستول کے دھوئیں کی بو آئی تھی۔ اس لیے ان کے اندر آنے سے چند سیکنڈ پہلے ضرور ایک فائر ہوا ہوگا۔

کیری کو ملنے والا پیغام بھی قتل کی تصویری میں رکاوٹ تھا۔ کیا اسے کہیں دور سے بھیجا گیا تھا؟ اینی نے ایسے ٹیلی فونز کے بارے میں سن رکھا تھا جو ہو بہو کسی دوسرے فون کی نقل تھے۔ اس بارے میں فارنسک ٹیم ہی بتا سکتی تھی لیکن اینی کے خیال میں اس کا امکان نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مہروں کا معاملہ بھی ابھی حل طلب تھا۔ اس لیے ٹیلی فون اور پستول کے ساتھ مہروں کو بھی لیبارٹری بھیجنا ضروری ہو گیا تھا۔ اینی جاننا چاہتی تھی کہ آخری بار کس نے بادشاہ اور ملکہ کی جگہ تبدیل کی تھی۔

جیکب کے فون کی ٹیسٹ رپورٹ دو دن بعد آئی۔ وہ پیغام اسی کے فون سے بھیجا گیا تھا اور اس پر جیکب کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ بہر حال ان پر دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سفید پاؤڈر کی ہلکی تہ بھی موجود تھی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ کہ کیس کے کنارے پر مصنوعی کائی کے دو چھوٹے ذرات نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک اور انوکھی بات تھی۔ یہ نشانات کہاں سے آئے؟ اینی جانتی تھی کہ یہ سارے ثبوت خودکشی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن اس نے ایک بار پھر ہینوور جانے کا فیصلہ کیا۔

جیکب رسل کا سوئٹ ابھی تک بند تھا اور وہاں صرف شطرنج کے مہرے اس انداز میں ایستادہ تھے جیسے وہ خاموشی سے اپنے مالک کا انتظار کر رہے ہوں۔ اینی نے بڑی احتیاط سے سوئٹ کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے کائی جمتی اور نہ ہی سفید پاؤڈر کے ذرات نظر آئے جن کی تہ جیکب کے فون پر جمی ہوئی تھی۔ میری نے اس بات کی تصدیق کی کہ جیکب کے سوئٹ میں اصلی یا نقلی پودے نہیں تھے۔ صرف ایک ہی جگہ تھی جہاں اینی کو مصنوعی کائی مل سکتی تھی اور وہ سامنے والے دروازے کے ساتھ لگے ہوئے پودے تھے۔ اینی نے سوچا کہ موازنے کے لیے اس کائی کا نمونہ لے لیا جائے لیکن جب وہ لابی میں پہنچی تو اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ لیبارٹری سے ونسٹن کی کال تھی۔

”ہمیں کچھ اور انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔“ اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”مرنے والے کے نشانات پستول پر ہیں لیکن صرف گرپ اور ٹریگر پر۔ اس کے علاوہ کہیں کوئی نشان نہیں جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ دروازوں کا معاملہ بھی دلچسپ ہے۔ گارڈن ڈور پر ڈیوڈ رسل کی انگلیوں کے نشانات واضح ہیں اور اندرونی دروازے کے باہر والے ہینڈل پر میری ڈیک کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ البتہ اس دروازے کا اندرونی ہینڈل بالکل صاف ہے۔ اس پر کوئی نشان نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جیکب کے اپنے نشان بھی نہیں ہیں۔“

”یہ بہت عجیب بات ہے۔ دیکھ بھال کرنے والی عورت اسی دروازے سے باہر گئی۔ اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات تو ہونے چاہئیں۔“

”ہاں لیکن ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔“ ونسٹن نے کہا۔ ”دروازے کا ہینڈل ہی صاف نہیں ہے بلکہ دروازے کی سائڈ میں لگی ہوئی پلیٹ پر بھی اچھی طرح

پالش کی گئی ہے جس کسی نے بھی ہینڈل اور دروازے کا کنارہ صاف کیا وہ دیوار پر لگی ہوئی اسٹرائیکر پلیٹ صاف کرنا بھول گیا جہاں سے دروازے کی چوکھٹ میں بولٹ لگتے ہیں۔ تمہیں اندازہ ہے کہ ہمیں وہاں کیا ملا؟"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں، تم بتاؤ۔"

"گن پاؤڈر کی تلچھٹ۔"

"اسٹرائیکر پلیٹ پر؟ میں سمجھی نہیں۔"

"ایئی! یہ بالکل واضح ہے۔ جو چیز دھماکے سے پھٹی وہ ضرور لوہے کے دروازے کے اندر تھی۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ پورا دروازہ نکال کر چیک کریں کیونکہ یہی اس کیس کو حل کرنے کی کنجی ہے اور ہاں تم نے ہمیں جو مہرے بھیجے تھے، ان پر ڈیوڈ رسل کی انگلیوں کے نشان ہیں۔"

ونسٹن نے فون بند کر دیا اور ایئی اس کے کہے ہوئے الفاظ کی اہمیت پر غور کرنے لگی۔ اگر دوسرا فائر نقلی تھا تو ڈیوڈ رسل کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ثابت نہیں ہوتی لیکن جس کسی نے بھی دروازے کا ہینڈل صاف کیا، وہ لازماً وہاں موجود ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ ڈیوڈ رسل کا کوئی ساتھی بھی ہے اور اسی نے جعلی پیغام بھی بھیجا تھا۔ جب ایئی نے پودوں کی طرف دیکھا تو اسے وہاں کسی کے قدموں کے نشان نظر آئے اور وہ اچانک ہی اداس ہوگئی۔ وہ ونسٹن کی ٹیم کو کائی کا تجزیہ کرنے کے لیے کہتی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ یہ تصدیق کریں گے یہ وہی کائی ہے جس کی باقیات جیکب کے فون پر ملی تھیں۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ سفید پاؤڈر کہاں سے آیا تھا۔ یہ دستانوں پر لگی ہوئی تلچھٹ تھی۔ ڈیوڈ رسل کی کیری سے دشمنی محض دکھاوا تھی اور جیکب رسل اس نوجوان خادمہ سے دھوکا کھا گیا جس نے اس کا دل جیت لیا تھا۔

☆☆☆

کیری سے سچ اگلوانا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ ڈیوڈ رسل کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی اور اس کی مدد کرنے پر تیار ہوگئی لیکن وہ اس کی اسکیم سے خوف زدہ اور غیر مطمئن تھی اور بوڑھے جیکب کی موت کے حوالے سے اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ تاہم شادی کے وعدوں اور سہانے مستقبل کے جھانسے میں آکر اس نے اپنے محبوب کی ہدایات پر عمل کیا اور جیکب کا فون حاصل کرلیا جو اس نے لابی کے پودوں میں چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ جیکب کا آخری پیغام بھیج سکے اور جب جیکب کی لاش ملنے کے بعد ہنگامہ ہوا تو اس نے موقع دیکھ کر فون اس کی میز پر رکھ دیا اور جب میری کمرے سے باہر گئی تو اس نے دروازے پر سے گن پاؤڈر کی تلچھٹ بھی صاف کردی۔

اپنے بیان پر دستخط کرنے کے بعد کیری زار و قطار رونے لگی۔ ڈیوڈ رسل اپنی ساتھی کے مقابلے میں زیادہ سخت جان ثابت ہوا۔ اس نے مہروں پر اپنی انگلیوں کے نشانات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے باپ سے بحث کرتے ہوئے میز سے ٹکرا گیا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ یہ وضاحت اسے کیسے بچا سکتی ہے اگر جیکب زندہ ہوتا تو وہ بادشاہ اور ملکہ کو ان کی اصلی جگہ پر رکھ دیتا جو اس کے بیٹے نے غلط خانوں میں رکھ دیے تھے لیکن وہ دروازے میں نصب ڈیوائس کی کوئی وضاحت نہ کر سکا جو دروازہ نکالنے کے بعد ظاہر ہوئی تھی۔ دروازے کے اندر ایک جدید فائرنگ میکانزم تھا جو اعشاریہ بائیس کے پستول کو کھول کر نکالا گیا تھا۔ اس کا اسپرنگ اور ہتھوڑا الگ کر دیا تھا تاکہ فائرنگ پن کا سرا سامنے آجائے اور اس کی جگہ ایک کارتوس لگا دیا گیا۔

ڈیوڈ کو اس ڈیوائس کی تیاری کے لیے مناسب وقت مل گیا جب وہ اپنے باپ کے سوئٹ کے لیے دروازہ بنا رہا تھا۔ ہینڈل لگانے سے پہلے اس نے ڈور بولٹ ری ٹریکٹر کے پیچھے ایک چھوٹا کھوکھلا خانہ بنایا۔ اس کے بعد اس نے نیچے کی جانب ڈرل سے ایک سوراخ کیا اور اس میں وہ میکانزم لگا دیا پھر اس نے دروازے کے اندر ایک اور سوراخ کیا تاکہ دھماکے کو جذب کر سکے۔ قتل والے روز اسے ہینڈل کھولنے اور بولٹ ری ٹریکٹر کے پیچھے کھوکھلی جگہ میں ایک انچ کی بال بیرنگ ڈالنے میں صرف دو منٹ لگے جیسے ہی میری نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو ری ٹریکٹر کی ضرب سے بال بیرنگ ڈھیلی ہوگئی۔ وہ سوراخ سے نکل کر گری اور اس نے فائرنگ پن کو چلا دیا۔

ایئی نے سوچا کہ یہ منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنایا گیا تھا اور اگر ڈیوڈ رسل یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرتا کہ اس کا باپ اس وقت بھی زندہ تھا جب وہ کائی پنے اسٹار یک گیا تو شاید وہ کامیاب ہو جاتا۔ اب بھی شاید وہ اسے نظر انداز کر دیتی اگر اس نے بادشاہ اور ملکہ کے مہروں کو اپنی جگہ کے بجائے دوسرے خانوں میں نہ دیکھا ہوتا۔ ایئی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈیوڈ رسل کو زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی جب اس کے باپ نے اسے شطرنج سکھانے کی کوشش کی تاکہ وہ جان جاتا کہ مہروں کو خانوں میں کس ترتیب سے رکھا جاتا ہے۔

❖❖❖

محبت کی طاقت

سیرینا راضی

ہر جذبہ ایک طاقت رکھتا ہے... وقت آنے سے پہلے ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا... ازدواجی زندگی میں الجھنوں کا شکار رہنے والے میاں بیوی کی کہانی... بیوی پریشان تھی کہ شوہر اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے اور شوہر روپوش ہو کے بیوی کے مفادات کا سوچ رہا تھا... میاں بیوی کے تعلقات کا ایک انوکھا رنگ...

محبت کی طاقت پر یقین رکھنے والے شخص کے تجربات و سانحات

میں اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا دو چھوٹے بکسوں کو گھور رہا تھا جن میں میرے والدین کی راکھ تھی۔ ان کے انتقال کو تین برس ہو چکے تھے۔ وہ دونوں ہی عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ ان کی راکھ سین جرمن کے باہر دریا میں بہا دوں گا جہاں وہ پیورٹو ریکو کے جزیرے میں پیدا ہوئے تھے لیکن کسی نہ کسی بہانے یہ معاملہ ٹلتا رہا۔ کبھی کام کی زیادتی تو کبھی یہ فکر کہ اس موقع پر تمام رشتے داروں کو جزیرے پر بلانا ہوگا۔

میں اپنے آپ کو تصور وار اور بے وقعت محسوس کرنے لگا جس نے مجھے غیر متحرک بنا دیا۔ میں گھنٹوں بیٹھا میز پر سے گرد جھاڑتا رہتا۔ اسی لیے جب میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے فون نہیں اٹھایا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ فون میری کزن ملڈرڈ نے کیا تھا۔ دو گھنٹیوں کے بعد میں نے فون اٹھا لیا۔

''اے، کیا تم باتھ روم میں تھے؟'' اس نے کہا۔ ''اتنی دیر کیوں لگی؟''

''کیا ہو رہا ہے؟''

''میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔ مجھے تمہارے لیے ایک کلائنٹ مل گیا ہے۔ وہ مالدار عورت ہے۔''

میں ویلنٹ سیکیورٹی انٹرنیشنل میں لائسنس یافتہ پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کرتا تھا اور اپنی تمام تحقیقات کمپنی کے دفتر بیٹھ کر میں کمپیوٹر پر کیا کرتا۔ یہ اکیسویں صدی میں معلومات حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے آدمیوں کو فیلڈ میں بھیجا جائے اور وہ سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھریں لیکن اس کے علاوہ میں بعض اوقات اپنے کام سے ہٹ کر پرائیویٹ کیس بھی کرتا تھا جو ہمیشہ ملڈرڈ کے ذریعے ملتے۔ یہ میں پیسے کمانے کے لیے نہیں کرتا تھا کیونکہ ضروریات بہت محدود تھیں اور ایجنسی سے ملنے والی تنخواہ میں میرا گزارہ بہت اچھی طرح ہو رہا تھا لیکن کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر کام کرنا میرے لیے کئی لحاظ سے نقصان دہ تھا۔ صحت کے مسائل کے علاوہ میں ہر روز کی ٹک ٹک سے بھی بور ہو جاتا تھا اور میرے دل میں شدت سے یہ خواہش سر اٹھانے لگتی کہ میں دفتر سے باہر نکل کر کوئی کام کروں۔ اس کے باوجود میں یہ کیس لینے میں ہچکچاتا تھا کیونکہ تکنیکی اعتبار سے یہ قانونی نہیں تھا۔ میں پرائیویٹ سراغ رساں نہیں بلکہ کمپیوٹر پر کام کرنے والا ٹیکنیشن تھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے اپنی کزن کو ٹالنے کے لیے کہا۔ ''میں مصروف ہوں۔''

وہ میرا ذہن پڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ اس وقت تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ بہت زیادہ پیچیدہ نہ ہو۔''

''ہر کیس پیچیدہ ہوتا ہے اور یہی تمہاری صلاحیتوں کا امتحان ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ بولی۔ ''وہ تم سے فوراً ملنا چاہتی ہے۔ درحقیقت وہ اپنے دفتر میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

''ہفتے کے روز؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

''کامیلا سانتیاگو...... کونسل کی خاتون رکن۔''

☆☆☆

میں نے لباس تبدیل کیا۔ کنٹیکٹ لینس لگائے اور کوٹ پہننے سے پہلے اس عورت کے بارے میں انٹرنیٹ پر تھوڑی سی ریسرچ کی۔ وہ اپنے آبائی ضلع بروکلین میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔ وہ اب بھی وہیں رہ رہی تھی۔ وہ مسلسل چار مرتبہ کونسل کی رکن منتخب ہو چکی تھی۔ اس نے مرحومین کے نام پر سڑکوں کے نام رکھنے میں مدد کی۔ اس کے علاوہ اس نے بلند و بالا عمارت کی تعمیر کے خلاف بھی احتجاج کیا جس کی وجہ سے دو بلاک کے رہائشیوں کو بے دخل ہونا پڑ رہا تھا پھر اس کا ذہن تبدیل ہو گیا اور عمارت کی تعمیر شروع ہو گئی۔ اس حوالے سے اس نے کئی تقریریں کیں جن میں سے زیادہ تر کیئر فری ببلز لانڈری کے سامنے کیں۔ میں نے اس بارے میں ریسرچ کی تو معلوم ہوا کہ کیئر فری ببلز، اس کے شوہر کی ملکیت تھی۔

سانتیاگو کا دفتر بھی اسی لانڈری کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔ ایک نوجوان عورت استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا بیٹا پیزا کی ضد کر رہا تھا۔

''میں بولوگیو ویگا ہوں اور مس سانتیاگو سے ملنے آیا ہوں۔''

''بالآخر تم آ ہی گئے۔'' اس نے کہا پھر انٹرکام پر کسی سے بات کی اور میری طرف دیکھے بغیر اندر جانے کا اشارہ کر دیا پھر اپنے بیٹے سے بولی۔ ''اب ہم تمہارے لیے پیزا منگوا سکتے ہیں۔''

میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں سے ایک چھوٹے قد کا آدمی چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس باہر آ رہا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا اور چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اس نے بہت تیز خوشبو لگا رکھی تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو سانتیاگو نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ویگا! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے سفید کوٹ، سفید بلاؤز اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کافی بڑے لگتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ماں نے خوب کھلایا پلایا ہے۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم ملڈرڈ کو کیسے جانتی ہو؟''

''اس نے رضاکارانہ طور پر میرے ساتھ کچھ پروگرام کیے ہیں۔ بہت ہی ذہین عورت ہے۔ اس نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم اس کیس کے بارے میں سوچ رہے ہوگے اور یہ اتنا اہم کیوں ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ میرا شوہر اشائیل لاپتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اسے تلاش کرو۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔''

''تم مجھے اپنا ای میل ایڈریس دو۔ میرے پاس اس کے بارے میں جو بھی معلومات ہیں، ایک تازہ ترین تصویر، اس کے دوستوں کی فہرست اور کریڈٹ کارڈ نمبروں کے ساتھ ای میل کردوں گی گو کہ یہ اتنی زیادہ نہیں ہیں۔ وہ اپنی بہت سی باتیں مجھ سے خفیہ رکھتا ہے لیکن ملڈرڈ کا کہنا ہے کہ تمہارے پاس بہت ذرائع ہیں۔''

میں نے سانتیاگو کو اپنا ای میل ایڈریس دیا اور وہ میل کرنے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو میں نے اس سے عام نوعیت کے کچھ سوالات کرنا شروع کیے۔ ''تمہارا شوہر کب سے لاپتا ہے؟''

''گزشتہ روز سے۔''

''کیا یہ کوئی غیر معمولی بات ہے؟''

''ہاں، غیر معمولی اس لیے کہ وہ ہمارے مشترکہ سیونگ اکاؤنٹ سے ساری رقم نکال کر لے گیا ہے لہٰذا مجھے دوسرے اثاثے منجمد کرنا پڑے جن میں ہم دونوں کا حصہ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی بھوت میری گردن سے خون نچوڑے۔''

''کیا اس کے پاس فرار کی کوئی معقول وجہ ہے؟ کیا تم دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے؟''

''ہمارے درمیان معمولی لڑائیاں ہوتی تھیں لیکن ہم پینتیس سال سے ساتھ رہ رہے ہیں اور کبھی کوئی سنجیدہ نوعیت کا جھگڑا نہیں ہوا۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہوا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس کا شناختی کارڈ یا اے ٹی ایم کارڈ چھین کر اسے وہ رقم نکالنے پر مجبور کردیا ہو؟''

''ہو سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جینا کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔''

''یہ کون ہے؟''

''وہ اس کی لانڈری کا انتظام سنبھالتی ہے۔ اس کے بارے میں معلومات میں نے ای میل میں لکھ دی ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ وہ کچھ کرنے والے ہیں۔ شاید انہوں نے اٹلانٹک سٹی جانے کا فیصلہ کیا ہوتا کہ وہاں رنگ رلیاں منا سکیں۔''

''کیا تم نے پولیس کو اطلاع دی؟''

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس معاملے کی تشہیر نہیں چاہتی۔ تمہاری خدمات اسی لیے حاصل کررہی ہوں کہ نمبر ایک ملڈرڈ نے تمہارا نام تجویز کیا ہے۔ نمبر دو یہ کہ تم بہت مشہور اور کامیاب سراغ رساں نہیں ہو۔ اس لیے میں بہ آسانی تمہیں معاوضہ دے سکتی ہوں اور نمبر تین یہ کہ تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو۔ اس لیے محتاط رہ کر کام کروگے۔''

''میں نقد معاوضہ لیتا ہوں۔''

سانتیاگو نے میز کی دراز میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ''اس میں ایک ہزار ڈالر ہیں، تم اسے زیادہ سے زیادہ جمعے تک تلاش کرلو کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ اس کی عمر ستر سال سے زیادہ ہے اور اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ خدا نہ کرے کہ اس آوارہ گردی کے دوران اسے کچھ ہوجائے۔ دوسری بات یہ کہ وہ بہت ضدی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور چلا جائے اور تیسرے یہ کہ وسط مدتی انتخابات میں صرف ایک مہینا رہ گیا ہے اور اس کا یہاں موجود ہونا ضروری ہے ورنہ لوگ اس کے بارے میں سوالات کریں گے۔ اگر تم نے جمعے سے پہلے اسے تلاش کر لیا تو میں مزید ایک ہزار ڈالر دوں گی۔''

''اگر میں اس وقت تک اسے تلاش نہ کرسکا تو؟''

''پھر مجھے پولیس کو اطلاع دینا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اسے تلاش کرلوگے۔''

میں کہنے والا تھا کہ اس نے جو معلومات مجھے دی ہیں، ان کے ذریعے میں شاید ایک گھنٹے میں اسے تلاش کر لوں لیکن میں نے سوچا کہ وہ محسوس کرے کہ میں اس کے لیے دوڑ دھوپ کررہا ہوں۔

سانتیاگو بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم اس کام کا آغاز میری بیٹی سے کرو۔ دونوں باپ بیٹی میں گہری دوستی ہے۔ وہ اپنے دفتر میں تمہارا انتظار کررہی ہوگی۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم اس سے ملنے آؤ گے۔ اس کا پتا بھی ای میل میں موجود ہے۔''

میں نے ایک کار کرائے پر لی اور اس جگہ روانہ ہوگیا جہاں اس کی بیٹی کام کرتی تھی۔ میں نے سامنے والی کھڑکی

سے دیکھا لیکن کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ کوئی گیلری، کتابوں کی دکان، کمیونٹی سینٹر، یوگا اسٹوڈیو یا ہیئر سیلون کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تو اندر جا کر ہی معلوم ہوتا کہ وہاں کیا کام ہو رہا تھا۔ ایک نوعمر لڑکی دروازے کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا اُس نے مسکرا کر خوش آمدید کہنے کے انداز میں مجھے دیکھا اور ایک کلپ بورڈ مجھے پکڑا دیا جس پر ایک کاغذ لگا ہوا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا۔''

وہ اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم پہلے کبھی یہاں آئے ہو؟''

''نہیں۔''

''یہ ایک ریسورس سینٹر ہے اور ہم گزشتہ دس سال سے لوگوں کو پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہمیں مالی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ کیا تم عطیہ دینا چاہو گے؟''

میں تھوڑا سا ہچکچایا تو وہ بولی۔ ''ہماری لیز خطرے میں ہے۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے اسے دس ڈالر دے دیے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں گھمائیں۔ میں نے اس سے راکیل کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک جانب اشارہ کر دیا۔ وہ عقبی حصے میں ایک میز پر جھکی ہوئی تھی۔

دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں میں تھوڑی سی مشابہت تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ بھی ایک جیسا نہیں تھا۔ خاص طور پر دونوں کا اسٹائل بالکل مختلف تھا۔ راکیل نے اپنے بال پیچھے کی طرف باندھ رکھے تھے اور اوورآل پہن رکھا تھا جس پر رنگ، مٹی اور سیاہی کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

میں نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی اور میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''تو مما نے ایک شکاری کتا حاصل کر لیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے ڈیوڈ کو یہ کام کرنے کے لیے کیوں نہیں کہا لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس میں یہ صلاحیت نہیں۔''

''ڈیوڈ؟''

''ایک دقیانوسی مرد جو ہر وقت سیاہ چشمہ لگائے رہتا ہے۔''

''اس کی چھوٹی سی داڑھی بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''چمڑے کی جیکٹ پہنتا ہے؟''

''وہ کئی معاملات میں مما کا دایاں بازو ہے۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ ڈیڈی کہاں گئے ہیں۔''

''یعنی تم جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟''

''میں بھی نہیں جانتی، تم اپنا کام کرو۔''

میں گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ ''تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ اشمائیل......''

''اش۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''سب لوگ اسے اش کہہ کر بلاتے ہیں۔''

''اش کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری ماں اس بارے میں فکر مند ہے۔''

''وہ بیل کی طرح صحت مند ہے۔ میری ماں کو صرف اپنی انتخابی مہم کی فکر ہے اور ہونی بھی چاہیے۔''

''کیا تمہارے والدین کی آپس میں بنتی ہے؟''

''کبھی نہیں، میں نے ہمیشہ اپنے گھر میں دوسری جنگ عظیم، ویت نام اور افغانستان جیسی جنگیں ہوتی دیکھیں، والدین ایسے ہوتے ہیں؟''

''شاید۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیوں چلا گیا؟''

''ہاں، میرے کچھ اندازے ہیں۔ شاید وہ اپنی فرنچائز کو بڑھانے کے لیے کسی دوسری جگہ کی تلاش میں ہے لیکن وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔''

میں اپنی کوشش ترک کرنے والا تھا۔ مجھے اب تک کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی تھی اور میں کمپیوٹر سے مدد لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں صرف تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

راکیل نے کام چھوڑ دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''معاف کرنا، تمہیں ایک کام ملا ہے۔ ٹھیک ہے تمہیں بھی روٹی کھانی ہے۔ یہی میرے والد بھی کہتے ہیں لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ اگر تم میرے باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا اس کی کوئی وجہ ہے۔ اگر وہ نہیں چاہتا کہ میری ماں کو پتا چلے' وہ کہاں ہے تو تمہیں بھی اس کے جذبات کا احترام کرنا ہوگا۔''

میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ میں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔''

''اگر تم کسی اور سے بات کرنا چاہو تو وہ جینا ٹورس ہے لیکن اسے معلوم نہ ہو کہ میں نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا ہے۔''

''تمہارے باپ کی لانڈری کی منیجر۔ تمہاری ماں کا خیال ہے کہ تمہارے باپ کے ساتھ اس کا تعلق کوئی اور رنگ اختیار کر رہا ہے۔''

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

میں گھر جانا چاہ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ لباس تبدیل کر کے دوبارہ گرد جھاڑنے بیٹھ جاؤں۔ مجھے صرف یہی کام نہیں کرنا تھا بلکہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر کچھ چیزیں تلاش کرنی تھیں لیکن میں نے سوچا کہ بہتر ہوگا اگر جلد از جلد جینا ٹورس سے بات کرلوں۔

میں نے ریسورس سینٹر سے باہر آ کر اپنے لیے ایک کار منگوائی۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا کہ میری نظر جامنی رنگ کی ایک اسپورٹس کار پر گئی جس کی کھڑکیوں کے شیشے سیاہ تھے۔ اس علاقے میں اس طرح کی کاروں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن جس انداز میں اسے کھڑا کیا گیا تھا' اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے تو اس علاقے میں ایسی عجیب باتیں ہوتی رہتی تھیں اس لیے میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔

جب میں اُترنے والا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہی جامنی رنگ کی اسپورٹس کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پیچھے آ رہی تھی۔ مجھے ایک موڑ کاٹنے کے بعد اترنا تھا لیکن اس کے بجائے میں نے دروازہ کھولا اور کار سے اُتر گیا۔

میں نے ایک ورکر سے جینا کے بارے میں پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے دفتر میں ہوگی کیونکہ وہ وہاں کی منیجر تھی لیکن اس ورکر نے ایک موٹی عورت کی طرف اشارہ کیا جو تولیوں کے ڈھیر کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس گیا۔ اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں کیوں آیا ہوں۔

اس نے کہا۔"میں مسٹر سانتیاگو کی نگراں نہیں ہوں۔ اس لیے کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"اس کی بیوی کا خیال ہے کہ تم دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔"

"اس عورت کو فضول بولنے کی عادت ہے۔ اش میرے لیے باپ کی طرح ہے اور میں نہیں جانتی کہ اگر اس کے ساتھ کچھ برا ہوا تو میں کیا کروں گی؟"

"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں اسے کہاں تلاش کر سکتا ہوں؟"

"نہیں۔" اس نے کہا۔"میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔ ویسے بھی دو آدمی بیماری کی وجہ سے نہیں آئے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے میز پر اپنا کارڈ رکھتے ہوئے کہا۔"اگر کچھ معلوم ہو جائے تو مجھے بتانا۔"

جب میں لانڈری سے باہر نکلا تو جامنی کار کہیں نظر

نہیں آئی۔ گھر پہنچ کر میں عقبی دروازے سے چھت پر پہنچا اور باہر نظر دوڑائی تو مجھے وہ اسپورٹس کار بلاک کے آخری سرے پر نظر آئی۔ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آ کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ ایک بیئر کا ٹن کھولا اور کومیلا کی دی ہوئی معلومات کو بنیاد بنا کر سرچنگ شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''آج کا دن کیسا رہا؟'' ملڈرڈ نے پوچھا۔

''بہت عجیب۔'' میں نے کہا۔ ''یہ عورت چاہتی ہے کہ میں اس کے شوہر کو تلاش کروں اور اس طرح ظاہر کر رہی ہے جیسے وہ اس کی صحت کے بارے میں فکرمند ہے لیکن وہ پریشان دکھائی نہیں دیتی۔ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ میں اسے تلاش کروں۔''

''یعنی تمہیں اس کے شوہر کو واپس لانا ہوگا؟''

''اس نے یہ نہیں کہا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ اس کا محل وقوع جاننا چاہتی ہے۔ باقی کام وہ خود کرے گی۔''

''تم اسے کس طرح تلاش کرو گے؟''

''اس نے مجھے کام شروع کرنے کے لیے بہت سی معلومات دی ہیں۔ میں انہیں ہی بنیاد بنا کر آگے بڑھ رہا ہوں اور ابھی ابھی اس کے کریڈٹ کارڈ اکاؤنٹ تک پہنچا ہوں۔''

''تم تو بہت تیز جا رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم یہ کام کر لو گے۔''

میں نے اشمائیل کی حالیہ خریداری کی تفصیل دیکھی۔ ''ہیلو، تمہیں اس پر یقین نہیں آئے گا۔''

''میں تمہاری ہر بات پر یقین کرتی ہوں۔''

''اشمائیل اس وقت پیورٹوریکو میں ہے۔ اس نے گزشتہ ہفتے وہاں کا ٹکٹ خریدا اور گزشتہ شب سان جون کے ہوٹل میلا تو میں پہنچا۔''

''واؤ، تم نے تو اپنا کام کر لیا۔ دیکھا یہ کتنا آسان تھا۔ اب تم مجھے ڈنر کی دعوت دے سکتے ہو۔''

''مجھے منظور ہے لیکن میں فی الحال اس کا جشن نہیں منا سکتا اور نہ ہی کومیلا کو بتا سکتا ہوں کہ اس کا شوہر کہاں ہے۔''

''کیا؟ اس نے تم سے یہی تو کہا تھا۔''

''اشمائیل کی بیٹی اور لانڈری کی منیجر سے بات کرنے کے بعد جو معلومات حاصل ہوئیں، میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ شاید اس کے پاس چھپنے کی کوئی معقول وجہ ہو گی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اب کیا کیا جائے۔''

''ظاہر ہے کہ اب تمہیں خود وہاں جانا ہو گا تاکہ حقیقت کا علم ہو سکے۔''

''نہیں، میں وہ سراغ رساں نہیں جسے سفر کرنے کا شوق ہو۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ کرتے ہو۔ تمہیں وہاں جا کر اس سے بات کرنی چاہیے۔ اسی طرح تمہیں اصل بات معلوم ہو سکے گی۔''

''لیکن مجھے سوموار کو کام پر جانا ہے۔''

''میری بات سنو، تم اس بہانے اپنے والدین کی راکھ بھی ساتھ لے جا سکتے ہو تاکہ اسے دریا میں بہا سکو۔ یوں سمجھ لو کہ تمہیں سیدھے راستے پر چلنے کا ایک موقع مل رہا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ملی کالج میں ہے اور نیل اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ خود اپنا خیال رکھ سکے۔ اس بہانے میں بھی کام سے چھٹی کر لوں گی۔ اس کے علاوہ اس موقع پر تمہارے رشتے دار بھی آئیں گے اور میں جانتی ہوں کہ تم انہیں ہینڈل نہیں کر سکتے۔''

''واقعی میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے کومیلا بول رہی تھی۔ ''میرا شوہر کہاں ہے؟''

''مجھے کام شروع کیے ابھی صرف دو دن ہوئے ہیں۔''

''دو نہیں، ڈھائی۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''میرا خیال تھا کہ تم اپنے کام میں ماہر ہو۔ اسی لیے مجھے تمہاری کامیابی کا یقین تھا۔''

''میری بات سنو۔'' میں نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اش کا پتا معلوم ہو جائے تو میں خود اس سے جا کر بات کروں تاکہ یقین ہو جائے کہ وہ خیریت سے ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ یہاں سے کیوں گیا۔''

''میں نے اس لیے تمہاری خدمات حاصل نہیں کی تھیں۔''

''مجھے افسوس ہے۔ میرے پاس یہی ایک راستہ ہے۔''

''تم صرف اسے تلاش کرو۔ تمہیں یہی کام کرنا ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں اور یہ جاننا میرا حق ہے کہ وہ کہاں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

اس روز جب میں دیر سے گھر پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور سب لائٹس جل رہی تھیں۔ میں نے جیسے ہی اندر قدم

رکھا کسی نے لائٹس بند کر دیں اور گھر میں تاریکی چھا گئی۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میں نے اپنے آپ کو فرش پر گرا دیا۔ گولی میرے اوپر سے گزرتی ہوئی دروازے کا شیشہ توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے زمین پر رینگنا شروع کیا۔ تبھی کسی نے میرے اوپر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا لیکن اس نے میرے جسم کے نازک حصے پر زوردار ضرب لگائی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

جب میں فرش سے اٹھنے کے قابل ہوا تو میں نے لائٹس جلائیں اور دیکھا کہ اپارٹمنٹ بہت ابتر حالت میں ہے۔ وہ یقیناً ڈیوڈ ہی ہوگا۔ مجھے اب بھی اس کے کولون کی خوشبو آ رہی تھی لیکن اسے کوئی کام کی چیز نہیں مل سکی۔ میں ہر روز اپنا لیپ ٹاپ ساتھ لے کر جاتا تھا۔

میں نے ایک بیئر کا ٹن کھولا اور ملڈرڈ کا نمبر ملایا اور اسے مختصراً یہ واقعہ بتانے کے بعد کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آسکتا کہ ''ہاں'' کہنے والا ہوں۔''

اسی رات جینا ٹورس نے مجھے فون کیا۔ ''وہ بدمعاش ڈیوڈ یہاں آیا تھا۔''

''تم ٹھیک تو ہو؟''

''اوہ ہاں، اس نے مجھے ایک لانڈری کارٹ میں دھکیل دیا تھا۔ اس لیے میں فوراً نہ اٹھ سکی ورنہ اس پر ضرور حملہ کرتی لیکن اس نے میرا فون چیک کر لیا۔ وہ جانتا ہے کہ اش پیورٹوریکو گیا ہے۔''

''میں کل صبح کی پرواز سے وہاں جا رہا ہوں اور اس سے پہلے وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔''

''اوہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن سنو...... اش وہاں نہیں ہے جہاں یہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''پھر وہ کہاں ہو سکتا ہے؟''

''سان جون کے ہوٹل میلانو میں، لیکن سنو...... ڈیوڈ نے صرف وہ ای میل دیکھی جو اش نے مجھے بھیجی تھی۔ اش نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ ہوٹل میلانو جائے گا لیکن وہاں ٹھہرے گا نہیں۔''

''پھر وہ کہاں ہے؟''

جینا نے مجھے ایک چھوٹے قصبے کا پتا دیا جس کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔

''تمہیں یہ اطمینان کرنا ہے کہ وہ خیریت سے ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس کی بیوی کی مت سنو۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت اچھا آدمی ہے، اس نے میری بہت مدد کی اور میری زندگی بدل دی۔ تم ڈیوڈ سے پہلے اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔''

میں عمارت کی عقبی گلی سے باہر نکلا لیکن ائرپورٹ جاتے ہوئے مجھے کوئی نارنجی رنگ کی اسپورٹس کار نظر نہیں آئی۔ ملڈرڈ بھی میرے ساتھ تھی۔ جہاز میں اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے میں نے والدین کی راکھ کے باکس اپنے زانو پر رکھ لیے۔ ائرہوسٹس نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں اپنے سامنے والی سیٹ کے نیچے رکھ دوں۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا لیکن جب وہ دور چلی گئی تو میں نے دوبارہ انہیں اپنے کوٹ کے نیچے زانو پر رکھ لیا۔

ہم سان جون کے ہوائی اڈے پر اترے۔ ملڈرڈ نے ایک اکانومی کار کرائے پر لی کیونکہ وہ اسی جزیرے میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ اس لیے یہاں کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ لہٰذا اس نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ میرے فون میں جینا کا بتایا ہوا پتا تھا۔ ہم اسی سمت میں ہائی وے کی جانب بڑھنے لگے۔

میں نے بیک ویو مرر چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور جو کچھ مجھے نظر آیا، اس کی روشنی میں مجھے راستہ تبدیل کرنے کی سوجھی۔

''کیا تم یہاں سے بائیں جانب مڑ سکتی ہو؟''

''کیا ہوا؟''

''میں کچھ چیک کرنا چاہ رہا ہوں۔''

میں نے ایک بار پھر بائیں جانب مڑنے کے لیے کہا اور شیشے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔''

''واقعی۔'' اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ''یہ تو بہت سنسنی خیز ہے۔''

''پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں کوئی سنسنی خیزی نہیں بلکہ پریشان کن اور تھوڑا سا خطرناک ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے اسے دیکھ لیا ہے۔''

''یہ وہی شخص ڈیوڈ ہے جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا؟''

''ہاں وہی ہو سکتا ہے۔'' ہمارے پیچھے ایک سرخ اسپورٹس کار تھی جس کی کھڑکیوں کے شیشے سیاہ تھے۔ ''وہ یقیناً ہوٹل میلانو گیا ہوگا اور وہاں سے خالی ہاتھ واپس آیا۔ شاید وہ ائرپورٹ سے ہی ہماری نگرانی کر رہا ہو۔''

''کیا وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟''

''نہیں، وہ صرف ہمارا پیچھا کر کے اش تک پہنچنا چاہتا ہے پھر وہ اسے نقصان پہنچائے گا۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''ہمیں اگلے سگنل پر پہنچ کر فاصلہ بڑھانا ہوگا۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اگلے سگنل پر دوسری کاروں کو مڑنے کا راستہ دینے کے بجائے رفتار بڑھاؤ اور ان کے آگے بڑھنے سے پہلے اپنی گاڑی موڑ لو۔ اس طرح وہ ٹریفک میں پھنس کر رہ جائے گا۔''

''کیا تم یہ پہلے بھی کر چکے ہو؟''

''کئی بار۔'' میں نے کہا۔ ''ویڈیو گیم میں۔''

جیسے ہی سگنل کھلا ملڈرڈ نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا اور دوسری کاروں سے آگے نکلنے کی کوشش کی تاکہ پیچھے آنے والی اسپورٹس کار سے فاصلہ بڑھ جائے لیکن ہمارے دائیں بائیں دوسری کاروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کسی نے ہارن نہیں دیا اور نہ ہی بریک لگائے، وہ سب سگنل بند ہونے سے پہلے آگے نکلنا چاہ رہے تھے جیسے یہ ان کے لیے لازمی تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''اوہ میرے خدا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کیا تھا؟''

''تم بھول گئے کہ یہاں لوگ کتنی رف ڈرائیونگ کرتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا اس کا کوئی فائدہ ہوا؟''

میں نے بیک مرر میں دیکھا کہ ڈیوڈ کی کار اب بھی ہمارے پیچھے تھی تاہم اس نے مناسب فاصلہ رکھا ہوا تھا۔

''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہم نہیں چاہتے کہ وہ اس تک پہنچ جائے اگر اس نے اسے ڈھونڈ لیا تو وہ اسے قتل کردے گا۔''

میرے ذہن میں کئی آئیڈیاز آئے لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے ذریعے ڈیوڈ کو ہمارا پیچھا کرنے سے روکا جاسکے پھر میں نے غور کیا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں اور تبھی میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے ملڈرڈ سے کہا کہ وہ اگلے موڑ پر مغرب کی جانب چلتی رہے۔

''لیکن وہ غلط سمت ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں سین جرمن جانا ہے۔''

''کیوں؟''

''کیا تم فون پر کسی کزن سے بات کرسکتی ہو؟ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں۔ میں اس وقت گاڑی چلا رہی ہوں۔''

''ہم ان سے اسپیکر فون پر بات کرسکتے ہیں۔''

''کوئی بھی اسپیکر فون پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے بھی اس سے نفرت ہے، تم خود کیوں نہیں فون کرلیتے؟''

میں نے ایک بچے کی طرح منہ بنایا اور اپنی فون لسٹ دیکھنے لگا۔ سین جرمن میں رہنے والے میرے کزن کیڈن نے دوسری گھنٹی پر فون اٹھایا۔ جہاں تک مجھے یاد تھا کہ سان جرمن کو جانے والی سڑکیں بہت تنگ تھیں۔

''کافی عرصہ ہوا تم سے بات نہیں ہوئی۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ''تمہارے والدین کا سن کر افسوس ہوا۔''

واقعی اس سے بات کیے کافی عرصہ ہوگیا تھا اور مجھے بہت عجیب لگا کہ میں اپنے مطلب کے لیے اسے فون کر رہا تھا لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''تم سمجھ گئے۔'' اس نے راستہ بتانے کے بعد کہا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

ان پہاڑی بل کھاتی سڑکوں پر ہمیشہ درمیان میں گاڑی چلانا ہوتی ہے اور اگلا موڑ آنے سے پہلے ہارن دینا پڑتا ہے تاکہ سامنے سے آنے والے ڈرائیور ہوشیار ہو جائیں ورنہ حادثہ ہونے کی صورت میں گاڑی پہاڑ سے گر کر نیچے گھنے جنگل میں چلی جائے گی۔

وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ڈیوڈ کو ان سڑکوں پر ہمارا تعاقب کرنے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔

اچانک ہی ایک ٹریلر ہمارے سامنے آگیا۔ ملڈرڈ نے تین بار ہارن دیا۔ وہ ٹریلر ایک طرف ہوگیا اور ملڈرڈ نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔ اس کے نکلنے کے فوراً بعد ٹریلر کا ڈرائیور دوبارہ سڑک کے وسط میں آگیا اور اس نے پوری سڑک گھیر لی۔

''آدھ میل آگے جانے کے بعد ہمیں کزن کیڈن نے اشارہ کیا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ملڈرڈ نے کار ایک چھوٹے فارم ہاؤس کے گیٹ میں موڑ لی۔ ایک اور کزن کرسٹینا نے ہاتھ ہلا کر ہمیں مکان کے پیچھے جانے کے لیے کہا۔ اسی وقت ہمارے درجن بھر رشتے دار باہر آگئے اور سڑک پر سے ٹائروں کے نشانات مٹانے لگے۔ کیڈن نے گیٹ بند کردیا۔

ایک منٹ بعد ڈیوڈ تیزی سے کار چلاتا ہوا وہاں سے گزرا۔ میں نے ملڈرڈ سے کہا۔

''وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ ہم آگے نکل گئے۔''

''دیکھا تم نے؟ خاندان کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ کوئی میرے گلے لگ رہا تھا۔ کوئی مجھ سے تعزیت کر رہا تھا اور کوئی مجھے بیئر پکڑا رہا تھا۔

واقعی وہ میرے اپنے ہی تھے۔
موٹاپو، پیورٹو ریکو کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں سمندر کے ساتھ ایک طویل ساحل ہے۔
''وہ وہیں ملے گا۔'' ملڈرڈ نے کہا۔ ہم اپنے رشتے داروں کے ساتھ لنچ کرنے کے لیے رکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سب اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے جب ہم ہائی وے پر آئے تو ڈیوڈ کی کار کہیں نظر نہیں آئی۔
راستے میں ہم ایک ریستوران پر رکے اور اس کے بارے میں معلوم کیا، ایک عورت نے ہمیں ساحل پر جانے کے لیے کہا اور بولی۔ ''تمہیں اس کے لیے کسی نقشے کی ضرورت نہیں۔ وہاں صرف وہی ایک شخص پینٹنگ کرتا ہوا ملے گا۔''
ہم وہاں پہنچے تو سورج کی روشنی پانی کی سطح کو منور کر رہی تھی۔ واقعی ساحل پر صرف اس سانتیا گو ایزل سمیت موجود تھا۔ اس کا رخ سمندر کی جانب تھا اور وہ ورجن آئی لینڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''مسٹر سانتیا گو۔'' میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ اس نے ایک اوورآل پہن رکھا تھا جس پر مٹی اور رنگ کے دھبے لگے ہوئے تھے۔
''میں ہی سانتیا گو ہوں۔ تم کون ہو؟'' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔
''تمہاری بیوی نے تمہیں تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔''
ملڈرڈ کینوس کے قریب جا کر بولی۔ ''بہت شاندار ہے۔''
''یہ کون ہے؟'' سانتیا گو نے پوچھا۔
''میں اس کی کزن ملڈرڈ ہوں۔''
''تم بھی بہت شاندار ہو۔'' اس نے کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ تم مجھے مارنے کے لیے نہیں آئے ورنہ اپنی کزن کو ساتھ لے کر نہ آتے۔''
''تمہاری بیوی تمہیں تلاش کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔
''یہ میں جانتا ہوں۔''
''اس کا کہنا ہے کہ وہ تمہارے لیے فکر مند ہے۔''
''اس نے یہ کہا؟ کیا اس کے یہی الفاظ تھے؟''
''ہاں، اس نے کچھ اسی طرح کی بات کی تھی۔ تمہاری بیٹی اور جینا بھی پریشان ہیں۔''
''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

''تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری بیوی مجھے جان سے مارنا چاہتی ہے۔ مجھے سیڑھیوں سے دھکا دے سکتی ہے یا کوئی میری کار کو ٹکر مار سکتا ہے۔ وہ کسی ایسے طریقے سے میری جان لینا چاہتی ہے جو دیکھنے میں حادثہ لگے۔ مجھے ہارٹ اٹیک ہو جائے۔ میں کینسر یا کسی دوسری بیماری سے مر جاؤں۔''

ملڈرڈ نے کہا۔''وہ کس طرح کینسر کو حادثے کا رنگ دے سکتی ہے؟''

''تم اس عورت کو نہیں جانتیں۔''

میں نے کہا۔''لیکن تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ وہ تمہیں مارنا چاہتی ہے؟''

''الیکشن! اسے صرف اس کی فکر ہے۔ اس کے مقابلے پر بہت مضبوط امیدوار ہے۔ اس نے 2016ء میں ہیلری کی شکست پر کہا تھا کہ اگر بل کلنٹن الیکشن سے ایک مہینا پہلے مر جاتا تو ہیلری کو ہمدردی کے ووٹ مل جاتے اور وہ الیکشن جیت سکتی تھی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ میری لاش پر الیکشن جیتنا چاہتی ہے۔ لہٰذا میں اپنی جان بچانے کے لیے روپوش ہو گیا۔''

''سنو۔'' میں نے کہا۔''میں اسے نہیں بتاؤں گا کہ تم کہاں ہو۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ میں اسے سراہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔''اس کے باوجود میں اسے ایک فیور دینا چاہ رہا تھا۔ میں نے یہاں ڈوبنے کے بارے میں سوچا تھا۔ دیکھو کتنا خوب صورت سمندر ہے جیسے یہ مجھے بلا رہا ہو۔ میں نے سوچا کہ یہ اس کے لیے ایک بہترین الوداعی تحفہ ہوگا۔''

''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری بیٹی اسے پسند کرے گی۔''

''نہیں، اسی لیے میں ابھی تک خشکی پر ہوں۔''

''پھر اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''مجھے یہاں صرف ایک مہینا چھپنا ہوگا۔ اس کے بعد اسے میری پروا نہیں ہوگی۔ یہ جزیرہ چھپنے کے لیے بہترین ہے۔''

''تمہارے کاروبار کا کیا ہوگا؟''

''اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے آنے سے پہلے چینا کے ہاتھ اسے بیچ دیا تھا اور کچھ رقم اپنی بیٹی کو دے دی تھی تاکہ وہ نئے کمپیوٹر خرید سکے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اگلے ایک سال کے لیے اس سینٹر کا کرایہ دینے کے قابل ہو سکے۔''

ایک موج ساحل سے ٹکرائی اور میں سنجیدگی سے سمندر میں چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ واقعی ایک طویل گرم دن تھا۔

''بہر حال اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا وقت ہوا ہے؟''

میں نے اپنا فون دیکھ کر کہا۔''چھ بج کر پندرہ منٹ۔''

''تقریباً ایک گھنٹا پہلے میری بیوی کے مخالف امیدوار اور نیویارک ٹائمز کو ان دستاویزات کی نقول مل گئی ہیں جن میں میری بیوی کو ایکائی رائز رہائی رائز ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی طرف سے رقم کی ادائیگی کے ثبوت موجود ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کس طرح سے عمارت کی تعمیر میں قانونی رکاوٹ دور کی۔''

''گویا تم یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو جب تک یہ معاملہ ختم نہ ہو جائے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، میں مزید کچھ عرصہ یہاں رکوں گا پھر واپس جا کر مقدمے کے دوران اپنی بیوی کی مدد کروں گا۔''

''کیا؟'' میں نے کہا۔''لیکن وہ تو تمہیں مارنا چاہ رہی تھی؟''

''اسے غلط مت سمجھو۔ وہ اچھی عورت ہے۔ اس نے جائدادیں خریدنے میں میری مدد کی جو میں کبھی نہیں خرید سکتا تھا۔ اس کے عوض میں نے اس کی انتخابی مہم کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ اس طرح ہمارے درمیان ایک اچھی کاروباری شراکت قائم ہو گئی گو کہ ہماری ازدواجی زندگی کامیاب نہیں تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا۔ پہلے اسے الیکشن جیتنے کے لیے میری لاش کی ضرورت تھی لیکن اب وہ مشکل میں ہے۔ مجھے اپنی محبت کی طاقت پر یقین ہے اور میں مرتے دم تک اس کا ساتھ دوں گا۔''

میں اور ملڈرڈ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔ کیا کوئی صحیح الدماغ شخص اپنی بیوی کے بارے میں ایسا سوچ سکتا ہے جو اپنے سیاسی مفاد کی خاطر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس کا مطمئن چہرہ دیکھ کر ہمیں یقین آ گیا کہ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہے۔

میں ملڈرڈ کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ وہاں کیڈن سمیت میرے بھی رشتے دار موجود تھے۔ وہ میری پیٹھ تھپک کر مجھ سے اظہارِ تعزیت کر رہے تھے۔ میں نے کپکپاتی انگلیوں سے دونوں باکس کھولے اور والدین کی راکھ دریا میں بہا دی۔ اس بہانے یہ فرض بھی پورا ہو گیا تھا۔

❖❖❖

کائنات کی خوب صورتی ہر ایک کو متاثر کرتی ہے... لیکن ساتھ ساتھ ہی سرزمین دنیا کے کچھ حصے ایسے ہیں جو آج بھی انسانی آنکھ سے اوجھل ہیں... انسان کی فطری جستجو اسے مسلسل مجبور کرتی ہے کہ انہیں کھوجا جائے... ایسے ہی علاقوں کی تلاش کا سفر... وہاں بسنے والے خود کو دوسری دنیا کے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے تھے...

پُراسرار زمین پر بسنے والوں کی پُراسرار نقل و حرکت

وجه

اعتزاز سلیم وصلی

ہیلی کاپٹر مسلسل فضا میں چکرا رہا تھا اور اس میں موجود تین افراد میں سے ایک کی نظر نیچے سفر کر رہی تھی۔ کچھ دیر نیچے دیکھنے کے بعد اس نے اطلاع دی۔ ”جنگل دکھائی دے رہا ہے مگر کوئی شخص نہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے پائلٹ کو اشارہ کیا۔ پائلٹ کو اس کی ہدایت سمجھ آگئی۔ وہ ہیلی کاپٹر کو کافی نیچے لے آیا۔ اس بار جنگل کے درخت واضح دکھائی دے رہے تھے۔ لیڈر نظر آنے والے شخص نے ایک بار پھر دوربین ہاتھ میں پکڑ لی۔ اب کی بار اس نے پائلٹ کو بائیں جانب کا اشارہ کیا۔ اس طرف درختوں کی تعداد تھوڑی کم تھی۔ یہی وقت تھا جب اس کی آواز جوش سے بھر گئی۔

''وہ ہیں، ادھر ہی ہیں، یس۔'' اس کی نظروں نے ہاتھ میں نیزے جیسی کوئی شے پکڑے اور کسی جانور کی کھال سے جسم کو ڈھکے اس انسان کو دیکھ لیا تھا۔ ''دی لاسٹ ان کنٹیکلڈ پیپلز آف دا ورلڈ (دنیا سے کٹے ہوئے آخری لوگ)۔'' وہ بڑبڑایا۔

''ہم ان تک خوراک اور یہ ادویات کیسے پہنچائیں گے؟'' پائلٹ اور اس کے درمیان ... بیٹھے شخص نے پہلی بار زبان کھولی۔ اس کے جسم پر انڈین نیوی کی مخصوص وردی تھی۔ بحرِ ہند کے کنارے آباد اس جزیرے میں انسانی آبادی کا وجود کافی دنوں سے زیرِ بحث تھا۔ 2004ء کے آخر میں آنے والی سونامی نے جہاں مہذب دنیا کی آبادی کو شدید نقصان پہنچایا تھا وہیں یہ افواہ بھی تھی کہ اس جنگل میں موجود وہ لوگ جنہیں دنیا سے کٹے ہوئے آخری لوگ مانا جاتا ہے، وہ بھی ختم ہو چکے ہیں۔ اس افواہ کے بعد انڈین گورنمنٹ کے حکم سے انڈین نیوی انہیں ڈھونڈنے نکلی تھی۔ اس کام کے لیے انہوں نے بنگال کے اس کنارے پر سب سے زیادہ تحقیق کرنے والے جیالوجسٹ اِندر کمار کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اِندر کے اس جنگل میں موجود آبادی پر تحقیقی آرٹیکل کو درست مانا جاتا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی یہاں تین چار بار آچکا تھا۔ انڈین گورنمنٹ نے ممبئی یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو خاص طور پر انڈین نیوی کے ساتھ بھیجا تھا۔ کہنے کو تو یہ لوگ امدادی کارروائی کرنے کے لیے خوراک اور ادویات لائے تھے مگر سب جانتے تھے کہ جنگل میں موجود یہ انسان نہ تو ان ادویات کے استعمال سے واقف ہیں اور نہ ہی وہ ایسی خوراک کے عادی ہیں۔ یہ صرف اور صرف ایک مشن تھا، دنیا کے سامنے اس آبادی کو لانے کا جس کا نہ تو کوئی انسان کبھی مہذب دنیا میں آیا ہے اور نہ ہی مہذب دنیا کے کسی فرد نے ان کی سرزمین کو چھوا ہے۔

''یہ ہیلی کاپٹر مزید نیچے نہیں کرنے دیں گے گوتھم، بہتر ہے بیگ یہیں سے پھینک دو۔'' اندر نے بیگ کی زپ کھولی اور اس سے ایک کیمرا نکالا۔ یہ ویڈیو ریکارڈ کرنے والا جدید کیمرا تھا۔ گوتھم نے ایک نظر پائلٹ کی طرف دیکھا پھر بیگ اٹھانے لگا۔ یہی وقت تھا جب اِندر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''نیچے دیکھو۔'' اس نے دوربین گوتھم کو پکڑا کر کہا۔ گوتھم نے نیچے دیکھا۔ ایک چھوٹے سے قد کا انسان ہاتھ میں کوئی چیز پکڑے اشارہ کر رہا تھا۔

''اس کے ہاتھ میں کیا ہے اور اس کے اشارے کا مطلب؟''

''ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہے، میرا خیال ہے نیزے جیسا کچھ اور اشارے کا مطلب ہے دفع ہو جاؤ۔''

''اگر ہم نہ جائیں تو؟'' گوتھم نے پوچھا۔

''تو یہ شاید ہمیں کسی چیز سے نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے۔'' اس نے اندازہ لگایا۔ گوتھم نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ اس کے ساتھ ہی پائلٹ نے ہیلی کاپٹر اوپر لے جانا شروع کر دیا۔ مشن ناکام رہا تھا۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے اب وقت آ گیا ہے کہ کسی نہ کسی کو رسک لینا ہوگا۔ خطرہ مول لیے بنا نہ تو ہم کامیابی حاصل کر سکیں گے نہ ہی ان تک پہنچ سکیں گے۔ سینٹنیلیز کی حقیقت کیا ہے اور یہ جزیرہ اتنا پُراسرار کیوں ہے؟ کیوں وہ مہذب دنیا سے کٹ کر رہنا چاہتے ہیں، ان سوالات کا جواب مجھے ڈھونڈنا ہے، کسی بھی طرح۔'' مشن میں ناکامی کے بعد یہ تین ہفتے بعد کی بات تھی۔ اِندر کمار میڈیا کے سامنے بیٹھا اپنے عزائم بتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آرڈر تھا جو انڈین گورنمنٹ کی طرف سے تھا۔ اس نے آرڈر سب کو دکھایا۔ ''انڈین گورنمنٹ نے مجھے قانونی طور پر وہاں جانے کی اجازت دے دی ہے۔'' ایک ساتھ کئی فلیش چمک اٹھیں۔ ایک خاتون رپورٹر کی آواز سنائی دی۔

''1956ء میں یہ قانون بنایا گیا تھا کہ کوئی بھی شخص اس جزیرے کی خطرناک جگہ جہاں لوگوں کے مطابق سینٹنائل آباد ہیں، سے تین میل دور رہے گا۔ کیا آپ بھی اس قانون پر عمل کریں گے؟''

''نہیں، میں نے گورنمنٹ سے اسی چیز کی اجازت مانگی تھی جو کہ انہوں نے دے دی ہے۔''

''بعض لوگوں کے خیال میں وہاں جانے سے آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہوگا؟'' ایک اور رپورٹر نے سوال بلند کیا۔

''بالکل ہوگا مگر میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ میرے ساتھی ڈاکٹر دشوا بھی اس کام کے لیے تیار ہیں۔ امید ہے اس بار آپ سب لوگوں کے سامنے میں کچھ نیا لاؤں گا، زندگی رہی تو دوبارہ بات ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بات ختم کی اور اٹھ کر اپنی گاڑی کی طرف چل دیا جہاں اس کا بیٹا موہت کمار ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ موہت، اندر کمار کا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا شاگرد بھی تھا۔ وہ ممبئی

یونیورسٹی میں جیالوجی میں ماسٹرز کر رہا تھا۔
''کھا لیا میڈیا والوں نے سر؟'' اس کے بیٹھتے ہی موہت نے گاڑی اسٹارٹ کی۔
''ہاں کافی سارا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''چلیں یہ تو کام مکمل ہو گیا، مما سے کون اجازت مانگے گا؟''
''تم...... آخر کو اتنا تو کر سکتے ہو ڈیڈ کے لیے۔''
''بالکل بھی نہیں، یہ مشن امپاسیبل ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''میں نے تو کل کوشش کی تھی...... ناکامی ہوئی، اب دیکھو کیا بنتا ہے۔'' آخری الفاظ بڑبڑاہٹ میں بدل گئے۔
''بھگوان کو یاد کریں اور منتیں کرنا شروع کر دیں۔'' موہت ہنسا۔ اِندر نے گھور کر اسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ گھر پہنچ کر اس نے بیوی کو بلایا۔
''سلیھا۔'' کچھ دیر بعد سلیھا کچن سے باہر آئی۔
''آ گئے آپ دونوں؟''
''نہیں...... ابھی تک وہیں ہیں۔'' موہت کی زبان پھسلی۔ اندر ہنس پڑا۔ سلیھا نے موہت کا کان پکڑ کر کھینچا۔
''زبان کنٹرول کیا کرو، اتنی تو تمہارے ڈیڈ کی نہیں چلتی میرے سامنے۔''
''نہ چلتی ہوتی تو یہ آرڈر نہ پکڑا ہوتا ہاتھ میں......'' اس نے آرڈر کی طرف اشارہ کیا۔ سلیھا کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے۔
''یہ وہی منحوس آرڈر ہے؟'' اس کے پوچھنے پر اندر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ زبان سے کچھ بولے بغیر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ موہت نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

''آپ اکیلے ہیں صاحب؟'' کشتی پانی میں گھوم رہی تھی اور کشتی کو سنبھالنے والا ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اس کا سر کھا رہا تھا۔ ایک تو اس کی ہندی کمزور تھی، دوسرے وہ اس سے بار بار سوالات پوچھ رہا تھا۔ آخر اس نے تنگ آ کر جھڑک دیا۔
''خاموشی سے کام کرو یار اپنا۔ سر نہ کھاؤ۔'' مگر وہ بمشکل تین چار منٹ خاموش رہ سکا۔
''وہ علاقہ بہت خطرناک ہے۔'' اب کی بار بولے گئے الفاظ نے اسے چونکا دیا۔
''کونسا علاقہ؟''

وجہ

''جزیرہ...... سینٹینلز۔''
''تت...... تمہیں کیسے معلوم میں وہاں جا رہا ہوں؟''
''تیز رفتار بوٹ چھوڑ کر سمندر کے اس کنارے پر ایک سست رفتار کشتی میں سفر کرنا...... اور وہ بھی اتنی رازداری سے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''اتنا بے وقوف نہیں میں، صاحب۔'' اس نے براہ راست مسافر کی آنکھوں میں جھانکا۔ کچھ دیر الجھن کے بعد اب وہاں شوق نے جگہ بنالی تھی۔
''تم مجھے اس بارے میں معلومات دے سکتے ہو؟''
''نہیں۔''
''کیوں؟''
''میرا کام آپ کو وہاں تک پہنچانا ہے بس۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سفر جاری رہا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچے تھے۔ کنارے پر اترتے ہی اسے عجیب سی پُراسراریت کا احساس ہوا۔ ہر چیز اسرار میں لپٹی محسوس ہوئی۔ دور دکھائی دینے والے جنگلات سے پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خوف نے اسے جکڑ لیا۔ ملاح لمبے سفر کے بعد تھک گیا تھا۔ وہ کنارے پر پڑی ریت پر گر گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔
''کیا صاحب، ابھی سے ڈر لگ رہا ہے؟''
''میں ڈرتا نہیں ہوں۔'' وہ غرایا۔ ملاح ہنس پڑا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسے چڑا رہا ہو۔ کچھ ماحول کا اثر، کچھ جھنجلاہٹ، اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے لپک کر ملاح کی گردن پکڑ لی۔ ملاح نے پوری قوت آزما کر خود کو چھڑانا چاہا مگر اس کی جنونی گرفت کے آگے ملاح کی مزاحمت ناکام رہی۔ اچانک اس نے خود ہی ملاح کو چھوڑ دیا۔ ملاح ایک طرف گر کر کھانسنے لگا۔ وہ چھوٹے قد کا ایک بدصورت شخص تھا۔ نجانے کیوں مسافر کو ملاح کی شکل سے نفرت ہونے لگی۔

''اب بکواس کرے گا؟''
''آپ کا قصور نہیں صاحب، سینٹنائل چیز ہی ایسی ہیں۔'' تیز سانسوں کے دوران ملاح کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''حواسوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔''
''تم اتنا کیسے جانتے ہو انہیں؟''
''پچھلے پانچ سال سے جتنے بھی لوگ یہاں آئے ہیں، انہیں میں لایا ہوں۔ تیز رفتار بوٹ اور بحری جہاز جس کنارے پر رکنے سے کتراتے ہیں وہاں پہنچتی ہے یہ میری کشتی۔'' اس نے پرانے زمانے کی کشتیوں کے ڈیزائن پر بنائی گئی اس کشتی کی طرف اشارہ کیا۔
''مجھے اس جزیرے کے بارے میں جاننا ہے۔''
''اس جزیرے کے بارے میں یا دو سال پہلے آنے والے شخص کے بارے میں؟'' مسافر ساکت رہ گیا۔ ملاح کا معنی خیز لہجہ اسے بہت کچھ بتا رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ دیکھو...... کتنے ہی لوگ مارے گئے ان کی کھوج میں، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی اندر۔'' سلیہا کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس نے اخبارات کے تراشوں کو اندر کے سامنے رکھا۔ اندر نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے قریب کیا۔
''سلیہا، سینٹنائل میرا جنون ہیں، میری زندگی کا مقصد ہیں۔ میرے لیے یہ صرف ایڈونچر نہیں، میں انہیں منظر عام پر نہیں لانا چاہتا، ان کے مسائل حل کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہ دیکھو۔'' اس نے سائڈ پر پڑی ایک فائل اٹھائی۔ ''تحقیق بتاتی ہے کہ یہ ہزاروں سال سے یہاں آباد ہیں۔ ان کی آبادی 1867ء میں پانچ سو بتائی جاتی تھی، اب یہ صرف چالیس باقی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان کی نسل نہیں بڑھ رہی؟ اگر چالیس لوگ نہ رہے تو سوچو...... یہ نسل ختم ہو جائے گی۔ دنیا سے کٹے آخری لوگ کس وجہ سے کٹے رہے، کوئی نہیں جان پائے گا۔''
''یہ سب کرنا تمہارا فرض نہیں اندر۔''
''سلیہا...... تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نہیں تو اور کون؟''
''اور کوئی بھی......''
''اس 'کوئی بھی' کو تمہارے جیسی پتنی مل گئی تو؟'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔
''تم بات گھمانے کی کوشش کر رہے ہو۔''
''یار اگر میں یہ کام نہ کر سکا تو میں کبھی مطمئن نہیں ہو پاؤں گا، کیا تم مجھے یونہی بے سکون دیکھنا چاہو گی؟''
''بھگوان نہ کرے۔'' وہ تڑپ اٹھی۔
''پھر مجھے جانے دو۔'' سلیہا نے گہری سانس لی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
ٹھیک تین دن بعد موہت اور سلیہا نے اسے ائرپورٹ سے رخصت کیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر وشواس تھا۔ دونوں نے فلائٹ پکڑی اور دوسرے شہر پہنچ گئے۔ ان جزائر تک پہنچنے کے لیے انہوں نے بحری جہاز کا سہارا لیا۔ سینٹنائل کے پڑوسی جزیرے پر پہنچ کر انہوں نے مقامی ماہی گیروں کی مدد سے آگے کا سفر شروع کیا۔ یہ مقامی آبادی مہذب دنیا کے ساتھ رابطے میں تھی، اس لیے انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ یہاں چند پڑھے لکھے لوگ بھی تھے جو گائیڈ کے طور پر ان کے ساتھ مل گئے۔ سینٹنلیز جزیرے سے کچھ دور ان کے ساتھ آنے والے تمام لوگ پلٹ گئے۔ اندر کو حیرت ہوئی۔ اس کے پوچھنے پر ان کے ساتھ موجود ملاح نے بتایا۔
''یہ جزیرے کے لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اس لیے آگے نہیں جاتے...... اس بات میں حقیقت بھی ہے، وہ اچانک حملہ کر دیتے ہیں۔'' ملاح کے لہجے میں خوف نہ تھا۔
''مگر تم تو ہمارے ساتھ جا رہے ہو، تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''
''ڈرنے کی کیا بات صاحب...... جب موت قسمت میں ہوئی آ جائے گی، میرے بغیر میرے کون سے بچے بھوکے مر جائیں گے۔''
''شادی نہیں کی تم نے؟'' ڈاکٹر وشواس نے پوچھا۔
''نہیں، میرا دنیا میں کوئی نہیں، میں اکیلا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سفر جاری رہا۔ سینٹنائل تک پہنچنے میں انہیں کافی وقت لگ گیا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر انہوں نے کچھ دیر آرام کیا۔ وہ اپنے ساتھ خوراک لے آئے تھے جو ڈبوں میں پیک تھی۔ ملاح بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا۔ رات کی تاریکی نے جزیرے کو لپیٹ میں لیا تو ملاح اسی کنارے پر لیٹ گیا۔ سردی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اندر نے جیکٹ پہنی اور جزیرے کی طرف بڑھ گیا۔
''کہاں جا رہے ہو؟'' ڈاکٹر وشواس کی آواز سنائی دی۔
''جزیرہ گھومنے۔''
''اس وقت...... خطرہ ہوگا۔''
''اس لیے اکیلا جا رہا ہوں، میں صبح ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گا، تم ایسا کرنا...... دوپہر تک میرا انتظار کر لینا،

اس کے بعد نہ آؤں تو واپس چلے جانا۔" وشواس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اندر آگے بڑھ گیا۔ جیسے جیسے جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا، خوف کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی ٹارچ تھی جس سے وہ راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسلسل چالیس منٹ آگے راستے کی کھوج میں وہ بھٹکتا رہا، ایک جگہ وہ چونک گیا۔ یہاں انسانی ہاتھوں سے بنایا گیا راستہ تھا جو اردگرد سے درختوں کی شاخیں کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ یہ چھوٹی سی پگڈنڈی تھی۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں انسانی پیروں کے نشان جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان کی پیروی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہی وقت تھا جب کوئی چیخا...... اندر کمار کے قدم جم گئے۔

☆☆☆

"تم ان کے ساتھ بھی یہاں آئے تھے؟" مسافر نے ملاح کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مسافر نے گہری سانس لی۔ جس کھوج کی تلاش میں وہ یہاں بھٹکنے آیا تھا، وہ اسے پہلے قدم پر مل گیا تھا۔ اس نے نظریں ملاح کے چہرے پر جما دیں۔

"ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"وہی جو سب جانتے ہیں...... رات کی تاریکی میں حملہ ہوا۔ ایک مارا گیا اور ایک زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ جان بچ گئی تھی میرا خیال ہے اس کی؟" ملاح نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں بچ گئی تھی۔" مسافر نے تائید کی۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

"کھوج لگاؤں گا...... سینٹنل کا کھوج، دو سال پہلے مرنے والے شخص سمیت کئی لوگوں کے قاتلوں کا کھوج لگاؤں گا۔ آخر کیوں وہ یہ سب کر رہے ہیں، کیوں مار رہے ہیں ان لوگوں کو؟" مسافر کی آواز میں جوش تھا۔

"جواب تو بہت سادہ ہے ان کے پاس، ان کی زندگی میں مہذب دنیا مداخلت نہ کرے تو وہ کسی کو نہیں ماریں گے، کیا وہ کبھی مہذب دنیا گئے ہیں؟ کبھی انہوں نے ہماری یا تمہاری زندگی میں دخل دیا ہے؟" ملاح نے دلیل سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"کیا وہ ہماری زندگی میں دخل دیں گے تو ہم انہیں مار دیں گے؟" مسافر ہنس پڑا۔ "اس دنیا میں جہاں اتنا کچھ ہو رہا ہے، اس سے کٹے رہنے کی وجوہات بتاؤ۔ کیوں جنگل میں آباد ہیں، شہروں میں آ جائیں، کب تک جانوروں کو مار کر پیٹ پالیں گے؟ نسل کیوں اتنی تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ دو سال پہلے تک آخری تحقیق جو تھی اس کے مطابق یہ چالیس تھے، اب سترہ کیوں ہیں؟ صرف سترہ لوگ۔"

"وہ سترہ ہوں یا ستر ہزار...... جب خود انہوں نے اپنے لیے یہی زندگی چنی ہے تو تم لوگوں کو اس سے کیا مطلب؟"

"مطلب ہے...... ہم دنیا سے کٹے آخری لوگوں کو جاننا چاہتے ہیں۔"

"صرف اپنی تسکین کے لیے؟"

"جیسے مرضی سمجھ لو۔" مسافر نے کندھے اچکا دیے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ ملاح کو یہ سکوت پسند نہیں آیا۔ اس نے پھر پوچھا۔

"جزیرے کے اندر کب جانا ہے؟"

"کل رات کو...... پورا دن اردگرد گھوم کر دیکھوں گا کہ میرے بچنے کی کتنی امید ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ ملاح نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگلی صبح مسافر نے پورا جزیرہ کھنگال مارا۔ اس پورے جزیرے کے اردگرد پانی تھا۔ چھوٹے سے کنارے کے بعد ایک گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا جہاں خطرناک درندوں کی موجودگی کے شواہد تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ پورے جزیرے پر سوائے جنگل کے ایک مخصوص حصے کے، کہیں بھی سینٹنل قبیلے کے نشان تک موجود نہ تھے۔ یہی بات جب اس نے ملاح سے پوچھی تھی تو اس نے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے ان کی آبادی کم ہونے کی وجہ سے ایسا ہو کہ وہ صرف ایک مخصوص حصے میں آباد ہوں۔"

"ایسا بالکل ممکن ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میرا خیال ہے سو ڈیڑھ سو سال پہلے جب وہ زیادہ تھے تب وہ کناروں پر بھی حکمرانی رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ثبوت ملے ہیں کہ انہوں نے کئی لوگوں کو مارا بھی تھا حملوں میں۔"

"ہو سکتا ہے۔" ملاح نے سر ہلایا۔ "لیکن اب تو کبھی کبھار دکھائی دیتے ہیں پھر بھی پڑوسی جزیروں کے لوگ ادھر آنے سے ڈرتے ہیں۔" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سج گئی۔ سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد مسافر نے شام کو ساتھ لائی خوراک سے بھوک مٹائی۔ رات کی تاریکی کے راج کے ساتھ ہی اس نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور نکل پڑا۔ ملاح کنارے پر سو رہا تھا۔

☆☆☆

اِندر صبح کی روشنی سے پہلے واپس لوٹ آیا تھا۔ جب سے وہ واپس آیا تھا، بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر تھا نہ ہی اس نے گزرنے والی رات کے بارے میں ڈاکٹر وشواس کو کچھ بتایا تھا۔ اس نے بار بار پوچھنے کی کوشش کی مگر اندر نے ٹال دیا۔ آخر وہ تھک کر خاموش ہو گیا۔ ملاح نے بھی کوئی سوال نہ پوچھا۔ وہ پورا دن انہوں نے جزیرہ گھومنے میں لگا دیا۔ کوئی غلطی سے بھی خطرناک علاقے کی طرف نہیں گیا تھا بس ارد گرد سے جنگل دیکھ کر انہوں نے دن گزار دیا۔ دوسری رات کی تاریکی نے ڈیرے جما لیے۔ اِندر نے کھوئی کھوئی آواز میں ڈاکٹر وشواس سے کہا۔

''کیا تم بھی سینٹنائل کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے بے تابی سے جواب دیا۔

''تیار ہو جاؤ، آگے چلتے ہیں......'' ملاح سو چکا تھا۔ دونوں نے بیگ کندھے سے لٹکائے اور جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ اس بار اندر کمار کو کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ وہ اسے سیدھا لے کر جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ راستہ وہی کل والا تھا۔ ڈاکٹر وشواس کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ انہیں ابھی تک کسی نے روکا نہیں تھا۔ تقریباً تین کلومیٹر آگے جا کر انہیں آبادی کے نشان مل گئے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جہاں کسی نامعلوم ذریعے سے روشنی آ رہی تھی۔ اندر سیدھا ایک جھونپڑی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ باقی سب جھونپڑیوں میں خاموشی تھی۔ اس جھونپڑی میں ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا جس کا جسم کسی جانور کی کھال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اِندر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

''مجھے تو لگتا تھا تم نہیں آؤ گے۔'' یہ سینٹنائل کی مخصوص زبان تھی جو اِندر کچھ حد تک جانتا تھا کیونکہ اس نے یہاں آنے سے پہلے زبان پر خاص طور پر تحقیق کی تھی، یہ چند پرانی زبانوں کا مجموعہ تھی۔ البتہ ڈاکٹر وشواس کو کچھ سمجھ نہ آئی۔

''نہیں، میں اپنے دوست کو لے آیا ہوں، یہ تم لوگوں کی بیماری کے بارے میں کچھ بتا سکے گا۔'' اس کے بعد اِندر نے مڑ کر ڈاکٹر وشواس سے کہا۔ ''یہ سینٹنائل کا سردار ہے، عجیب سا نام ہے اس کا، سب اسے زوما کہتے ہیں، میں کل جب یہاں آیا تھا تب علم ہوا کہ ان کی آبادی تیزی سے کسی وجہ سے کم ہو رہی ہے...... یہ سردار برسوں پرانی روایت کو توڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔''

''روایت؟'' وشواس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں روایت......ان کے نزدیک جنگل سے باہر جا کر شہروں میں آباد ہو گئے تو ان کی نسل میں دوسری نسلیں شامل ہو جائیں گی اور اس کے بعد ان پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہو گا۔''

''جنگل میں بھی وہی وہم اور وہی ان پڑھ جاہلوں والی روایات۔'' وشواس نے افسوس سے کہا۔ ''مگر اب یہ روایت کیوں توڑ رہے ہیں؟''

''وہی بیماری......ان کے جسم پر سرخ رنگ کے دھبے بنتے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ بڑھتے چلے جاتے ہیں، اس کے بعد وہ شخص زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ زندہ رہتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے۔'' اندر نے تفصیل بتائی۔

''لیکن ان کی اتنی آبادی ختم ہو چکی، اب جا کر روایت توڑنے کا خیال کیوں آیا؟'' اس کی بات سن کر اندر افسردگی سے مسکرا دیا۔

''جب تک اپنا آپ محفوظ رہتا ہے تب تک روایات زندہ رکھنے کا سوچا جاتا ہے۔''

''مطلب؟'' وشواس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اندر ایک طرف بڑھا اور زمین پر بچھائے گئے پتوں کے ڈھیر پر پڑی کھال ہٹائی۔ اس کے نیچے ایک بارہ تیرہ سال کا دبلا پتلا لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ اندر کی ٹارچ کی روشنی میں ڈاکٹر وشواس نے دیکھا۔ اس کے جسم پر پڑنے والے سرخ دھبوں نے پورے جسم کا برا حال کر رکھا تھا۔ وشواس ڈاکٹر ہونے کے باوجود لرز کر رہ گیا۔

''یہ کون ہے؟''

''زوما کا بیٹا...... اسے صرف پانچ دن پہلے اس بیماری نے جکڑا ہے، یہی وہ وجہ ہے جو زوما کو روایت توڑنے پر مجبور کر رہی ہے، اسے یقین ہے مہذب دنیا میں اس کے بیٹے کا علاج ہو جائے گا۔ یہ اسے شہر بھیجنا چاہتا ہے ہمارے ساتھ۔'' زوما جو کافی دیر سے خاموش تھا، بول پڑا۔

''تم نے کل جو بیگ میں سے نکال کر ہم پر لگایا تھا، اس سے علاج ہوتا ہے؟'' اندر مسکرا دیا۔ زوما کا اشارہ کیمرے کی طرف تھا۔

''نہیں، اس سے میں سب لوگوں کو آپ کے حالات دکھاؤں گا۔'' اسے سمجھانے کے بعد اِندر، وشواس کی طرف مڑا۔ ''میں نے ان پر مکمل ڈاکومنٹری بنائی ہے......زوما کے بیٹے کو ہم ساتھ لے جائیں گے۔ تم اس بیماری کو سمجھ سکے

ہو؟''

''کوئی اندازہ نہیں ہو رہا۔''

''جلد کی کونسی بیماری ہے؟''

''نہیں، جلد کی بیماریوں سے اتنی جلدی انسان مرتا نہیں۔'' وشواس نے دوبارہ زوما کے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ ''خیر...... شہر میں جا کر ٹیسٹ وغیرہ لیں گے تو کچھ اندازہ ہو گا۔'' یہی وقت تھا جب آواز گونجی۔

''کوئی شہر جائے گا نہ ہی میں جانے دوں گا۔'' تینوں اچھل پڑے۔ زوما نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

☆☆☆

مسافر نے قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔ اسے راستہ ڈھونڈنے میں مشکل ضرور ہوئی مگر اس پگڈنڈی پر سیدھا جانے کے بعد اسے آبادی مل گئی۔ حالات مختلف تھے اس بار...... جیسے ہی اس نے جھونپڑیوں والے علاقے میں قدم رکھا۔ لکڑی سے بنایا گیا ایک نوکدار ہتھیار اس کی گردن سے آلگا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ آنے والے تعداد میں دو تھے، نامعلوم زبان میں اسے کچھ کہا گیا تھا۔ وہ وہیں رک گیا۔ ایک نے سامنے آکر اشارہ کیا۔ وہ دونوں اسے لے کر آگے بڑھ گئے۔ جھونپڑیوں کی کوئی مخصوص ترتیب نہ تھی...... الگ الگ اور بکھری ہوئی۔ انہی جھونپڑیوں میں سے ایک جھونپڑی میں وہ دونوں اسے لے گئے تھے۔ یہاں اندھیرے میں کوئی موجود تھا جس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کیوں آئے ہو یہاں؟''

''راز جاننے۔''

''کیا راز؟''

''کیوں تم دنیا سے کٹے ہوئے ہو؟''

''دو سال پہلے آنے والے دو افراد میں سے جو ایک زندہ بچ کر چلا گیا تھا، اس نے وہ راز دنیا کو نہیں بتایا؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''نہیں...... اس کے پاس بس ایک ویڈیو تھی جو تم لوگوں کی بیماری اور رہن سہن کے متعلق تھی، اس کے علاوہ کچھ علم نہیں۔''

''پھر اس راز کو راز ہی رہنے دو۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''نہیں، میں ناکام نہیں لوٹنا چاہتا۔'' مسافر کا لہجہ مضبوط تھا۔

یہ لو دفتری فائلیں...... میں نے سنا تھا کہ تم اپنی چھٹیاں گھر پر ہی گزار رہے ہو۔

''تم ناکام جاؤ گے بھی نہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''مطلب؟''

''کیونکہ تم یہاں سے کبھی جا نہیں پاؤ گے۔'' سامنے والا ہنس پڑا۔

اس کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ باہر کا موسم یکدم بدل گیا تھا۔ بارش جو کچھ دیر پہلے ہلکی ہلکی تھی، اب کھل کر برس رہی تھی۔ جنگل کے درختوں پر بارش کی بوندوں کے گرنے سے عجیب سا شور پیدا ہو رہا تھا۔ مسافر نے پل بھر کے لیے سوچا...... کیا یہ اس کی آخری رات ہے؟ جنگل...... بارش اور جلد آنے والی موت......

☆☆☆

''نہیں روبیر، یہ میرے مہمان ہیں اور یہ یہاں سے ضرور جائیں گے۔'' زوما ابتدائی جھٹکے سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے آنے والے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وشواس اور اِندر کمار ابھی تک شاک میں تھے۔ یہ وہی ملاح تھا جو اُن کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ایک سینٹائل کے ساتھ پچھلے دو تین دن سے تھے اور اب وہی ان کی واپسی میں رکاوٹ تھا۔ اِندر کو ان کی گفتگو سمجھ آ رہی تھی، وشواس خاموش تھا مگر اس کے چہرے پر دکھائی دینے والے خوف کے تاثرات اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

''کس حیثیت سے زوما؟''

''میں بستی کا سردار ہوں۔''

''سردار۔'' روبیر ہنسا۔ ''سردار جو اپنے بیٹے کے لیے برسوں پرانی روایت توڑنے پر مجبور ہے۔''

"سوال صرف میرے بیٹے کی زندگی کا نہیں، ہم سب کی بہتری اسی میں ہے۔"

"یہ بہتری تب کیوں دکھائی نہیں دی تھی جب میری ماں مرگئی...... میرا باپ مرگیا؟" زوما کمزور پڑ گیا۔ روبیر نے نیزہ تان لیا۔ "نہیں زوما...... اب یہ روایت ہمیشہ زندہ رہے گی، میں اسے کبھی توڑنے نہیں دوں گا۔" یکدم زوما کے چہرے کا رنگ بدلا، وہ اس پر جھپٹ پڑا تھا۔

"بھاگو۔" وہ اِندر اور وشواس کی طرف دیکھ کر چیخا۔

انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر دوڑ لگا دی۔ پگڈنڈی پر بھاگتے ہوئے انہیں احساس ہوا کوئی ان کے پیچھے تھا۔ اِندر نے اپنے جسم کی پوری طاقت بھاگنے میں لگا دی۔ وشواس اس سے کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ یہی وقت تھا جب اسے آواز سنائی دی۔

"اِندر۔" اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کوئی اس پر حملہ آور ہوا۔ چاقو کے وار نے اس کی گردن ادھیڑ دی۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ اِندر نیچے گر گیا...... اس کا گرم خون جنگل کی زمین گیلی کرنے لگا۔

ڈاکٹر وشواس بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنا اور اِندر کا بیگ کشتی میں رکھا اور اسے سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ کشتی کو قابو کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ ساری رات اسی کشمکش میں گزر گئی۔ صبح ہونے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اسے ہوش آیا تو وہ شہر میں تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ماہی گیروں کے ایک گروپ کو دکھائی دیا تھا جو اسے کنارے پر لے آئے جہاں بحری جہاز کے ذریعے اسے واپس بھیج دیا گیا۔ وہ پورے دو دن بے ہوش رہا تھا۔

یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ ہال میں لگی بڑی اسکرین پر ڈاکومنٹری چل رہی تھی ساتھ میں ڈاکٹر وشواس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سامنے کئی ٹی وی چینلز کے صحافی موجود تھے۔

"یہ میرے دوست اِندر کمار کی خواہش تھی جسے میں آج پورا کر رہا ہوں افسوس، وہ آج ہمارے درمیان نہیں، سینٹنائل کے قبیلے نے ان کی جان لے لی مگر مجھے خوشی ہے میں یہ ڈاکومنٹری یہاں تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دنیا سے کٹے آخری لوگوں کے رہن سہن اور ان کی آبادی کم ہونے کی وجوہات پر بنائی گئی مکمل ویڈیو ہے۔ اب حکومت اس بارے میں کیا اقدام اٹھاتی ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔" وشواس نے بات ختم کی۔

وشواس کو کئی کالجز اور یونیورسٹیز میں بلایا گیا۔ نیوز چینلز نے اس کے انٹرویو لیے۔ حکومت کی طرف سے اسے انعام دیا گیا، ساتھ ہی اِندر کمار کے خاندان کو بھی انعام سے نوازا گیا تھا لیکن سیہا اور موہت کو جو دکھ ملا تھا اس کا مداوا ممکن نہیں تھا۔ ان کے گھر میں ویرانی نے ڈیرے ڈال دیے۔ سیہا کے آنسو کئی ماہ تک بہتے رہے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آ گئی۔ موہت نے پڑھائی جاری رکھی۔ ماسٹرز مکمل کرتے ہی اس نے جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ ان دنوں اس کا موڈ عجیب سا ہو رہا تھا۔ سیہا کے بار بار پوچھنے پر آخر اس نے دل کی بات کہہ دی۔

"مما...... مجھے سینٹینلز کے جزیرے پر جانا ہے۔"

سیہا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس پر وہی مضبوطی دکھائی دے رہی تھی جو اِندر کے چہرے پر دکھائی دیتی تھی۔

"میں نہیں روکوں گی۔"

"سچی مما؟" اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دکھائی دیے۔

"ہاں میرے روکنے سے کونسا تم نے رک جانا ہے؟"

"نن...... نہیں...... ایسی بات نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے...... تمہارے ڈیڈ کے بغیر اگر میں زندہ ہوں تو تمہارے بغیر بھی رہ لوں گی۔" وہ کھڑی ہوئی۔ "تمہیں اجازت ہے...... اِندر بھی اس خواہش کو پورا کیے بغیر نامکمل تھا...... اور تم بھی، جاؤ موہت...... چلے جاؤ۔" موہت مزید بحث میں نہ الجھا اور چپ چاپ اس جزیرے پر چلا آیا تھا۔

☆☆☆

موہت نے خود کو مضبوط کیا۔ کچھ دیر جھونپڑی میں خاموشی رہی۔ اس کے بعد وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "تو اب تم مجھے مار دو گے؟"

"ہاں۔" روبیر اندھیرے سے روشنی میں آ گیا۔

"جیسے تم نے میرے ڈیڈ کو مارا تھا۔"

"دو سال پہلے مرنے والا تمہارا باپ تھا؟" وہ چونکا۔ موہت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم لوگ تو دنیا سے کٹ کر رہنا چاہتے ہو پھر یہ ملاح کا روپ دھار کر دوسرے جزیروں پر کیوں جاتے ہو تم؟"

"باہر سے آنے والے لوگوں کی آمد سے باخبر رہنے کے لیے...... اگر ہم یہ نہ کرتے تو جس تیزی سے بیماری ہمیں نگل رہی ہے اب تک کوئی بھی شخص ہمیں مار کر جزیرے پر

قبضہ کرلیتا۔"

"تم سردار ہو؟"

"نہیں، سردار زوما تھا مگر بیٹے کی موت کے بعد اب وہ کچھ دنوں کے لیے آرام کر رہا ہے اس لیے میں دیکھ رہا ہوں سارے معاملات......"

"ہندی کہاں سے سیکھی؟"

"یہیں آس پاس سے......" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ "تم وقت ضائع کر رہے ہو میرا۔"

"آخری سوال...... میرے باپ کو کس نے مارا تھا؟ ڈاکومنٹری بنانے کی تو اجازت دے دی گئی تھی انہیں۔"

"ہم نے نہیں مارا تھا......"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"ہم اس کے پیچھے ضرور گئے تھے مگر زوما کے منع کرنے کے بعد اور میری اور زوما کی لڑائی کے بعد ہم نے ان کو جانے دیا تھا۔"

"پھر وہ کیسے مرا؟"

"مجھے نہیں معلوم...... مگر اس کی گردن اس ہتھیار سے کاٹی گئی تھی اور یہ ہمارے جزیرے پر استعمال نہیں ہوتا۔" روبیر نے ایک طرف جا کر چاقو اٹھا کر اسے دکھایا۔ موہت نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چاقو پکڑا۔ ٹارچ کی لائٹ لگا کر اس نے دیکھا۔ اس پر باریک الفاظ میں "دشواس۔" لکھا تھا۔ اس کی نظروں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دشواس کو ملنے والی شہرت اور دولت اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ ان کے ساتھ دھوکا ہوا تھا...... بہت بڑا دھوکا۔

"میرا خیال ہے تمہیں سمجھ آگیا ہوگا اب۔" روبیر ہنسا۔

"ہاں۔" اس نے نظریں جھکا لیں۔ "اب تم میرے ساتھ جو کرنا چاہو کر سکتے ہو۔" روبیر نے اپنا نیزہ اٹھایا۔ موہت نے گردن جھکا لی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں، روبیر نیچے جھکا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ موہت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر جو عجیب طرز کا لباس تھا وہ نیچے ڈھلک گیا تھا۔ موہت نے دیکھا، اس کے جسم پر سرخ دھبے نکل رہے تھے۔ یہ جسم کو نگل رہے تھے۔

"چلے جاؤ تم...... دفع ہو جاؤ۔" وہ چیخا۔ موہت نے اس کا نیزہ اٹھا لیا۔

"مہذب دنیا سے کٹے رہنے کی روایت تو تم نے توڑ دی تھی...... پھر کیوں الگ ہو اب تک، وجہ بتا دو۔" روبیر نے سر اوپر اٹھایا۔

"وجہ......" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

☆☆☆

تقریباً بیس دن بعد وہ اپنے گھر پہنچا تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ سنیہا ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا، بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی۔ دونوں ماں بیٹا کافی دیر ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ جب وہ کچھ سنبھلے تو موہت صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مما کافی لا دیں...... شدید تھکن ہے۔" سنیہا کچن میں چلی گئی۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز کی سرخ پٹی چلنے لگی۔ نیوز رپورٹر کی ہیجانی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"سینٹنائل پر تحقیق کرنے والے مشہور ڈاکٹر...... ڈاکٹر دشواس کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی لاش گھر پر ملی ہے۔" کچھ دیر بعد سنیہا اور وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے خبر کی تفصیل دیکھ رہے تھے۔ پورے علاقے میں خوف پھیل گیا تھا کیونکہ آلۂ قتل سینٹنائل جزیرے پر استعمال ہونے والا مخصوص نیزہ تھا۔ ایک اور نیوز چینل کی رپورٹر چیخ رہی تھی۔

"کیا سینٹنائل نے اپنا راز دنیا کے سامنے لانے کی وجہ سے ڈاکٹر دشواس کو قتل کیا ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟ پولیس ابھی تک اندھیرے میں ہے۔" سنیہا غور سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے موہت؟"

"بدلہ۔"

"کیا مطلب؟" موہت نے چپ چاپ سب بتا دیا۔ سینٹنائل جزیرے پر پیش آنے والے واقعات سے لے کر ڈاکٹر دشواس کے قتل تک۔ سنیہا نے پوری بات سننے کے بعد آنکھوں سے نمی صاف کی۔

"روبیر نے کیا وجہ بتائی تھی دنیا سے کٹے رہنے کی؟" موہت مسکرایا۔

"روبیر کہتا ہے...... دنیا مہذب نہیں، ایک بڑا جنگل ہے جہاں کوئی قانون نہیں، صرف خود غرضی اور خود پرستی ہے جیسے ڈیڈ کو دشواس نے صرف شہرت کے لالچ میں قتل کر کے الزام ان پر لگایا ویسے ہی باقی سب بھی ہوں گے اس لیے وہ دنیا سے الگ ہی اچھے ہیں چاہے آبادی ختم کیوں نہ ہو جائے۔" سنیہا نے آہ بھری۔

"جھوٹ تو نہیں بولا اس نے۔" موہت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ساتویں قسط

الاؤ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے ..... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الاؤ کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الاؤ ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھناؤنے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے

جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

اس خالی کمرے کو دیکھتے ہی میں اور طارق اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔

چند ایک ثانیے اسی کیفیات سے دوچار رہنے کے بعد طارق کے منہ سے شٹ نکلا۔

"یہ تینوں کہاں گئے......؟"

میں نہیں جان سکا کہ اس نے یہ مجھ سے پوچھا تھا یا خود سے......

"یقیناً چہل قدمی کرنے تو نہیں گئے ہوں گے۔" میرے بھی حلق سے پھنسے پھنسے انداز میں برآمد ہوا۔

"تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے، سیف!" اس نے خفگی سے کہا۔ میرے بارے میں اس کا خیال غلط تھا۔ کبھی کبھی حالات کی سختیاں، کرب ناکیوں کا بوجھ انسان کی نفسیات پر براہِ راست پڑتا ہے۔ وہ بیزار، جھلّایا ہوا اور درونِ خانہ ایک کرب کی سی کیفیات سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت میں بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

اس کے بعد ہم نے تیزی سے مخالف سمتوں میں حرکت کی اور سارا ہٹ چھان مارا۔ جب سارا ہٹ گھوم پھر کر ہمارا ٹکراؤ دوبارہ اسی کھلے کمرے کے سامنے ہوا تو طارق تب تک اپنی جھلاہٹ اور احساسِ شکستگی پر قابو پا چکا تھا۔

"ہم......تو وہ بھاگ گئے؟"

"نہیں، انہیں بھگایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ضرور ان کے ساتھی یہاں آئے ہوں گے۔"

ٹھیک اسی وقت میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور ساتھ ہی میری چھٹی حس نے خطرے کا احساس دلایا اور یہی وہ وقت تھا جب ہٹ کے باہر ہمیں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

"ہوشیار......!" طارق چلّایا اور اس نے اپنا پستول نکال لیا، خود میں نے بھی مسلح ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھتے......کوئی دھواں چھوڑتی ہوئی شے ہمارے پیروں میں آن گری۔

ایک دوسرے کو سنگین خطرے سے آگاہ کرنے کا مطلب بھی موت ہی تھا، بھلا وقت ہی کہاں تھا؟ یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں اپنی دانست میں خطرے کو بھانپتے ہی دو مخالف سمتوں میں دوڑے اور شکر رہا کہ دونوں جانب کھڑکیاں تھیں۔

وہاں سے ہم باہر کودے ہی تھے کہ عقب میں سماعت شکن دھماکا ہوا۔

میں نے جس رخ پر چھلانگ لگائی تھی، وہاں......کی زمین کچی پکی مٹی سے اٹی ہوئی تھی اسی لیے کسی بڑی چوٹ سے تو بچ گیا، مگر اسی وقت میری سماعتوں نے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنی۔ یہ آواز اسی سمت سے آتی محسوس ہوئی تھی جس طرف طارق نے چھلانگ لگائی تھی۔

میں خود اس وقت حواس باختہ تھا، اب تک اس دستی بم سے بچاؤ کے لیے میں نے جو حرکت کی تھی، وہ بلاشبہ ایک فطری بقا کے ایکشن اور ری ایکشن کا نتیجہ تھی۔ مجھ جیسے ایک عام آدمی کے لیے یقیناً ایک جوا کھیلنے کے مترادف تھی، مگر اب...... آگے کیا کرنا تھا سو فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی میں نے فوری طور پر ہٹ کے فرنٹ کے بجائے بیک کی جانب دوڑ لگادی۔

طارق البتہ میرے مقابلے میں کچھ پروفیشنل تھا، نشانہ بھی اسے ہی بنایا گیا تھا، ممکن ہے میری طرف بھی اَن دیکھے دشمن پلٹے ہوں، کیونکہ میں نے بھی صورتِ حالات کی سنگینی کو بھانپتے ہی تیزی سے حرکت کی تھی۔ ایک مقصد طارق کی مدد کرنا بھی تھا۔

طارق کو میں نے ہٹ کی مشرقی دیوار کے ساتھ لگے دیکھا۔ وہ دو مسلح افراد پر فائرنگ کر رہا تھا۔ میں بھی پستول سنبھالے اس کے قریب چلا گیا۔

"تم پیچھے کی طرف دھیان رکھو، جلدی۔" اس نے ہانپتی سی آواز میں کہا۔ اسی وقت ایک گولی چلی۔ یہ اسی سمت سے آئی تھی جہاں چند سیکنڈ پہلے میں موجود تھا۔ ہم دونوں بدکے اور میں نے اس طرف اپنی پستول کا رخ کر کے فائر جھونک دیا۔ مقصد یہی بتانا تھا کہ ہم بھی مسلح ہیں۔

ہٹ دھڑا دھڑ جل رہا تھا، آگ ابھی اندر ہی لگی ہوئی تھی اور دیواروں تک پہنچنے میں اسے کچھ وقت لگتا۔

میں دوڑ کر پھر اسی سمت آیا۔ یہاں یکا یک سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ اَن دیکھے دشمنوں کی چال بھی ہو سکتی تھی، میں اور طارق محتاط انداز میں اسی طرح چوکس ہٹ کی عقبی دیوار سے لگے کھڑے رہے۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ دشمن دو سمتوں سے چھپ چھپا کر ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش میں ہوں کہ اچانک ان کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

سب سے پہلے تو ہماری سماعتوں نے پولیس سائرن کی آواز سنی اور دوسرے گاڑی اسٹارٹ ہونے اور انجن کے زور سے غرانے کا شور۔ اگلے ہی لمحے گاڑی کے دور جانے کی آواز نے ہمارے اعصاب یکلخت ڈھیلے کر دیے۔

کسی اور وقت میں پولیس سائرن کا یہ شور ناگوار گزرتا مگر ان نازک اور سنگین گھڑیوں میں یہ شور میری سماعتوں کو بہت ہی بھلا محسوس ہوا مگر طارق چپکا نہیں بیٹھا اور فوراً ہٹ کے فرنٹ کی جانب لپکا، ناچار میں بھی اس کے پیچھے دوڑا۔

ہمارے بائیں جانب سے ایک پولیس موبائل تیزی سے سائرن بجاتی ہوئی دوڑی آ رہی تھی، ساتھ ہی اس کی ہیڈ لائٹس بھی ''ڈمر'' کر رہی تھیں۔ یہ شاید ان کی آمد کا مخصوص کاشن تھا۔ جبکہ دائیں جانب مجھے اس لگژری جیپ کی دور ہوتی سرخ بیک لائٹس دکھائی دیں، جسے کچھ دیر پہلے ہی ہم بند موڑ سے یہاں ہٹ کی جانب آتے ہوئے دیکھ چکے تھے، اس میں چار پانچ نوجوان ام الخبائث کی بوتلیں تھامے ہوئے اترے تھے اور پھر شغل کرنے اور ہنسی مذاق میں مشغول ہو گئے تھے۔ حالانکہ ابتدا میں جب وہ ہمارے تعاقب میں آ رہے تھے تو ہمیں ان پر محض شبہ ہوا تھا۔

پولیس موبائل آندھی طوفان کی طرح دوڑتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی اور بے ہودہ بریک مار کے وہ ایک جھٹکے سے ہمارے قریب آن رکی۔

''اس جیپ کا تعاقب کرو......'' طارق نے چلا کر اور ہاتھ کے اشارے سے دور جاتی مذکورہ جیپ کی جانب اشارہ کیا۔

''خبردار! تم دونوں کوئی حرکت مت کرنا اور یہ اسلحہ زمین پر رکھ کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دو۔''

موبائل کے ڈرائیونگ کیبن کی کھڑکی سے مجھے ایک بھاری اور سانولے چہرے والے انسپکٹر ٹائپ کا آدمی نظر آیا تھا، اسی نے ہی گونج دار اور بھاری تحکمانہ آواز میں ہم سے کہا تھا۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔

اسے شاید پتا تھا کہ اس نے یہاں پہنچنے کے بعد اگلا قدم کیا اٹھانا ہے، لہٰذا اس نے تین عدد پولیس اہلکاروں کو نیچے اتارنے کے ساتھ ہی...... موبائل جیپ کے تعاقب میں لگا دی۔

اترنے والے ان تینوں اہلکاروں نے نہایت چوکسی انداز میں حرکت کی تھی۔ ایک نے لپک کر ہمارے ہتھیار اپنے قبضے میں کر لیے، دوسرے نے فون نکال لیا تھا، وہ شاید فائر بریگیڈ کو فون کر رہا تھا، نیز ممکن ہے اسے اپنے آفیسر کی ہدایت پر یہاں کی بھی پل پل کی خبر سے آگاہ رکھنے کی ہدایت تھی، تیسرے نے ہم پر سرکاری گن تان رکھی تھی۔

''میرا خیال ہے، ہم ادھر ہی آرام سے گفتگو کر لیتے ہیں۔'' طارق نے ایک رپورٹر کی حیثیت سے اپنا اور میرا ایک عدد ڈاکٹر کی حیثیت سے تعارف کروانے کے بعد ان سے کہا۔

''شٹ اپ!'' اس نے بدتمیزی سے طارق کو جھڑک دیا۔ وہ اپنے شولڈر پر لگے بیجز سے اے ایس آئی لگتا تھا۔ باقی دو پولیس والے بھی الرٹ کھڑے ہو گئے تھے۔

''آپ پھر ایس پی شاداب صاحب سے بات کر لیں......'' میں بھی اس کی جھڑکی کو خاطر میں لائے بغیر سنجیدگی سے بولا۔

ایس پی شاداب پر وہ ذرا چونک گیا۔ دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ کچھ دباؤ کا شکار لگا اور اس میں کچھ اخلاقیات بھی آ گئیں۔

''ٹھیک ہے، کر لیں گے۔ پہلے انسپکٹر رضوان صاحب کو آ لینے دیں، کچھ ضابطے کی کارروائی نمٹانا تو ہو گی ہمیں......''

''تو نمٹا لیں...... کس نے روکا ہے؟'' طارق نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ایس آئی کے سینے پر اس کے نام کا بھی پھول جڑا ہوا تھا جس کے مطابق وہ ظہیر خان تھا۔

طارق اور میں نے اپنے آئی ڈی کارڈ اسے دکھائے اور...... میں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی جبکہ طارق کو ہی اپنی صوابدید پر بولنے کا موقع دیا۔

''معاملہ کیا ہے آخر......؟'' بالآخر اے ایس آئی ظہیر نے پوچھا۔

''ڈکیتی کرنے آئے تھے۔ ہمیں لوٹنا چاہتے تھے۔'' طارق نے جواب میں کہا۔

ظہیر شاید اب تک خود بھی اپنے تئیں اندازہ قائم کر چکا تھا اسی لیے وہ فون پر اپنے افسر کو مطلع کرنے لگا۔ پھر دوسری جانب سے اس کی ہدایت کو بہ غور سنتا رہا، اس کے بعد ''رائٹ سر'' کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''انسپکٹر رضوان نے کیا ان لوگوں کو گرفت میں لے لیا ہے، جن کے تعاقب میں گئے تھے؟'' میں نے ظہیر سے سوال کیا۔

''ابھی تعاقب جاری ہے، امید ہے کہ وہ انہیں جا لیں گے۔'' ظہیر نے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں ہلکا پن محسوس ہوا۔ یوں جیسے وہ کوئی اصل حقیقت چھپاتے ہوئے ہمیں بہلاوا دے رہا ہو۔

''تب پھر ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ اپنے صاحب سے پوچھ لو...... ہمیں بھی کہیں جلد پہنچنا ہے۔'' طارق نے سبھاؤ سے اپنی بات کی۔

''یہ ابھی ممکن نہیں، اگلی ہدایت کا ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔'' ظہیر نے جواب دیا۔

''تم نے ہمارے آئی ڈی کارڈز دیکھ لیے، ایس پی شاداب کا بھی حوالہ کافی ہونا چاہیے، ہم اپنا رابطہ نمبر تمہیں دے دیتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم ضابطے کی کارروائی کے

لیے متعلقہ تھانے پیش ہو جائیں گے۔'' طارق نے اسے راہ بھائی۔

''آپ کیوں میری نوکری کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

''تم نے اپنے صاحب کو بتایا نہیں، ہم کون ہیں؟'' اس بار میں نے اس سے سوال کیا۔

''بتا دیا ہے۔''

''پھر؟''

''ان کا یہی فرمان ہے کہ آپ دونوں کو مجھ سمیت یہاں سے ہلنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔''

''تب پھر مجھے ایس پی صاحب کو فون کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

شاداب میرا دوست تھا، لیکن وہ ان کا باس تھا اسی لیے میں اس کے نام کے ساتھ ''صاحب'' کا لاحقہ لگا رہا تھا۔ میں نے مناسب نہیں جانا تھا کہ انہیں میری اپنے افسر کے ساتھ کسی قسم کی بے تکلفی کا اندازہ ہو۔

''ایک منٹ......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ ''آپ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ اس وقت صرف......'' اس کی بات منہ میں اور میرا سیل فون نکالنے کے لیے جیب میں جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

ہٹ کی آگ بتدریج پھیلنے لگی تھی۔ ہم اس کی گرم تپش سے بچنے کے لیے ذرا دور جا کھڑے ہوئے تھے کہ ٹھیک اسی وقت ظہیر کے فون کی بیل بجی۔

''یس سر......؟ اوکے سر......! رائٹ......'' دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چلیں جی، تشریف لائیں......تھانہ قریب ہی ہے۔ صاحب لوگ بھی وہیں پہنچنے والے ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

''کیا انہوں نے مجرم پکڑ لیے ہیں؟'' طارق نے اس سے پوچھا۔

''وہ بھی وہیں پہنچ رہے ہیں، باقی ان سے ہی دریافت کر لینا۔'' اس نے بیلٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

طارق کی مہران اور میری وین موجود تھی۔ ہم اسی میں سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

گلشن راوی والے تھانہ سیکشن اے میں ہمیں لایا گیا تو یہ دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا کہ وہاں احاطے میں دیگر دو تین پولیس گاڑیوں کے درمیان وہ موبائل بھی کھڑی تھی۔ میں نے اس کا نمبر تو نوٹ نہیں کیا تھا، ظاہر ہے اس کی ضرورت بھی کیا تھی، مگر میں پھر بھی اس کی ساخت سے پہچان گیا تھا، دیر ہی کتنی ہوئی تھی، ممکن تھا یہ دوسری پولیس گاڑی ہو۔

''کیا انسپکٹر رضوان یہاں پہنچ چکا ہے، یہ گاڑی......'' میں نے طارق سے کہتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

''ہاں! لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ دیکھتے ہیں۔''

ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سیدھا انسپکٹر کے کمرے میں ہی لے جایا جائے گا، مگر اے ایس آئی نے ہمیں برآمدے میں ہی ایک بینچ پر بیٹھنے کو کہا۔

''میرا خیال ہے انسپکٹر صاحب تو آ چکے ہیں۔'' طارق نے بینچ پر براجمان ہوئے بغیر ظہیر سے کہا۔

''ہاں! میں ان سے اندر مل کے آتا ہوں......پھر آپ اندر جائیں گے۔'' اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔ طارق پھر بھی نہیں بیٹھا اور کھڑا رہا۔ میں بھی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

''ہمارے پاس وقت کم ہے، تم اندر جا کر انہیں بتا دو......یہ بھی کہ ان حملہ آوروں کا کیا بنا؟'' طارق نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

ایس آئی ظہیر کا منہ بن گیا مگر بولا کچھ نہیں اور انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''آخر کیا معاملہ ہے یہ؟'' میں نے ہولے سے طارق سے پوچھا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' وہ بولا۔

ذرا ہی دیر بعد اندر سے ایک اردلی آیا اور ہمیں آنے کا اشارہ کر دیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہونے لگے تو اے ایس آئی ظہیر باہر نکل رہا تھا۔

سامنے وہی پولیس افسر اپنی کرسی پر میز کے پیچھے بڑے ٹھسے کے ساتھ دھنسا ہوا تھا۔ کمرے میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

''بیٹھو۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں ہم دونوں کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔

ہم نے اس کے سامنے والی کرسیاں سنبھال لیں۔ ساتھ ہی میں نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ ایک پچاس پچپن سالہ خرانٹ ٹائپ پولیس افسر نظر آتا تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور چہرہ پھولا پھولا اور جسم بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ آنکھیں موٹی اور گول تھیں، رنگت سانولی تھی۔

''کیا ہوا انسپکٹر صاحب؟ حملہ آور پکڑے گئے؟'' طارق نے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''آرام سے ذرا...... ہمارے پاس کوئی جادو کا چراغ

نہیں ہوتا کہ اسے رگڑیں اور جن کو مجرم پکڑ لانے کا حکم دے ڈالیں۔'' اس نے روایتی جملہ دہرا دیا۔

''مجرم سامنے ہوں اور آپ اس کے تعاقب میں گئے تھے تو یہ سوال پوچھنے کا حق میں رکھتا ہوں انسپکٹر رضوان صاحب!'' طارق نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ اس کے رویے پر میری طرح طارق کو بھی غصہ آ رہا تھا۔

''تمہارے سامنے ہم گئے تو تھے ان کے تعاقب میں......'' طارق کو کسی دباؤ میں آئے بغیر محسوس کر کے انسپکٹر نے اپنا لہجہ ذرا ہلکا کر لیا تھا۔

''وہ بہت آگے جا چکے تھے، خیر، میں نے ناکا بندی کروا دی ہے اور ایک پارٹی ان کی تلاش میں روانہ کر دی ہے۔'' وہ بولا۔ اس کے بعد ذرا آگے ہو کے پوچھا۔

''آخر یہ معاملہ کیا تھا؟ کوئی پرانی دشمنی؟''

میرا خیال تھا طارق اسے حملے کے پس منظر سے آگاہ کرے گا، مگر اس نے وہی بیان جاری رکھا جو اس کے ماتحت ظہیر کو دے چکا تھا۔

''ڈکیتی کی نیت سے آئے تھے، جوابی کارروائی اور آپ کی گاڑی کا سائرن سن کر فرار ہو گئے۔'' طارق نے بتایا۔

''کیا میں آپ کے پاس موجود اسلحے کا لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟''

''بصد شوق......'' کہتے ہوئے طارق نے جیب سے کارڈ نما لائسنس نکالا اور مجھے بھی اشارہ کیا۔

ہمارے لائسنس دیکھنے کے بعد اس نے آئی ڈی کارڈ بھی دیکھ ڈالے۔ اس کے پھولے پھولے چہرے پر، جو ذرا دیر پہلے برہمی کا مظہر تھا، اب وہاں ٹھہراؤ سا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور بولا۔

''ٹھیک ہے، ضابطے کی کارروائی تو ہماری مجبوری ہوتی ہے، آپ جا سکتے ہیں۔''

''ہم جانے کے لیے نہیں کہہ رہے ہیں جناب!'' طارق جیسے اس پر چڑھ دوڑا۔ ''ہمیں اپنے بارے میں یہ تسلی تھی کہ آپ ہم سے مطمئن رہیں گے۔ بات یہ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آپ ان حملہ آوروں کے تعاقب میں گئے تھے اور......''

''مسٹر طارق!'' اچانک انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ ڈالی۔ ''ہمیں ہمارا کام اچھی طرح آتا ہے۔ آپ ہمیں آخر سمجھانا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''ہم......'' تب ہی طارق نے ایک معنی خیز سی ہمکاری بھری۔ اس میں استہزائیہ کا عنصر غالب تھا۔ اسی لہجے میں آگے بولا۔

''میرا خیال ہے آپ کے اس رویے نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا ہے اسی لیے ہمیں اب اپنا کام کرنا چاہیے، اٹھو سیف!'' یہ کہتے ہوئے اس نے کرسی چھوڑ دی۔

میں اور طارق تھانے کی عمارت سے باہر نکل آئے۔

''اب کہاں چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہٹ پر۔''

''ہٹ پر؟ مگر وہ تو اب تک جل کر خاکستر ہو گیا ہوگا؟''

''یہ اسی علاقے میں دوسرا ہٹ ہے۔ میرا اصل ساز و سامان وہیں رکھا ہوا ہے۔ حفظِ ماتقدم کے لیے میں ہمیشہ ایک چیز اسپیئر میں رکھتا ہوں۔'' وہ بولا۔ میں نے کندھے اچکا دیے۔

ذرا دیر بعد ہم دوسرے والے ہٹ میں آ گئے۔ اگرچہ یہ پہلے والے ہٹ سے تھوڑا چھوٹا ہی تھا مگر ٹھیک تھا۔ ہم اس کے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔

یہاں آتے وقت راستے میں ہم نے اپنا پہلے والا ہٹ بھی دیکھا تھا، وہاں فائر بریگیڈ کا عملہ مصروف تھا۔ سرِدست ہم نے وہاں کا رخ کرنا غیر ضروری سمجھا تھا۔

مجھے ان تینوں قیدیوں کے نکل بھاگنے پر سخت تشویش ہو رہی تھی، جبکہ طارق اس سے بالکل مبرا نظر آ رہا تھا۔ اس کی شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اس نے مجھے بتایا تھا، وہ ان سے خاصی معلومات نچوڑ چکا تھا۔

''مجھے تو معاملہ مشکوک لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اب حملہ آوروں سے زیادہ انسپکٹر رضوان مشکوک لگ رہا ہے۔'' وہ بولا۔

''میرا اشارہ انسپکٹر ہی کی طرف تھا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ میں بنا کے لاتا ہوں۔'' طارق مزید تبصرہ کیے بنا اٹھ کھڑا ہوا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ دو کپ چائے کے لے آیا۔

''دال میں کالا ہے، انسپکٹر رضوان انہی کا بندہ لگتا ہے۔'' میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''صاف ظاہر ہے، ورنہ پولیس کی گاڑی اور حملہ آوروں کی گاڑی کے درمیان فاصلے کا زیادہ فرق نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ان کی گرفت میں نہ آ سکے، یہ ناممکن سی بات ہے۔'' طارق بولا۔ پھر ذرا رک کے دوبارہ گویا ہوا۔

''ہم سے ایک غلطی ہو گئی، ہمارے پاس دو گاڑیاں

تھیں، ہم میں سے ایک کو ان کے تعاقب میں نکل جانا چاہیے تھا، کم سے کم اور نہیں تو اس جیپ کی نمبر پلیٹ ہی نوٹ کر لیتا۔''

''کیسے جاتے؟ پولیس سر پر آ پہنچی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہم...... یہ بات بھی ہے۔'' طارق گومگو سے لہجے میں بولا۔

''کیا خیال ہے پھر اس سلسلے میں شاداب سے بات کر لی جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً! اور اس دوغلے...... انسپکٹر رضوان کی مشکوک کارکردگی کے بارے میں بھی بتانا ہوگا، میں بھی اپنے طور پر کچھ کرتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے ان تینوں کو یہی جیپ والے حملہ آور لے گئے ہوں گے، کوئی بعید نہیں وہ انہی کی جیپ میں ہی موجود ہوں۔'' میں نے موضوع بدلا۔

''ممکن ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے، ان کے اور ساتھی دوسری گاڑی میں ہوں اور وہ پہلے ہی یہ کام کر کے جا چکے ہوں، انہیں معلوم تھا کہ ہم یہاں پہنچیں گے، انہوں نے ہم پر ہلا بول دیا۔''

''یہی تو حیرت کی بات ہے کہ انہیں بھلا اس ہٹ اور یہاں موجود ان تینوں قیدیوں کے بارے میں کیسے پتا چلا؟'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر سیف! تم واقعی ڈاکٹر ہو؟'' اچانک طارق مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا مطلب؟ کیا تمہیں پہلے میرے ڈاکٹر ہونے پر کوئی شبہ تھا؟'' میں نے اس کی طرف گھورا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''میرا مطلب تھا کہ تمہاری یہ مار اماری والی لائن نہیں ہے نا...... اسی لیے...... تم ابھی تک چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھ جاتے ہو۔''

''مثلاً؟'' میں نے بدستور اسے گھورا۔

''میرے سیدھے سادے ڈاکٹر دوست! مت بھولو کہ تم نے اس وقت اپنے ڈاکٹری والے سفید کوٹ کو اتار کر اس کا کفن بنا کے سر پر باندھ لیا ہے اور یہ تلخ حقیقت تمہیں سمجھ آ جانی چاہیے کہ تم معمولی مجرموں سے نہیں بلکہ ایک انٹرنیشنل گینگ سے نبرد آزما ہو، جو انسانی اعضا کی غیر قانونی فروخت اور اس کے گھناؤنے حصول کے ایک مکروہ کالا زار میں مصروف ہیں۔''

''کالا زار......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں! کالا زار، یعنی کالا دھندا۔''

''کالا دھندا گورے لوگ۔'' میری زبان پر بے اختیار ایک پرانی فلم کا نام آ گیا۔ آگے بولا۔

''ہماری میڈیکل سائنس میں اسے ایک پیراسائٹک بیماری کہا جاتا ہے۔ جس کا دوسرا نام ''بلیک فیور'' ہے۔ یہ مین انٹرنل آرگن ڈیمج کرنے کا سبب بنتی ہے۔''

''میرے ڈاکٹر دوست! یہ بھی تو وہی ہے۔'' طارق بولا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ ان کے لیے ہمارے اس ہٹ کا اور اپنے قیدیوں کا پتا لگانا کیا مشکل ہو سکتا ہے!''

''میں سمجھتا ہوں یہ بات۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن مجھے کسی اور بات کا شبہ ہو رہا ہے۔''

''ہاں! یہ ایک الگ بات ہے اور قابلِ غور بھی۔'' طارق نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کہا۔ ''بولو...... میں سن رہا ہوں۔''

''گوہر شاہ نے اس مکروہ دھندے کا ہی نہیں بلکہ اپنے مخالفین کو بھی زیر و زبر کرنے کے لیے جاسوسوں کا ایک پورا نیٹ ورک بچھا رکھا ہے۔ ان میں اس کے اپنے آدمیوں سمیت کچھ ایسے نام نہاد شرفاء بھی شامل ہیں جو انہیں کسی بھی غیر معمولی بات کی ایک ایک رپورٹ پہنچاتے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھ رہا ہوں، کھل کر بولو......''

''یہاں ہٹ میں انہیں قیدیوں کا کیسے علم ہوا، تمہاری توجیہہ پیش کرنے کے باوجود یہ بات مجھے کھٹک رہی ہے۔'' میں نے پُرغور لہجے میں کہا۔ ''ضرور یہاں، آس پاس کوئی ایسا شخص یا گروہ موجود ہے، جس نے تم پر، مجھ پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔''

''ہم......! تمہارا مطلب ہے کہ جب میں ان قیدیوں کو یہاں لایا ہوں گا تو کسی نے مجھے دیکھ لیا ہوگا؟''

''یقیناً! اسی لیے میں تم سے یہ کہوں گا کہ وہ وقت یاد کر کے بتاؤ جب تم یہاں قیدیوں کو لے کر آئے تھے؟ اس وقت کوئی غیر معمولی پن محسوس کیا تھا تم نے؟''

میرے توجہ دلانے پر طارق کے چہرے پر یکایک ایک گمبھیرتا سی طاری ہو گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آنے لگا اور پھر دو تین منٹوں بعد ہی اس کے چہرے پر جوش کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ اسی انداز میں یک دم بولا۔

''ہاں! جب میں نے انہیں بے ہوشی کے عالم میں یہاں منتقل کیا تھا تو...... کسی گاڑی کو میں نے تیزی کے ساتھ پاس سے گزرتے دیکھا تھا، وہ ایک کار تھی، شاید پاسو یا ڈیز ٹائپ کی جاپانی آٹو گیئر کار۔ میں چونکا تو تھا مگر یہ سوچ کر کہ اس دریائی تفریحی مقام میں...... اس طرح کی گاڑیوں کی

آمدورفت کوئی غیر معمولی بات نہیں ہونی چاہیے۔ پھر جب میں یہاں سے لوٹنے لگا تو اسی کار کو میں نے ہٹ کی مشرقی سمت میں کھڑے دیکھا۔ کار کا بونٹ اٹھا ہوا تھا اور کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ تب بھی میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اپنی مہران میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔''

''بس! یہی وہ آدمی تھا جو عام سے بھیس میں تمہاری ریکی کر تا رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ ڈیفنس اور گلبرگ والی کوٹھی میں مارا ماری کے بعد سے ہی اپنے تین آدمیوں کے غیاب پر گوہر بھانپ گیا ہوگا کہ یہ کن لوگوں کی حرکت ہو سکتی ہے۔ ہم دونوں ہی کی ریکی کی جا رہی ہوگی اسی لیے تو میں بھی اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں تاج کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔''

''زبردست ڈاکٹر!'' طارق ایک دم جوش سے بولا۔ ''تم نے دل خوش کر دیا۔ پیش آمدہ حالات کا تم نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے۔ تمہارے اندر اب سراغ رساں والی باتیں پیدا ہونا شروع ہو گئی ہیں۔''

''مذاق چھوڑو اور اس ہٹ کو بھی......'' میں نے کہا۔ ''ہمارا نقصان تو ہو گیا۔''

''کوئی خاص نہیں۔'' وہ بے پروا لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ان تینوں سے بہت سی کام کی باتیں اگلوا چکا تھا۔ قانون کے سامنے بھی انہیں پیش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، گوہر شاہ انہیں ''اون'' کرنے سے انکار کر دیتا۔''

''لیکن میں نے اب گوہر شاہ کے خلاف ایک مربوط لائن آف ایکشن ترتیب دے دی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس وقت میرا چہرہ جوش اور کسی اندرونی جذبے کی حرارت سے مرتعش سا ہونے لگا تھا۔ طارق کی بہ غور نظریں میرے ہی چہرے پر مرکوز تھیں، میں نے اپنا وضاحتی بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''ہم شاید اب تک اپنے دفاع کی حد تک ہی کوشاں رہے ہیں جس کے باعث وہ آسانی کے ساتھ گل کھلاتا رہا۔''

''مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے۔ بولتے رہو۔'' طارق میری بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

''وہ بزدلوں کی طرح ہماری جذباتی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر ہمارے خلاف ایکشن میں آیا ہوا ہے، میں چاہتا ہوں، اسے بھی کوئی ایسی چوٹ دوں، میں اب اس کی دم پر پاؤں رکھنا چاہتا ہوں اور اسے تڑپتے بھی دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔''

میں نے ذرا رک کر دوبارہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے اسے بتایا۔

''صائمہ نے مجھے بتایا تھا کہ...... گوہر شاہ کی دو بیویاں ہیں اور ان...... سے بچے بھی ہیں، دونوں بیویوں کو ہی اس مکار شخص نے اپنی آبائی جاگیر کی ایک عالیشان حویلی میں رکھا ہوا ہے، جو پاک پتن کے کسی نیچے کے مضافاتی علاقے میں واقع ہے۔ یہاں ایک فلمی اداکارہ جس کی اب چمک دمک کا سورج غروب ہو چکا ہے، اس سے بھی اس کے ناجائز تعلقات ہیں، میں ایک ایک ضرب انہی دونوں حوالوں سے اسے لگانا چاہتا ہوں۔''

''کس طرح؟'' طارق نے خاصی دلچسپی لیتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

''اول اس اداکارہ کا کھوج اور اس کے حوالے سے اس کے کالے کرتوتوں کے ثبوت اس کی آبائی حویلی تک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''دوم؟'' طارق نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ کہ...... میں کچھ دن اس کی جاگیر میں ایک عام آدمی کے بھیس میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''اور یوں گوہر شاہ تمہاری تلاش میں بیٹا بغل میں ڈھنڈورا شہر کی تفسیر بنا رہے۔'' طارق مسکرایا۔

''ایسا بھی چلے گا، لیکن میرا وہاں رہنے کا ایک مقصد ہو گا۔ جو ابھی میرے ذہن میں واضح تو نہیں ہے، مگر کچھ ایسا سوچ رکھا ہے میں نے کہ اس کی جڑوں پر وار کرنے کی راہ نکال ہی لوں گا، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس کی کمزوری کی ''رگ'' وہیں سے ہی شروع ہوتی ہے۔''

''اور...... یہاں شہر میں ختم ہوتی ہے۔'' طارق نے جیسے لقمہ دیا۔

''ہاں! سوم یہ کہ تم نے مجھے یہ بھی خبر دی تھی کہ ان اعضا فروش قسائیوں کا مرکز جنوبی پنجاب میں حاصل پور کی طرف کہیں ہے۔''

''ہاں، یہ میں نے ان تینوں قیدیوں کے منہ سے اگلوایا تھا۔''

''میں اس کی بھی ریکی کرنا چاہتا ہوں، ممکن ہے وہاں سے اس ریکٹ کے اور گوہر شاہ کے خلاف ثبوت مل جائیں۔''

''ہم...... تو گویا تمہاری یہ لائن آف ایکشن مارا ماری سے عاری ہے۔''

''بہ ظاہر اور فی الحال ایسا ہی ہے، مگر ضرورتاً جسمانی ایکشن میں بھی آنا پڑا تو کوئی بات نہیں......'' میں نے کہا۔

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ اسکرین پر حمیرا کا نام تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر کال اٹینڈ کی اور ہیلو کہا۔

''سیف! تم کہاں ہو؟'' دوسری جانب سے حمیرا کی گھبرائی ہوئی سی آواز ابھری۔ میں پریشان ہوگیا۔

''کیا ہوا خیریت؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''تمہاری وجہ سے...... تم کہاں ہو؟ خیریت سے ہو؟'' میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور پوری تسلی سے بولا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم خود کو نارمل کرو۔ بالکل ہی حواس باختہ ہو رہی ہو، آخر میرے بارے میں تم نے ایسا کیا سن لیا ہے؟''

''سنا ہے تو کہہ رہی ہوں نا......'' اس بار اس کی ذرا تسلی آمیز سی آواز ابھری۔ ''میرے سیل پر کسی اجنبی نے رابطہ کیا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' میں نے یک دم کہا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہوگئیں۔

''تمہارے سلسلے میں دھمکیاں دے رہا تھا۔''

''تم کو ان سے کہنا تھا کہ یہ سب مجھ سے ہی براہِ راست رابطہ کر کے کہہ دو۔''

''سیف! وہ مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں سمجھاؤں، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے بیچ کیا چل رہا ہے! شاید اسی وجہ سے...... ہی اس نے میرے ذریعے تم پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔''

''نمبر مجھے سینڈ کرو جس پر دھمکی دینے والے کی کال آئی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''پہلے سن تو لو اس نے کہا کیا ہے!'' وہ بولی۔

''سن رہا ہوں۔''

''وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اپنے یار کو سمجھا دو کہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے، اب کی بار اس کے سارے قریبی دوستوں اور بہی خواہوں کو وہ نشانہ بنائیں گے۔''

''اس کے بعد......؟''

''اوہو...... پلیز، سیف! فارگاڈ سیک، تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔'' دوسری جانب سے اس کی جھلاہٹ بھری آواز سنائی دی۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میرے یہ الفاظ ازراہِ تفنن کے زمرے میں آتے تھے یا غیظ و غضب کا اس سے اظہار ہوتا تھا۔

انسان اپنی فطرت میں ایک سمندر ہے۔ کوئی چہرہ سرخ کر کے اور آنکھیں چڑھا کر غصہ دکھاتا ہے تو کوئی مزاحیہ انداز میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ کسی کے اندر یکلخت آگ بھرنے لگتی ہے تو کوئی مارے طیش کے اندر سے یخ بستہ ہونے لگتا ہے۔ میں آتش مزاج کا نہیں آبی مزاج کا آدمی تھا۔ غصے کی گرمی میرے اندر پہلے یخ کی سی کیفیت طاری کرتی تھی، جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا تھا۔ میرے اندر کی یخ میرے جذبات کو...... منجمد کر دیتی تھی، جیسے کسی آتش فشاں کی چوٹی پر جمی برف سے اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اس کے اندر کھولتا لاوا موجود ہے۔ اس لیے میں حمیرا کے ساتھ بہت سکون سے باتیں کر رہا تھا۔ ورنہ شاید میں جوش و جذبات میں حمیرا کے سامنے کیا کیا کہہ جاتا، اپنے کن کن ارادوں اور عزائم کا اظہار کر جاتا کہ وہ مجھے میرے اصل روپ کے بجائے کسی اور روپ میں دیکھنے لگتی۔

''میں نے کوئی مذاق نہیں کیا ہے۔ تم ایسا سمجھ رہی ہو تو میں کیا کروں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ، تم ان دھمکیوں کے جواب میں مجھے کیا مشورہ دو گی؟ کیا میں اپنے بھائی اور انسانیت کے ان گھناؤنے اور خونی قاتلوں کو معاف کر دوں؟ چھوڑ دوں انہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ یک دم بولی۔ ''میں بس یہی کہنا چاہتی ہوں کہ محتاط رہو اور...... اور......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''اور...... کیا......؟''

''سیف! میں تم سے کچھ نہیں چھپاتی۔'' وہ اس بار ذرا خفیف سا ہو کر بولی۔ میری بھویں سکڑ گئیں۔ بولا۔

''چھپانا بھی نہیں چاہیے۔''

''سیف! مگر...... میرے پاپا شاید ہار مان رہے ہیں۔''

''کیوں؟ وہ تو بڑے حوصلے والے تھے؟''

''ماجد بھائی کی اچانک اور دائمی جدائی کے بعد وہ جس کرب و اذیت سے دوچار رہے، یہ میں ہی جانتی ہوں، مگر اب وہ ٹوٹنے بھی لگے ہیں، اب ان میں مزید ایسا کوئی زخم سہنے کا حوصلہ نہیں رہا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا سیف؟ وہ میری وجہ سے تشویش زدہ رہنے لگے ہیں۔''

''جوان بیٹے کا دکھ ایک باپ کے لیے کس قدر کرب اور اذیت ناک ہوتا ہے، اس کا ہم صرف اندازہ ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی بات غلط نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب کیا چاہ رہے ہیں وہ......؟'' میں نے کچھ کچھ حمیرا کی بات کا اصل مطلب بھانپتے ہوئے دھڑکتے دل سے کہا۔

''وہ یہ ملک چھوڑنا چاہتے ہیں۔''

''یعنی......؟ ہمیشہ کے لیے......؟'' میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ اپنے تئیں تو میں نے بھی انہی سنگین حالات کے پیشِ نظر حمیرا سے بھی ایسا ہی کچھ کہا تھا، مگر وہ اور بات تھی، اب اور۔ اب ان دونوں باپ بیٹی کا فیصلہ تھا۔

''ہمیشہ کے لیے تو نہیں۔'' اس نے کچھ حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ ''لیکن...... وہ کچھ عرصے کے لیے یو کے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے ہائر اسٹڈیز کا ٹاسک دیا ہے، لیکن......''

''یہ ان کا بالکل درست فیصلہ ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے یاد تھا اس دن امجد صاحب نے مجھ سے یہی تو کہا تھا، جب میں نے بھی ان سے کچھ اسی قسم کی بات کی تھی، ''میں چاہتا ہوں کہ اب وہ (حمیرا) مجھ سے اور میرے معاملات سے دور رہے۔''

اب واقعی وہ حمیرا کو اس کی خالہ کے پاس بیرونِ ملک بھیجنا چاہتے تھے، ہائر اسٹڈیز کا ٹاسک دے کر، تاکہ وہ بھی دیارِ غیر میں مصروف رہے۔

البتہ اس بار خود ان کا بھی ساتھ ہی جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ یہ بات کہتے ہوئے وہ اب بھی حسبِ سابق اپنے نرم و نازک اور گلابی ہونٹ کاٹ رہی ہو گی۔

''لیکن کیا؟'' میں نے فوراً کہا۔ ''بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے امجد صاحب نے۔''

''اور تم......؟'' اس کا لہجہ کپکپانے لگا۔

''تم میری راہ شناسا ہو، تمہیں کیا بتاؤں؟''

''سیف! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

''گویا تم میرے پاؤں میں زنجیر ڈالنا چاہتی ہو؟''

''تم پھر سنگدلی دکھا رہے ہو؟''

''حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ زندگی صرف جذباتی باتوں اور سہاروں سے نہیں گزرا کرتی۔''

''میں ایک مشکل میں پھنس گئی ہوں، سیف! تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔ ایک طرف پاپا ہیں اور دوسری طرف تم۔''

''پاپا کی بات مان لو، میری فکریں بھی کچھ کم ہو جائیں گی اور زیادہ آزادی سے میں اپنے مشن کو آگے بڑھا سکوں گا۔''

''لیکن میں اس مشن میں تمہارا ساتھ دینا چاہتی تھی۔'' اس کا لہجہ رُندھنے لگا تھا۔

''میرے ساتھ اللہ ہے اور میرے چند مخلص ساتھی، لیکن دعائیں کرنے والا شاید کوئی نہیں، تم یہ شعبہ سنبھال لینا اور یو کے میں اپنی ہائر اسٹڈیز کے ساتھ ساتھ میرے مشن کی کامیابی کی دعائیں بھی مانگتی رہنا۔''

دوسری جانب سے مجھے اس کے ہولے سے سسکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے ایک دم کہا۔ ''اب دوبارہ یہ الزام مت لگا دینا مجھ پر......'' میں نے ذرا اس کے درد و کرب کو کم کرنے کی غرض سے محبت بھرے مذاق سے کہا۔

''کیا؟'' وہ جیسے سسک کر بولی۔

''یہی کہ...... میں کٹھور، سنگ دل، اور...... اور پتا نہیں کیا کیا......'' میں نے کہا اور وہ ایسی غمناک حالت میں بھی تھوڑا سا ہنس پڑی۔

یہ اس کی ادا مجھے بہت پسند آئی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، حمیرا کوئی عام یا معمولی لڑکی نہیں تھی، وہ ایسی ہی تھی کہ جسے مل جاتی تو وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت آدمی سمجھتا۔ اس پر مستزاد وہ مجھ سے محبت بھی کرنے لگی تھی، ایسی صورت میں یہ پیار اور اس کی صورت میں ہونے والا لطن اور بھی مزہ دیتا ہے۔ بہ قول شاعر، عشق یک طرفہ ہو تو سزا دیتا ہے۔ دو طرفہ ہو تو مزہ دیتا ہے......وغیرہ۔

اس سے پہلے بھی میرے اور امجد صاحب کے علاوہ حمیرا سے بھی اس موضوع پر بات ہو چکی تھی، مگر اب مجھے اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ معاملہ کسی نتیجے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بات دکھ کی بھی تھی مگر چاہتا میں بھی یہی تھا۔ جس کا میں کھل کر امجد صاحب سے بھی اظہار کر چکا تھا۔

''تم نہیں بدلو گے سیف!'' وہ بولی۔ ''اچھا تم آؤ تو سہی، پاپا بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''آ جاؤں گا مگر ابھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''او کے! میں کچھ بزی ہوں، آنے سے پہلے فون کر دوں گا، باقی جیسا تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں، اس پر فوراً عمل کرو۔ یو کے خلا میں نہیں اسی دنیا میں ہی ہے، بشرطِ زندگی ملتے رہیں گے، دنیا گلوبل ویلج ہو گئی ہے۔ بس! دعا کرتی رہو، وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہی ہو جاتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں طارق کی طرف متوجہ ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کرسی پر بہ ظاہر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا اپنے پستول کا جائزہ لے رہا تھا، اس دوران اس کی بھی کوئی کال آ گئی تھی اور وہ ایک طرف کھڑا باتیں کر رہا تھا۔

''روحی کا فون تھا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

ایک انٹرپول کی آفیسر ہونے کے ناتے اس کے پاس بھی کوئی اہم خبر ہوسکتی تھی۔

"مڈل ایسٹ کی جس ریاست میں تم کام کرتے رہے ہو، وہاں کی ایک بڑی سنسنی خیز نیوز ہے۔"

اس کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "کیا خبر ہے؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ...... میری طرح ایک اور رپورٹر بھی آرگن پائریسی پر ایک خفیہ اسائنمنٹ میں مصروف ہے۔" اس نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اسی نے رومی سے رابطہ کیا ہے اور اسٹیشن روڈ پر واقع ایک ہوٹل میں اپنی ایک ساتھی لڑکی کے ساتھ عام ٹورسٹ کی حیثیت سے مقیم ہے۔ مجھے اس نے وہیں بلوایا ہے۔ رومی بھی وہیں پہنچ رہی ہے؟ ضرور اس کے پاس کوئی ایسی اہم خبر ہوگی جو وہ بالمشافہ صراحت کے ساتھ بتانے والا ہے، ورنہ وہ مجھے فون یا ای میل کرتا۔"

"ابھی نکلنا ہے؟ تھکن بھی ہو رہی ہے یار!" میں نے کسی قدر کسلمندی سے کہا۔ یوں بھی رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔

"کل ہی صبح سویرے نکلیں گے، رومی نے احتیاطاً بتا دیا تھا، تاکہ ہم صبح نکل جائیں۔"

"اچھا ان موصوف کا ذرا حدود اربع تو بتا دو، پھر آرام کیا جائے۔" میں نے بھی سکون کی سانس لی۔

رات شاید زیادہ بیت جانے کے سبب طارق نے اس کے بارے میں مجھے اسی قدر ہی بتایا کہ...... شوکت حسین ایک بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی کا فیلڈ اینڈ ریسرچ رپورٹر تھا۔ وہ ایک بھارتی نژاد مسلم رپورٹر تھا۔ کسی این جی اوز کے ساتھ بھی فری لانسر کے طور پر منسلک رہا تھا۔ ممبئی میں اس کی مستقل رہائش تھی۔

یوں بھی عموماً اپنے کام کی نوعیت کے حوالے سے وہ پروفیشنلی "گردش" میں رہتا تھا۔

ہم آرام کرنے کی غرض سے بستر پر سو گئے اور اگلے دن صبح سویرے جاگ گئے۔ حسب سابق طارق نے میری جوانا کی ڈوز لی اور ہلکا پھلکا ناشتا تیار کیا تھا۔

یہ علاقہ دشمنوں کی نظروں میں آنے کے بعد اب طارق کے لیے یہ دوسرا ہٹ بھی بیکار تھا۔

لہٰذا اسے اپنا تھوڑا بہت ضروری سامان سمیٹنے میں وقت لگا، اس کے بعد ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں ایک دوسرے کے پیچھے مذکورہ ہوٹل روانہ ہوگئے۔

مطلوبہ ہوٹل اسٹیشن روڈ کی ایک معروف شاہراہ پر واقع ہونے کے سبب یہاں کی دو رویہ روڈ ٹریفک سے ہر وقت رواں دواں رہتی تھی۔ زیادہ تر رکشا، مسافر وین کا ہی رش نظر آتا تھا، مسافر کوچز بھی نظر آتی تھیں۔ ہوٹل میں دوسرے فلور پر اس کا کمرا تھا جہاں ہم لفٹ کے ذریعے پہنچے۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا مگر اس میں ہر طرح کے آرام اور سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔

دروازے پر طارق نے ہلکی سی دستک دی تو...... دروازہ کھولنے والی رومی (رومانہ) ہی تھی۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔

ڈبل بیڈ کے اس کمرے میں سامنے ہی مجھے دو افراد نظر آئے تھے۔ ایک میز پر موجود تیکھے نقوش اور سبک اندام سی لڑکی بیٹھی نظر آئی تھی، جس نے اپنے سامنے لیپ ٹاپ کھول رکھا تھا، اس سے یو ایس بی وائرلیس ڈیوائس لگی ہوئی تھی، قریب میز پر ہی ایک چھوٹا سا پرنٹر بھی رکھا ہوا تھا جبکہ دوسری کرسی پر ایک دبلا پتلا سا درمیانی عمر کا شخص اپنے ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے براجمان تھا۔ اس نے عام سی بنگی اسٹائل کی شرٹ اور چست سی پینٹ چڑھا رکھی تھی۔ اس کے سامنے والی کرسی خالی تھی، وہاں شاید تھوڑی دیر پہلے رومی بیٹھی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لڑکی کے نقوش مجھے خالصتاً ہندووانی سے لگے تھے۔

شوکت نے مجھے دیکھتے ہی چونک کر طارق سے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ یوں جیسے اس کے ساتھ مجھے یا ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ تھوڑا بے چین ہو گیا تھا۔ یہی حال اس کی ساتھی لڑکی کا ہوا تھا۔ پھر طارق نے ہی اس سے مختصراً نجانے کیا کہا تھا کہ اس کی تسلی ہوئی اور وہ ہم دونوں سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملا۔

طارق اب اسی انڈین ٹائپ لڑکی کی طرف دیکھنے لگا تو شوکت نے جھٹ سے (میری موجودگی کے سبب) پہلے اپنا اور پھر لڑکی کا تعارف ہم دونوں سے کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ مس ریتا ہیں۔ میری ساتھی، میری طرح ان کا تعلق بھی ممبئی سے ہی ہے۔"

اس بار میں نے کچھ پُرغور سی نظر اس کے سراپا پر ڈالی۔ وہ سانولی سہی مگر کشش انگیز اور متناسب الاعضا جسم و حسن کی مالک تھی، بالخصوص اس کی کھنچی ہوئی ابرووں والی آنکھوں میں مجھے ایک خاص چمک کا بھی احساس ہوا تھا۔ ہونٹ اس کے

جاننی سے تھے اور کافی پُرکشش بھی...... ہلکے بھورے بوائے کٹ بال تھے، جبکہ اس کا ساتھی شوکت چھریرے جسم اور درمیانی قامت کا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ تھوڑا لمبوترا اور آنکھیں چھوٹی تھیں، چہرہ کلین شیو تھا۔ سر کے بال چھوٹے اور بے ترتیب سے نظر آتے تھے۔

''ریٹا! تم ذرا روم سروس سے چائے کا کہہ دو۔'' شوکت نے اپنی ساتھی لڑکی سے کہا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، ہم ابھی چائے پی کر روانہ ہوئے تھے۔'' طارق نے منع کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہاں سے کب گئے، کب آئے؟ آرگن پائریسی پر تمہاری کنسائنمنٹ کہاں تک پہنچی؟''

''پہلے وہ ہم خبر سنو گے یا اس کی تفصیل؟'' شوکت نے مسکرا کر کہا۔ وہ اب بھی میری جانب دیکھ لیتا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ بدستور میری طرف سے کچھ تشویش میں مبتلا ہے۔ ریٹا بھی مجھے اسی طرح دیکھ لیتی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔

''وہی سننے کے لیے تو آئے ہیں۔'' طارق نے جواب دیا تو شوکت نے ایک بار پھر میری جانب دیکھا، لیکن اس بار اس نے اپنی نظریں میرے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں اور طارق سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے ذرا اپنے اس ڈاکٹر دوست کے بارے میں تو کچھ تفصیل بتادو۔''

''تو تمہاری سوئی ابھی تک اسی پر اٹکی ہوئی ہے، تم بڑے ہی شکی ہو۔'' طارق نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا اور میری جانب بھی دیکھا تھا۔ گویا اس نے بھی اس کی وہ بے چینی بھانپ لی تھی جو میں محسوس کیے ہوئے تھا۔

طارق نے اسے سنجیدگی کے ساتھ میرے بارے میں ساری تفصیل سے آگاہ کردیا۔ میں نے دیکھا، میرے بارے میں یہ سب سننے کے بعد شوکت حسین کا منہ سے حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر وہ اسی انداز میں میری جانب اپنی ایک انگلی اٹھا کر متحیرانہ لہجے میں بولا۔

''تت...... تو...... یہ وہی ڈاکٹر ہے......؟ اسی کی تلاش میں تو ہم یہاں آئے تھے۔ جسٹ اے منٹ......'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ میں اور طارق اس کے ڈرامائی انداز پر قدرے چونک کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

''ریٹا! ذرا جلدی سے مجھے اس ڈارک روم کی نیوز کا پرنٹ دو جس کا تم نے اسکرین شاٹ لے رکھا تھا، تصویروں سمیت دینا بلکہ وہ مجھے واٹس اپ بھی کرو تا کہ میں وہ طارق کو بھی اسٹار کر کے ریکارڈ کے لیے اسے واٹس اپ کردوں اور ہاں پرنٹ کا پی دو نکالنا۔'' وہ جلدی سے اپنی ساتھی سے مخاطب ہوکر بولا۔

ریٹا روم سروس کو فون کرنے کے بعد اپنی میز کرسی پر جا بیٹھی تھی۔

پتا نہیں اس کی ڈارک روم نیوز سے کیا مراد تھی، ممکن تھا وہ آگے اس کی وضاحت کرتا، تاہم شوکت کی بات سن کر اس نے فوراً لیپ ٹاپ پر کچھ اوپن کیا، پھر اس کا پرنٹ نکالا۔ چند وائٹ پیپر اس میں لگے ہوئے تھے۔

اس کے بعد وہ اپنے موبائل پر کچھ کرنے لگی پھر اسی وقت شوکت کے سیٹ پر بپ ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ریٹا نے ایک پرنٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو واٹس اپ کردیا ہے، یہ اسی کی پرنٹ کاپی ہے۔''

''تھینکس ریٹا!'' شوکت نے کہا اور ایک نظر دونوں کاپیوں پر ڈالی، اس کے بعد ایک ایک ہماری جانب بڑھا دی۔

میں نے وہ کاپی لی اور اسے بہ غور پڑھنے لگا۔ وہ ایک عالمی خبر رساں ادارے کی جانب سے آٹوموٹیو نیوز رپورٹ تھی۔ جس کی اوریجن مڈل ایسٹ کی اسی ریاست سے تھی جہاں میں جاب کرتا تھا، بلکہ یہی نہیں، اس میں اسی ہاسپٹل کا نام بھی درج تھا، جس میں، میری ریزی ڈینس شپ تھی۔

میں آنکھیں پھاڑے اس رپورٹ کی کاپی کو پڑھنے لگا اور جیسے جیسے پڑھتا جارہا تھا، میرے اندر کی یخ بستگی عروج پر پہنچتی جارہی تھی، ایک سناٹے کی سی کیفیت تھی جس نے بالکل اسی طرح مجھے سن کر کے رکھ دیا جیسے سخت ٹھنڈ یا سردی میں فراسٹ بائٹ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ساری رپورٹ پڑھ چکنے کے بعد میں نے یوں دو تین بار اپنے سر کو جھٹکے دیے جیسے سکتے اور جمی ہوئی یخ بستگی کو جھاڑنا چاہتا ہوں۔ اس سنگل کاپی کے ساتھ چند تصاویر بھی حاشیہ کی گئی تھیں، نہ صرف اس کی عبارت پڑھ کر بلکہ یہ تصویریں بھی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ مجھے اب پتا چلا تھا کہ...... شوکت اور اس کی ساتھی لڑکی ریٹا کیوں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

''سنسنی خیز، ڈرامیٹک، اینڈ تھرلنگ......'' طارق کے منہ سے نکلا۔

''تم نے دیکھ لیا یہ سب میرے ڈاکٹر دوست؟'' طارق نے اسی جوش سے میری جانب دیکھا تھا۔

"ہاں!" میری آواز میں ہلکی لرزش تھی۔

"یہ تو سارا معاملہ ہی حل ہو گیا۔" طارق بولا۔

"تو یہ تصویر واقعی تمہاری ہی ہے ناں ڈاکٹر سیف؟" شوکت حسین نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ہاں! یہ تصویر میری ہی ہے اور اس میں جو دو تصویریں مزید میں دیکھ رہا ہوں، ان میں سے ایک تو انڈین ڈاکٹر رمیش اگروال ہے، جبکہ دوسرا برما سے تعلق رکھنے والا ڈاکٹر جو جنرل سرجن ہے، امرناگ جس کے ساتھ رمیش ہر آپریشن میں "اسسٹ" کرتا تھا، دونوں اسی اسپتال میں کام کرتے تھے جہاں میری ریذیڈینسی شپ تھی۔ انہیں اکثر میں ساتھ دیکھا کرتا تھا" میں نے بتایا۔

میرے دماغ میں ابھی تک اس رپورٹ کی بے رحم اور چونکا دینے والی سطریں گردش کر رہی تھیں۔

"یہ رپورٹ ہائی لائٹ کیوں نہیں کی گئی؟ کیا اسے دبا دیا گیا تھا؟" طارق نے پوچھا۔

"ہاں! تم نے ٹھیک سمجھا۔" شوکت معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے میرے منہ سے "ڈارک نیوز روم" کا لفظ نہیں سنا تھا، اس کا مطلب بھی تم جانتے ہی ہو گے۔ آخر کو تم بھی کرائم رپورٹر ہو۔"

"بہت اچھی طرح سے۔" طارق نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جس طرح پولیس میں بعض کیس داخلِ دفتر کر دیے جاتے ہیں، اسی طرح اس طرح کی خفیہ رپورٹس "زرد صحافی" لفافہ لے کر ڈارک روم میں چھپا دیتے ہیں اور ساری عمر اس کے ٹکے کھرے کرتے رہتے ہیں۔"

"یہ کام بھارتی میڈیا کے ایک رپورٹر گروپ نے کیا تھا، مجھے اس کی بھنک ملی اور ریٹا نے اسے اڑا لیا۔"

شوکت نے فخر سے اپنی ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ تب ریٹا بھی پہلی بار شاملِ گفتگو ہوئی، بولی۔

"یہ رپورٹر گروپ ایک زیرِ زمین مافیا کے خفیہ مفادات کے لیے کام کرتا ہے۔ درحقیقت اس رپورٹ کو بنانے کا سہرا بھارت ہی کی ایک دلیر اور غیر جانبدار لیڈی رپورٹر آشادت کے سر جاتا ہے، جو ایک عرصے سے کشمیر کاز پر بھی کام کرتی رہی ہے۔ جسے اس کی زمین (بھارت) پر، دیش دروہی (غدار) اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اس کی کارکردگی کو سراہتا بھی ہے۔ خیر، اس بے چاری نے بڑی محنت اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہ رپورٹ تیار کی تھی، اگر یہ منظرِ عام پر آ جاتی تو...... بھارت کے بڑے بڑے نیتاؤں کے بت زمین بوس ہو جاتے، لیکن ان کی زد میں پاکستان کی بھی کچھ بھاری بھر کم شخصیات کے گھناؤنے چہرے بے نقاب ہوتے...... انہی میں ایک بڑی سیاسی شخصیت سہراب مجوکا ہے، جبار ماہی نامی اسی کا ہی آدمی تھا، جس کے بارے میں مجھے طارق نے ایک روز پہلے ہی بتایا تھا کہ اسے گوہر شاہ کا اس گھناؤنے کاروبار میں بزنس پارٹنر کہہ سکتے ہیں۔ وہ جنوبی پنجاب کے شہر حاصل پور کے ایک بے نام سے دریائی علاقے میں واقع قلعہ میں رہتا تھا، جسے یہ لوگ کراکوٹ کہتے تھے۔ یہاں انسانی اسمگلنگ اور دیگر قیدیوں کو رکھنے اور ان کے اعضا آپریٹ کرنے کا سارا بندوبست کیا گیا تھا۔ گوگل میپ میں مجھے طارق نے یہ قلعہ نما عمارت دکھائی تھی۔

"دوسرا نام یہاں کے ایک سابقہ ایم پی اے گوہر فیروز شاہ کا ہے جس کی کہانی ابھی آپ نے ڈاکٹر سیف کے حوالے سے ہمیں سنائی تھی۔ تیسری اہم شخصیت بھارت سے تعلق رکھتی ہے، جو ایک مافیا کے لیے بھی کام کرتی ہے، بہ ظاہر وہ بھارت میں سماج سدھار کی ایک تنظیم کا روحِ رواں ہے، مگر در پردہ وہ جرائم پیشہ آدمی ہے۔ یہ شنکر چانکیہ ہے۔ یہ تینوں اعضا فروشی کے اس گھناؤنے "کالا زار" (کاروبار) میں بزنس پارٹنر ہیں۔ ان کی تصویریں تم دیکھ ہی رہے ہو۔ بدقسمتی سے آشادت کو اس خونی مافیا نے حادثاتی موت مروا دیا، مگر میں نے کسی طرح یہ رپورٹ اڑا لی لیکن بدقسمتی سے ثبوت اس کے پہلے ہی ضائع کر دیے گئے تھے۔"

ریٹا یہ سب بڑی صراحت سے بتا کر خاموش ہوئی تو میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"اگر اس رپورٹ کی سچائی میں ذرا سا بھی مغالطہ یا مفروضہ شامل نہیں ہے تو ثبوت حاصل کرنا میرے لیے ناممکن نہیں ہوگا، کیونکہ ہدف اب میرے سامنے واضح ہو چکا ہے۔"

"سو فیصد سچی رپورٹ ہے یہ۔" اس بار شوکت نے پورے وثوق سے جواب میں کہا۔ "تم نے اور طارق نے یہ رپورٹ پڑھ لی، اس پر تم کام کرتے رہے بلکہ کر رہے ہو، کیا یہ رپورٹ چیخ چیخ کر تم سے نہیں کہہ رہی ہے کہ اس میں کتنی سچائی ہے اور کتنی مبالغہ آرائی؟"

شوکت نے غلط نہیں کہا تھا۔ بلاشبہ رپورٹ کی ایک ایک سطر ہی نہیں بلکہ اس کا ایک ایک لفظ اس کے سچا ہونے کی گواہی دے رہا تھا، گوہر شاہ، اور دیگر کے ناموں کے تذکرے کے علاوہ ڈاکٹر رمیش اگروال کے ذکر سے تو میں کبھی نہیں صرف نگاہ کر سکتا تھا۔ اب میرے دل کو وہ منظر یاد کر کے

گھومنا لگا تھا جس وقت میں اتر کر ٹیکسی والے کو کرایہ دے رہا تھا تو پارکنگ کی طرف سے رمیش نمودار ہوا۔ اس نے ہاتھ میں سلور رنگ کا ایک بڑا سا بکس اٹھا رکھا تھا۔ میں جانتا تھا اس قسم کے بکس میں ٹرانسپلانٹ کے لیے اعضا منتقل کیے جاتے ہیں۔ یہ اصل میں آئس بکس ہوتا ہے، جو مکمل طور پر سیل ہوتا ہے اور اندر موجود عضو کو ہوا اور گرمی سے بچاتا ہے۔

یوں رمیش مجھ سے آگے اندر داخل ہوا اور لفٹ کی طرف جانے لگا۔ مجھے گراؤنڈ پر ہی کام تھا کیونکہ انتظامی دفاتر یہیں تھے۔ لیکن راستہ لابی سے ہو کر جاتا تھا۔ میں لابی میں داخل ہوا تو لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا اور رمیش مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر مجھے اس کی مسکراہٹ میں استہزا اور ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی تھی جو میں بیان نہیں کر سکتا ہوں۔

جب لفٹ کا دروازہ بند ہونے میں تھوڑا خلا باقی تھا تو اس نے اچانک سلور بکس اوپر کر کے جیسے خاص طور سے مجھے دکھایا اور اسی لمحے لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں عبدالرحمان کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے خاص طور سے مجھے سلور بکس کیوں دکھایا؟ یہ بات اب اس اہم رپورٹ کو دیکھنے کے بعد میری سمجھ میں آگئی تھی کہ رذیل ڈاکٹر رمیش مجھے درحقیقت میرے ہی معصوم بھائی عادل کے اعضا دکھا رہا تھا جو ایک مقررہ وقت پر جیٹ طیارے میں پاکستان سے یہاں لائے گئے تھے اور بالترتیب تین افراد کو وہ فوری طور پر ٹرانسپلانٹ کر دیے گئے تھے۔

میرا دل ایک بار پھر دکھ سے بھر گیا۔ ساتھ ہی رمیش کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت و غیظ کا الاؤ بھی مزید بھڑک اٹھا۔ میرا جی چاہا کہ اسی وقت اڑ کر اس کے پاس جا پہنچوں اور رمیش سمیت اس بری قسائی سرجن ڈاکٹر امرناگ کو اتنی اذیتیں دوں کہ ان کی روحیں تک تڑپ تڑپ کر مجھ سے موت کی بھیک مانگنے لگ جائیں۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں طارق شاید میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ میرے دکھ کا اندازہ کر سکتا تھا، اسی سبب اس نے ہولے سے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ ریٹا اور شوکت بھی میرا کرب سمجھ رہے تھے اور خاموش کھڑے تھے۔

طارق بولا۔ ''اس رپورٹ کی باقیات پر اب ہمیں اپنا کام آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔''

''بالکل، ہم اسی لیے تو یہاں آئے ہیں، تاکہ مل کر اس پر کام کریں۔'' شوکت جوش سے بولا۔

''یہ رپورٹ ہم رکھ سکتے ہیں؟'' میں نے شوکت سے پوچھا۔

''شیور، یہ تمہارے ہی لیے کاپی نکالی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

ایک کاپی طارق کی بھی ریٹا نے نکال دی تھی۔ وہ ہم نے جیب میں ڈالی اور مزید ایک گھنٹا وہاں ہم نے قیام کیا اور اسی موضوع سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد دوبارہ جلد ملنے اور رابطے میں رہنے کی خواہشات کے اظہار کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔

میں اپنی وین میں تھا اور طارق اپنی کار میں۔ روبی اس کے ہمراہ تھی، وہ اپنے ہی ایک ٹھکانے کی جانب لے جا رہی تھی، جس سے میں تو نہیں البتہ طارق ہی واقف ہو سکتا تھا، البتہ میں ان کی گاڑی کے پیچھے تھا اور انہیں فالو کر رہا تھا۔ یہ ون وے تھی۔

یہاں ٹریفک کا خاصا رش تھا، کہیں آگے جانے والی طارق کی کار پھنس جاتی اور کبھی میری وین...... یوں ہمارا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں انہیں کھو نہ دوں، مگر یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہ تھا، سیل فون پر ہم رابطہ کر سکتے تھے۔

اسٹیشن روڈ سے ہم...... ایک دائیں جانب مڑنے والی سڑک کراس کر رہے تھے کہ مجھے اچانک طارق کی کال آگئی، میں چونکا، کیونکہ ابھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، اس لیے کہ ہم ابھی ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہی تھے، ماسوائے درمیان میں ایک کالی پیلی ٹیکسی اور دو کاروں کے۔

''ہاں! خیریت؟ میں پیچھے آ رہا ہوں۔'' میں ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پر گرفت جماتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سیل فون کان سے لگا لیا تھا۔

''درمیان میں ایک کالی ٹیکسی ہے، پیلی چھت والی پرانی سی......'' اس نے جیسے چھوٹتے ہی کہا۔ ''دیکھ رہے ہو تم اسے......؟''

اس کی بات پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ بولا۔ ''ہاں! مجھے نظر آ رہی ہے۔''

''مجھے تو نہیں روبی کو اس پر شبہ ہوا ہے کہ کوئی شخص اس میں بیٹھ کر ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور وہ ہوٹل سے ہی ہمارے پیچھے لگا تھا۔''

''او کے......! لیکن اس نے مجھے بھی دیکھا ہو گا۔ وہ ہمارے درمیان کیوں ہے؟''

''ممکن ہے، کیونکہ ہم تینوں ساتھ ہی نکلے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے ٹریفک کے رش کی وجہ سے ٹیکسی ڈرائیور ہماری دونوں گاڑیوں کے درمیان آ گیا ہو یا پھر اس مشکوک آدمی نے ڈرائیور سے صرف ہماری ہی کار کے تعاقب کا کہا

ہو، اسے معلوم ہوگا کہ تم بھی ہمارے پیچھے ہو اسی لیے تم بھی دھیان رکھنا اسے شبہ نہ ہو کہ ہم اس سے چونکے ہوئے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اب میری ساری توجہ اسی ٹیکسی پر مرکوز رہی۔

میں نے ذرا قریب وین لا کر اس کے اندر دیکھنے کی کوشش بھی چاہی تھی۔ پسنجر سیٹ پر صرف ایک ہی شخص بیٹھا تھا۔ اس وقت تو میں بھی اس کی ایک مشکوک حرکات و سکنات پر چونک گیا جب وہ بار بار کبھی سامنے اور کبھی گردن پوری موڑ کر عقبی اسکرین سے میری گاڑی کی جانب دیکھنے لگتا، تب ...

مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری ... نہ ہوئی کہ وہ کچھ پریشان اور گھبرایا ہوا سا تھا۔ شبہ اپنی جگہ مگر اس کا یوں مضطرب الحال نظر آنا اچنبھے کی بات تھی۔

میں نے فوراً سیل پر طارق سے رابطہ کیا۔

''یہ معاملہ کوئی اور ہی لگتا ہے، یعنی خطرے والا نہیں ہے۔'' اس سے یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اس کی وجہ بھی بتا دی۔ وہ بولا۔

''رومی نے بھی اس کے بارے میں ایسا ہی کچھ اندازہ لگایا ہے۔ میں کسی جگہ گاڑی روکتا ہوں، تم بھی محتاط رہنا۔ ہو سکتا ہے یہ ہم سے ملنا اور کوئی بات کرنا چاہتا ہو۔''

''عین ممکن ہے۔'' میں نے اثباتی انداز میں کہا۔

سفر جاری رہا اور...... پھر طارق نے ایک کشادہ سی گلی کی جانب کار گھما دی، میں بھی اس کے پیچھے وین گھما چکا تھا۔ ایک مقام پر طارق نے کار روک دی۔ ٹیکسی کے اندر اس آدمی کو ہم نے جلدی سے ڈرائیور کو کرایہ دیتے اور نیچے اترتے دیکھا تھا، اکیلا تھا اسی لیے ہمیں اس سے فی الحال کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا، البتہ اندر سے مسلح ہوتا یہ الگ بات تھی۔ میں اور طارق وغیرہ بہر حال اس سے محتاط تھے۔

وہ سیدھا طارق کی کار کی جانب لپکا تھا، جبکہ وہ دونوں اس کے قریب پہنچنے تک نیچے اتر چکے تھے، ایک نظر اس نے میری وین پر بھی ڈالی تھی، شاید تسلی کرنا چاہتا تھا کہ میں اتر رہا تھا یا نہیں۔

جب تک میں محتاط انداز میں وین سے اتر کر ان کے قریب پہنچا تب تک وہ بھی طارق اور رومی کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

''مم...... تم لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔'' اس نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''کون ہو تم؟ اور اس طرح ہمارا کیوں تعاقب کر رہے تھے؟'' طارق نے اس کا بہ غور سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا۔

''میں کسی بُری نیت سے تعاقب نہیں کر رہا تھا۔'' اس نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں...... میں اگر چاہتا تو اسی ہوٹل میں بھی تم سے ملاقات کر لیتا مگر وہاں مجھے خطرہ تھا کہ کہیں میں اُن کی نظروں میں نہ آ جاؤں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ٹیکسی میں تعاقب کر کے ہوٹل سے ذرا آگے جا کر آپ کو روکوں، مگر روڈ ہی اتنا مصروف تھا کہ......''

''کیسا خطرہ؟ کن لوگوں کی بات کر رہے ہو تم؟'' طارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ میری اور رومی کی اس پر نظریں جمی ہوئی تھیں۔ وہ ایک سانولی رنگت کا آدمی تھا، قد اس کا مناسب تھا، صحت بھی ٹھیک ہی تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ وہ غیر مقامی مجھے محسوس ہوتا تھا۔

''کیا ہم کسی مناسب جگہ پر آرام سے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟'' بالآخر اس نے ملتجی سے لہجے میں کہا۔

''لیکن تم ہو کون؟ چاہتے کیا ہو ہم سے؟'' طارق نے پھر سوال کیا۔

''میں یہ سب آپ کو تفصیل سے بتا دوں گا اور بھی بہت کچھ ہے میرے پاس آپ لوگوں کو بتانے کے لیے...... آپ میری تلاشی لے کر اطمینان کر سکتے ہیں۔''

مجھے وہ واقعی بے ضرر سا نظر آ رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ بہت کچھ جانتا ہو اور ہم سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہو۔

طارق تو سوچ میں پڑ گیا مگر میں نے فوراً اسے اپنے ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی تھی۔

ہم جہاں موجود تھے، یہ بھی مصروف جگہ تھی۔ طارق نے رومی سے کہا کہ وہ میری وین سنبھال لے جبکہ اس آدمی سمیت طارق نے مجھے اپنی کار میں سوار ہونے کا کہہ دیا۔

کار میں سوار ہوتے ہی طارق نے مجھے تاکید کر دی کہ میں اس کی تلاشی لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

اس کے پاس ماسوائے عمومی اور روزمرہ کی اشیا کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک موٹے زمردی پتھر کی انگوٹھی بھی تھی اس کی جیب میں۔ پتا نہیں کیوں اس نے اسے اپنی انگلی میں پہننے کے بجائے جیب میں رکھ چھوڑا تھا۔

میں نے اوکے کی رپورٹ دی اور طارق نے کار آگے بڑھا دی۔ ہمارے پیچھے رومی وین میں آ رہی تھی۔

ہم ایک بار پھر مین روڈ پر آ گئے۔ چونکہ ہم نے رومی کے ٹھکانے پر جانا تھا اسی لیے طارق نے اسے آگے رہنے کو کہا تھا۔ ہم اس کے پیچھے روانہ ہو گئے۔

طارق کار ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس آدمی کے پیچھے

پسنجر سیٹ پر براجمان تھا۔

آگے ایک عام سی رہائشی کالونی آ گئی، یہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھی۔ چھوٹے بڑے مکان بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایسے ہی ایک تنگ سی گلی میں دونوں گاڑیاں داخل ہو گئیں اور بالآخر ایک چھجے دار مکان کے دروازے کے سامنے رک گئیں۔

ہم سب اپنی اپنی گاڑیوں سے اترے، دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا جسے روی نے ہی اپنی جینز کی ہپ پاکٹ سے چابی نکال کر کھولا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اجنبی اس جگہ اور اب مکان کے اندر بڑے غور غور سے دیکھے جا رہا تھا، انداز اس کے دیکھنے کا کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ یہ ساری لوکیشن حفظ کرتا رہا ہو۔

ہم اندر کمرے میں آ گئے۔ کمرے دونوں سلیقے کے تھے۔ ایک میں ہم دو کرسیاں، ایک میز اور ایک صاف ستھرے بستر سے آراستہ بیڈ پر قبضہ جما چکے تھے۔ آدمی کو ہم نے بیڈ پر بٹھایا تھا۔

"ہاں! اب بتاؤ تم کون ہو اور ہم سے کیا کہنا چاہتے تھے؟" طارق نے اجنبی کے چہرے کی طرف غور سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں تم سب کو جانتا ہوں۔" اس نے منہ کھولا۔

"اچھی بات ہے، آگے بولو اور یہ بھی بتا دو کہ کیسے جانتے ہو ہمیں؟ جبکہ ہم تو تمہیں آج پہلی بار دیکھ رہے ہیں؟"

"میں یہاں کا شہری نہیں ہوں۔" اس نے جیسے انکشاف کیا۔ ہم تینوں چونک اٹھے۔

"میں بھارت کا شہری ہوں اور کپڑے کا بیوپار کرتا ہوں، مستقل طور پر پاکستان یعنی لاہور میں ہی آج کل مقیم ہوں، مگر بھارت میں میرا کاروباری اور کچھ عزیز رشتے داروں سے ملنا جلنا لگا رہتا ہے، میرا نام پرکاش لوہانا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا۔ ہم تینوں کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے ہولے سے کھنکھار کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"میرا ایک بیٹا تھا جیون داس، وہ واقعی ہمارا جیون تھا، ہمارا سنسار تھا۔" کہتے ہوئے اس کا لہجہ رندھنے لگا۔ "ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا، ہم جیسے کاروباری لوگوں کے بچے اغوا ہو جائیں تو سیدھا اغوا برائے تاوان کا ہی ہوتا ہے، مگر کافی دن گزر جانے کے بعد کسی نے ہم سے رقم کا مطالبہ کرنے کے لیے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ بالآخر ایک دن اس کی لاش ہمیں لکشمی چوراہے کے پاس گلی سے ملی۔ ہم بھی وہیں رہتے ہیں۔ میری اور شانتی کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی کیونکہ جیون ہماری اکلوتی اولاد تھی۔ معاملہ پولیس تک گیا، پوسٹ مارٹم ہوا تو ہم پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ میرے بیٹے جیون کے اندرونی اعضا نکال لیے گئے تھے۔ پہلے تو میں بیٹے کی موت پر دکھی تھا اور صبر کر لیا تھا لیکن پھر جب مجھے اس بربریت کا پتا چلا تو میرا پورا وجود نفرت و انتقام کے شعلوں سے بھڑک اٹھا۔" اتنا بتاتے بتاتے اس کا لہجہ مارے غم کے رُندھ گیا، وہ رو پڑا۔ میں اس کی یہ خونی داستان سن کر متاثر ہونے لگا، شاید اس لیے کہ میرا دکھ بھی یہی تھا اور جو الاؤ میرے سینے میں اپنے بھائی کے لیے دہک رہا تھا وہی الاؤ پرکاش کے سینے میں بھی بھڑکا ہوا تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ طارق اور روی اس کی "رام کتھا" سے بالکل بھی متاثر نظر نہیں آتے تھے، ان کے چہرے بدستور سپاٹ تھے، تب ہی طارق نے ذرا لہجے میں تلخی لاتے ہوئے اس سے دوبارہ سوال کیا۔

"یہ کہانی اپنی جگہ، مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا ہمیں کہ ہوٹل سے یہاں تک تم ہمارے پیچھے کیسے لگے تھے؟ ہمارے بارے میں تمہیں کیسے یہ معلوم ہوا کہ......"

"میں اسی طرف ہی آ رہا ہوں۔" پرکاش نے اپنی قمیص کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے بات کاٹی۔

"میں تمہارے پیچھے نہیں بلکہ...... ان دونوں بھارتی رپورٹروں سے ملنے اور ان سے مدد لینے کے لیے گیا تھا، بھارت میں مقیم میرے ایک رشتے دار نے مجھے ان دونوں کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ دونوں ایسے خونی سوداگروں کو انجام تک پہنچانے کا وچن کیے ہوئے ہیں، انہوں نے بھی آپ کی طرح میری دردناک داستان پر وشواس نہیں کیا اور مجھے دھتکار دیا، تب ہی میں نے آپ دونوں کو دیکھا اور کافی دیر بعد جب آپ کو ان کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو جان گیا کہ آپ ضرور ان کے قریبی ساتھی ہوں گے اسی لیے میں نے...... سوچا تم لوگوں سے ہی مدد مانگ لوں۔"

"تمہارے بیٹے کے ساتھ یہ خونی واقعہ کب اور کہاں پیش آیا تھا؟" روی نے پرکاش سے سوال کیا۔

"ممبئی میں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم یہاں اور تمہارا بیٹا ممبئی میں......؟" طارق نے سوالیہ نظروں کے ساتھ اسے گھورا۔

"تو یہ کون سی بڑی بات ہے، ہم اکثر ممبئی آتے جاتے رہتے ہیں، میرا بیٹا آج کل وہیں کا ہی ہو کر رہ گیا تھا، کیونکہ وہاں اس کی ہم نے منگنی کر رکھی تھی، اس کی ہونے والی لوگائی

وہیں جو رہتی ہے۔"

"تم شوکت اور ریتا سے ابھی فون کر کے اس کے بیان کی تصدیق کیوں نہیں کر لیتے طارق؟"

میں نے اسے بدستور شبے میں مبتلا دیکھ کر مشورہ دیا۔

"وہ تو ظاہر ہے میں کر ہی لوں گا مگر اس سے کیا ثابت ہوگا؟ یہی کہ وہ ان سے ملا اور انہوں نے اسے نکال باہر کیا۔" طارق بولا۔

ٹھیک اسی وقت میرے کان کھڑے ہو گئے...... باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری تھی...... طارق اور رومی بھی چونکے، پرکاش کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا، اسی انداز میں کپکپاتی آواز سے بولا۔

"ک ک...... کہیں وہ تو نہیں آ گئے؟ میرے پیچھے بھی پڑ

بائیں نکل بھاگے تھے۔

"اندر آ جاؤ، کوئی فائدہ نہیں......"

طارق نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ گولیوں کی آوازوں پر لوگ مکان کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ہم نے انہیں یہی بتایا کہ ڈکیتی کی نیت سے کچھ لوگ گھس آئے تھے مگر ہم نے انہیں مار بھگایا۔

لوگ واہ...... واہ کر کے واپس اپنے کام دھندوں کی جانب پلٹنے لگے۔

"ہمیں سردست فوری طور پر یہاں سے نکلنا پڑے گا، کوئی نہ کوئی پولیس کو اس کی اطلاع ضرور کرے گا اور پولیس ہمارے ہاتھ لگے اس اہم کلیو کو چھین لے گی ہم سے......"

طارق نے پرکاش کو بدستور دبوچے رکھتے ہوئے کہا۔

ب لپکا۔
دروازے
ں کیوں کا
ست نے
دھڑ سے

پھر ہم وہاں نہیں ٹھہرے...... مکان کو تالا لگایا اور......
اپنی گاڑیوں کی جانب بڑھے۔ پہلے والی ترتیب کے ساتھ ہم سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

رومی کی ویگن اب ہماری مہران کار کے پیچھے تھی۔ طارق نے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالا ہوا تھا اور میں پرکاش کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا

لئے تھے وہ......" یہ کہتے ہوئے وہ د
مجھے اس کی عجیب حرکت پر
کی طرف تھا اور یہ بھی اسی سمت بھا
جواب مجھے طارق اور رومی کی بیک
دیا۔ وہ اسے دبوچنے کے لیے اس

نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی۔ اس نے طارق کو دیکھتے ہی جیسے تعظیم پیش کر دی۔

"اور کون کون ہے یہاں؟" طارق نے اندر گھستے ہی اس سے سوال کیا۔

"اور کوئی نہیں جناب! سوائے میرے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"یہ میرے دوست ہیں۔" طارق نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ہم سب اندر آ گئے۔

سامنے چھوٹا صحن تھا، اوپر دو چھتی تھی۔ بائیں جانب دو کمرے تھے۔ سامنے کے رخ پر غسل خانہ اور رسوئی تھی۔ ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ معلوم ہوا یہ ایک ہی بڑا اور کشادہ کمرا تھا، یا پھر درمیان کی دیوار گرا کر اسے ایک ہی کمرا کر دیا گیا تھا، کیونکہ باہر سے اس کے دو دروازے نظر آتے تھے۔ زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ دو بستر لگی چارپائیاں تھیں، ایک پر کتابوں کا ڈھیر اور دوسری پر لحاف اور تکیہ الٹ پلٹ پڑے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ دو میزیں تھیں۔ ایک پر کتابیں اور دوسری پر کمپیوٹر اور پرنٹر رکھا ہوا تھا۔ ایک اٹھارہ انچ کی ایل ڈی بھی دیوار پر نصب تھی۔ اس پر کوئی خبروں والا چینل کھلا ہوا تھا۔

طارق نے دانت پیس کر پرکاش لوہانا کو مجھ سے لے کر گردن سے دبوچا اور اسے اڑنگا مار کے نیچے گرا دیا۔ وہ اس وقت جوش سے بھرا ہوا تھا۔ سرخ چہرے اور پُرغیظ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"اب اپنی حقیقت بتا دو، ورنہ کتے کی موت ماروں گا۔" اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ رومی اور وہ نوجوان ایک طرف خاموش کھڑے پرکاش کو تھر تھر کانپتا دیکھ رہے تھے۔ رومی اور میری طرح اس نوجوان کے چہرے سے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ "معاملات" اس کے لیے نئے نہیں ہوں۔

"م...... میں ...... نے کیا کیا ہے؟ م...... میرے ساتھ تو خود اتنا ظلم ہوا ہے۔" پرکاش گڑگڑانے لگا۔ طارق نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور بولا۔

"تمہاری حقیقت تو اسی وقت کھل گئی تھی جب تم نے دروازے کی جانب دوڑ لگائی تھی اور ان تینوں حملہ آوروں نے تمہیں نشانہ بنانے کے بجائے ہمیں بنانے کی کوشش کی تھی، حالانکہ تم پہلے اُن کی زد میں تھے۔" طارق غراتے ہوئے بولا۔ "اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم انہی کے ساتھی ہو۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، وہ تم لوگوں کے پیچھے تھے۔" پرکاش بولا۔

"لیکن خوف زدہ تو سب سے زیادہ تم اُن سے ہو رہے تھے؟" اس بار میں نے بھی اس کی چالاکی پر ہاتھ ڈالا۔

"میرا خیال ہے شوکت سے ٹیلی فونک رابطہ کرتے ہیں۔" رومی نے درمیان میں مشورہ دیا۔

"کر کے دیکھ لو، مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" طارق بولا۔ "یہ خود اپنی زبان سے ہی اصلیت بتائے گا، اپنی بھی اور ان تینوں حملہ آوروں کی بھی۔" آخری الفاظ اس نے دانت پیستے ہوئے ادا کیے۔

رومی، شوکت سے رابطہ کرنے لگی۔ میں دونوں کی جانب باری باری دیکھ لیتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انہونی یا کچھ ایسا ہونے والا تھا جو ہماری توقعات سے بعید تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والا حملہ بھی اچانک تھا، یہ تو شکر تھا کہ ہماری غیر معمولی محتاط روی نے ہمیں اُن دیکھے اور خطرناک دشمنوں کے خونی ٹکراؤ سے بچا لیا تھا، لیکن اب بھی جانے کیوں میرے دل کو ایک نامعلوم سی بے چینی لگی ہوئی تھی۔

"ہیلو، کون؟ شوکت؟" رومی کی آواز ابھری۔

"واٹ......؟" وہ فون کرتے ہوئے اس زور سے چیخی تھی کہ بے اختیار ہماری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"او مائی گاڈ! کب......؟ کیسے ہوا یہ واقعہ؟" رومی کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑنے لگا۔

"میں ...... میں ایک انٹرپول آفیسر ہوں، ہاں! یہ دونوں میرے جاننے والے تھے، ہم ابھی پہنچتے ہیں۔" رومی نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

طارق کے چہرے پر سناٹے اترے ہوئے تھے، وہ جیسے سب سمجھ گیا تھا اور اسے رومی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ٹھیک اسی وقت پرکاش اٹھ کر دروازے کی طرف اس قدر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دوڑا کہ ایک لمحے کو تو ہم اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کر سکے۔ البتہ اس نوجوان نے اس کے پیچھے جست لگائی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ آتے آتے بچا اور دروازے کی جانب لپکا۔ تب ہی طارق کے حلق سے غراہٹ سے مشابہ آواز خارج ہوئی اور...... وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔

پرکاش کو سیڑھیاں اترنے سے پہلے ہی دبوچ لیا گیا اور اندر لا کر طارق نے اسے کسی بھری ہوئی بوری کی طرح

اس زور سے پٹخا کہ وہ حلق کے بل چیخ پڑا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی کمر کی ہڈی تو ضرور چیخ گئی ہوگی۔ سر بھی اس کا پکے فرش سے بجا تھا اور وہیں بجا تھا جہاں سے دری ہٹی ہوئی تھی اور سیمنٹ نظر آرہا تھا۔ باقی دھڑ دری پر تھا۔

"کیا ہوا رومی؟" طارق نے ہانپتے ہوئے بالآخر اس سے دریافت کیا۔

"شوکت اور ریٹا ہلاک کر دیے گئے۔ تین نامعلوم حملہ آوروں نے ان کے کمرے میں دھاوا بولا تھا۔"

"اوہ......!" طارق کے منہ سے ہانپتی ہوئی سی متاسفانہ آواز برآمد ہوئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے، میں خود دھک سا رہ گیا تھا۔

"لل......لیکن ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اُن سے مل کر آئے تھے؟ اتنی جلدی یہ کب اور کیسے ہوگیا؟"

"تھوڑی دیر تو نہیں خیر، کم از کم دو گھنٹے تو ہو ہی گئے ہوں گے ہمیں اُن سے مل کر آئے ہوئے۔" طارق نے جیسے تصیح کی۔ "کوئی پہلے نے ہی کسی کی تاک میں ہو تو چند سکنڈ بھی کم نہیں ہوتے۔"

"پھر بھی اس واقعے کی ٹائمنگ اہم ہے۔" میں نے کہا اور اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی۔ "ہم ساڑھے دس اور گیارہ بجے ان سے ملنے ہوٹل پہنچے تھے۔ کم وبیش ایک گھنٹا ہی رکے ہوں گے۔ اب دو بج رہے ہیں۔"

"صحیح کہا تم نے ڈاکٹر!" طارق بولا۔ "ٹائمنگ آبزرویشن ضروری ہے۔ مجھے یہ سب اسی کی کارستانی لگتی ہے، وہ تینوں حملہ آور وہی ہوں گے جن کا یہ بھی ایک ساتھی ہے۔"

اس نے آخر میں فرش پر پڑے ہائے ہائے کرتے پرکاش کی طرف دیکھا تھا، پھر ہونٹ بھینچ کر اس نے اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔

"اب تمہاری اصلیت کھل چکی، سچ سچ بتا دو کس نے تم لوگوں کو یہ ٹاسک دے کر بھارت سے یہاں بھیجا تھا۔"

"یہ ضرور ڈبل ٹاسک پر یہاں آئے ہوں گے۔" رومی نے لقمہ دیا۔ "ایک طرف یہ شوکت اور ریٹا کو ٹھکانے لگانا چاہتے تھے اور دوسری طرف ہمیں بھی بلف کرنے کے بعد ٹھکانے لگا دیتے۔"

"جیسا کہ انہوں نے اسٹیشن روڈ والی جگہ پر پرکاش کو آگے لا کر کیا تھا۔" میں نے بھی خیال ظاہر کیا۔

"تم اپنی مکروہ زبان کھولو گے یا میں دوسرا طریقہ استعمال کروں؟" طارق نے پرکاش کو خاموش پا کر پھر اسے درشتی سے مخاطب کیا اور ساتھ ہی اس کی گردن پر اپنے جوتے کا دباؤ بڑھا دیا۔

اس کے منہ سے خرخراتی ہوئی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ اس نے پاؤں ہٹا دیا۔

"تت......تم لوگ بھی نہیں بچو گے زندہ......" یک دم پرکاش کا لب ولہجہ بدل گیا۔ اس کی بات نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ طارق نے نوجوان سے کچھ کہا۔ اس نے چشم زدن میں پرکاش کے ہاتھ پیر باندھ دیے اور رومال اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے پرکاش پر لاتوں، مکوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسے ہونے کے سبب وہ چیخ بھی نہیں پا رہا تھا، ورنہ وہ اس وقت بہت اذیت سے دوچار تھا۔ میں اور رومی یہ تماشا دیکھتے رہے۔ اس کے بعد طارق جب تھک کر بُری طرح ہانپنے لگا تو مجھے اشارہ کر دیا۔

میں تو ویسے ہی ان خونی سوداگروں پر ادھار کھائے بیٹھا تھا، یوں میں نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کر دی۔

"بس کرو اب......اسے بولنے کا موقع بھی دو......مر ہی نہ جائے یہ بدبخت......کہیں۔" رومی بولی۔ پرکاش مار کھا کھا کر ادھ موا ہو گیا تھا۔ وہ یا تو بے ہوش ہو گیا تھا یا پھر بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ تاہم اس کے ناک، منہ اور کانوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔

مجھے تشویش ستانے لگی کہیں یہ کم بخت مر ہی نہ جائے اور شوکت اور ریٹا کے قتل کا معما اٹکا نہ رہ جائے۔ مجھے ان دونوں کے یوں بے رحمانہ انداز میں قتل کا بے حد افسوس تھا، یقیناً طارق کو اس سے زیادہ ہوگا۔ وہ اس کا ضرور کوئی پروفیشنل کولیگ ہوگا۔

"تیمور! اسے ہوش میں لاؤ، پانی پھینکو اس پر اور ہو سکے تو اس کی مرہم پٹی کر دو، تاکہ یہ کچھ بولنے جوگا ہو سکے۔" طارق نے نوجوان سے کہا۔

تیمور نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ بے ہوش اور مضروب پرکاش کے بے سدھ وجود کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ذرا دور کونے میں لے گیا اور پھر ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھا۔

"بہت بُرا ہو گیا یہ......" طارق نے سر جھٹک کر جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمارے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔" میں نے بھی

پریشان کن لہجے میں کہا۔ ''جب بھی کوئی اہم کلیو یا سراغ ہاتھ لگتا ہے، وہ یا تو ہاتھ سے نکل جاتا ہے یا اسے بے اثر بنا دیا جاتا ہے۔''

''ہماری جنگ کسی معمولی آدمی یا لوکل گروہ سے نہیں بلکہ ایک عالمی ریکٹ سے ہے۔ نجانے اس کی جڑیں اور کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔'' رومی نے بھی تبصرہ کیا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ شوکت اور ریٹا کی قربانی ضائع نہیں گئی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے اچھا ہوا کہ یہاں آتے ہی وقت ضائع کیے بغیر ہمیں اس اہم رپورٹ سے آگاہ کر دیا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ اب تک ہم ایک مفروضے پر کام کر رہے تھے، اس رپورٹ اور ان تینوں قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے بعد ہمیں اب اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے کئی راستے مل گئے ہیں۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے ڈاکٹر! لیکن اگر شوکت حسین اور ریٹا زندہ رہتے تو ہمارا ہدف تک پہنچنا نسبتاً آسان اور کم وقت میں ہوتا'' طارق نے کہا۔

''ایسی صورتِ حالات میں یہی غنیمت ہے کہ ہمیں بہت سی باتوں کی جان کاری تو ملی۔ میرا خیال ہے اب ہمیں عملی طور پر ایکشن میں آجانا چاہیے۔''

''ایکشن میں تو آئے ہوئے ہیں۔'' رومی بولی۔

''میرے ڈاکٹر دوست کا مطلب کچھ اور ہے رومی ڈیئر!'' طارق نے اس سے غیر تاثراتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ اٹیک کی بات کر رہا ہے۔''

''اس میدان میں بھی ہم نے قدم رکھ دیا ہے۔'' رومی بولی۔ ''بلکہ خود ڈاکٹر سیف نے گوہر شاہ کو اب تک کم نقصان سے دوچار نہیں کیا، بقول انہی کہ جب یہ تاج کے ذریعے گوہر شاہ کے ہتھے چڑھے تھے تو اس نے بھی دانت پیس کر اس سے یہی کہا تھا۔''

''میرے بھائی عادل اور دیگر معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے ان خونی سوداگروں کا یہ نقصان محض مٹی جھاڑنے کے مترادف ہے۔ میں ان کی جڑوں پر وار کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس وقت مجھے اپنا لہجہ اور آواز تک بدلی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''حاصل پور ان کی اہم اور مرکزی کمین گاہ ہے۔ کراکوٹ پر گوریلا ٹائپ ایکشن سے ہمیں ان کے خلاف ٹھوس شواہد ملنے کے امکانات ہوں گے، نیز صائمہ نے مجھے بتایا تھا کہ گوہر شاہ کی وہاں آبائی حویلی ہے، جہاں اس کی دونوں بیویاں چار بیٹے اور ایک بیٹی بھی رہتی ہے۔ جبکہ گوہر شاہ کو اپنی بیٹی سے بے حد محبت ہے۔''

''ہم...... تو گویا تم اس کی بیٹی کو نشانہ بنانا چاہتے ہو؟''

''گوہر شاہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا میرے ساتھ...... عادل میرا بھائی، میرا خون تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میرے اندر کی تخ کیفیات پھر ابھرنے لگی تھیں۔

''تت...... تو تم...... کیا گوہر شاہ کی بیٹی...... ی ی...... یعنی ایک عورت ذات کو اپنے انتقام کا نشانہ بناؤ گے، جس کا اپنے باپ کے کالے کرتوتوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں......؟'' رومی کی آنکھوں میں حیرت اور ساتھ ہی تلخی کا بھی عنصر غالب تھا، مگر اس کے برعکس طارق کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''میرے بھائی عادل کا بھی تو کوئی قصور نہیں تھا۔'' میں نے اسی تخ کیفیت تلے کہا۔

''تم ایک ڈاکٹر ہو کے ایسی حرکت کرو گے تو پھر تم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا؟'' رومی کا لہجہ اب پوری طرح تلخ ہو گیا تھا۔

''میں گوشت پوست کا ایک عام انسان بھی ہوں، میرے اندر بھی انتقام اور رقابت کے جذبات ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر کوئی آسمان سے اتری ہوئی مخلوق نہیں ہے جسے فرشتہ تصور کر لیا جائے۔'' میں نے بھی جواب میں اسی تلخی سے رومی کی طرف دیکھ کر کہا۔

طارق کا چہرہ ہنوز گہری مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔ وہ خاموشی سے ہماری جھڑپ سن رہا تھا۔

''ہرگز نہیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''تب پھر ہمارے راستے جدا ہیں مس رومی!'' میں نے تلخی سے کہا۔

''پلیز، سیف! کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟'' میرے سخت لہجے پر وہ خفیف سی ہو گئی تھی۔

''رومی!'' تب ہی اچانک طارق نے اسے مخاطب کیا اور پوری تسلی سے کہا۔ ''سیف کی طرف سے تمہیں ایسی کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی مطلق ضرورت نہیں، میں تمہیں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے جیسا اس کے ذہن میں گوہر شاہ اور اس کے دیگر درندہ صفت حواریوں اور گاڈ فادرز کے اصلی چہرے بے نقاب کرنے کا ارادہ ہے، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ کیونکہ دشمن جڑوں پر وار کرتا ہے اور وہ اپنی اسی بزدلانہ حرکت سے ہی عارضی طور پر سہی مگر طویل

عرصے حاوی رہتا ہے، میرا خیال ہے میرا دوست ڈاکٹر سیف اسے اسی کے انداز میں جواب دینا چاہتا ہے۔"

"لیکن کچھ واضح تو ہونا چاہیے طارق؟" رومی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے ہم فضول بحث میں پڑ گئے ہیں۔" میں نے درمیان میں ٹوک دیا۔ پھر میں نے طارق کو رومی سے کچھ کھُسر پھُسر کرتے دیکھا، تو خود میں ایک طرف کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

میں کہہ سکتا تھا کہ میرے ذہن میں موجود پلاننگ کو طارق سمجھ رہا تھا، مگر رومی جذباتی ہو گئی تھی۔ اب پتا نہیں وہ اسے کس طرح سمجھانے کی تگ ودو میں مصروف تھا۔

"حاصل پور اور اس قلعہ نما عمارت کراکوٹ کے بارے میں ہمیں تفصیلات دیکھ لینی چاہیے۔" تھوڑی دیر بعد طارق مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"شیور!" میں نے مختصر اپنی جگہ پر ہی کھڑے کھڑے کہا۔

"جناب! اسے ہوش آ گیا ہے۔" اچانک تیمور نے ہمیں آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس کا اشارہ پرکاش کی طرف تھا۔

ہم تینوں اُس کی طرف بڑھے۔

تیمور نے اسے سوالوں کے جوابات دینے کے لیے...... دیوار سے اس کی پشت لگا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کی حالت کچھ سنبھلی ہوئی تھی۔ تیمور نے اس کی ضرورتاً کچھ مرہم پٹی کر دی تھی اور وہ اس کام میں مجھے خاصا "پروفیشنل" لگا۔ پرکاش نڈھال سا تھا، وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا یا پھر دوبارہ ایکٹنگ کے موڈ میں تھا۔

"اگر تمہارے سر سے نوٹنکی کا بھوت اتر چکا ہے تو...... ہمارے سوالوں کے صحیح جواب دے کر اپنی جان اس عذاب سے چھڑا لو۔" میں نے اس سے کہا۔

"ہم...... مجھے پپ...... پولیس...... کے حوالے کر دو۔" پرکاش نے پتا پھینکا۔ وہ ابھی تک روایتی مکاری سے کام لے رہا تھا۔ گویا اتنی مار کھانے کے بعد بھی وہ جواب دینے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اندر ہی اندر پکتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ طارق اس سے مخاطب ہو کر استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"پولیس! مگر تم ان کی نظروں میں ابھی مجرم کہاں ہو؟ جب تک وہ یہ ثابت کریں گے تم باہر ہو چکے ہو گے، لیکن ہم تمہیں پولیس کے حوالے نہیں موت کے حوالے کریں گے۔" آخری جملہ اس نے دانت پیس کر درشتی سے کہا اور تیمور کی طرف دیکھا۔

"جناب!" اس نے فوراً کسی تابع دار کے مانند اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے مؤدبانہ کہا۔

"رات میں اسے بے ہوش کر کے کسی ویران جگہ کے ریلوے ٹریک پر ڈال دینا اور اس وقت تک وہاں سے مت ہٹنا جب تک...... کوئی تیز رفتار ٹرین اس کے اوپر سے نہیں گزر جاتی۔" طارق نے سفاکی سے کہا۔ "اس کی اب ہمیں ضرورت بھی نہیں رہی ہے۔ جو کچھ ہم شوکت اور ریٹا سے حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ کر چکے ہیں۔"

آخر میں اس نے پرکاش لوہانا پر نفسیاتی وار کیا تھا۔

"جیسے آپ کا حکم، میں بے ہوشی کا انجکشن تیار کرتا ہوں۔" تیمور یہ کہہ کر دوبارہ اسی الماری کی طرف بڑھ گیا جہاں اس نے شاید کوئی ڈریسنگ یا فرسٹ ایڈ کا بکس رکھا ہوا تھا۔

مجھے وہ خود بھی اسی فیلڈ سے متعلق محسوس ہو رہا تھا، کم از کم اس کے مرہم پٹی کے ماہرانہ انداز سے یہی لگا تھا مجھے۔

"نن...... نہیں...... بھگوان کے لیے ایسا مت کرنا......" پرکاش یک دم کانپ کر بولا۔ تیمور جاتے جاتے رکا اور اس کی جانب دیکھنے لگا تو طارق نے برہمی سے کہا۔

"تم رک کیوں گئے؟ ہم اب اس کا مزید چلتر برداشت نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمارے پاس وقت... ہے اتنا۔ یہ اب ہمارے لیے بیکار ہو چکا۔"

طارق کے اس نفسیاتی حربے کا.... پرکاش پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اس کی منت سماجتوں پر اتر آیا۔

"بھگوان کے لیے ایسا مت کرو، میں تمہیں ان کے بارے میں سب بتا دوں گا، لیکن اس سارے چکر میں میرا کوئی دوش نہیں ہے، میں بھی اور لوگوں کی طرح ان کا زرخرید غلام ہوں۔"

"ہمیں ان لوگوں کے بارے میں سب پتا چل چکا ہے، ریٹا اور شوکت نے ہمیں اس اہم رپورٹ سے بھی آگاہ کر دیا ہے جس کے لیے انہیں تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے بے رحمی سے ہلاک کر دیا، چھوڑوں گا تو میں انہیں بھی نہیں۔ تم چھٹی کرو۔" طارق اس کی کوئی بات اب سننے کو تیار نہ تھا۔

"میں...... میں ان تینوں کے بارے میں بھی تمہیں بتا دوں گا مگر مجھے وچن دو کہ میری جان بخشی کر دو گے۔"

"ہم کوئی وعدہ نہیں کر سکتے، ہاں البتہ یہ تمہارے

تعاون کی نوعیت پر ہی منحصر ہو سکتا ہے کہ تم ہمیں ان کے خلاف کارروائی کرنے میں کتنی مدد کر سکتے ہو۔ ورنہ تمہارا انجام موت ہی ہے۔ کیونکہ تمہیں اندازہ نہیں شاید کہ ہمارے اپنے پیارے عزیز، رشتے دار اور بھائی ان خونی درندوں کے ہتھے چڑھ کر بیدردی سے مار دیے گئے، ہم بھلا ان پر یا ان کے حواریوں پر کیوں رحم کھائیں؟ چاہے زرخرید ہی سہی۔"

"مم...... میں اپنی جان کے عوض تم لوگوں سے پورا تعاون کروں گا۔۔۔ وچن دیتا ہوں میں......"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مداخلت کی۔ "تو پھر سب سے پہلے تم ہمیں اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ گے، لیکن یاد رکھنا، جھوٹ، دھوکا اور چالاکی ہم فوراً ہی بھانپ لیتے ہیں۔ لہٰذا اسے آخری موقع سمجھو۔"

"لیکن میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔" طارق بدستور اس کی فطرت دیکھتے ہوئے اسے خوف زدہ کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر بھی ہو رہا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی تھی موت کے خوف سے......

"ذرا ٹھہر جاؤ، دیکھیں یہ کیا بتاتا ہے۔" میں نے طارق کو آنکھ ماری پھر میں پرکاش کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا میں اپنا سوال دہراؤں؟" میں نے اسے گھورا۔ وہ فرفر شروع ہو گیا۔

"مم...... میرا اصل نام پرکاش ہی ہے۔ میں بھارتی شہری ہوں، یہاں پہلی بار آیا ہوں اور میں ان ہی تینوں کا چوتھا ساتھی ہوں۔ درحقیقت ہماری یہی پلاننگ تھی کہ ہم میں سے تین افراد ریٹا اور شوکت کو ٹھکانے لگائیں گے اور ان سے وہ رپورٹ لے اُڑیں گے۔ اس کے بعد تمہیں اغوا کر کے بھارت پہنچانا تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو تم تینوں کو ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھ کر ہم چونک پڑے۔ ہمیں تمہاری تصویر دکھائی گئی تھی۔ یوں فوری طور پر ہمیں اپنے منصوبے میں ترمیم کرنی پڑی، میں تم لوگوں کے پیچھے لگ گیا اور وہ تینوں ریٹا اور شوکت کو ٹارگٹ کرنے کے لیے ہوٹل میں داخل ہو گئے، میں درحقیقت تمہارا ٹھکانا دیکھ کر واپس لوٹ جانا چاہتا تھا تاکہ بعد میں اپنے ان تینوں ساتھیوں کے ساتھ تم پر بھی دھاوا بولا جائے۔ لیکن میرے تعاقب کا تمہیں شبہ ہو گیا اور میں بھی خطرے میں پڑ گیا تو میں نے تم لوگوں کو اپنے بارے میں جھوٹی کہانی سنا کر رام کرنا چاہا تھا۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو طارق نے سوال کیا۔

"ڈاکٹر سیف کو اغوا کرنے اور اسے انڈیا لے جانے کا مقصد؟"

"ہمیں اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔"

"یہاں تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"شنکر چانکیہ نے......"

اس نام پر میں چونکا تھا، کیونکہ اس کا ذکر رپورٹ میں موجود تھا۔ طارق نے اس سے کہا۔

"زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا، تم ہمیں وہی کچھ بتا رہے ہو جو ہمیں اس رپورٹ، شوکت اور ریٹا سے مل کر معلوم ہو چکا ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ شنکر چانکیہ کے یہاں پاکستان میں اس خونی کاروبار کے سلسلے میں کن کن لوگوں سے روابط ہیں؟"

"ان خونی سوداگروں کا ایک بین الاقوامی ریکٹ ہے۔ جسے کوڈ ورڈ کے طور پر "باڈی سنڈیکیٹ" کا نام دیا گیا ہے۔" پرکاش بتانے لگا۔ "بنیادی طور پر اس تنظیم کا کوئی ایک سربراہ یا باس نہیں ہے۔ البتہ یہ اس کاروبار میں پارٹنرز کہلاتے ہیں۔ جو ابھی تک پانچ کی تعداد میں ہیں، ایک تو یہی بھارتی شنکر چانکیہ ہے، دوسرا گوہر شاہ ہے۔ تیسرا مڈل ایسٹ کی ایک ریاست سے تعلق رکھنے والا اسعد عامر الکریم ہے (اس نام پر میں چونکا تھا۔ جب میں مذکورہ ریاست کے ایک اسپتال میں تعینات تھا تو پولیس تفتیش کے دوران خالد کی زبانی یہ نام میں نے سنا تھا، جو وہاں کا ایک بزنس ٹائیکون تھا۔ خالد نے اپنے آئی فون پر مجھے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی)

"ان کا چوتھا پارٹنر تھائی لینڈ سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پانچواں یورپ کے کسی ملک کا ہے، ان آخری دو افراد کے بارے میں مجھے اس سے زیادہ جان کاری نہیں ہے۔" پرکاش اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔

"کیا شنکر چانکیہ کا براہِ راست یہاں گوہر شاہ سے رابطہ رہتا ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"ان پانچوں کا براہِ راست اور کسی بھی وقت ایک دوسرے سے رابطہ رہتا ہے۔"

"تم چاروں کی یہاں آمد اور مقصد سے گوہر شاہ بھی واقف تھا؟" یہ سوال طارق نے کیا۔

"ہو سکتا ہے، مگر ہمیں یہی حکم دیا گیا تھا اور اپنا کام فوراً نمٹا کر کسی سے ملے بغیر واپس آنے کی تاکید کی گئی تھی۔"

"ہم......" طارق نے ہنکاری بھری تو میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر رمیش اگروال کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

"کچھ نہیں، یہ نام ... میں آپ کے منہ سے پہلی بار سن رہا ہوں۔" پرکاش نے جواب دیا۔ میں نے ایک لمحہ بھانپتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اگلا سوال مڈل ایسٹ کی اسی ریاست کے اسپتال سے کیا جہاں میں کام کیا کرتا تھا۔ "کیا اس اسپتال کا ان خونی سوداگروں سے کوئی تعلق ہے؟"

"اسپتال کا تو کوئی تعلق نہیں، البتہ وہاں آرگن ٹرانسپلانٹیشن کے علاج کی آڑ میں وہاں کے بعض لوگوں کے مفادات کے لیے کچھ ڈاکٹر اور سرجن کے بھیس میں کام ضرور کرتے ہیں۔"

"گویا مذکورہ اسپتال کی انتظامیہ کو خبر نہیں ہے اس کی......؟"

"نہیں۔"

"اب آخری سوال......" طارق نے مداخلت کی۔ "وہ تمہارے تینوں ساتھی ہمیں کہاں ملیں گے؟"

پرکاش نے ایک مقامی ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "ہم اسی ہوٹل میں تھے مگر اب ان کا وہاں ملنا ناممکن ہوگا، وہ اس واقعے اور حملے کی ناکامی کے بعد وہاں سے رفوچکر ہوگئے ہوں گے۔"

"تو گویا تم ان کے ٹھکانے سے واقف نہیں ہو۔" میں نے اسے گھورا۔

"ظاہر ہے، مجھے کیا معلوم کہ وہ وہاں سے کہاں گئے ہوں گے۔ میں تو یہاں آپ لوگوں کے قبضے میں ہوں۔"

"تم اب ہمارے قبضے میں ہی رہو گے۔" طارق نے کہا اور مجھ سے بولا۔

"اسے تمہارے دوست ایس پی شاداب کے حوالے کر دیتے ہیں، وہ جانے اس کا کام...... ہم اپنے اگلے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا سوچتے ہیں۔"

شاداب سے رابطہ کر کے میں نے اسے مختصر الفاظ میں ان سارے واقعات کی رُوداد بتائی اور ساتھ ہی انسپکٹر رضوان کی "مشتبہ" جانبداری کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھا۔

شاداب نے آج اسٹیشن روڈ پر ہونے والے خونی واقعے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے میری کاوشوں کو سراہا اور آئندہ کے لیے بھی تاکید کر دی کہ میں اسے اسی طرح "اپ ڈیٹ" کرتا رہوں۔

یہ اس کا خیال تھا کہ میں ایسا کروں گا، جبکہ میرا ایسا ارادہ صرف ضرورت کی حد تک تھا۔

طارق سے پوچھ کر میں نے شاداب کو یہاں کا پتا بتا دیا۔ اس نے گاڑی میں پولیس کے دو آدمی روانہ کر دیے جو پرکاش کو اپنے ساتھ لے گئے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے طارق کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ان تینوں کی تلاش......"

"یہ تو اس بھرے پُرے شہر میں بھوسے میں سوئی تلاشنے کے مترادف ہوگا۔" رومی نے کہا۔

"وہ اپنا کام کر کے نکل گئے ہیں...... یوں بھی ہم سے مارا ماری کے بعد اب شاید وہ دوبارہ ہم سے بھڑنے کی کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنے لائحہ عمل کے تحت کام شروع کر دینا چاہیے۔"

"یعنی حاصل پور کی جانب روانگی؟" طارق نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

"لیکن صرف میں اور تم ہوں گے۔ رومی کی ضرورت نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ رومی نے پہلے تو حیرت سے ایک نگاہ طارق پر ڈالی، پھر میری جانب قدرے خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ میں کیوں نہیں ساتھ چلوں؟ کوئی وجہ؟"

"وجہ تم خود ہو۔" میں نے کہا۔ طارق ہنسنے لگا۔

"نہیں، میں بھی چلوں گی۔" اس نے بڑی رسانیت سے میری جانب تکتے ہوئے ضد کی۔

"جانے دو ڈاکٹر! لے چلتے ہیں اِسے بھی...... بچّی ہے خوش ہوجائے گی۔" طارق ہنسا۔

"ایک شرط پر۔" میں نے کہا۔

"کیسی شرط؟" رومی نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے کوئی نصیحت نہیں کرو گی۔"

"منظور ہے۔" اس نے فوراً کہا۔ طارق نے شاید ذرا دیر پہلے اس کے ساتھ کھُسر پھُسر کر کے اسے سمجھا بجھا دیا تھا۔

اس دوران میں حمیرا کی کال دوبارہ آئی تھی، میں اٹینڈ نہیں کر سکا تو اس کا ایس ایم ایس آیا ہوا تھا۔ خیریت اور میری موجودگی پوچھ رہی تھی۔ دل تو چاہا اسے کال کروں لیکن میں نے ایس ایم ایس کے ذریعے ہی اسے مختصراً اپنی خیریت اور مصروفیت کا بتا دیا اور جلد رابطہ کرنے کا بھی کہا۔

حقیقت یہی تھی کہ میں اب حمیرا سے دور رہنا چاہتا تھا۔ دشمنوں کی تازہ دھمکیوں کے بعد یوں بھی امجد صاحب اور کافی حد تک باپ کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حمیرا

نے بھی باہر یوکے اپنی خالہ کے ہاں جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اب وہ دونوں باپ بیٹی کب روانہ ہونے والے تھے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

حمیرا کے بیرون ملک جانے سے میرا دل بھی بھاری ہونے لگا تھا، ایک کرب ایک دکھ مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا، دل چاہا اس سے بات کر لوں، مگر اپنے آپ سے ڈر لگا کہیں اس کی آواز سن کر اس کے لہجے کی پژمردگی، اس کی تڑپ مجھے پگھلا نہ ڈالے، میں نے ارادہ بدل دیا۔ پڑھائی کے بہانے ہی سہی وہ یوکے جا رہی تھی تو یہ اچھا ہی تھا۔ ممکن تھا کہ امجد صاحب بھی اپنا بزنس وہیں سیٹل کرنے کی کوشش کرتے۔

☆☆☆

دین میں نے امجد صاحب کو تیمور کے ہاتھ بھجوا دی، تیمور طارق کا ہونہار شاگرد تھا۔ اکیلا تھا۔ طارق کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔

اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ طارق کی مہران میں ہم روانہ ہو گئے۔

مشہور بازار والی روڈ سے ہم گلبرگ کی سڑک پر آئے اور وہاں سے عبدالحکیم موٹروے سے ہم نے سفر کی ابتدا کی، روبی کا خیال تھا کہ نیشنل ہائی وے یا پھر دیپالپور روڈ کا راستہ اختیار کیا جاتا۔ مجھے مذکورہ راستوں کا کچھ اندازہ نہ تھا، مگر طارق نے موٹروے کو ہی ترجیح دی تھی اس لیے بھی کہ وہ ایک رواں روڈ تھی۔ اس کے محتاط اندازے کے مطابق ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے پانچ سے ساڑھے پانچ گھنٹے لگ سکتے تھے۔ مہران آٹھ سو سی سی کی ایک ہلکی پھلکی فیملی گاڑی تھی۔ پانچ گھنٹوں کا سفر اس میں آرام سے طے کیا جا سکتا تھا۔

طارق نے اسٹیئرنگ سنبھالا ہوا تھا، جبکہ میں اس کے برابر والی نشست پر اور روبی پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ ... وہ لیپ ٹاپ کا کام اپنے سیل فون سے لے رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ سے ساری معلومات اور ڈیٹا وغیرہ یو ایس بی میں بھی رکھتی تھی، تاکہ بہ وقتِ ضرورت اور جگہ کی گنجائش کے مطابق اسے اپنے فون کے ذریعے استعمال کر سکے اور اب بھی وہی کر رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے ہیڈ آفس سے بھی رابطے میں رہتی تھی۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد روڈ سائڈ ہوٹل میں ہم ذرا چائے وغیرہ پینے کے لیے رکے۔ یہاں ہم نصف گھنٹا رکے اس کے بعد پھر روانہ ہو گئے۔

ڈیڑھ بجے تک ہم حاصل پور پہنچ چکے تھے۔ حاصل پور جنوبی پنجاب میں ضلع بہاولپور کی تحصیل کہلاتی تھی۔ یہ علاقہ بہاولپور سے تقریباً چھیانوے کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے ستلج اور انڈیا کے بارڈر پر تھا۔

ہمیں کراکوٹ والی جس قلعہ نما عمارت کی تلاش تھی، وہ شمال مشرق میں کہیں واقع تھی، جیسا کہ مذکور ہو چکا، طارق نے چند دن پہلے گوگل میپ پر سرچ کر کے مجھے بتایا تھا کہ یہ عمارت حاصل پور کے شمال مشرق میں واقع تھی۔ جب میں نے اسکرین پر اس عمارت کو دیکھا تھا تو ایک ہول سا میرے اندر اٹھا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی مگر طارق نے جس عمارت کی نشان دہی کی تھی، وہ خاصی بڑی اور کسی قلعے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف موٹی اور اونچی دیوار والی فصیل تھی، اندر کئی عمارتیں تھیں اور آس پاس سرسبز ماحول تھا۔ کیونکہ یہ جگہ پنجاب کی دریائی وادیوں میں آتی تھی، اس کا کوئی نام نہیں تھا میں نے طارق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا تھا۔ ''اس عمارت کو یہ لوگ کراکوٹ کہتے ہیں۔ اس کا مالک جبار ماہی نامی شخص ہے۔''

''اس کا گوہر شاہ سے کیا تعلق ہے؟''

''بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں ہے مگر ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں وہی گوہر شاہ کا آدمی ہے مگر ساتھ ہی خود مختار بھی ہے۔''

''تب تم اسے بزنس پارٹنر کہہ لو۔ وہ صرف تنخواہ پر کام نہیں کرتا ہوگا بلکہ نفع میں شامل ہوگا۔''

''عین ممکن ہے۔'' طارق نے سر ہلایا۔ ''عنقریب سو افراد کی ایک کھیپ کراچی کی طرف جانے والی ہے۔''

میں حیران رہ گیا۔ ''سو افراد، یہ تعداد بہت زیادہ نہیں ہے کیا؟''

''اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔'' طارق نے بتایا۔

''جنوبی پنجاب میں حاصل پور کے پاس کہیں ان لوگوں کا مرکز ہے جہاں یہ ان لوگوں کو رکھتے ہیں جن کے اعضا نکالنے ہوں۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ وہاں براہِ راست آپریٹ بھی ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو اسمگل بھی کیا جاتا ہے۔''

''کہاں؟''

اس نے شانے اچکائے۔ ''ظاہر ہے بیرونِ ملک۔''

معلوم یہ ہوا کہ ان لوگوں کو پہلے کراچی بھیجا جاتا ہے اور وہاں سے وہ مختلف راستوں سے باہر جاتے ہیں۔“

”انسانی اسمگلنگ کا تو سنا ہے لیکن اعضا کے لیے انسانوں کی اسمگلنگ کا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔“

”جو لوگ اس طرح اسمگل ہو کر جاتے ہیں، ان کا ہر طرح سے استحصال ہوتا ہے۔ عورتوں کو جنسی غلام کے طور پر بیچا جاتا ہے اور مرد بیگاری کیمپوں میں کام کرتے ہیں۔ بچے غلام کی حیثیت سے دولت مندوں کو فروخت کیے جاتے ہیں۔ بچوں سے خطرناک جگہوں پر کام لیا جاتا ہے۔ اونٹوں کی ریس کا تو تم نے سنا ہوگا اس کے علاوہ بھی بچوں کو بہت سی جگہوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔“

لہٰذا ان ساری باتوں کے تناظر میں...... کراکوٹ پر ہمارے خفیہ ایکشن پلان سے گوہر شاہ سمیت ان خونی درندوں کے خلاف ٹھوس شواہد اور ثبوت ملنے کے امکانات تھے۔

شوکت اور ریٹا سے حاصل کردہ رپورٹ اور معلومات کے مطابق میرے بھائی عادل کے قاتلوں میں...... ڈاکٹر رمیش اگروال کا ہاتھ تھا۔ وہ مجھ سے ذاتی بغض اور عناد رکھتا تھا۔ اس نے مربوط منصوبہ بندی کے تحت...... گوہر شاہ کے ذریعے میرے بھائی عادل کو اغوا اور پھر اس کے اعضا کی جبری چوری کر کے ہلاک کر دیا۔ مجھے رمیش اگروال جیسے بغض سے ہر طرح کی امید تھی مگر مجھے رہ رہ کر اس پر طیش آرہا تھا کہ آخر میں نے اس کا ایسا کیا بگاڑا تھا کہ اس نے محض اتنی سی خار پر اتنا بڑا جرم کر کے ناقابلِ تلافی دکھ مجھے دیا تھا۔ میں نے تو اسی دن ہی بھائی کی قبر پر قسم کھائی تھی کہ اس کے خونی اور گھناؤنے قاتلوں کو بھی اسی طرح عبرتناک اور اذیت ناک موت سے ہمکنار کروں گا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ابھی اُڑ کر اس کے پاس جا پہنچوں اور اس رذیل شخص کا خون پی جاؤں۔

یہ ایک بڑا ریکٹ تھا، مجھے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا تھا اور ان کے گرد اس طرح جال پھیلانا تھا کہ یہ سب قانون کی زد میں آکر پھر نہ نکل سکیں۔

اب تو طارق کو بھی میرے توجہ دلانے پر احساس ہو چکا تھا کہ کراکوٹ کی عمارت ان مجرموں کے گلے کا پھندا بن سکتی ہے، بشرطیکہ کہ ہم کسی جلد بازی سے کام نہ لیتے ہوئے ایک مربوط پلاننگ سے ان پر ایسا کاری وار کریں کہ وہ بچ نہ سکیں۔

شہر پہنچتے ہی ہم نے فوراً کراکوٹ کا رخ کرنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ ایک ہوٹل میں کمرا لے کر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ دشمن پر کاری وار لگانے کا وقت آچکا تھا۔ بقول طارق کے، کراکوٹ پر وار گویا ان خونی سوداگروں کی شہ رگ دبانے کا مترادف ہو سکتا تھا۔

پانچ، چھ گھنٹوں کی تھکن ہم نے کھانا وغیرہ کھا کر سو کے اتاری تھی۔ رات نو بجے جاگے۔ غسل کیا اور روم سروس کے ذریعے کھانا ہم نے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ کچھ خاص بھوک نہ تھی اسی لیے ہلکا پھلکا ہی کھایا گیا تھا۔

اس کے بعد ہم ایک بار پھر کراکوٹ کے محل وقوع کا جائزہ لینے کے لیے لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئے۔ راستے میں اس سلسلے میں رومی نے اس پر خاصا کام کیا تھا۔

اس نے دریائی وادی کے اس علاقے کو کئی زاویوں سے کلوز کر کے اور چند دیگر ویب سائٹس کھنگالنے کے بعد قریب کی معلومات بھی لے رکھی تھیں۔

جہاں مذکورہ عمارت تھی، وہ جگہ خاصی سرسبز تھی۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی، رومی نے اس سلسلے میں مقررہ تاریخوں کے پرانے اخبارات کی خبروں اور کالموں سے یہ اپ ڈیٹ بھی لیتے ہوئے بتایا کہ مذکورہ قلعہ نما عمارت کو بہ ظاہر فارم ہاؤس شو کیا گیا تھا اور اس کے اردگرد جو کچی پکی آبادیاں تھیں اور جو مکانات تھے، وہ اس عمارت کی ”پرائیوسی“ کی خاطر دھونس دھمکی اور دیگر حیلے بہانوں سے علاقہ مکینوں سے جبراً خرید لیے گئے تھے یوں اب آس پاس میلوں تک سرسبز بارانی سا جنگل بنا دیا گیا تھا۔ اس کے پار دریائے ستلج اور پھر انڈین بارڈر تھا۔ اس جنگل میں عمارت کے مالک جبار ماہی کے ہی مسلح آدمی گشت کرتے رہتے تھے اور کسی بھی مشکوک آدمی کو دیکھتے ہی گرفت میں لے لیتے تھے، بالفاظ دیگر پرائیویٹ پراپرٹی کے طور پر وہ علاقہ ممنوعہ تھا۔

”گویا ڈاکٹر سیف! تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہمیں وہاں گوریلا ایکشن ہی کرنا پڑے گا۔“ طارق نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”گوریلا ایکشن نہیں جاسوسی، یعنی پہلے سراغ رسانی کرنا ہوگی، پتا چلانا ہوگا کہ اندر ہو کیا رہا ہے؟ تاکہ شواہد اور ٹھوس ثبوت حاصل کیے جاسکیں۔ عملی کارروائی تو پولیس ہی کرے گی۔“ رومی نے تصحیح کی۔

رومی نے یہ آخری الفاظ میری جانب ایک نگاہ تکتے ہوئے کہے تھے، مجھے اس پر کوفت سی محسوس ہوئی اور حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ جس کا میں نے چہرے وغیرہ سے اظہار ہونے نہیں دیا تھا۔ جانے کیوں میری ایک بات اس

نے پکڑلی تھی کہ..... کہیں میں اپنے ذاتی انتقام کے لیے قانون کو ہاتھ میں نہ لے لوں۔ نہ جانے طارق نے اس کی میری جانب سے کیسی تسلی کروائی تھی کہ میری خلاصی نہیں ہو پا رہی تھی اور نہ روبی کی تشفی۔

اگر روبی میرے متعلق ایسا سوچ بھی رہی تھی تو اس میں اس بے چاری کا بھی کیا قصور تھا، وہ خود ایسے ہی بین الاقوامی ادارے سے متعلق تھی جسے قانون کہتے ہیں۔ بے شک میں بھی قانون کی پاسداری کرنے کو اپنا فرض سمجھتا تھا مگر کبھی کبھی یہ سوچ مجھے بے چین اور مضطرب بھی کر ڈالتی تھی کہ اگر کبھی ایسا ہوا، یعنی دشمنوں اور مجرموں کے خلاف ٹھوس شواہد اور ثبوت ہونے کے باوصف وہ قانون کے نرغے میں تب بھی نہ آسکیں تو پھر کیا ہوگا؟ گرفتاری......، ضمانت......، پیشیاں...... تاخیری حربے...... جیسا کہ بڑی سیاسی و غیر سیاسی اور بااثر شخصیات ایسے ہتھکنڈے اختیار کرتی رہی ہیں؟

جبکہ ڈاکٹر رمیش اگروال، جسے اب میں ڈاکٹر کہنا بھی اس معزز اور سچے پیشے کی توہین سمجھتا ہوں، شوکت اور ریٹا کی رپورٹ پڑھنے کے بعد گوہر شاہ وغیرہ میرے ثانوی دشمنوں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے (اگرچہ وہ اس میں برابر کے شریک تھے) لیکن اس بدذات رمیش اگروال نے تو براہِ راست میرے ساتھ دشمنی اور نفرت و انتقام کا جذبہ رکھا تھا، جس کے بل بوتے پر مجھے یہ ناقابلِ تلافی زخم دیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس بدذات کا بگاڑا بھی کچھ نہیں تھا، مگر اب مجھے اس کا جو بگاڑنا تھا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے ساتھ سرجن امرناگ بھی تھا۔ یہ دونوں اگرچہ پہلے ہی سے...... خونی سوداگروں کے اس ٹولے کے لیے خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ باقی رپورٹ میں وہی کچھ تھا جس کا ہمیں بھی پہلے ہی سے اندازہ تھا، تاہم اب یقین ہو گیا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہی عمارت گوہر شاہ وغیرہ کے گلے کا پھندا بھی بن سکتی ہے، مگر شرط یہی ہے کہ ہمیں اس کلیو کو جلد بازی سے نہیں بلکہ بہت محتاط ہو کے کام میں لانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''بالکل۔'' روبی بولی۔ طارق نے بھی ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

''ہاں! اگر ذرا سی بھی انہیں ہماری بھنک پڑ گئی، تو یہ اپنا وہاں سے بوریا بستر لپیٹنے یا اسے کسی اور طرح ''کیموفلاج'' کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ اس کے بعد ہمارے ہاتھ کچھ نہیں رہے گا ان کے خلاف کرنے کو۔''

''اس کے لیے ہمیں بھیس بھی بھرنا پڑے گا، تاکہ دھر لیے جانے کی صورت میں نکاسی کی راہ بن سکے۔'' روبی نے مشورہ دیا تو طارق نے فوراً اختلاف کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''دھر لیے جانے پر یہ ہمیں زندہ ہی کب چھوڑیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی شخص ان کی راجدھانی میں غلطی سے بھی داخل ہو جاتا ہوگا تو اسے کہاں زندہ چھوڑتے ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ روبی کی بات غلط نہیں ہے۔'' میں نے پہلی بار روبی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں کوئی نہ کوئی بچاؤ کا طریقہ اختیار کر کے ہی اس خطرناک مہم پر نکلنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' طارق نے کہا۔ پھر روبی، طارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم بوڑھے آدمی کا بھیس بھر لو، سیف اور میں شکلیں بدل کر میاں بیوی کا بہروپ بدل لیتے ہیں۔''

''بھائی بہن کا بھی تو بہروپ بھر سکتے ہیں؟'' میں نے اس کی جانب گھورا تو طارق ہنستے ہوئے بولا۔

''یار! تم بہت ٹچی ہو جاتے ہو، یہ ڈراما ہوگا۔''

روبی بھی ہنسنے لگی۔ میں خاموش رہا۔

وہ دن ہم نے آرام کیا اور اپنے سازوسامان کی کٹس میں موجود اشیا، کا جائزہ لیا تاکہ اگر کوئی کمی بیشی ہے تو وہ ''کراکوٹ مہم'' پر جانے سے پہلے ہی پوری کر لی جائے۔

اس مہم کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا حصہ نظری تھا اور دوسرا عملی۔

صبح میں جا کر پہلے ہم آس پاس کے علاقے کا جائزہ لینا چاہتے تھے، اس میں تھوڑی بہت یا ضرورتاً مقامی افراد سے بات چیت (پوچھ گچھ) بھی شامل تھی، پھر ہوٹل واپسی اور اس کے بعد مہم کے دوسرے حصے یعنی عملی کارروائی پر رات کو نکلا جاتا۔

صبح ہم جلدی جاگ گئے، معمول کے مطابق کمرے میں ہی ہلکا پھلکا ناشتا منگوالیا۔ یعنی چائے، بریڈ، ابلا ہوا انڈا جیم۔ چائے پیتے اور باتوں کے دوران آخر میں طارق نے سگریٹ سلگالیا پھر یونہی کھڑکی کی طرف ٹہلتا ہوا گیا تو میں اور روبی بھی اٹھنے لگے کہ اچانک طارق کی چونکتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے......! یہ تو وہی جیپ ہے۔" رومی اور میں نے اس کی آواز پر چونک کر گردنیں موڑ کر دیکھا۔ وہ اب کھڑکی سے باہر ایک پردے کی تھوڑی آڑ سی بڑھا کر نیچے دیکھ رہا تھا، اس کا انداز محتاط تھا، ساتھ ہی اس نے ہمیں بھی قریب آنے کا اشارہ کر دیا۔ میں اور رومی متحیر چہروں کے ساتھ اس کے قریب پہنچے تو اس نے کھڑکی سے چہرہ ہٹا کر ہم سے کہا۔

"دیکھو ذرا...... یہ وہی لگژری جیپ نہیں ہے، جس کے سواروں نے ہم پر ہٹ میں ہلا بولا تھا؟"

میں اس کی بات سن کر چونکا اور سب سے پہلے میں نے آگے بڑھ کر پردے کی اوٹ سے دیکھا۔

یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا، اس کی کار پارکنگ زیادہ کشادہ نہیں تھی، وہ جیپ احاطے کے اندرونی گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی اور اس میں کوئی بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند ضروری نشانیوں کے سبب میں بھی اس جیپ کو پہچان گیا، جس پر ہمارا شبہ تھا کہ ہمارے تینوں قیدیوں اور ہم پر ہٹ میں حملہ کرنے والے یہی لوگ ہو سکتے تھے۔

"سو فیصد یہی جیپ ہے۔ اب تو میں نے اس کی نمبر پلیٹ بھی ذہن نشین کر لی ہے۔" میں نے جوش سے کہا مگر دوسرے ہی لمحے خطرے کو آس پاس محسوس کرتے ہی میرے رگ و پے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ رومی نے سرسری نگاہ ہی ڈالی تھی، ظاہر ہے اس وقت وہ موجود نہیں تھی ہمارے ساتھ اس لیے جیپ کو وہ کیا پہچانتی؟

"کیا یہ لوگ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں؟" طارق نے خود کلامیہ انداز میں کہا۔

"یہ تو بُرا ہو گیا، یہاں آتے ہی ہمارے مشن کا پہلا مرحلہ فیل ہو چلا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہوا؟" رومی نے باری باری ہمارے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں نے تو دورانِ سفر پوری احتیاط کر رکھی تھی کہ...... کوئی مشکوک گاڑی ہمارے تعاقب......"

"بہت ہوشیار اور چالاک لوگ نکلے ہیں یہ......" طارق نے دانت پیس کر تبصرہ کیا۔ "ان مردودوں نے تو اب تک کراکوٹ والوں کو ہوشیار بھی کر دیا ہوگا اور اب یقیناً ہماری گھات میں یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔"

"میں اپنے اردگرد خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ جس سے ماحول میں ایک دم سنسنی پھیل گئی۔

"مجھے معاملہ کچھ اور ہی محسوس ہو رہا ہے۔" رومی نے اچانک جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مثلاً......؟" طارق نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا خبر تمہیں مغالطہ ہوا ہو۔" وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔ "نمبر پلیٹ تو تمہیں معلوم نہیں، محض نشانیوں سے کسی گاڑی کا پتا لگانا تُکے کے سوا کچھ نہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ کوئی اور لوگ ہو سکتے ہیں؟" طارق نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا۔

"ہاں......! ورنہ وہ اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ اس طرح اپنی گاڑی یہاں پارک کرتے۔"

"لیکن میں سو فیصدی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ انہیں لڑکوں کی گاڑی ہے۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔ "افسوس کہ میں نے اس کی نمبر پلیٹ پر غور نہیں کیا تھا مگر اس کی جزئیات ازبر ہیں مجھے۔"

"میرا خیال ہے ہمیں مہم کے آغاز میں ہی ایک جھٹکا لگ گیا ہے، ہمیں اب اس بات کا کھوج لگانا ہوگا۔"

طارق نے کہا، وہ اب بھی تھوڑے وقفے سے کھڑکی سے باہر جھانک لیتا تھا۔

"وہ آ گئے...... تم بھی دیکھو سیف!" اچانک طارق نے چونکتے ہوئے کہا۔

میں بھی بدک کر آگے بڑھا اور نیچے جھانکنے لگا۔ وہ صرف دو بھاری جسامت کے آدمی تھے اور میں ہی نہیں طارق بھی انہیں دیکھ کر چونکا تھا۔

"اوہ...... یہ تو واقعی رومی کی بات سچ نکلی...... یہ کوئی اور ہی افراد ہیں۔" طارق نے بدستور نیچے تکتے ہوئے کہا۔ تبھی وہ وقت تھا جب میں نے ایک موٹے آدمی کو بھی ذرا ہی دیر بعد ہوٹل کے اندرونی دروازے سے باہر نکلتے اور ان کی جانب بڑھتے دیکھا، اس کے ہمراہ ایک نوجوان بھی تھا، اسے دیکھ کر میں اور طارق بُری طرح ٹھٹکے تھے۔ یہ وہی نوجوان تھا جنہیں ہم نے ان چار پانچ نوجوانوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

"یہ تو ہوٹل کا ہی آدمی نظر آ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہمارا مطلوبہ شکار بھی ہے۔" میں نے کہا۔ اپنی بات کے درست ثابت ہوتے ہی یکایک میری آواز فرطِ جوش سے مرتعش ہونے لگی۔

ہوٹل کے مالک کو پہچان لینے کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم اس ہوٹل میں داخل ہوئے تھے تو ہم تینوں نے اسے ریسپشن

پر عملے کے افراد کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اس وقت چند ویٹرز کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ یہ ہوٹل کا مالک منیر گانجا ہے، لیکن اب مطلوبہ نوجوان کی اس کے ساتھ موجودگی ہمارے اچنبھے کا سبب بننے لگی تھی۔ سر دست رومی کی پھر نصف حد تک بات درست ثابت ہو رہی تھی، افراد وہی تھے مگر معاملہ اور تھا۔

اول الذکر دونوں بھاری جسامت والے آدمی اس وقت جیپ میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، وہ نوجوان منیر گانجے کے آگے تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ پہلے والے اس کے دو ساتھیوں میں سے ایک سوار ہو چکا تھا، دوسرا نوجوان اور ہوٹل کے مالک منیر کو آتا دیکھ کر جیپ کا دروازہ کھولے کھڑا ہو گیا، مگر نوجوان کے قریب آتے ہی وہ سوار ہو گئے، منیر نیچے کھڑا رہا، وہ اب ان سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ان تینوں کی منت سماجت کر رہا ہو۔ یہاں تک کے کھڑکی کی سیٹ والے نوجوان نے اسے دھکا دیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

منیر کچھ دیر کھڑا جیپ کو حسرت سے جاتا دیکھتا رہا، اس کے بعد اس نے سیل فون نکالا اور کسی سے باتیں کرتا ہوا ہوٹل کے دروازے کی جانب پلٹا۔ پلک جھپکتے میں میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں دروازے کی جانب بھاگا۔ میری اس حرکت پر یقیناً طارق اور رومی ہکا بکا ہو گئے ہوں گے۔

میں ہوٹل کی مختصر سی لابی میں آ گیا اور میری متلاشی نظریں دروازے پر جمی رہیں جہاں سے منیر گانجا ہنوز سیل فون کانوں سے لگائے ہوئے ریسپشن کاؤنٹر کے برابر میں بنے چھوٹے سے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اس کا شاید آفس روم تھا۔

میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں گردشی نظروں سے کاؤنٹر کی جانب دیکھا، وہاں دو افراد اپنے کام میں مگن تھے۔ میں تیزی سے کھسکتا ہوا قریب ایک ستون کی آڑ سے دوسری جانب کے خلا میں آیا، یہاں سے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اب میں اندر موجود منیر کی فون پر ہونے والی گفتگو بہ آسانی سن سکتا تھا، اگرچہ اس طرف کسی کے نکل آنے کا خدشہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ تاہم میں نے سوچ رکھا تھا کہ دیکھ لیے جانے پر کوئی بھی عمومی نوعیت کا بہانہ کر دوں گا۔

''سائیں پھل صاحب! جلدی سے کچھ کیجیے، وہ لوگ نہیں مان رہے ہیں۔ میرا ایک ہی جوان بیٹا ہے، صابر کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ لاش بن جاؤں گا اور...... اور جیراں تو بس مر ہی جائے گی...... ن ن...... نہیں پھل صاحب! میں تمہاری بہن کو بددعا نہیں دے رہا میں تو...... اچھا...... چنگا، وڈی مہربانی سائیں پھل صاحب، ہن تساں ہی کچھ کرے سیں...... (اب تم نے ہی کچھ کرنا ہے۔) زمیندار جبار ماہی ڈاڈا ڈنگا ہے......'' (بڑا ٹیڑھا ہے)

مجھے ہوٹل کے مالک منیر گانجے کی آواز سنائی دی، جس سے وہ فون پر باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے منہ سے...... جبار ماہی کا ذکر سن کر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ معاملہ کچھ سمجھ میں آیا تھا میری کہ جبار گروپ نے اس کے بیٹے کو اغوا کر لیا تھا اور اس کے ساتھی اس سلسلے میں اس سے بات کرنے آئے تھے...... وجہ ابھی نامعلوم تھی۔ اب وہ کسی ''سائیں پھل صاحب'' سے مدد کا خواہاں تھا، شاید منیر گانجے کی بیوی سائیں پھل کی بہن بھی تھی اور اغوا ہونے والے لڑکے کا وہ ماموں بھی تھا۔

بس، یہی بات ہوئی اور پھر منیر نے کسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دی۔ بات تشنہ رہی مگر ادھوری سہی، میں جس مقصد کے لیے...... اور کچھ سوچ کر اس کی جانب بھاگا تھا، وہ کسی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ لہٰذا جیسے اس نے اپنی بات ختم کر کے گھنٹی بجائی، میں فوراً وہاں سے ستون کی آڑ لے کر سیڑھیوں کے خلا کے نیچے سے ہوتا ہوا لابی میں آ گیا۔

وہاں دو کرسیوں پر میں نے طارق اور رومی کو بیٹھے دیکھا، میں سمجھ گیا وہ میرے ہی منتظر تھے۔

میری اس حرکت کا کسی حد تک وہ بھی مطلب سمجھ ہی چکے ہوں گے تاہم میرا ذہن بہت تیزی سے منصوبے کی ترمیم اور نئے اُدھیڑ بُن میں لگ گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں ان کی جانب بڑھ رہا تھا کہ میرا سیل فون گنگنایا۔

یہ حمیرا کی کال تھی، میرا دل یکبارگی جانے کس نامعلوم خدشے کے تحت دھڑکا تھا۔ اسی حالت میں جب حمیرا کی میں نے کال ریسیو کی تو دوسری جانب سے اس کی...... سسکیاں سنائی دیں۔ وہ اسی عالم میں مجھے جو بھی خبر دینے والی تھی، وہ یقیناً اچھی خبر نہیں ہو سکتی تھی......

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے
نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

ناقابلِ اعتبار

عکسِ فاطمہ

تواتر سے ہونے والی ملاقاتیں ہمیں ایک دوسرے کا عادی بنا دیتی ہیں... انسانی عادات... خصلتیں آہستہ آہستہ ایک، دوسرے پر آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں... قابلِ بھروسا... زندگی سے قریب تر لوگوں کو بھی ایک غیر معمولی موقع مل جائے تو وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کرتے... دولت کی دل فریبی کا شکار ہو جانے والے کرداروں کا مکرو فریب....

ایک ناقابلِ فہم صورتِ حال......ایک شکاری کا تیار کردہ موت کا جال

وہ خط جس کاغذ پر لکھا گیا وہ اتنا پتلا تھا کہ اس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ اس میں ہمارے خاندانی وکیل سیلاس کرسٹوفر نے استدعا کی تھی کہ میں یہاں فوری طور پر.... پہنچ جاؤں۔ نہ جانے پہاڑی پر واقع اس مکان کا نام ''بیوہ کا بسیرا'' کس نے رکھا تھا۔ بہرحال اس خط نے مجھے تھوڑا سا مضطرب کر دیا۔ یہ ایک ہنگامی نوعیت کا خط تھا اور اس کی شکستہ تحریر سے لگ رہا تھا کہ اسے بہت عجلت اور گھبراہٹ میں لکھا گیا ہے۔ میری نظروں کے سامنے سیلاس کی تصویر آ گئی۔

مہربان چہرہ، چمکتی ہوئی آواز اور ہمیشہ کی طرح سوچتی ہوئی آنکھیں، یہ تحریر اس سیلاس کی نہیں ہوسکتی جسے میں جانتا تھا۔ ضرور مارگریٹ کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کردیتی ہے۔

موسم گرما کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور مضافاتی علاقے گرمی کی لپیٹ میں تھے۔ میں اپنی چھوٹی سی آسٹن کار میں منزلِ مقصود کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گرمی سے بچنے کے لیے میں نے کھڑکیوں کے شیشے اتار دیے تھے اور صبح کی نرم و گرم ہوا میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ مکان پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے کیبل کار کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اس کے ساتھ متصل کیبل کار ٹرمینل ہی باہر کی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ اس ٹرمینل پر الیکٹرانک پینل لگا ہوا تھا اور اس میں نصب ایک سوئچ کی مدد سے کیبل کار اوپر یا نیچے جاسکتی تھی۔ جب میں پہاڑی کے دامن میں پہنچا تو کیبل کار آہستہ آہستہ مجھے لینے کے لیے نیچے آرہی تھی۔ اس کا ڈھانچا فولاد سے بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف شیشہ لگا ہوا تھا۔

وہ مکان اٹھارویں صدی میں تعمیر ہوا اور تب سے ہی Latimer خاندان کی ملکیت چلا آرہا تھا اور کچھ عرصہ پہلے تک یہاں میرا فرسٹ کزن جائلز رہ رہا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں پندرہ سال بڑا تھا۔ میں آخری بار اس کی سینتالیسویں سالگرہ پر اس سے ملنے دسمبر 1923ء میں یہاں آیا تھا۔ اس رات کی کچھ دھندلی یادیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اس روز جائلز بڑے اچھے موڈ میں تھا اور پانی کی طرح شراب پی رہا تھا۔ اس کی بیوی مارگریٹ بھی اس موقع پر شیخی بگھارنے سے باز نہ آئی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنی سہیلیوں سے ملانے لے گئی۔

''لیڈی مارچ مونٹ کو یہاں آنا بہت پسند ہے۔'' اس نے ایک کرخت چہرے والی مالدار بیوہ سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''واقعی مجھے یہاں آنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ بیوہ بولی۔

''اور اس شریف آدمی نے جائلز کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا تھا۔'' مارگریٹ نے ایک سابق نیوی افسر سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' وہ شخص اپنی ٹائی سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ ''اور تم یقیناً ایڈگر ہو جس نے آرٹ کی دنیا میں بڑا نام بنایا ہے۔''

وہ ایک یادگار رات تھی۔ اس کا ہر لمحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس کے تین ماہ بعد ہی جائلز کا انتقال ہوگیا۔ اس کی لاش سب سے پہلے مارگریٹ نے ہی دیکھی۔ وہ لندن سے واپس آئی تھی۔ اس نے کیبل کار کے شیشوں سے دیکھا کہ جائلز کی لاش پہاڑی کے دامن میں پتھروں پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور چہرہ پتھر کی طرح سخت ہوگیا تھا۔ چند روز تک تو اس کی موت کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں پھر لوگوں نے اسے یوں بھلا دیا جیسے اسے مرے ہوئے صدیاں گزر گئی ہوں۔

میں پہاڑ کے دامن میں کھڑا چٹان کو دیکھ رہا تھا اور کیبل کار آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اپنی کار سڑک کے ایک جانب کھڑی کی اور کیبل کار میں سوار ہوگیا۔ میرے بیٹھتے ہی کیبل کار ایک جھٹکے سے اوپر اٹھی۔ میں نے شیشے سے باہر دیکھا تو مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کار کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ منزلِ مقصود کے قریب پہنچتے ہوئے یہ احساس ہورہا تھا کہ میں ایک غیر یقینی صورتِ حال کی جانب بڑھ رہا ہوں۔

ایک نوجوان عورت ٹرمینل پر میرا انتظار کررہی تھی۔

''جیرالڈ، میرا خیال ہے کہ یہ تم ہی ہو۔'' اس نے خوش مزاجی سے کہا۔ ''کیا میں فرض کرلوں کہ سیلاس نے تمہیں بھی خط لکھا ہے؟''

وہ مارگریٹ کی سوتیلی بہن اسٹیو اسپاربنگ تھی۔ اس نے گھر کی طرف جاتے ہوئے بتایا کہ مارگریٹ عنقریب ہجرت کرنے والی ہے اور خاندانی موروثی اشیا لکڑی کے بکسوں میں بند کردی گئی ہیں۔ جلد ہی انہیں کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ کسی کو دوبارہ نظر نہیں آئے گی اور یہ مکان ایک بار پھر خالی ہوجائے گا۔

اسٹیو مجھے یہ بات بتا ہی رہی تھی کہ ہم مرکزی ہال میں داخل ہوئے جہاں سیلاس ہمارا انتظار کررہا تھا اور اس کے قریب ہی اوپر نیچے بہت سارے لکڑی کے باکس رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے آگے بڑھا تاہم اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

''جیرالڈ، بالآخر تم یہاں آہی گئے۔ تمہیں اسٹیو کے ساتھ دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''مارگریٹ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ ایک بہت ہی خوفناک غلطی کررہی ہے۔ اگر تم مجھے وضاحت کرنے کا موقع دو کہ میں نے تم دونوں کو یہاں کیوں بلایا ہے......''

لیکن میں اس کی بات سننے کے لیے نہیں رکا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی منزل پر چلا گیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ خود سنگھار میز کے سامنے بیٹھی کوئی پرفیوم لگا رہی تھی اور ساتھ ہی داد طلب نظروں سے آئینے میں اپنا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا اور بولی۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ بوڑھا گدھ لوگوں کو خط لکھ کر بلا رہا ہے۔''

''ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے مارگریٹ؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ مجھے اطلاع کیے بغیر اس مکان کو خالی کر دو۔ یہاں ہماری خاندانی موروثی اشیا ہیں جو نسلوں سے ہماری ملکیت چلی آ رہی ہیں۔''

اب وہ میری طرف گھومی۔ ''گویا سیلاس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟''

''کیا؟''

''میں جانتی ہوں کہ تم یہ سن کر ناراض ہو گے لیکن بہرحال تمہیں بتا رہی ہوں کہ کوئی مجھے قتل کرنا چاہ رہا ہے۔''

☆☆☆

ہم چاروں ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ مارگریٹ ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ کافی ست نظر آ رہی تھی۔ کمرے کی تمام دیواریں خالی تھیں اور اب صرف وہاں تصویروں کے فریم کے بدنما نشانات نظر آ رہے تھے۔

''مجھے تم لوگوں کو یہ بتانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' مارگریٹ نے کہا۔ ''کیونکہ میں بہت جلد یہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی شخص مجھے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''وہ اس کی وجہ نہیں سننا چاہتی۔'' سیلاس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اور نہ ہی ضروری احتیاط کر رہی ہے۔''

''کیسی احتیاط؟'' مارگریٹ نے جواب دیا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک مرتبہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے اور میں جانتی ہوں کہ یہ وہی ہے جس نے جائلز کو قتل کیا تھا۔''

''یہ حقیقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جائلز ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔''

''جیرالڈ۔'' سیلاس نے محتاط انداز میں کہا۔ ''ہم یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے۔''

''سیلاس کی بات سنو جیرالڈ۔'' مارگریٹ بولی۔ ''ہم سب صرف یہ جانتے ہیں کہ میرا شوہر پھسل کر نیچے گرا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ شاید ہم اس پر یقین کر لیتے لیکن تم اور میں دونوں ہی جانتے ہیں کہ وہ کتنا محتاط شخص تھا۔ اس طرح کے مہلک حادثات اسے پیش نہیں آ سکتے۔''

میں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ کسی نے اسے دھکا دیا؟''

مارگریٹ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''جیسا کہ تم جانتے ہو میں لندن میں تھی جب جائلز کا قتل ہوا لیکن شاید تم یہ نہیں جانتے ہو کہ وہ اس وقت اکیلا نہیں تھا جب اس کی موت واقع ہوئی۔ یہ بات میں نے پولیس کو نہیں بتائی۔''

اس نے ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ میں زنانہ سگریٹ پیتی ہوں جبکہ جائلز صرف پائپ پیا کرتا تھا لیکن جب میں یہاں واپس آئی تو میں نے ایش ٹرے میں براؤن سگریٹ کے ٹوٹے دیکھے جو ترک سگریٹ ہیں۔ میرے مرحوم شوہر یا میں نے کبھی یہ سگریٹ نہیں پیے۔ میں سمجھ گئی کہ جب اس کی موت واقع ہوئی تو کوئی اس کے ساتھ یہاں موجود تھا اسی نے اس کو قتل کیا اور اب مجھے مارنا چاہ رہا ہے کیونکہ میں اس کا راز جان گئی ہوں۔''

''بہت دلچسپ کہانی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا جیرالڈ؟ تم بتاؤ سیلاس۔ اصل واقعہ کیا ہے؟''

میں نے بوڑھے وکیل کی جانب دیکھا تب تک وہ پرسکون ہو چکا تھا۔ ''دو روز قبل مارگریٹ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

''اوہ مائی ڈارلنگ۔'' اسٹیو اپنی بہن کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔

''میں اس وقت یہاں موجود نہیں تھا۔'' سیلاس نے کہا۔ ''لیکن میں نے ثبوت دیکھے ہیں اور میں انہیں نہیں جھٹلا سکتا۔''

''ثبوت؟''

سیلاس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر باہر نکال کر اپنی مٹھی کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹے سائز کے کارتوس کا خول رکھا ہوا تھا جو اعشاریہ اڑتیس کے ریوالور میں استعمال کیا جاتا ہے۔

''یہ واقعہ کب پیش آیا؟'' اسٹیو نے پوچھا۔

''نصف شب کے بعد۔'' مارگریٹ نے وضاحت کی۔ ''میں اس کمرے میں اکیلی تھی اور تم جانتی ہو کہ میں خالی گھر میں رہنا برداشت نہیں کر سکتی لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ

میں اکیلی نہیں تھی۔ میں نے راہداری میں کسی کے قدموں کی آواز سنی اور اگلے لمحے مجھے دروازے میں ایک سائے کی جھلک نظر آئی پھر اس نے پستول اوپر اٹھایا اور فائر کر دیا۔"

"اوہ ڈارلنگ! تم یقیناً خوف زدہ ہو گئی ہو گی۔" اسٹیو نے اپنا بازو بہن کی گردن میں ڈال دیا۔

"اس نے صرف ایک ہی فائر کیا اور وہ گولی تمہیں نہیں لگی؟" میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

مارگریٹ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور اس نے اپنی بائیں آستین اوپر کھینچ کر بازو پر بندھی ہوئی پٹی دکھائی جس پر خون جما ہوا تھا۔ "اس نے ایک ہی فائر کیا لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں پتھر کی طرح نیچے گر گئی اور وہ پاگل سمجھا کہ میں مر گئی ہوں چنانچہ وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس کے دوڑتے قدموں کی آواز سنی تھی۔"

"لیکن وہ فرار کیسے ہوا؟"

مارگریٹ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کیبل کار اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں کھسکی۔ جب جائلز کی موت واقع ہوئی تب بھی ایسا ہی ہوا تھا اسی لیے سب نے فرض کر لیا کہ وہ گھر میں اکیلا تھا لیکن اب معاملہ مختلف ہے۔ جائلز کا قاتل سمجھتا ہے کہ میں اسے پہچان چکی ہوں لیکن وہ غلطی پر ہے۔ میں اس شخص کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ترکی سگریٹ پیتا ہے اور کسی کو مارنے کے لیے گولی چلانے سے دریغ نہیں کرتا۔ اسی لیے میں اس ملک سے جانا چاہ رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میرے لیے کوئی اور مشکل کھڑی ہو جائے۔"

"تم کب جا رہی ہو؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"آج...... میرا خیال ہے کہ سیلاس نے تم لوگوں کو اسی لیے یہاں بلایا ہے تاکہ مجھے روکنے کی کوشش کر سکو۔"

"لیکن میں کیوں؟" میں نے جاننا چاہا۔ "سیلاس، تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا؟"

"کیونکہ شاید تم جائلز کے قاتل کو شناخت کرنے کی پوزیشن میں ہو؟"

میں نے اپنے گلاس میں اسکاچ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہم سب کو اس سارے معاملے پر غور کرنا چاہیے۔ مارگریٹ لندن میں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی شخص یہاں آیا جس کے بارے میں ہم ابھی تک نہیں جانتے کہ وہ کون تھا۔ اس نے جائلز کو چوٹی سے نیچے پھینکنے سے پہلے ترکی کے بنے ہوئے کئی سگریٹ پیے پھر وہ غائب ہو گیا۔ کئی ہفتوں بعد وہ یہ سوچ کر واپس آیا کہ مارگریٹ اسے پہچان چکی ہے۔ اس نے مارگریٹ پر گولی چلائی اور ایک بار پھر غائب ہو گیا۔"

"اگر وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر فرار ہو گیا۔" اسٹیو نے کہا۔ "پھر اس نے سگریٹ کے ٹوٹے ایش ٹرے میں کیوں چھوڑ دیے جبکہ یہی اس کے خلاف واحد ثبوت تھا۔"

"اس سوال کا بھی ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا۔" مارگریٹ نے کہا۔ "اوہ مجھے اس طرح مت دیکھو۔ میں جانتی تھی کہ تم میری کسی بات کا یقین نہیں کرو گے۔ اسی لیے میں نے سیلاس کو تم سے رابطہ کرنے کے لیے منع کیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے پُراسرار طریقے سے یہ سب کیا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میں یہ چاہتی ہوں۔ میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔"

"لیکن مارگریٹ۔" اسٹیو نے مایوسی سے کہا۔ "تمہارے سامان کا کیا ہو گا جس میں تمہارے چھوٹے چھوٹے زیورات بھی شامل ہیں؟"

"وہ میرا نمائندہ وصول کرے گا۔ صرف ان کی خاطر میں اس بدبخت پہاڑی پر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رک سکتی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور راہداری میں چلی گئی۔

"اسے روکو پلیز۔" سیلاس نے کہا۔

میں اس کے پیچھے دوڑا، لیکن وہ پہلے ہی بیرونی دروازہ کھول کر کیبل کار کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا۔ اسٹیو میرے برابر میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پیچھے سیلاس بھی تھا۔ "ہمیں اسے روکنا ہو گا۔" اس نے کہا۔ "اسے یہاں سے اکیلے نہیں جانا چاہیے۔"

مارگریٹ کیبل کار میں سوار ہونے سے پہلے لمحہ بھر کے لیے رکی اور ہماری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "مجھے روکنے کی کوشش مت کرو جب میں کوئی فیصلہ کر لوں تو اس پر قائم رہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کار کے ساتھ لگے ہوئے کنٹرول پینل کا ایک سوئچ آن کیا۔ کار میں سوار ہوئی اور شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔

میں اس کے پیچھے جانا چاہ رہا تھا۔ تبھی میں نے اپنی کہنی پر اسٹیو کے نرم بازو کا دباؤ محسوس کیا۔ "اسے جانے دو جیرالڈ، وہ ہمیشہ سے ہی اپنی مرضی پر چلتی ہے۔"

ایک زوردار آواز کے ساتھ کیبل کار ٹرنس سے الگ ہو گئی اور نیچے کی جانب بڑھنے لگی۔ میں شیشے کی کھڑکی کے پیچھے مارگریٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

"وہ اکیلی ہے مس اسٹیو اور یہی بات ہے مجھے پریشان کررہی ہے۔" سیلاس نے کہا۔ "اگر وہ ہم میں سے کسی کو اپنے ساتھ لے جاتی......"

"اس کا یہی طریقہ ہے۔" اسٹیو نے کہا۔

ہم تینوں ٹرمینل میں کھڑے ہوئے کیبل کار کو اونچائی سے نیچے کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ تبھی میں نے شیشے پر سورج کی روشنی کی چمک دیکھی لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کیبل کار ایک لمحے کے لیے بھی میرے یا میرے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔"

ہم میں سے سب سے پہلے کس نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے؟ کیا وہ اسٹیو تھی؟ بہرحال اس نے بھاگ کر کیبل کار کو راستے میں روک دیا۔ میں نے یہ سوچا کہ یہ کام میں بھی کر سکتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے چلانا شروع کردیا تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر چلاتا رہا۔ سیلاس اس دوران بالکل خاموش کھڑا رہا جیسے جانتا ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔

اب کیبل کار زمین اور پہاڑ کی چوٹی کے درمیانی راستے میں جھول رہی تھی پھر اچانک ہی اسے ایک نارنجی شعلے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسٹیو بری طرح چلانے لگی لیکن اس خاندان کا پرانا دوست سیلاس اب بھی میرے برابر میں خاموش کھڑا ہوا تھا۔ اس کی یہ خاموشی میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں اس جلتی ہوئی کیبل کار کو دیکھ رہا تھا، اس کے نتیجے میں مارگریٹ کی ناقابلِ بیان موت واقع ہوئی اور میرے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔

کیبل کار کا اندرونی حصہ جل کر سیاہ ہوگیا تھا اور مارگریٹ کی سوختہ لاش منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دلکش عورت چند منٹ پہلے یہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ اب وہ صرف جلے ہوئے گوشت کا ڈھیر تھی جس میں سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

ایک ہفتے بعد میں نے اپنے ایک شناسا جوزف اسپکٹر کے سامنے اس کیس کی تفصیل بیان کی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے کرمنالوجسٹ تھا اور سائنسی انداز میں جرم کی تفتیش کیا کرتا تھا لیکن اسے روحانیات سے بھی دلچسپی تھی اور یہی اس کا کاروبار تھا۔ وہ ہمیشہ ہر پُراسرار معاملے کی تہ میں جاکر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ میں اکثر اس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کو دیکھ کر تعجب کیا کرتا خصوصاً جب وہ کسی قتل کی تفتیش کر رہا ہوتا۔

ہم بلیک بگ کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی جوزف کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ

معزز سامعین! سڑکوں پر ہر طرف برف جمی ہوئی ہے......

یہاں عمدہ قسم کی شراب دستیاب تھی بلکہ پرائیویسی کا ماحول بھی ملتا تھا۔ اس نے مشروب کا ایک گھونٹ لیا پھر میرے چہرے پر اپنی نیلی آنکھیں جماتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے کہ اچانک ہی اس کے جسم نے آگ پکڑلی۔"

"لیکن اس کی کوئی وضاحت نہیں دی جاسکتی۔" میں نے خودکلامی کرتے ہوئے کہا۔

"پولیس کو کیبل کار کے اندر کوئی آتش گیر مادہ نہیں ملا جو کسی چنگاری کا سبب بن سکتا۔"

ہم کھانے کے وقفے سے باتیں کررہے تھے اور اب چار بج چکے تھے لیکن ہماری گفتگو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہاں کا عملہ اس کا عادی تھا اور جانتا تھا کہ جب اسپکٹر کسی جرم کی کھوج میں مصروف ہو تو اسے تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔

"اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں کہانی بیان کرنے کی صلاحیت پر تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم یقیناً جانتے ہو کہ کس طرح ایک کہانی کو گھما پھرا کر بیان کیا جائے۔"

"اس کہانی کا ہر لفظ سچ پر مبنی ہے۔"

"لیکن میں تمہارے کرداروں پر ضرور بات کروں گا۔ تمہارے کہنے کے مطابق سیلاس اس خاندان کا خوش طبع اور خوش مزاج دوست ہے لیکن جب ہم اسے اس کہانی میں فٹ

کرتے ہیں تو وہ اس کے برعکس ایک بیزار کن اور غیر متعلق شخص نظر آتا ہے۔"

"سب لوگ اس طرح کے نہیں ہوتے اور ان سے جو توقع کی جاتی ہے وہ اس کے مطابق کام نہیں کر سکتے اور میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس وقت وہاں بہت زیادہ تناؤ کی کیفیت تھی۔"

"اس کے باوجود اس کہانی میں ایک ایسا شخص ہے جس نے بالکل وہی کیا جو اس نے سوچا تھا۔ میں مارگریٹ کی بات کر رہا ہوں۔ میرے ذہن میں اس کی جو تصویر ہے اس کے مطابق وہ وہمی، بے پروا اور ایک لمحے میں سب کچھ چھوڑ دینے سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔ اس نے مجھے مایوس نہیں کیا اس کے علاوہ اور کون اس عالی شان مکان کو ایک دستی بیگ لے جائے بغیر چھوڑ سکتا ہے؟"

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ "میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔"

"کیا تم نے اس پر غور کیا کہ اسے آنے والے خطرے کا ادراک ہو گیا تھا اور وہ اسی لیے وہاں سے فرار ہو رہی تھی؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اپنے بیئر کے گلاس میں دیکھ رہا تھا جب وہ کیبل کار میں قدم رکھ رہی تھی تو اس نے کہا تھا۔ "مجھے روکنے اور پیچھا کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"میں نہیں سمجھتا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کہ مس اسپاربنگ یا مسٹر سیلا اس میں سے کوئی ترکی سگریٹ پیتا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سیلا بھی جائلز کی طرح پائپ پیتا ہے اور اسٹیو کا کوئی مخصوص برانڈ نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ جو لگ جائے وہی پی لیتی ہے۔"

"اور تم؟"

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔ بچپن میں مجھے پھیپھڑوں کا عارضہ ہو گیا تھا۔ اس لیے احتیاط کرتا ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس شخص کو شناخت کر سکتا ہوں جو اس رات جائلز سے ملنے آیا تھا جب اس کی موت واقع ہوئی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ آگے کیا کہتا ہے۔

"تم نے ولیم ہنری کا نام سنا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے میری الجھن کو محسوس کیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے کزن جائلز کی شخصیت کو کس طرح بیان کرو گے؟ میرا خیال ہے کہ تم نے اسے ایک محتاط انسان کہا تھا۔"

"مارگریٹ نے اس کے بارے میں یہی کہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پرانے خیالات کا انسان تھا لیکن ہینڈسم اور ہوشیار ہونے کے باوجود اپنے طور طریقوں پر چلتا تھا۔"

"اس کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟"

"چند سالوں تک اس نے شہر میں فنانسر کی حیثیت سے کام کیا لیکن جب اسے وراثت میں اپنا حصہ مل گیا تو مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"لیکن اس نے کاروبار پر گہری نظر رکھی؟"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ہم اتنے قریب نہیں تھے۔"

"ٹھیک ہے جیرالڈ، میں اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کروں گا البتہ یہ بتا دوں کہ ولیم ہنری اس کے گھر آیا تھا جس رات جائلز کی موت واقع ہوئی۔"

"تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"یہ فرض کرنا جائز ہوگا کہ جائلز اس رات کسی مہمان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کو اس مہمان کے آنے کا پتا نہ چلے۔ یہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے کہ اس شخص نے جائلز کو قتل کیا یا نہیں۔ اس کے باوجود جائلز نے اس شخص کا انتظار کیا جب اس کی بیوی کے لندن سے واپس آنے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا اور وہ اپنے گھر پر اس کی میزبانی کے لیے راضی ہو گیا۔"

انسپکٹر نے اپنا گلاس ختم کر لیا تھا۔ میں نے جلدی سے ویٹر کو بلا کر اسے ایک اور مشروب لانے کے لیے کہا۔ "میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ بزنس مین پیدائشی ہوتا ہے۔ اسے بنایا نہیں جاتا۔ جائلز نے بظاہر کاروبار سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ مفادات حاصل کرنے میں لگا رہا۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتا۔ اسے بھی اپنے دماغ کو متحرک رکھنے کے لیے کوئی مصروفیت درکار تھی اور یہ ایسے مفادات تھے جنہیں اس نے اپنی بیوی سے خفیہ رکھنے کے لیے بہت زیادہ محنت کی۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ جائلز کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث تھا؟"

"شاید ابتدا میں ایسا نہیں تھا۔ شروع میں اس نے اسے ایک بے ضرر مشغلہ سمجھ کر اختیار کیا لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کام میں بہت پیسا بنایا جا سکتا ہے۔"

"تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟"

"اسمگلنگ۔"

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ شخص کو تجسس بھرے انداز میں دیکھا۔ وہ پوری طرح سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب میں تمہارے علم میں یہ بات لا رہا ہوں کہ جائلز اپنے ساتھی ولیم ہنری کے ساتھ مل کر اس ملک میں ہیروئن کی غیر قانونی اسمگلنگ کر رہا تھا اور اس رات ہنری اسے قتل کرنے نہیں بلکہ اسے تنبیہہ کرنے آیا تھا۔''

''لیکن یہ ولیم ہنری کون ہے؟ تم نے ابھی تک یہ وضاحت نہیں کی کہ تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

انسپکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''چھ جون کی صبح جب جائلز کی لاش ڈھلوان چٹان کے دامن میں پائی گئی تو اسی روز ولیم ہنری کی لاش بھی کینری وہارف میں واقع ریڈ اسٹار شپنگ کمپنی کے دفتر میں ملی۔ اس کی موت کی وجہ کنپٹی میں لگنے والا گولی کا زخم تھا۔ شاید تم نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہو؟ پولیس کا ایک مخبر کسی طرح اس کے گروہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا جس کی وجہ سے اس کی کارروائی وقت سے پہلے بے نقاب ہو گئی اور وہ سمجھ گیا کہ اس کے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے آسان راستے کا انتخاب کیا۔''

''اوہ۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں بات کو سمجھ رہا ہوں۔''

''ہاں، یہ بالکل آسان بات ہے گو کہ ہنری نے اپنے خط میں یہ ذکر نہیں کیا کہ اس کے ساتھی کون تھے البتہ اس نے کچھ پارٹنرز کی طرف ضرور اشارہ کیا جنہوں نے اس آپریشن کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہنری یہی بات بتانے جائلز کے پاس گیا تھا کہ ان کی خطرناک مہم ناکام ہو چکی ہے اور پولیس کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتی ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اس گفتگو کے دوران ہنری نے پریشانی کے عالم میں بے تحاشا کئی سگریٹ پیے ہوں گے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب وہ کیبل کار کے ذریعے وہاں سے واپس روانہ ہوا تو اس وقت بھی جائلز زندہ تھا۔''

ہمارے گلاس خالی ہو چکے تھے۔ میں نے ویٹر کو اشارہ کر کے مزید مشروب لانے کے لیے کہا۔ انسپکٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہنری کے جانے کے بعد جائلز نے کیبل کار واپس بلائی۔ اسے جونئی اور خوفناک اطلاع ملی تھی۔ اس کا دماغ اس میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ انتہائی تکلیف کے عالم میں ٹہلنے لگا لیکن اسے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ بالآخر وہ کھڑی چٹان کی طرف بڑھا اور اس کے کنارے پر پہنچ کر چھلانگ لگا دی۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔ تم نے یہ معما تو حل کر دیا۔ مارگریٹ کی موت کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''ایک وقت میں ایک بات۔ مارگریٹ نے تمہیں بتایا تھا کہ اس پر قاتلانہ حملہ کی ایک کوشش ہوئی تھی۔ ایک پُراسرار شخص ڈرائنگ روم کی چوکھٹ میں نظر آیا اور اس پر گولی چلا دی جس سے اس کا بایاں بازو زخمی ہو گیا۔ اس مرحلے پر مارگریٹ کے بارے میں ایک سوال ضرور ذہن میں آتا ہے۔ اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ واضح طور پر نہیں جانتی اس کے شوہر کو کس نے قتل کیا تھا کیونکہ ہم یہ فرض کر رہے ہیں کہ اس کے شوہر کا قتل نہیں ہوا بلکہ اس نے خودکشی کی تھی۔ اب ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ مارگریٹ اس بارے میں درحقیقت کیا جانتی تھی۔ مثال کے طور پر کیا اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر نے ایک بہت بڑی بیمہ پالیسی لے رکھی ہے جس کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس کی طبعی موت واقع ہو یا اسے قتل کر دیا جائے لیکن خودکشی کی صورت میں مارگریٹ اس کے فوائد سے محروم رہے گی۔ کیا یہی وجہ تو نہیں کہ وہ جائلز کی موت کو قتل قرار دے رہی ہے۔''

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ میں نے بیئر کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یعنی اس جعلی قتل کا ڈراما رچایا صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ کسی شخص نے جائلز کو قتل کیا تھا جبکہ یہ سچ نہیں ہے۔''

انسپکٹر نے بھی ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''جیرالڈ! میرا مقصد کچھ ثابت کرنا نہیں ہے۔ تم نے میرے سامنے ایک مسئلہ رکھا اور میں نے اس کا حل پیش کر دیا۔ اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ اسے درست سمجھتے ہو یا نہیں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ مارگریٹ کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ اپنے بازو پر زخم کا نشان لگائے اور ایک فرضی قاتل کی کہانی گھڑ لے۔ اس طرح وہ اپنے شوہر کی خودکشی کو قتل کا رنگ دے کر انشورنس کی رقم وصول کر سکتی ہے۔''

میں نے اپنا گلاس ختم کیا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں تمہارا نظریہ ناکام ہو گیا۔ کسی نے مارگریٹ کو بھی قتل کر دیا۔''

انسپکٹر بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو جیرالڈ، یہاں میرا نظریہ ناکام ہو گیا۔''

لیکن اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ موجود تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''اس میں ضرور اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہو گا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انسپکٹر بولا۔ ''یہ سوال تم اپنے آپ سے پوچھو، اگر مارگریٹ کو وہ خط مل جاتا جو جائلز نے خودکشی سے پہلے لکھا تھا تو وہ یقیناً اسے ضائع کر دیتی لیکن اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس خط میں کیا لکھا تھا۔ اس میں کوئی اعتراف نہیں بلکہ الزام تراشی کی گئی تھی۔''

وہ بڑے غور سے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''اب ہم اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔ مارگریٹ نے کیبل کار میں قدم رکھا جو سیکنڈوں میں نیچے کی طرف جانے لگی۔ وہ تنہا تھی اور جہاں تک ہمارے علم میں ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو فوراً آگ پکڑ لے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسے قتل کرنے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں کی گئی لہٰذا اس کے پاس زندگی کو خطرہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس نے یقیناً کسی اور وجہ سے اتنی عجلت میں وہ مکان چھوڑا ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ وہ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''یہ نخرے دکھانے کا وقت نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں مشروب کے چھٹے راؤنڈ کا آرڈر دوں، میں جاننا چاہوں گا کہ تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''

''بہتر ہے کہ یہ کام کر ہی لو۔ مجھے بہت زور کی پیاس لگی ہے۔''

مشروب آنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ہر سوال کا جواب تلاش کریں۔ تم نے اس روز وہاں کیا دیکھا اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے ٹوک دینا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نے ایک عورت کو چھوٹے زیورات مثلاً انگوٹھی، بندوں وغیرہ سے غیر آراستہ کیبل کار میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا جو چند سیکنڈ بعد ہی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی جبکہ نہ کوئی چنگاری بھڑکی اور نہ ہی کار میں کوئی آتش گیر مادہ تھا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جبکہ یہ درست نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چنگاری اور آگ پکڑنے والا مادہ دونوں ہی وہاں موجود تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ مارگریٹ سگریٹ پیتی تھی لیکن جب اس کی موت واقع ہوئی تو وہاں سگریٹ کے پیکٹ یا لائٹر کی موجودگی کا ثبوت نہیں ملا۔ ہمیں اس بارے میں گہرائی سے سوچنا ہوگا۔ اس روز موسم کیسا تھا؟''

''گرم۔''

''سورج کی روشنی تیز تھی؟''

''ہاں اور دھوپ میں تمازت تھی۔ کیبل کار کے چلتے ہی اس کا عکس شیشوں پر پڑا۔''

انسپکٹر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ درست ہے؟''

''ہاں، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

وہ اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یہ نکتہ اہم ہو سکتا ہے۔ ہم ایک قدم پیچھے جاتے ہیں۔ میں مارگریٹ کی بہن اسٹیو کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے کوئی اہم بات کی ہوگی۔''

''مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اس نے مارگریٹ کے جانے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''جب مارگریٹ نے اسی روز وہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسٹیو کا فوری جواب کیا تھا؟''

''اس نے کہا کہ تمہارے سامان کا کیا ہوگا؟''

''اور تمہارے چھوٹے زیورات؟ یا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں، اس نے یہی کہا تھا۔''

''اور اس کا اشارہ کن زیورات کی جانب تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ جیولری، مارگریٹ کو چھوٹے زیورات، گھڑیوں اور نیکلس وغیرہ کا شوق تھا۔ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ ان میں سے کسی ایک چیز کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی جیسے سگریٹ لائٹر وغیرہ؟''

''یہ واضح نہیں ہے اگر میں درست ہوں تو یہ ایک ایسی چیز تھی جس نے وہی کام کیا جس کے لیے اسے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں چند سیکنڈ لگے لیکن مارگریٹ کو مارنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔''

''سیدھے سادے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ کسی نے اس کے لیے جال تیار کیا تھا؟''

''ہاں، موت کا جال۔ مارگریٹ لاج میں آ گئی تھی اور وہ وہاں سے جانے کے لیے مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت تم نے فطری طور پر یہ سوچا کہ وہ اپنی زندگی کے لیے خوف زدہ ہے لیکن اب ہم جان گئے ہیں کہ تم غلطی پر تھے پھر کس بات نے اسے اچانک روانگی پر مجبور کیا؟ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ پہاڑی سے اترتے ہی اسے ایک بھاری رقم مل جائے گی۔''

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ جائلز نے خودکشی سے پہلے ایک خط چھوڑا جو مارگریٹ کو مل گیا اور بعد میں اس نے اسے ضائع کر دیا۔ اس خط میں جائلز نے ایک خاموش پارٹنر کا نام لیا تھا جو اس کے ناجائز کاروبار میں شریک تھا۔ مثال کے طور پر

سیلاس؟''

انسپکٹر نے میرے جواب کا انتظار کیا لیکن میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب یہ بات مارگریٹ کے علم میں آئی تو اسے سیلاس پر برتری حاصل ہو گئی اور یہ ایک ایسی پوزیشن تھی جس کی وہ اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ مارگریٹ کے مفاد میں تھا کہ وہ تواتر کے ساتھ کہتی رہے کہ جائلز کو قتل کیا گیا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ قابلِ بھروسا خاندانی وکیل کے بارے میں یہ انکشاف اسے بلیک میل کرنے کا ایک غیر معمولی موقع ہے۔

سیلاس سے بحث مباحثہ کے بعد وہ دونوں ایک سمجھوتے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اس خیال پر قائم رہنے پر اتفاق کر لیا کہ جائلز کو کسی نامعلوم شخص نے قتل کیا اور اب وہی مارگریٹ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح مارگریٹ بیمہ پالیسی کا کلیم کر سکتی تھی اور سیلاس کو بھی سانس لینے کا موقع مل جاتا۔ تم نے کہا کہ یہ سیلاس ہی تھا جس نے تمہیں اور اسٹیو کو مارگریٹ کی رہائش گاہ پر بلایا۔ پہلی نظر میں یہ ایک غیر معمولی حرکت معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہم اس کا بغور جائزہ لیں تو اس سے سیلاس کی ہوشیاری ظاہر ہوتی ہے۔ اس نے وہاں تمہیں اس لیے بلایا کہ وہ اپنے آپ کو جرم سے فاصلے پر رکھ سکے جو اس سے سرزد ہونے والا تھا۔ اس نے مارگریٹ کو تحریری ہدایات دیں اور سختی سے تاکید کی کہ کیبل کار میں سوار ہونے سے پہلے اس لفافے کو نہ کھولے۔ شاید اس نے مارگریٹ کو یہ بتایا ہو کہ وہ ان ہدایات پر عمل کر کے رقم کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ شاید وہ اس لفافے میں کسی بینک اکاؤنٹ نمبر کی توقع کر رہی ہو؟ اسی لیے وہ جلد از جلد وہاں سے روانہ ہونے کے لیے بے چین تھی۔

''لیکن اس نے دو باتیں اس پر واضح کر دی تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ کیبل کار پر تنہا جائے اور دوسری یہ کہ وہ اس وقت لفافہ کھولے جب وہ بہ حفاظت نیچے جا رہی ہو۔''

''مارگریٹ نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ اب یہاں سے اس کے چھوٹے زیورات یا دیگر اشیا کا کردار شروع ہوتا ہے۔ ہم اب تک لائٹر اور سگریٹ کیس کی بات کرتے رہے لیکن اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ مارگریٹ اپنے ساتھ ایک محدب عدسہ لے گئی ہو۔ ایک اسٹائلش زیبائشی شیشہ جو چشمے کا بہترین متبادل ہوتا ہے۔ سیلاس کے علم میں یہ بات تھی اور مجھے شبہ ہے کہ اسٹیو بھی اس سے واقف تھی۔

''تم نے مجھے بتایا کہ کیبل کار میں کوئی آتش گیر مادہ نہیں ملا۔ میں تمہاری بات سے انکار نہیں کرتا لیکن یہ درست نہیں ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ مارگریٹ نے اپنے اوپر ایسا محلول چھڑک رکھا تھا جسے جلانے کے لیے ایک چنگاری ہی کافی ہے۔''

''لیکن کیسے؟''

''جب تم نے پہلی بار مارگریٹ کو دیکھا تو وہ کیا کر رہی تھی؟''

''وہ......وہ بیڈروم میں تھی۔''

''وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟''

''اپنے بدن پر پرفیوم لگا رہی تھی۔''

انسپکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ سیلاس نے پرفیوم کی بوتل میں ایک ایسا محلول بھر دیا تھا جو سفید اسپرٹ کی طرح بہ آسانی دستیاب ہے۔ جب مارگریٹ نے اسے اپنی کلائیوں اور گردن پر لگایا تو گویا اس نے اپنی قسمت پر مہر لگا دی۔ اس نے نائیلون کا لباس پہن رکھا تھا جو بہت جلدی آگ پکڑ لیتا ہے۔

''جب وہ کیبل کار میں سوار ہوئی تو مجھے یقین ہے کہ اس نے جلدی سے لفافہ اور محدب عدسہ نکالا۔ اس دن موسم گرما تھا اور دھوپ میں تیزی تھی۔ سیلاس کی تحریر بدنما تھی اور اس نے ایک سستے کاغذ پر خط لکھا تھا لہٰذا مارگریٹ نے اس کا رخ سورج کی روشنی کی جانب کیا تا کہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ محدب عدسہ سے گزرنے والی سورج کی روشنی کاغذ کو جلا دیتی ہے اور اگر اس کاغذ پر بھی آتش گیر مادہ لگا ہوا ہو تو اچانک چنگاری بھڑک اٹھتی ہے۔ مارگریٹ کی کلائی اور گردن پر پہلے ہی اسپرٹ لگی ہوئی تھی پھر اس نے نائیلون کا لباس پہن رکھا تھا۔ ان سب عوامل کی بدولت وہ دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔''

''بہت ہی عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں کہتا کہ یہ سچ ہے۔ میں نے صرف تمہارے سامنے ایک ممکنہ وضاحت پیش کی ہے اگر تمہارے پاس اس کے علاوہ کچھ ہے تو مجھے سن کر خوشی ہوگی۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سیلاس ایسا ہو سکتا ہے؟''

چند روز بعد سیلاس کی حقیقت سامنے آ گئی جب پولیس نے اسے اس کی رہائش گاہ سے ان الزامات میں گرفتار کیا جو کسی پر ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اس خبر نے مجھے ایک بار پھر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس خبر کی پیچیدگیاں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ میں نے شکست خوردہ انداز میں اخبار میز پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سیلاس کی اصلیت ظاہر ہونے کے بعد اب میں کسی شخص پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔

❖❖❖

بھیڑیا

منظر امام

انسان اور حیوان میں احساسات کا فرق ہوتا ہے... انسان دیکھ بھال اور پیار و محبت سے پرورش کرتا ہے... اور حیوان چیر پھاڑ دیتا ہے... مگر بات احساس کی ہے... بعض اوقات حیوان کا کام انسان انجام دے رہے ہوتے ہیں اور حیوان انسان کے رتبے سے بڑھ جاتے ہیں...

احساسات کے جذبوں سے گندھی انسان نما حیوان کی مسیحائی

میں نے اس دفتر کو حال ہی میں جوائن کیا تھا۔

ابا کی موت کے بعد زندگی بہت دشوار ہو گئی تھی۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ اتفاق یہ تھا کہ میں سب سے بڑی تھی۔ میرے بعد ایک بہن تھی، غازیہ۔ اس کے بعد ایک بھائی تھا، امروز۔

وہ دونوں ابھی چھوٹے تھے۔ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بے چارے گھر چلانے میں کچھ کر سکیں گے۔ ایک اماں تھیں۔ پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے گھر میں ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا لیکن اس سے

کیا ہوتا تھا۔

میں گریجویشن کر چکی تھی۔ میری منگنی بھی خاندان ہی کے ایک لڑکے امجد سے ہو چکی تھی۔ خیال تھا کہ اگلے سال میری رخصتی بھی ہو جائے گی۔ لیکن بدقسمتی سے ابا ہی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد زندگی دشوار ہوتی چلی گئی۔

ابا ہم سب کے لیے کڑی دھوپ میں گھنے سائے کی طرح تھے۔ بہت کم لوگ اتنا خیال رکھنے والے اور پیار کرنے والے ہوتے ہوں گے۔

اچانک کسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میرے دفتر کا باس میرے سامنے کھڑا غصے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کہاں کھوئی ہوئی ہیں مس تنزیلہ؟'' اس نے پوچھا۔

''کہیں نہیں سر۔'' میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

''کہیں نہیں تو پھر یہ سوچ بچار کہیں اور کیا کریں۔''

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ کیسے بے رحم لوگ ہوتے ہیں۔ یادیں بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ مجبوریاں بھی کیا ہوتی ہیں۔ انسان دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب گھر کے حالات خراب ہوتے چلے گئے تو ایک دوست نے اس دفتر کے بارے میں بتایا کہ وہاں جگہ خالی ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام تھا اس دفتر میں۔ میں نے اپنی سی وی بھیج دی اور مجھے جاب مل بھی گئی۔ سیلری بھی معقول تھی۔ اماں کو بہت سے تفکرات سے نجات مل گئی تھی۔ ورنہ سوچوں نے انہیں بیمار کر دیا تھا۔

اس دفتر میں سب کچھ صحیح تھا سوائے باس کے۔ اس کا مزاج بالکل الگ تھا۔ کبھی تو انتہائی مہربان اور کبھی انتہائی بے رحم۔ جب اسے غصہ آتا تو ہنگامہ برپا کر دیتا۔ ہم سب اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔

اس دفتر میں سات آٹھ آدمی کام کرتے تھے۔ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ دونوں بھی کچھ سہمی سہمی سی رہتیں۔ ایک لڑکی کا نام نیلما تھا۔ وہ پہلے ہی دن مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ اس کا گھر ہمارے محلے سے آگے جا کر تھا۔ یعنی ہم دونوں کا روٹ ایک تھا۔ ہم نے ایک گاڑی مہینے پر بک کر لی تھی۔

گاڑی والا پہلے نیلما کو لیتا تھا... پھر وہ مجھے لینے آ جاتی تھی۔ اس طرح ٹرانسپورٹ کی سہولت ہو گئی تھی۔

ایک دن دفتر کی طرف جاتے ہوئے نیلما نے مجھ سے کہا۔ ''تنزیلہ، آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کیوں نہیں، ضرور کرو۔''

''اس طرح گاڑی میں بیٹھ کر نہیں بلکہ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔''

''جیسے تم جو کہو۔''

''ایسا کرو تم آج میرے ساتھ میرے گھر چلنا۔ اپنے گھر فون کر دینا کہ تم ذرا دیر سے آؤ گی۔''

میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں کئی بار اس کے گھر جا چکی تھی۔ اس کی امی مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھیں۔ دکھ سکھ کی باتیں کر لیا کرتیں، اسی لیے جب نیلما نے اپنے گھر چلنے کی بات کی تو میں نے انکار نہیں کیا۔ بس یہ تجسس رہا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔

ہم دفتر سے واپسی پر نیلما کے گھر چلے گئے۔ اس کی امی سے سلام دعا کے بعد ہم نیلما کے کمرے میں آ گئے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔ ''ہاں اب بتاؤ! تم کیا خاص بات کرنے والی تھیں۔''

''تنزیلہ! کیا تم میری بات پر یقین کر لو گی؟''

''کیوں نہیں؟ بتاؤ ایسی کیا بات ہے؟''

''باس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سخت مزاج آدمی ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''دیکھو، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں۔'' وہ کچھ الجھی ہوئی تھی۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہا نہیں جا رہا ہو۔

''نیلما تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا تم یقین کرو گی کہ باس ایک بھیڑیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، میں نے ایسے آدمیوں کے بارے میں سنا ہے جو انسان نما بھیڑیے ہوتے ہیں بے رحم درندے۔''

''تنزیلہ میں محاوروں اور کہاوتوں والے بھیڑیے کی بات نہیں کر رہی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ واقعی بھیڑیا ہے۔ ہر رات کو وہ انسانی چولا اتار کر بھیڑیا بن جاتا ہے اور اس وقت اتنا خوفناک ہوتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

''نیلما! تم کیوں مجھے ڈرانے والی بات کر رہی ہو؟''

''میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔''

''میں نے شاید بہت پہلے ایک ایسی کہانی پڑھی تھی اور اس موضوع پر فلم بھی دیکھی تھی۔ عام زندگی میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔''

''لیکن باس کے ساتھ معاملہ عام زندگی والا نہیں ہے بلکہ سچائی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو میں بتاتی ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ یہ اب سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔ دفتر کے اکاؤنٹنٹ نے بے پروائی سے کام لیا تھا۔ انکم ٹیکس ریٹرن جمع

نہیں ہو سکا تھا۔ آخری تاریخ سر پر آ گئی تھی۔ باس نے حکم دیا کہ ہم دیر تک کام کریں گے۔ میں اور حبیب کام کرنے بیٹھ گئے۔ باس نے ہمارے لیے عمدہ کھانوں کا آرڈر کر دیا تھا۔ اس نے ہمیں آفر دی کہ ہم چاہیں تو اس کے گھر بیٹھ کر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ وہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ ہم کھانے کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔

اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ہماری خدمت کے لیے ایک ملازم بھی تھا جو ہمارا دھیان رکھ رہا تھا۔ بہت پُرسکون ماحول تھا۔ باس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی معاملہ الجھ جائے تو اس سے رات کو رابطہ نہ کیا جائے بلکہ صبح کو بتایا جائے۔ میرے اور حبیب کے لیے دو کمروں کا بندوبست کر دیا گیا تھا کہ ہم وہاں جا کر آرام کر سکتے ہیں۔ میں دو چار گھنٹے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ بہت شاندار کمرا تھا۔ اس کی ایک کھڑکی باہر گارڈن کی طرف کھلتی تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں اندھیرا کر دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس چاندنی میں وہ پائیں باغ بہت پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ مجھے پرانی کہانیاں اور داستانیں یاد آنے لگی تھیں۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ ہر چیز پر چاندنی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔"

"اوہو، تم تو شاعری کرنے لگیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں تنزیلہ! یہ شاعری نہیں حقیقت ہے۔ اس وقت میرے احساسات ایسے ہی ہو رہے تھے۔"

"اچھا چلو، پھر آگے کیا ہوا؟"

"میں نے اس چاندنی میں ایک انسانی سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ اور پہچان بھی لیا۔ وہ باس ہی تھا جو جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی رات کو باس ان جھاڑیوں کے پاس کیوں جا رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔ کیونکہ کمرے میں اندھیرا تھا اور میں پردے کی آڑ میں ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ باس ان جھاڑیوں کے اندر گھس گیا۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ جھاڑیوں میں گھس گیا؟"

"ہاں یار، پتا نہیں کیا چکر تھا۔ میں اسی جگہ کھڑی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد جھاڑیاں ہلیں اور ایک جانور باہر نکل آیا۔"

"جانور؟ وہاں جانور کہاں سے آ گیا؟"

"وہی تو میں بتا رہی ہوں۔ پہلے تو وہ مجھے کتا نظر آیا۔ میں نے یہی سمجھا لیکن ایک کتے اور بھیڑیے میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کی جسامت بھی مختلف ہوتی ہے۔ میں دم سادھے دیکھتی رہی۔ وہ جانور جھاڑیوں سے باہر نکل کر ایک طرف بیٹھ گیا۔"

"اور باس؟ وہ کہاں تھا؟"

"وہ کہیں نہیں تھا۔ سنتی تو رہو۔" نیلما نے کہا۔ "کچھ دیر بعد اس جانور نے چاند کی طرف دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ تم نے بھی کہانیوں میں پڑھا ہوگا یا فلموں میں دیکھا ہوگا کہ بھیڑیے اسی طرح چاند کو دیکھ کر آوازیں نکالتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، میں نے سنا اور پڑھا ہے۔"

"وہ کچھ دیر تک تو آوازیں نکالتا رہا پھر ان ہی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ چند لمحوں کے بعد باس پھر ان جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ جیسے ایک بھیڑیا اندر گیا اور روپ بدل کر انسانی شکل میں باہر آ گیا۔"

"نیلما یہ تم کیسی خوفناک کہانی سنا رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ کہانی نہیں سچائی ہے۔ تم خود سوچو۔ اس وقت میرا کیا حال ہو رہا ہوگا؟" نیلما نے کہا۔ "میں تو خوف سے کانپ رہی تھی۔ میں بستر پر جانے کے بجائے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ حبیب اپنی جگہ کام کر رہا تھا۔ اس نے میری حالت دیکھی تو حیران رہ گیا۔ "ارے کیا ہو گیا نیلما تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو؟ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کون میری بات کا یقین کرتا؟ حبیب بھی مذاق ہی اڑاتا۔ اسی لیے میں خاموش رہی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید یہ سب کچھ میرا واہمہ ہو۔ میں نے یہ سنا ہے کہ چاندنی راتوں میں کبھی کبھی انسان واہموں کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ اسے ہیولے نظر آنے لگتے ہیں۔"

"یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد بھی تم اسی دفتر میں کام کر رہی ہو۔ اس تجربے کے بعد تو تمہیں بھاگ جانا چاہیے تھا۔"

"ہاں، یہ بھی تم ٹھیک کہتی ہو۔" نیلما نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس دفتر میں مجھے آسانیاں بہت ہیں۔ میری سیلری بہت مناسب ہے۔ جتنی کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔ اس کے علاوہ باس کی طرف سے کوئی خوفزدہ کرنے والی بات نہیں ہوئی۔ وہ ہر طرح نارمل ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اسے بھیڑیا بنتے دیکھا ہے تو یہ سوائے حماقت کے اور کیا ہوگا؟"

"یہ بات تو ہے۔" میں نے ہنکاری بھری۔

"کیا باس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ تم نے اس کو دیکھ لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میرا خیال ہے کہ اس کو کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا رویہ ہمیشہ کی طرح نارمل ہے۔ اب بتاؤ۔ مجھے کیا مشورہ دے رہی ہو؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں کیا مشورہ دیا جائے۔ باس کی طرف سے ہمیں ابھی تک کوئی خطرہ بھی نہیں ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی اس کا رویہ بہت سخت ہو جاتا ہے لیکن دوسری طرف وہ مہربان بھی ہے۔ کوئی بھی پرابلم ہو۔ اس کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی غیر ضروری کام نہیں لیا۔ اگر ہمیں ٹرانسپورٹ وغیرہ کی پریشانی ہو رہی ہو تو اپنی گاڑی پر روانہ کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"یہ تو ہے لیکن اس بھیڑیے کا کیا کیا جائے؟"

"نظر انداز کر جاؤ۔ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہے۔ سوچتی ہوں کہ اگر جاب چھوڑ دی تو ایسی جاب دوبارہ مشکل سے ملے گی۔"

نیلما نے جو کچھ کہا تھا۔ اس پر یقین کرنا تو مشکل ہی تھا لیکن ایک طرف یہ بھی سوچتی تھی کہ اس کو غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی ایسی بات جو حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔

میں معمول کے مطابق اپنا کام کرتی رہی۔ دفتر جاتی رہی۔ دس بارہ دنوں کے بعد نیلما نے ریزائن کر دیا۔ اس نے جاب چھوڑ دی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

میں اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن موقع نہیں ملا تھا۔ دفتر والے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی نے کوئی گفتگو کی تھی۔

لیکن ایک شام وہ اچانک میرے گھر آ گئی۔ اس نے میرا گھر دیکھا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"نیلما تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم تو جانتی ہو کہ میں نے دفتر چھوڑ دیا ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"تم کو تو میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔" اس نے کہا۔

"مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ تم ابھی تک اسی دفتر میں ہو؟"

"کیا کروں۔ میرے پاس کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے تلاش میں ہوں۔ کہیں بھی کوئی اچھی جگہ مل جائے تو فوراً جاب چھوڑ دوں گی۔"

نیلما تو چلی گئی لیکن میں سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کیا واقعی باس ایک بھیڑیا ہے۔ عجب مضحکہ خیز خیال تھا۔ کسی کو بتایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال میں ان ہی خدشات کے درمیان گھری ہوئی دفتر جاتی رہی۔

ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ میں نے یہ دیکھا اور سنا ہے کہ جس دن زندگی میں کوئی تبدیلی آنے والی ہوتی ہے یا کوئی سانحہ سر اٹھانے لگتا ہے تو اس دن قدرت کی طرف سے ایسی باتیں ہونے لگتی ہیں جن کو اتفاق بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ کسی پلاننگ سے ہو رہا ہو۔

میں دفتر سے نکلی تو بارش شروع ہو گئی۔ ایک تو ہمارے شہر میں بارش نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔

نیلما کے جانے کے بعد ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ کسی اور دفتر جانے لگی تھی۔ اس لیے اس کا روٹ کچھ اور ہو گیا تھا اور میں اپنے طور پر ٹیکسی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے بسوں سے آنا جانا ہوتا تھا۔

اس شام بارش کی وجہ سے بسیں بھی نہیں مل رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کہ اچانک ایک گاڑی میرے پاس آ کر رک گئی۔ گاڑی چلانے والا باس ہی تھا۔ اس نے بہت خشک لہجے میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ"

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ میں انکار نہیں کر سکی۔ اس کا لہجہ بہت حکم دینے والا ہوتا تھا۔ اس نے کہا بیٹھ جاؤ اور مجھے بیٹھ جانا پڑا۔ ویسے بہت خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جب اس قسم کی کوئی سچویشن ہوتی ہے تو مرد عام طور پر کوشش کرتے ہیں کہ لڑکی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ جائے لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔

"کہاں رہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے اپنا پتا بتا دیا۔ اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بس گاڑی چلاتا رہا۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔

کوئی بات نہیں۔ کوئی ہدایت نہیں۔ بس خاموشی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے مجھے میرے محلے تک پہنچا دیا۔ "اب اُتر جاؤ۔" اس نے کہا۔ "یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"شکریہ سر! میں پہنچ ہی گئی ہوں۔ اگلی گلی میں میرا گھر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ہنکاری بھری۔ "کل اگر بارش رک جائے تو دفتر آ جانا۔"

اس نے مجھے اتار کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں کھڑی رہی تھی۔ بارش نے پورا راستہ جل تھل کر دیا تھا۔ میں کسی طرح چھپ چھپ کرتی ہوئی گھر پہنچ گئی تھی۔

اب تک تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ میں باس کی طرف سے کسی وہم میں مبتلا ہوتی یا اس سے خوف آتا۔ دفتر میں بھی اس کا رویہ معمول کے مطابق ہی رہا تھا۔

اگلے روز اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا تھا۔ ''مس تنزیلہ! کیا آپ کا روزانہ آنا جانا بس سے ہوتا ہے؟''

''یس سر، آج کل تو بسوں ہی سے آتی جاتی ہوں۔''

''آج کل سے کیا مراد ہے؟''

''سر پہلے میرے ساتھ نیلما ہوا کرتی تھی۔ اس کا بھی وہی روٹ ہے۔ ہم نے ایک گاڑی مہینے پر ہائر کر رکھی تھی لیکن اس کے جانے کے بعد اب اتنی گنجائش نہیں کہ اکیلی گاڑی کو افورڈ کر سکوں۔''

''ہوں۔'' اس نے ہنکاری بھری۔ ''سمجھ گیا۔''

میں اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اچانک میری سیلری میں تین ہزار کا اضافہ ہو جائے گا۔ اکاؤنٹنٹ نے جب یہ خبر سنائی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ اس نے بتایا کہ باس کے خاص حکم پر سیلری بڑھائی گئی ہے۔

میں شکریہ ادا کرنے باس کے پاس پہنچ گئی۔ ''سر وہ پتا چلا ہے کہ میری سیلری میں......''

میری بات مکمل نہیں ہو سکی تھی کہ اس نے کہا۔ ''ہاں تین ہزار کا اضافہ ہوا ہے کہ تم گاڑی افورڈ کر سکو اور مہینے کا کرایہ نکال سکو۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئی۔ کیا تھا اس کا رویہ؟ حیرت انگیز۔ اس نے میری باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں بسوں میں آنے جانے سے پریشان رہتی ہوں اسی لیے اس نے سیلری میں اضافہ کر دیا تھا۔

ایک طرف نیلما کی باتیں تھیں تو دوسری طرف باس کا رویہ تھا۔

میں نے ایک گاڑی ہائر کر لی۔ اس کی پک اینڈ ڈراپ کی سروس تھی۔ بہت آسانی ہو گئی تھی مجھے۔

نیلما نے اپنی باتوں سے جتنا مجھے سہا دیا تھا اب اس کا تاثر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میں اب اس دفتر میں خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی۔ باس کا رویہ اب پہلے سے زیادہ مہربان ہو گیا تھا۔

ایک دن باس نے آفر کی۔ ''مس تنزیلہ! آج تم میرے ساتھ چلنا۔''

''کہاں سر؟''

''ایک اہم میٹنگ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس میٹنگ کو اٹینڈ کرو۔''

یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر مجھے کوئی پریشانی ہوتی۔

اس لیے میں نے ہاں کر دی۔ "واپسی میں تمہارے محلے میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔"

دفتر سے ہم تین بجے اٹھ گئے تھے۔ میں نے باس کے کہنے پر کچھ فائلیں اٹھالی تھیں۔

میں باس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی چلتی رہی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ باس مجھے کن راستوں سے اپنے گھر کی طرف لے جا رہا ہے۔ جب چلتے ہوئے کچھ دیر ہوگئی تو میں نے پوچھا۔ "باس یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنے گھر۔" اس نے جواب دیا۔ اور اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی بھیڑیا غرایا ہو۔ خوف سے میں کانپ کر رہ گئی تھی۔

"سر! آپ مجھے یہیں اتار دیں۔" میں نے کہا۔ "میں چلی جاؤں گی۔"

"خاموش رہو۔" وہ پھر غرایا۔ "ورنہ...... کچھ دیر بعد گھر واپس چلی جانا۔"

خوف سے میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ بیک مرر میں میری حالت دیکھ رہا تھا۔ میں اس وقت نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اس کے بڑے مکان کے گیٹ پر ایک چوکیدار بھی تھا جس نے گاڑی کا ہارن سن کر گیٹ کھول دیا تھا۔

گاڑی کو اندر لا کر اس نے کہا۔ "چلو، اب نیچے اترو۔"

"سر مجھے گھر جانے دیں۔" میں گڑگڑا کر بولی۔ "گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"چلی جانا۔ ابھی اندر چلو۔ تم سے ایک کام ہے۔"

میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ مجھے اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا، بہت زبردست اور خوبصورت ڈرائنگ روم تھا۔ اس کی دیواریں اعلیٰ پینٹنگز سے سجی ہوئی تھیں لیکن اس وقت مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ کاش میں کسی طرح یہاں سے نکل سکوں۔ وہ مجھے اس وسیع کمرے میں بٹھا کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس مکان میں، میں نے چوکیدار کے سوا اب تک کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں گلاس رکھے ہوئے تھے۔ کسی مشروب سے بھرے ہوئے۔ اس نے وہ ٹرے میرے سامنے والی میز پر رکھ دی۔

"لو پیو۔" اس نے حکم دیا۔

"نو سر۔" میں نے انکار کیا۔ "مجھے خواہش نہیں ہو رہی۔"

"اس گھر میں کسی اور کی خواہش نہیں چلتی۔" اس کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ اس لہجے میں سفاکیت تھی، غراہٹ تھی۔ "پی لو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے اس میں زہر نہیں ملایا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک گلاس اٹھایا اور جلدی سے مشروب پی کر خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ "دیکھا۔ اس میں زہر نہیں تھا۔"

"یس سر...... یس سر۔" میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

"چلو گلاس اٹھاؤ۔" میں انکار نہیں کر سکی۔

میں نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ کچھ تلخ سا ذائقہ تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ پی نہ سکوں۔ اس کے کہنے پر میں نے وہ پورا گلاس خالی کر دیا۔

اس دوران وہ بہت غور سے میری طرف دیکھتا رہا تھا۔

"اب بتاؤ، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ میرا مطلب ہے اس مشروب کو پی کر؟"

"کچھ نہیں ہوا ہے سر۔"

"میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتاؤں۔" اس نے کہا۔

"ض ض...... ضرور بتائیں سر......" میں کیا کہہ سکتی تھی۔

"تنزیلہ! میں ایک ایسا بچہ ہوں جس کو کبھی محبت نہیں ملی۔"

"میں نہیں سمجھی سر۔"

"جانتی ہو، میری پرورش کس نے کی ہے؟"

"ظاہر ہے آپ کے والدین نے کی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔" اس نے بتایا۔ "مجھے ایک کچرا دان میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس وقت میں صرف چھ سات ماہ کا تھا۔ کچھ لوگوں نے ایک روتے ہوئے بچے پر رحم کھا کر اسے ایک ایسے ہوم میں جمع کرا دیا تھا۔ جہاں اسی قسم کے بچے رکھے جاتے تھے۔ تم اسے فلاحی ادارہ سمجھ لو۔ ان لوگوں نے بڑی محبت اور شفقت سے میری پرورش کی۔ بہت اچھا ادارہ تھا۔ وہاں میری پرورش ہوتی رہی۔ ہاں ایک بات اور بتا دوں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ قدرت کے کھیل کتنے نیارے ہوتے ہیں۔"

"جی سر، ضرور بتائیں۔"

"تنزیلہ انسانوں نے تو مجھے ایک کوڑے دان میں

پھینک دیا تھا۔ اس بات سے بے فکر ہو کر کہ میرا کیا بنے گا۔ لیکن ایک کتیا نے میری دیکھ بھال کی تھی۔ جو مجھے بعد میں پتا چلا تھا۔"

"کتیا نے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ایک کتیا نے۔ ہے نا ایک حیرت انگیز بات؟ اس نے اپنی فطرت کے برخلاف میری دیکھ بھال کی تھی۔ انسان کی فطرت دیکھ بھال کرنے کی ہے جبکہ جانور کی فطرت چیر پھاڑ کرنے کی ہے۔ لیکن اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ میرے پاس اس وقت تک موجود رہی جب تک میں محفوظ ہاتھوں میں نہ پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے مجھے اٹھا کر اس ادارے کے حوالے کیا تھا، انہوں نے یہ کہانی سنائی تھی۔ پھر ان لوگوں نے اس وقت مجھے بتایا جب میں بڑا ہو گیا تھا۔"

"حیرت کی بات ہے سر۔"

"کوئی حیرت نہیں۔ وہ جس سے چاہے کام لے سکتا ہے۔ ہم سب اس کا حکم ماننے پر مجبور ہیں۔"

"پھر کیا ہوا سر؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اس کی داستان حیرت زدہ کر رہی تھی۔

"اس کے بعد میں نے اسی ادارے میں پرورش پائی۔ جب میں چودہ یا پندرہ برس کا تھا تو میری قسمت نے میرا ساتھ دیا اور ایک فیملی نے ضروری قانونی کارروائی کے بعد مجھے اڈاپٹ کر لیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ سمجھ لو کہ وہی میرے والدین تھے اور ہیں۔ مرتے دم تک میں ان کا احسان نہیں بھلا سکوں گا۔"

"یس سر۔ دنیا میں ایسے بھی اچھے لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر اسی گھر میں میری تربیت ہوئی۔ انہوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ اپنی اولاد کے طور پر مشہور کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود میں نے بھی ان کا حق ادا کر دیا۔ ان کی بے پناہ خدمت کی۔ کیونکہ میں ان کے رتبے سے واقف تھا۔ وہ کمال کے لوگ تھے۔ اب ایک بات سنو۔ انہوں نے جرمن نسل کی ایک کتیا پالی۔ جس کا نام انہوں نے کیٹی رکھا تھا۔ وہ بہت پیاری اور خوبصورت کتیا تھی۔ پورے گھر سے مانوس تھی۔ خاص طور پر مجھ سے تو بہت مانوس تھی۔ میرے آگے پیچھے پھرا کرتی۔ نہ جانے کیوں۔ آج تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

میں اس کی باتیں سنتی رہی۔ واقعی اس کی زندگی بہت دشوار گزری تھی۔ وہ ایک بے نام اور بغیر کسی خاندان کا انسان تھا۔ اس کے مزاج کی درشتگی کی وجہ اب سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے انسانوں سے دھوکے کھائے تھے۔ اس کے ماں باپ اسے پیدا کر کے کچرے میں مرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

"میرے ماں باپ کا مجھ پر احسان ہے۔ جنہوں نے میری پرورش کی ہے۔"

"یہ تو ہے سر۔ وہی آپ کے والدین ہیں۔"

"وہ بہت پیسے والے لوگ تھے۔ بہت بڑا بزنس تھا۔ میں اس شخص کو پاپا کہتا تھا۔ پاپا کی موت کے بعد سارا بزنس میرے پاس آ گیا۔ میری ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ میں ایک بزنس مین بن گیا۔ میں نے ان کے کاروبار کے پیسوں سے عیاشی نہیں کی بلکہ بزنس کو اور بھی مستحکم کیا۔ جو تمہارے سامنے ہے۔ تو یہ ہے میری کہانی۔"

"میں سمجھ گئی سر۔"

"اس کے بعد یہ ہوا کہ میں نے ایک ادارہ کھولا۔ اس ادارے میں آوارہ پھرتے ہوئے کتے رکھے جاتے ہیں۔ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال ہوتی ہے۔ اگر وہ زخمی یا بیمار ہوں تو ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ ان کی موت کے بعد انہیں باقاعدہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ یوں ہی نہیں پھینک دیتے۔ اس ادارے میں بیس پچیس افراد کام کر رہے ہیں۔ جانتی ہو میں یہ سب کیوں کرتا ہوں۔ کیونکہ ایک اس کتیا کا مجھ پر احسان ہے جس نے ایک چھ ماہ کے ناتواں بچے کی حفاظت کی تھی۔ میری پہلی ماں وہی کتیا ہے۔ دوسری اور حقیقی ماں وہ خاتون ہیں جنہوں نے مجھے سینے سے لگا کر میری پرورش کی ہے۔"

حیرت انگیز کہانی تھی باس کی۔ جس کی شخصیت کے پرت اُتر گئے تھے۔

اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کون ہے اور لوگ اس سے کیوں خوف زدہ رہتے ہیں۔ اس نے اپنے کمپاؤنڈ میں بھی کچھ خون خوار کتے پال رکھے تھے جو اس سے بہت مانوس تھے۔ وہ خود ہی ان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

وہ اس کتیا کا قرض اتار رہا تھا۔ اس جیسی مخلوق کے ساتھ سلوک کر کے۔ ان کے زخموں کا علاج کروا کے۔

میں یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنا بڑا انسان ہے۔ یہاں تو لوگ خود اپنے جیسے انسان کے سلوک کو فراموش کر دیتے ہیں اور وہ ایک کتیا کے احسان کا بدلہ چکا رہا تھا۔

اس کہانی کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ میں نے اس شخص سے شادی کر لی ہے۔ مخالفتوں کے باوجود۔ اور زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ اب میں بھی اس کے ساتھ کتوں کی دیکھ بھال میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔

❖❖❖

آخری حصہ

باغ سے باغ تک

طاہر جاوید مغل

کچھ واقعات انتہائی غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں... صدیوں کا سفر طے کرنے کے باوجود ہمیشہ ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں... تاریخ سے جڑے ایک ایسے ہی یادگار واقعے کی ناقابلِ فراموش کہانی... جس کے ایک کردار کی تلاش و کھوج نے کہانی کو ایک نئے رخ سے ہمکنار کر دیا... بہادری... دلیری کا تمغہ سجائے محبت کی فصیلوں کو عبور کرتا ایسا کردار جو اپنے شاندار ماضی سے جڑے رشتوں کی پاس داری کرنا جانتا تھا... نصف صدی گزرنے کے باوجود اس کی رگوں میں وہی جوشیلا خون دوڑ رہا تھا... دشمن سرکار کے ظلم و ستم اور اندھیر نگری نے اسے ایسے راستوں کا راہی بنا دیا کہ ہارے بھی تو بازی مات نہیں...

کشمیر کی آزادی......اور جدوجہد

کے گرد گھومتی خون رنگ داستان

محبت کے نشیب و فراز

آنیہ اور نہار کور راجوری سے واپس جالندھر جا رہی تھیں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہی ہوا تھا۔ ماموں دلبر سنگھ بھی ہکا بکا رہ گئے تھے اچانک دونوں کی واپسی کا پروگرام کیسے بن گیا۔ حقیقت یہی تھی کہ آنیہ اب ایک منٹ بھی یہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی کہ خیر خیریت کے ساتھ زباب منزل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ راسو کی ہدایت کے مطابق وہ صبح چھ بجے کے لگ بھگ بالائی منزل سے اتری تھی۔ راسو کی دی ہوئی چابی کے ساتھ اس نے بیرونی گیٹ کا چھوٹا دروازہ ان لاک کیا تھا اور اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی...... اور اب صرف دس گھنٹے بعد وہ دونوں بذریعہ بس جالندھر کی طرف رواں تھیں۔

بس میں سوار ہوتے وقت نہار کور نے ایک اخبار لیا تھا اور اس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ پھر وہ اخبار دیکھتے دیکھتے ایک دم چونکی۔ ''یہ دیکھو آنیہ جانی! یہاں رات والی خبر لگی ہوئی ہے۔''

آنیہ نے بھی ٹھٹک کر دیکھا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک ''دو کالمی'' خبر موجود تھی۔ لکھا تھا۔ ''راجوری میں مرغزار کے علاقے میں ایک پولیس ناکے پر مشکوک کار سواروں اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ اس میں ایک فرد موقع پر ہلاک ہوا، جبکہ دو شدید گھائل ہوئے۔ ان میں ایک اے ایس آئی بھی شامل ہے۔ گھائل ہونے والوں میں سے دوسرا فرد اسپتال میں چل بسا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس واقعے کا تعلق پرسوں والی اس واردات سے ہے جس میں راجوری کے پریمی جوڑے ظہیر اور نادیہ کو ایک پرائیویٹ کلینک کے پاس سے مبینہ طور پر اغوا کر لیا گیا تھا۔ ابھی تک ظہیر اور نادیہ کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس سلسلے میں چند گرفتاریاں بھی عمل میں آئی ہیں۔''

خبر دیکھ کر آنیہ نے ماتھے سے پسینا پونچھا۔ یقینی طور پر راسو اس کیس میں ملوث تھا۔ وہ گرفتار ہو چکا تھا۔ اب پتا نہیں اس نے کیا کچھ اُگل دینا تھا۔ اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ نہار اور آنیہ کی زباب منزل میں آمد و رفت بھی سامنے آ جاتی...... اور یوں پولیس ان تک بھی پہنچتی اور سوال جواب کرتی۔ بہرحال ابھی یہ صرف قیاس آرائی ہی تھی۔

راسو نے غالباً کام تو اچھا کیا تھا مگر اب اس واقعے میں دو ہلاکتیں شامل ہو گئی تھیں اور یہ سنگین تر ہو گیا تھا۔

بس ہموار سڑک پر تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ نہار نے نشست کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے مدھم آواز میں بولی۔ ''آنیہ اوپر والے کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے جلدی ہماری آنکھیں کھول دیں...... تمہارے سامنے شہابی حیدر کا اصل کردار آ گیا۔ ورنہ شاید دیر ہو جاتی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' آنیہ نے تائید کی۔

نہار اسی کھوئے کھوئے آہنگ میں بولی۔ ''اس شہابی حیدر کے بارے میں تھوڑی سی مزید جانکاری مجھے بھی ملی ہے۔ صحافتی حلقوں میں اس کا نام تو ہے مگر اس کی ''ریپو'' کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ کئی ملازمتیں بدل چکا ہے...... ایک اخبار کی ملازمت کے دوران میں اسے بدعنوانی کے ایک معاملے کا سامنا کرنا پڑا اور اسے نکال دیا گیا۔ اگر یہ بندہ......''

''پلیز نہار، اب چھوڑو اس ذکر کو۔ مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے، کوئی اور بات کرو۔'' آنیہ نے بیزار لہجے میں کہا۔

نہار گہری سانس لے کر چپ ہو گئی۔

اسی دوران میں آنیہ کے پاپا خورشید عالم صاحب کا فون آ گیا۔ وہ ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں امرتسر میں تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''آنو! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم واپس آ رہی ہو؟''

''جی پاپا۔''

''اتنی جلدی، خیریت تو ہے؟''

''بس پاپا! راجوری کا موسم عجیب ہو رہا ہے۔ روزانہ ہی بارش ہو جاتی ہے۔ ٹھیک سے کام بھی نہیں ہو رہا تھا۔ نہار کی طبیعت بھی کچھ خراب ہے اس لیے واپس آ رہے ہیں۔''

''اور وہ پکی ٹیشن؟''

''ابھی تو پوسٹ پونڈ ہی کر دیا ہے پھر دیکھ لیں گے۔'' آنیہ نے کہا۔

☆☆☆

آنیہ کو راجوری سے واپس آئے دوسرا دن تھا۔ وہ بیسمنٹ میں موجود تھی۔ جو پینٹنگز اس نے راجوری کے قلعے میں بنائی تھیں، وہ ایک گوشے میں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ ان میں ایک ادھوری پورٹریٹ بھی تھی۔ یہ شہابی حیدر کی تھی۔ وہ بڑی نفیس پینٹ شرٹ میں...... باقاعدہ ٹائی لگائے ایک درخت سے کندھا ٹیکے کھڑا تھا۔ آنیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور عجب کوفت کے عالم میں تصویر پر برش پھیر کر اسے ضائع کر دیا۔ تب اس نے وہ کینوس بھی پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ عجب یاس کے عالم میں سوچنے لگی۔ کبھی کبھی ہمارے ''خیال'' کتنے خام ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا ہمیشہ یہ خیال رہا تھا کہ البم کی سو سال پرانی تصویر میں نظر آنے والی بے مثل دلیری اور جرأت نے آگے تک سفر کیا ہوگا۔ کم از کم اگلی ایک دو نسلوں تک تو ضرور گئی ہو گی اور اسی دلیری اور بے مثل ''فیس

ایکسپریشنز" کو ڈھونڈنے کے لیے وہ راجوری جا پہنچی تھی اور پھر یہ ثابت ہوا تھا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان کی ساری خوبیاں یا ساری خامیاں آئندہ نسلوں تک منتقل ہوں۔ خون میں خون شامل ہوتے ہیں اور انسانی فطرت میں تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں۔ شیر بچہ اپنے باپ کی طرح فوجی بنا تھا...... مگر اس کا بیٹا کوہ پیما بن گیا تھا اور اس کا بیٹا صحافی...... مگر ایسا صحافی نہیں جس پر فخر کیا جا سکتا......

وہ ایک آہ سی بھر کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں...... پھر ایسا کیوں ہوا تھا؟ کیوں جب جب اس نے البم کی تصویر دیکھی تھی اور اسد اللہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا، اسے لگا تھا کہ ان آنکھوں میں لشکارا مارنے والی دلیری منفرد ہے...... یہ رکنے والی نہیں، یہ منقطع ہونے والی نہیں...... یہ آگے تک جائے گی۔ جیسے شیر کیسے بھی حالات سے گزرے، رہتا تو شیر ہی ہے۔ اس کی جبلت کو مکمل طور پر بدلا نہیں جا سکتا۔

اچانک دستک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ یہ ماما تھیں اور اسے باہر آنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ وہ باہر آئی تو اسے پتا چلا کہ اس کا خالہ زاد فرحان آیا بیٹھا ہے۔ وہ مرے مرے قدموں سے باہر آئی۔ وہ اُسے دیکھتے ہی جوش سے بولا۔ "میں تو یونہی خالہ سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ تم بھی آ گئی ہو، بہت اچھا سرپرائز ہے بھئی، زبردست۔"

ماما بولیں۔ "بس اس کی فرینڈ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اس لیے یہ دونوں جلدی چلی آئیں۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" فرحان نے آنیہ سے پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تک تو ٹھیک تھی۔" اس نے کہا پھر ماما کے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔ "مگر اب سر میں ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔"

"تہ خانے میں بند رہو گی تو یہی کچھ ہو گا۔ چلو تمہیں تھوڑی سی تازہ ہوا کھلاتا ہوں۔ ایک بڑی اچھی خبر بھی سنانی ہے تم کو۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"تو یہیں پر سنا دیں نا۔"

"خالہ کو تو سنا چکا ہوں، تمہیں باہر جا کر سناؤں گا اور مٹھائی بھی کھلاؤں گا۔"

"ارے کہیں منگنی شنگنی تو نہیں ہو گئی آپ کی؟" وہ بے حد خوش ہو کر بولی۔

فرحان کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ چہرے پر واضح طور پر سٹپٹاہٹ نظر آئی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اس کے فون پر کال آ گئی۔ یہ کوئی اہم کاروباری کال تھی۔ وہ باتیں کرنے لگا۔ ماما خشمگیں نظروں سے آنیہ کو گھور رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے آنیہ کو باہر بلایا۔

دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے دانت پیسے اور تیز سرگوشی کے لہجے میں بولیں۔ "آنو! میں سچ کہتی ہوں، بہت بُری طرح پچھتائے گی۔ اپنی حرکتوں سے باز آ جا۔ مرد ذات کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

"لیکن میں نے کیا کہہ دیا ماما؟" وہ ٹھٹکی۔

"آہستہ بول۔" انہوں نے آنکھیں نکالیں۔ "وہ اتنے پیار سے تمہیں لے جانے کا کہہ رہا ہے اور تم آگے سے اسے منگنی کے ٹھٹھے مار رہی ہو۔" ان کی آواز بھرّا گئی۔ "بہت دل دُکھاتی ہو تم میرا...... بہت دل دُکھاتی ہو......"

"ماما! میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا سر دکھ رہا ہے۔"

"مت کہا کر مجھے ماما، میں نہیں ہوں تیری ماما۔ اگر ہوتی تو تُو اس طرح ہر وقت اپنی باتوں کی چھری سے میرا گوشت نہ کاٹتی۔" انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا اور دروازہ زور سے بند کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

آنیہ کچھ دیر تک گم صم کھڑی سوچتی رہی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ماما کا موڈ اتنا خراب ہو جائے گا۔ اس کے ذہن میں کشمکش سی تھی۔ کسی وقت وہ خود بھی سوچنے لگتی تھی کہ کہیں وہ کوئی غلطی تو نہیں کر رہی۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس کمرے میں آ گئی جہاں فرحان فون پر باتوں میں مصروف تھا۔

آدھ گھنٹے بعد آنیہ اور فرحان چمچماتی "ہنڈائی" پر سٹی سینٹر کی طرف جا رہے تھے۔ آنیہ کے ساتھ آنے سے فرحان کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ وہ بات بات پر ہنس رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کے فربہ رخساروں کا گوشت کانوں کی طرف دوڑتا محسوس ہوتا تھا۔ "کس خوش خبری کی بات کر رہے تھے آپ؟" آنیہ نے پوچھا۔

"وہی خوش خبری جو میں تمہیں چھ سات روز سے سنانا چاہ رہا ہوں۔ کوئی بیس بار فون کیا ہو گا لیکن کبھی تمہارا فون بند جاتا تھا، کبھی کال اٹینڈ نہیں ہوتی تھی۔"

"بس...... بتایا ہے نا کہ نہار کی طبیعت کچھ خراب تھی، اسی کے چکر میں رہی۔"

"کسی نہ کسی چکر میں تو تم ہر وقت ہی رہتی ہو اور سب

سے بُرا چکر تو مجھے یہ پینٹنگ والا لگتا ہے۔ پلیز آنیہ! ختم کرو اب اس بچپنے کو، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ باقی کی پڑھائی بھی ہمارے گھر......"

"فار گاڈ سیک فرحان۔" آنیہ نے ناگواری سے اس کی بات کاٹی...... پھر چند سیکنڈ بعد نارمل لہجے میں بولی۔ "آپ خوش خبری کی بات کرنے لگے تھے؟"

فرحان نے جوشیلے انداز میں اس کے گھٹنے کو دبایا اور بولا۔ "چمبا ٹاؤن میں ایک بڑا ٹھیکا ملا ہے لکڑی کے کام کا۔ تمہیں اندازہ ہے کتنے کا ٹھیکا ہوگا؟"

"کتنے کا؟" آنیہ نے بے دلی سے پوچھا۔

"قریباً قریباً ساڑھے پانچ کروڑ کا۔ پانچ پانچ مرلے کے پندرہ بیس گھر ہیں جن کا سارا لکڑی کا کام کرنا ہے۔"

"تو پھر چمبا جا رہے ہیں؟"

"جا تو نہیں رہا...... مگر آنا جانا لگا رہے گا۔ دو ڈھائی سو کلومیٹر سفر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بائی ائر کا کوئی انتظام ہو جائے۔"

"بائے ائر؟" آنیہ حیرانی سے بولی۔

"وہ جو اپنا جے پوری یار ہے نا وہ ایک چھوٹا کمرشل "چاپر" لے رہا ہے۔ اکثر چمبا آتا جاتا رہتا ہے۔" فرحان نے فخریہ انداز میں کہا۔ لہجے سے عیاں تھا کہ شیخی بگھار رہا ہے۔

آنیہ بولی۔ "آپ کے زیادہ یار ہندو ہی ہیں۔ یہ وہی راجندر چوہان ہے نا جو پچھلے سال ابوظہبی میں شراب نوشی اور لڑکی سے زبردستی کرنے کے الزام میں پکڑا گیا تھا؟"

"اوہو آنیہ تم منفی باتوں پر ہی کیوں دھیان دیتی ہو۔ راجندر کو عدالت نے بری بھی تو کیا تھا اور پھر یہی راجندر ہے جس نے غریب لوگوں کی بھلائی کے لیے ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے۔"

"اور جناب نے خود ہی بتایا تھا کہ یہ ٹرسٹ اسے "ٹیکس" وغیرہ بھرنے کے سلسلے میں فائدہ دیتا ہے۔"

فرحان بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ شاید یہ گفتگو بحث کی شکل اختیار کر جاتی مگر اسی دوران میں گاڑی ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں داخل ہو گئی۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر فرحان نے آنیہ کو اس 'سائٹ' کی تصاویر بھی دکھائیں جہاں اسے بڑا ٹھیکا ملا تھا۔ یہ کوئی ہاؤسنگ سوسائٹی لگتی تھی۔ متعلقہ لوگوں کے ساتھ دو تین گروپ فوٹو بھی تھے۔ ایک گروپ فوٹو کو دیکھ کر آنیہ چونکی۔ اس میں چند سوٹڈ بوٹڈ افراد کے ساتھ وہی کرخت چہرے والا ریٹائرڈ کرنل اروڑا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین مسلح گارڈز تھے۔ فرحان اس کے پہلو میں موجود تھا۔

"یہ...... یہ کون ہے؟" آنیہ نے پوچھا۔

"یہی تو مالک ہیں، سابق فوجی ہیں۔ بڑی توپ قسم کی چیز ہیں۔ ان کا ریئل اسٹیٹ کا کام تیزی سے پھیل رہا ہے...... تم جانتی ہو انہیں؟"

"نن...... نہیں۔ یونہی صورت کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔" آنیہ نے بات بنائی۔

اسی دوران میں ویٹر جوسز اور دیگر لوازمات لے آیا۔ فرحان ان اشیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اروڑا کا خیال ذہن میں آتے ہی آنیہ کا دھیان شہابی حیدر کی طرف بھی چلا گیا۔ اس کے اندر ایک ناگواری کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے آفس میں تھی اور اتفاقاً ایک ہائی سیکیورٹی ایریا میں جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے شہابی کو دیکھا تھا۔ وہ کرنل اروڑا کے سامنے بت بنا کھڑا تھا اور اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ پچھلے دو تین دن میں شہابی نے چار پانچ دفعہ آنیہ سے فون پر رابطے کی کوشش کی تھی۔ آنیہ نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی...... اور آخر میں اس کا نمبر ہی بلاک کر دیا تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا...... قریباً دو ڈھائی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ راجوری اور وہاں کے تمام معاملات سے آنیہ اور نہار کنارہ کش ہو گئی تھیں۔ آنیہ نے وہ ساری پینٹنگز اسٹور روم میں پھینک دی تھیں جو اس نے "مصوری کے مقابلے" کے لیے بنائی تھیں۔ اب تو مقابلے کی تاریخ گزرے بھی دو تین ہفتے گزر چکے تھے۔ بس ماموں دلبر سے کبھی کبھار فون پر آنیہ کی بات ہو جاتی تھی۔ پچھلے ہفتے دلبر ماموں سے جو گفتگو ہوئی، اس سے ایک اہم بات آنیہ کو اور نہار کو معلوم ہوئی تھی۔ ماموں نے بتایا تھا کہ شہابی حیدر کے دوست راسو کے بارے میں ایک خبر پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ پولیس کی حراست میں نہیں ہے بلکہ فرار ہو چکا ہے، پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ دلبر ماموں کے مطابق راسو کے فرار ہونے کا واقعہ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے پیش آیا تھا۔

یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔ راسو کو یقیناً اس وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا کہ اس نے پریمی جوڑے یعنی ظہیر اور نادیہ کو ٹھیکیدار نرائن اور کرنل اروڑا کے چنگل سے بچایا تھا۔ یہ بات

بھی طے تھی کہ لڑکی لڑکے کو برآمد کرانے کے لیے راسو پر تشدد وغیرہ بھی کیا گیا ہوگا۔ آنیہ اور نہار کو اندیشہ تھا کہ وہ ظہیر اور نادیہ کے بارے میں اُگل دے گا مگر اب اس تازہ خبر کے بعد یہ خوش فہمی پالی جاسکتی تھی کہ شاید شادی شدہ جوڑا ابھی تک محفوظ ہو۔

آنیہ اس بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ ایک روز اس نے خود دلبر ماموں کو فون کر ڈالا۔

''ہیلو، میری دھی رانی کیسی ہے؟'' وہ ہمیشہ کی طرح چہکے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ماموں، آپ کیسے ہیں؟''

''میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ ڈائٹنگ والا حربہ بھی تقریباً ناکام ہوگیا ہے جب تک راجوری کی سویٹ شاپس پر گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو بننا بند نہیں ہوندے، میرا کچھ نہیں ہوسکدا۔''

آنیہ اور دلبر ماموں دونوں ہنسنے لگے۔

چند لمحے بعد آنیہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ماموں! اس لڑکی نادیہ اور لڑکے ظہیر کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

''ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں اور وہ کہندے ہیں ناں کہ نو نیوز از گڈ نیوز۔ لگدا یہی ہے کہ وہ دونوں ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔''

''کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ راسو نے ہی ان دونوں کو بھگایا تھا؟''

''آہو دھی رانی! یہ بات تو اب کھل گئی ہے کہ اسی نے کڑی منڈے کو ایم پی اے ریاض کی کوٹھی کے پاس سے اٹھایا اور کسی محفوظ تھاں (جگہ) پر پہنچا دتا۔ وہ بھی جی دار منڈا ہے۔ اس نے زباب منزل میں ایک لنگڑی کڑی کو بھی پناہ دے رکھی ہے۔ کہندے ہیں کہ اس کے پیّو کو بھی پولیس نے ہی مارا تھا، یا شاید فوج نے۔ اس کڑی کا نام سدرہ ہے۔''

''وہ...... سدرہ اب کہاں ہے؟''

''جہاں تک میری جانکاری ہے، وہ بھی اب زباب منزل میں نہیں ہے۔ پہلے شاید اسپتال میں تھی، پھر وہاں سے بھی چلی گئی۔ لگدا ہے، پولیس کے ڈر سے کہیں غائب ہوگئی ہے۔''

''اس...... راسو کے بارے میں اب کیا خبر ہے؟''

''سنا ہے کہ پولیس اس کے لیے چھاپے مار رہی ہے۔ یہ بھی کہندے ہیں کہ اس کا کسی گروپ وغیرہ سے سمبندھ ہے۔ باقی رب جانے۔ خیرو بتا رہا تھا کہ تین چار دن کے لیے شہابی حیدر بھی گرفتار رہا ہے...... پھر چینل والوں نے اُسے چھڑایا تھا۔''

ماموں دلبر سے گفتگو ختم کرنے کے بعد آنیہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار راسو کی طرف جا رہا تھا۔ زباب منزل میں راسو نے جس طرح زبردستی اسے اپنا مہمان بنایا تھا، وہ بھی اس کے حافظے پر نقش تھا۔ پھر اس کے موبائل میں اس کی تصویر؟ عجیب ایب نارمل رویہ تھا اس کا۔ اس رویے میں اور اس کی شخصیت میں ایک طرح کی پراسراریت شامل تھی۔ اس کی گرفتاری کے بعد آنیہ کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ کہیں اس سارے معاملے میں اس کا نام بھی نہ آجائے، کیونکہ راسو کی گرفتاری کے وقت وہ زباب منزل میں موجود تھی مگر اس حوالے سے خیریت ہی رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ راسو نے پولیس کو کسی کے بارے میں کچھ بتا کر نہیں دیا تھا۔

اچانک آنیہ کا دھیان اس ڈائری کی طرف چلا گیا جو اس نے راسو کے بیڈروم کے ایک چور خانے میں دیکھی تھی۔ آنیہ کے اسمارٹ فون میں اس ڈائری کے تقریباً سارے اوراق کی تصاویر موجود تھیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد اس ڈائری کا خیال آیا تو آنیہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ وہ کیا تحریر تھی۔ اس ڈائری کی تصاویر اتارتے وقت آنیہ نے سوچا تھا کہ وہ نہار سے یہ تحریر پڑھوانے کی کوشش کرے گی۔ (وہ مشکل اور ناقابلِ فہم تحاریر پڑھنے کا ذوق رکھتی تھی) مگر پھر جالندھر آکر یہ بات آنیہ کے ذہن سے نکل گئی تھی۔

اس نے فون کی گیلری میں جا کر اس ڈائری کا عکس دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ کل نہار بھی امرتسر سے جالندھر آرہی ہے۔ اسے یہاں کی لائبریری میں کوئی کام تھا۔ یہ اچھا موقع تھا کہ اسے ڈائری کی یہ تحریر دکھائی جاتی۔

☆☆☆

اگلا روز بے حد انکشاف انگیز اور سنسنی خیز ثابت ہوا۔ نہار سے ملاقات ہوئی۔ آنیہ نے اسے دلبر ماموں سے ہونے والی ساری گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر ڈائری کی وہ نقل بھی دکھائی۔ کافی غور و خوض کرنے کے بعد بھی نہار اسے سمجھ نہیں سکی۔

اس نے کہا۔ ''یہ تو طے ہے کہ یہ کوئی قدیم طرزِ تحریر نہیں۔ یہ نیا ہے...... بلکہ شاید جدید ہے۔ کسی رائج زبان میں ایک 'کلیے' کے تحت بہت سے اضافی حروف شامل کر کے اسے ناقابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً اگر ہم اردو کے لفظ کتاب

میں ف کا جابجا استعمال کریں تو کتاب کے بجائے ''کف تفابیف'' بن جائے گا۔''

پھر وہ ایک دم چونکی اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ اپنے لمبے بالوں کو ہلکورا دے کر بولی۔ ''ہاں، ایک کام ہو سکتا ہے آنیہ جانی۔''

''وہ کیا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ایک جگہ چلنا ہے۔ تم گاڑی نکالو۔''

صرف بیس منٹ بعد وہ دونوں ایک بنگلا نما گھر کے ڈرائنگ روم میں فرنچ کٹ داڑھی والے ایک پروفیسر صاحب کے رُوبرو بیٹھی تھیں۔ زیڈ اے صدیقی نام کے یہ پروفیسر چند سال پہلے نہار کے ٹیچر رہ چکے تھے اور لسانیات کے ماہر تھے۔ نہار کور انہیں ڈائری کی نقل دکھا چکی تھی۔

پروفیسر صاحب کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں تحریر کے ''کی ورڈز'' کا پتا چل گیا ہے اور وہ ان کی سمجھ میں آ رہی ہے۔ ان کے سرخ و سپید چہرے پر بتدریج ہیجان کے تاثرات پیدا ہو گئے۔ پڑھنے کے دوران میں انہوں نے تین چار مرتبہ اپنی عینک کے اوپر سے نہار اور آنیہ کو دیکھا۔ پندرہ بیس صفحات دیکھنے کے بعد انہوں نے موبائل کی اسکرین سے نگاہ ہٹائی اور سنسنی خیز نگاہوں سے نہار اور آنیہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آنیہ! آپ مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں، یہ ڈائری آپ کو کہاں ملی؟''

آنیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں سر! راجوری کی ایک بس میں سفر کرتے ہوئے کوئی شخص اسے اپنی نشست پر بھول گیا یا پھر اس سے گر گئی۔ جب کوئی اس کا دعویدار نہیں بنا تو میں نے اٹھالی۔ میرا خیال تھا کہ...... اس پر ایڈریس وغیرہ ہو گا اور...... میں اسے مالک تک پہنچا دوں گی لیکن اس کا کوئی لفظ میرے اور نہار کے پلے نہیں پڑا۔''

صدیقی صاحب عجیب نظروں سے آنیہ اور نہار کی طرف دیکھتے رہے پھر ٹھہرے اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''کشمیر کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''

''وہی سر...... جو سارے جانتے ہیں۔ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ پاکستان کے پاس اور زیادہ تر انڈیا کے پاس ہے۔ پاکستان کا تقاضا ہے کہ یو این او کی قراردادوں کے مطابق وہاں رائے شماری ہونا چاہیے۔''

''اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی ہو؟'' صدیقی صاحب نے بیک وقت دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

نہار بولی۔ ''سر! بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینا چاہیے لیکن بھارت سرکار ایسا نہیں چاہتی۔ شاید ہمارے نیتاؤں کا خیال ہے کہ جس طرح انہوں نے خالصتان کے لیے سکھوں کی تحریک کو مار کوٹ کر دبا لیا اس طرح کشمیری بھی ایک روز ہمت ہار جائیں گے۔''

خالصتان کی بات کرتے ہوئے نہار کور کے لہجے میں ایک طرح کی تپش نمودار ہو گئی۔ شاید اسے 1984ء کے خونی واقعات یاد آ گئے تھے۔

''تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے آنیہ؟'' صدیقی صاحب نے پوچھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ پروفیسر صاحب نے اچانک یہ سیاسی گفتگو کیوں چھیڑ دی ہے، وہ بولی۔ ''یہ بات تو طے ہے جناب! کہ دونوں ایٹمی ملکوں کے درمیان کشمیر ایک جلتا ہوا مسئلہ ہے۔ اس کو ایک نہ ایک دن ''سیٹل'' ہونا ہے مگر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی شدت پسندی کی قائل نہیں ہوں۔ چاہے یہ شدت پسندی آزادی چاہنے والے مسلمانوں کی طرف سے ہو یا آزادی کی تحریک کو دبانے والی انڈین فورسز کی طرف سے۔ دونوں فریقین کو تحمل سے کام لینا چاہیے۔ کشت و خون اور تشدد کسی مسئلے کا حل نہیں۔ آخر تو بات چیت کی میز پر ہی آنا پڑتا ہے۔''

پروفیسر صدیقی عجیب انداز سے مسکرائے بولے۔ ''آگ کو دور سے دیکھ کر اور اس کی خصوصیات کے بارے میں لیکچر سن کر اس کی صحیح تپش اور اذیت ناکی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ اندازہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہوتا ہے۔''

''آ...... آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں سر؟'' آنیہ نے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''مجھے نہیں پتا کہ تم دونوں نے مجھے اس ڈائری کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ کتنا صحیح ہے لیکن...... شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے کشمیر کاز کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ وہ ایسی اسٹیج پر ہے جہاں موت اور موت سے جڑے ہوئے سارے خوف بے معنی ہو جاتے ہیں۔''

''آ...... آپ کس کی بات کر رہے ہیں سر؟'' آنیہ نے پوچھا۔

صدیقی صاحب نے اسکرین پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام راسم ہے۔ اسے جاننے والے اسے راسو کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔''

آنیہ اور نہار نے سکتے کی سی کیفیت محسوس کی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تب ایک بار پھر صدیقی صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔

وہ بولے۔ ”اس ڈائری کا ایک حصہ راسو کی اپنی زندگی کے حالات سے وابستہ ہے اور یہ کافی ڈرامائی تاثر لیے ہوئے ہے۔ شاید یوں کہنا چاہیے کہ اس حصے میں راسو نے اپنی زندگی کے ایک اہم ترین راز کو قلمبند کیا ہے...... دوسرا حصہ ان حالات کے بارے میں ہے، جنہوں نے اسے ایک عام کشمیری نوجوان کے بجائے ایک سربکف فریڈم فائٹر بنایا ہے۔ یہ بھی ایک دل ہلا دینے والی رُوداد ہے۔“ صدیقی صاحب ایک بار پھر ڈائری کے اوراق میں کھو گئے۔

آنیہ کو اپنی نرم ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس نے کشمیر کے فریڈم فائٹرز کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا۔ ان میں اکثر ایسے نوجوان تھے جن کے قریبی عزیز اور پیارے کشمیر میں لگی آگ کی نذر ہوئے تھے یا پھر بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اب ان کشمیری مجاہدوں نے پہاڑوں میں نشیمن بنا رکھے تھے اور گاہے بگاہے انڈین فورسز کو للکارتے تھے۔ کچھ لوگ ان کے اس عمل کو درست کہتے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ کشمیر میں آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ جدوجہد مسلح لڑائی میں نہیں بدلنی چاہیے۔ کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی حامی ہونے کے باوجود آنیہ بھی پُرامن جدوجہد کی حامی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کسی خطرناک کشمیر فریڈم فائٹر سے نہ صرف ملے گی بلکہ اس کے ساتھ ایک چار دیواری میں بند ہونے کے بعد اس کی ذاتی زندگی میں بھی جھانکے گی۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔

پروفیسر صدیقی مسلسل ورق گردانی میں مصروف تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”ڈائری کے آخری حصوں میں لکھنے والے نے بہت محتاط انداز اختیار کیا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق اس ڈائری کی زبان وہ ہے جو برسوں پہلے کشمیری مجاہدین نے باہمی پیغامات اور معلومات کے تبادلے کے لیے ایجاد کی تھی۔ اس خفیہ زبان کے باوجود راسم عرف راسو نے کئی جگہ کوڈ ورڈز کا استعمال کیا ہے......“ وہ تحریر پر نگاہیں جماتے ہوئے بولے۔ ”بار بار کسی فاروق کا ذکر ہے...... یہ نوجوان یقیناً راسو کا قریبی دوست تھا۔ کسی امیر گھرانے کی برہمن لڑکی کا ذکر بھی ہے...... پھر...... سدرہ نام کی ایک نہایت خوش شکل لڑکی کا ذکر ہے۔ اس کی ایک ٹانگ اس کے ظالم شوہر نے توڑ ڈالی تھی...... شوہر کا نام بھی کوڈ ورڈز میں ہے۔ یہ سدرہ نامی لڑکی اپنے شوہر کے ستم سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے غالباً گھر سے بھاگنے کی کوشش کی اور ٹانگ گنوانے کی سزا پائی۔“

آنیہ کی نگاہوں کے سامنے وہ تصویریں گھوم گئیں جو اس نے راسو کے بیڈ کے نیچے چور خانے میں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کے اندر حیران کن طور پر مسلمان سدرہ کرنل اروڑا کے ساتھ اگنی کے پھیرے لے رہی تھی۔ مطلب یہ کہ اروڑا ہی اس کا شوہر تھا اور اسی نے سدرہ کو ٹانگ سے معذور کیا؟ یہ کوئی اُلجھی ہوئی بے مہر کہانی تھی۔

صدیقی صاحب بدستور تحریر کے پیچ و خم میں کھوئے ہوئے تھے۔ پُرسوچ انداز میں بولے۔ ”ڈائری کے اس حصے میں لکھنے والے نے زیادہ اشاروں کنائیوں سے ہی کام لیا ہے۔ یہ فاروق، راسو کا بہت گہرا دوست تھا۔ یہ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہوا۔ غالباً یہ کشمیر کی تحریکِ آزادی میں شامل ہونے کی وجہ سے کسی حادثے کی نذر ہوا۔ اور یہی وہ موڑ ہے جس کے بعد راسو کی زندگی کا رخ بھی تبدیل ہوا...... تحریر میں کئی جگہ کسی کھلونے کا ذکر بھی ہے جو راسو گراں قیمت پر اپنے کسی شناسا سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کھلونا اپنے کسی پیارے کو اس کی سالگرہ پر دینا چاہتا ہے، لگتا ہے کہ یہ کھلونا کوئی ہتھیار ہی ہے جس کی راسو کو ضرورت رہی ہے۔“

آنیہ اور نہار بڑی توجہ سے صدیقی صاحب کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ جلد ہی ڈائری کے پہلے حصے کی طرف آ گئے۔ یہ راسو کی ذاتی زندگی کے ابتدائی واقعات تھے اور یہ صراحت سے بیان کیے گئے تھے۔ صدیقی صاحب نے کہا۔ ”یہ ایک مزے دار کہانی ہے اور اس میں ایک طرح کا ”کہانی پن“ بھی ہے۔ کیا تم سننا پسند کرو گی؟“

”ضرور۔“ آنیہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

صدیقی صاحب نے تحریر پر نظریں جمائے جمائے کہنا شروع کیا۔ ”یہ ایک طرح سے اس راسو نامی نوجوان کی حیات کا ایک اہم ترین راز ہے۔ اس نے یوں لکھا ہے......
ماں! میری یہ تحریر ایک خط کی طرح ہے۔ وہ خط جو میں تمہیں کبھی پوسٹ نہیں کروں گا۔ ماں! میں برسوں تیرے آس پاس رہا، تیرے ساتھ رہا پر تجھے ماں نہ کہہ سکا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ تو ماں ہے اور میری رگوں میں تیرے جسم کا خون دوڑتا ہے...... اور جب اس بات کا پتا چلا تب بہت دیر ہو چکی تھی...... اور مجھے یہ راز بتایا بھی کس نے؟ اس نے جسے میں ہمیشہ ماں سمجھتا رہا۔ وہ بھی مجھے اپنا بیٹا کہتی رہی لیکن پتا نہیں کیوں ماں...... جو کشش میں نے تیری طرف محسوس کی شاید اُس کی طرف بھی نہ کی۔ اس کے ضمیر پر بوجھ تھا ماں، اور پھر

میری اس غیر حقیقی ماں نے اس بوجھ کے سبب ایک دن مجھے سب کچھ بتا دیا۔ ان دنوں وہ بہت علیل تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ میں نے بھی سب کچھ جان لیا مگر یہ سب بے فائدہ ہو گیا۔ میں تب تک بہت دور نکل چکا تھا...... ہاں ماں! میں تجھ سے بہت دور ہوں۔ اب تجھے اپنا بیٹا ہونے کا صدمہ نہ ہی دوں تو اچھا ہے۔ کیا پتا کب موت کے سفر پر چل نکلوں، تو پھر ٹھیک ہے نا۔ یہ راز میرے سینے میں ہی رہنے دو...... تم کبھی نہ سنو...... ہاں تم کبھی نہ سنو...... اور میں کبھی نہ بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟...... تجھے کبھی معلوم نہ ہو کہ میں جس دن تیری کوکھ سے پیدا ہوا، اسی دن مجھے تجھ سے دور کر دیا گیا۔ دراصل...... میری غیر حقیقی ماں کے اصل بچے کے دل کو پیدائشی عارضہ لاحق تھا۔ وہ دل کو دھڑکانے والے سگنلز کی کمزوری کا مریض تھا۔ میری غیر حقیقی ماں اتنی استطاعت نہیں رکھتی تھی کہ مستقبل میں اس کا علاج کرا پاتی، اس پر ہزاروں لاکھوں خرچ کرتی۔ اسے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ مستقبل قریب میں اس کا بچہ مر جائے گا۔ اس نے اسپتال میں اپنی دوست نرس کی مدد سے اپنے نوزائیدہ بچے کو ایک امیر، باحیثیت ماں کے بچے سے بدل دیا۔ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ اس نے امیر ماں کے بچے کو اپنا بنا کر پالا...... اور وہ راسو بن گیا۔ اب تو سمجھ گئی ہو گی ماں! کہ اس غریب ماں کا بچہ کون تھا اور وہ بہ حیثیت ماں کون تھی؟ وہ بچہ شہباز حیدر تھا۔ میرا دوست...... میرا بھائیوں جیسا دوست شہابی حیدر...... اور وہ بہ حیثیت ماں تو تھی۔

...... ہاں، اب یہ سب کچھ راز ہی رہنے دو ماں۔ اسی میں تیرا اور میرا بھلا ہے۔

آنیہ اور نہار صم بکم سن رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ کسی ڈرامے یا فلم کی کہانی ہے مگر قرائن بتا رہے تھے کہ یہ جیتی جاگتی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ کہانیاں بھی تو ہماری زندگی میں سے ہی پھوٹتی ہیں۔ پروفیسر زیڈ اے صدیقی نے چند مزید اوراق ''اسکپ'' کیے اور پھر ایک جگہ رکتے ہوئے بولے۔ ''یہاں راسم عرف راسو نے لکھا ہے...... کچھ عرصہ بعد میری غیر حقیقی ماں (جسے آپ سب لوگ آیا خالہ کہتے ہیں) ایک ملازمہ کی حیثیت سے زباب منزل میں آ گئیں۔ اس وقت میں چند ماہ کا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے ناانصافی کی۔ اپنا بچہ تو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا مگر آپ کے بچے کے بارے میں آپ کو کچھ پتا نہ چلا...... یہ بچہ آپ کے گھر میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہی ایک بے سمت زندگی گزارتا رہا شاید یہی زندگی کی بوالعجبی ہے۔''

اس سے آگے چند چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر تھا جن میں راسم کی محرومی اور یاسیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس کے نیچے چند پُر درد شعر لکھے تھے۔

اس رُوداد کے آخری حصے کا ایک پیرا صدیقی صاحب نے سنایا۔ کہنے لگے۔ ''اپنی ماں زباب بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے...... میری غیر حقیقی ماں (یعنی زباب منزل کی آیا خالہ) آپ سب کے سامنے بھی اپنے جھوٹ کا اعتراف کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے اسے اپنے سر کی قسم دے کر منع کر دیا ہے۔ اب یہ راز ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان رہے گا۔ میں جانتا ہوں ماں! میں نے ٹھیک کیا ہے۔ میں تجھے ایسے ملاپ کی خوشی کیوں دوں جس کے اوپر جدائی کا گہرا سایہ ہے۔ میں اس جدائی کو جدائی ہی رہنے دوں تو ٹھیک ہے...... تمہیں یہ خط لکھ کر میرے دل کو کچھ نہ کچھ سکون مل گیا ہے۔ کاش میں یہ خط تمہیں پہنچا بھی سکتا......''

صدیقی صاحب بول رہے تھے۔ ان کی آواز آنیہ کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے پہنچ رہی تھی۔ وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ ''شیر بچے'' کی نظر انداز کی ہوئی تصویر اب ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اب اس کے رنگ پھر نکھر آئے تھے۔ اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ بالآخر ''دھوکا'' اختتام پذیر ہوا۔ بالآخر ایک ILLUSION کی موت ہوئی۔ بالآخر وہ اصل شخص تک پہنچ گئی ہے۔

اسے اپنے اس یقین پر ہمیشہ بہت ''یقین'' رہا تھا کہ شیر بچے کی موجودہ پود کے افراد کو وہ اعلیٰ اور باوقار مقامات پر دیکھے گی۔ ان کی آنکھوں میں اس دلیری اور جرأت مندی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لشکارے مارتا ہو گا، جو شیر بچے کی آنکھوں میں چمکتی تھی جو بہ زبان خاموشی پکار کر کہتی تھی...... تم ظلم ہو تو میں بغاوت ہوں۔ تم جبر ہو تو میں ایک دیوانی مزاحمت ہوں۔ مجھے اپنی ہمت طاقت کے مطابق تمہارا راستہ روکنا ہے...... یہی وجہ تھی کہ جب راجوری میں شہابی حیدر کا اصل چہرہ اس کے سامنے آیا تھا تو اسے لگا تھا کہ اس نے برسوں تک رنگ آمیزی کر کے اپنے پردۂ تصور پر جو ایک عالیشان تصویر بنائی تھی اس کے سارے رنگ کچے نکلے ہیں، بارش میں دھل کر ناپید ہو گئے ہیں...... مگر آج کئی ماہ بعد اس ڈائری کے اوراق نے ایک انکشاف کر دیا تھا۔ اگر یہ انکشاف درست تھا تو پھر حقیقت یہ تھی کہ وہ جس شخص کو دیکھ کر اتھاہ مایوسیوں میں ڈوب گئی تھی...... وہ تو اس ساری کہانی میں اجنبی تھا۔ جذبوں اور حوصلوں میں گندھی ہوئی اس صد سالہ

داستان سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور جس کا تعلق تھا...... جس کی آنکھوں میں اصل شجاعت کی چنگاریاں چمکتی تھیں اور جس کے سینے کو مزاحمت کی بے مثل آگ وراثت میں ملی تھی، وہ کوئی اور نہیں راسم تھا۔ راسم عرف راسو...... چلیانوالا باغ اور اسد اللہ سے شروع ہونے والی کہانی، چلتے چلتے کشمیر اور راسم تک آ پہنچی تھی۔ کہانیاں ایسے ہی اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ جذبے ایسے ہی نسل در نسل سفر کرتے ہیں۔ ''شیر بچے'' کا پوتا راسم ویسے ہی مقام پر پایا جا رہا تھا جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ آنیہ کے نزدیک یہ ایک علیحدہ سوال تھا کہ وہ جس مقام پر ہے وہ موجودہ حالات میں اس کے لیے ٹھیک ہے یا نہیں؟

صدیقی صاحب کی آواز نے آنیہ کو خیالوں سے چونکایا۔ وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔ ''لگتا ہے کہ اس راسو نام کے نوجوان کی شخصیت دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک روپ میں وہ ایک عام کشمیری نوجوان ہے۔ انڈین فورسز سے نفرت کرنے والا، ان کے خلاف پوسٹر لگانے والا، جلوس نکالنے والا اور ان کی گاڑیوں پر پتھراؤ کرنے والا۔ لیکن اس کا دوسرا روپ زیادہ خطرناک ہے۔ یقیناً وہ مسلح جدوجہد کا حصہ بن چکا ہے...... اور اپنے اندر خوفناک ارادے پال رہا ہے...... اور غالباً یہ سب کچھ اس کے دوست فاروق کو پیش آنے والے نامعلوم واقعے کے بعد ہوا ہے۔''

وہ ڈائری کے اوراق پر نظر دوڑاتے رہے پھر یکایک اُن کے چہرے پر سنسنی نظر آئی۔ انہوں نے موبائل کی اسکرین پر کچھ سطور کو غور سے پڑھا اور بولے۔ ''یہ دیکھو، یہ جس کھلونے کا اس تحریر میں کئی بار ذکر ہے، یہ بات یقینی ہے کہ یہ ایک ہتھیار ہے...... اور ہتھیار بھی کوئی عام نہیں۔ یہاں، یہ اس کونے میں ایک نمبر لکھا ہوا ہے۔'' صدیقی صاحب نے آنکھیں سکیڑ کر پڑھا۔ ''M2-HB...... مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی مشہور آٹومیٹک رائفل کا نمبر ہے۔''

انہوں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور ''گوگل'' کیا۔ کچھ ہی دیر بعد اُن کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ ''یہ دور تک مار کرنے والی ایک مشین گن ہے۔ قریباً ڈیڑھ پونے دو کلومیٹر تک یہ آسانی اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ امریکا کی بنی ہوئی یہ مشین گن افغانستان کی جنگ میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ یقیناً مہنگی بھی ہوگی۔ پرانی ہوئی تو بھی خاصی قیمت کی ہوگی۔''

''یعنی...... یہ وہ کھلونا ہے جو یہ راسو حاصل کرنا چاہ رہا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''چاہ ہی نہیں رہا بلکہ حاصل کر چکا ہے یا کرنے والا ہے۔ یہ نیچے ایک نوٹ لکھا ہوا ہے...... ش نے وعدہ کیا ہے کہ جولائی کی 31 تک کھلونا مجھے مل جائے گا۔ اس کا مطلب ہے میں سالگرہ پر تحفہ پیش کر سکوں گا۔'' صدیقی صاحب نے سر اٹھا کر آنیہ اور نہار کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟''

''2 اگست۔'' نہار نے جواب دیا۔

صدیقی صاحب نے نیچے کچھ اور سطور پر نگاہ دوڑائی اور تحریر کو ''ڈی کوڈ'' کرتے ہوئے بولے۔ ''راسو لکھتا ہے...... ایک دفعہ کھلونا مل جائے...... پھر ایک دیرینہ ارمان پورا ہو جائے گا...... بلکہ باقی کے ارمان بھی پورے ہو جائیں گے۔ چھوٹی چھوٹی کئی خوشیاں ہیں جن کے لیے دل ترس رہا ہے۔''

آنیہ اور نہار کی آنکھوں میں سراسیمگی جمع ہو رہی تھی۔ آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کیا ارمان ہو سکتا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کیا ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ وہ کچھ لوگوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔'' پروفیسر صدیقی بولے۔ ''یہ بات طے ہے کہ یہ شخص اب پُرامن جدوجہد کے بجائے مسلح جدوجہد کی طرف آچکا ہے۔ خطرناک زون میں قدم رکھنے والا ہے اور یہ کوئی اکیلا نہیں ہے۔ بہت سے کشمیری نوجوان اس راہ پر چل پڑے ہیں۔''

''اور نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔'' آنیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ انڈیا کی باقاعدہ فوج سے ٹکرا کر یہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ قریباً ایک لاکھ لوگ اپنی جان کی بازی ہار چکے ہیں، اَن گنت گھرانے برباد ہو چکے ہیں۔ چند دن پہلے میں نیٹ کے ذریعے آنے والی ایک وڈیو دیکھ رہی تھی۔ انڈین فوج کی گولیوں سے چھلنی ہونے والے سیکڑوں مجاہدوں کی لاشیں ایک ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ سب کے سب نوجوان تھے۔ کشمیری ماؤں کے لختِ جگر تھے۔ یہ لوگ کیوں مسلسل اس آگ کا ایندھن بن رہے ہیں۔ کیوں اس مسئلے کے حل کے لیے دوسرے راستے اختیار نہیں کیے جاتے؟ کیوں ٹیبل ٹاک اور مذاکرات کا وتیرہ اختیار نہیں کیا جاتا؟''

پروفیسر صدیقی نے عجیب نظروں سے آنیہ کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہیں بتا رہا تھا نا کہ آگ کو دور سے دیکھ کر اس کی صحیح تپش اور اذیت ناکی کا اندازہ نہیں ہوتا، یہ اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ کے جسم کا کوئی حصہ براہِ راست

آگ میں ہوتا ہے..... میں بھی ایک کشمیری ہوں۔ اسی جنت سے نکل کر یہاں آیا ہوں جو ایک جہنم ہے اور یہ جہنم تو برسوں سے تیار ہو رہی ہے۔ یہ شعلے 72 سال سے بھڑک رہے ہیں اور بلند تر ہو رہے ہیں۔ 1998ء میں میرا ایک کزن ان شعلوں میں زندہ جل چکا ہے اور یہ تو کشمیر میں بسنے والے تقریباً ہر ''مسلمان خاندان'' کی کہانی ہے۔ ہر خاندان میں کوئی نہ کوئی شہید پایا جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی لاپتا یا اپاہج موجود ہے۔''

آنیہ اور نہار خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ آنیہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''تم نے اپنی سوچ کے مطابق مذاکرات اور گفتگو کی بات کی ہے۔ ذرا چند لمحوں کے لیے تصور کرو۔ کشمیر کی ایک ٹھٹھری ہوئی شب ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے ہیں۔ چند فوجی ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ رائفلیں تان کر اہلِ خانہ کو ہراساں کرتے ہیں۔ ایک لڑکی کو ریپ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیا اس لڑکی کا باپ یا بھائی ان لوگوں سے مذاکرات کرے گا۔ نہیں، وہ اگر بندھا ہوا نہ ہوا، تو جا پڑے گا ان پر..... مارا جائے گا یا اتنا زدوکوب ہوگا کہ ہوش میں نہ رہے گا۔ یہاں گن پوائنٹ پر پامال کیا جا رہا ہے کشمیر کو۔ یہ بات مذاکرات اور گفتگو سے آگے نکل چکی ہے۔''

آنیہ افسردگی سے بولی۔ ''آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے سر! مگر مسلح جدوجہد بھی تو کسی منظم حکمتِ عملی کے تحت ہونی چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی صورت میں جان گنوا دینا تو شاید..... دانشمندی نہیں ہے۔''

شاید یہ بحث آگے چلتی مگر پروفیسر صدیقی کے فون پر کال آگئی۔ انہیں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے یونیورسٹی جانا تھا۔ یہ نشست یہاں پر ختم ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹے آنیہ کے لیے نہایت تہلکہ خیز تھے۔ وہ گھر واپس آ چکی تھی مگر اس کا دل و دماغ اس ڈائری کے انکشافات کے اندر جذب ہو چکا تھا۔ وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ ایک اتفاق کے تحت وہ ایک بہت بڑے راز کی امین بن چکی تھی اور وہ راز یہ تھا کہ راجوری کی زباب منزل میں جس کو زباب بیگم کا بیٹا سمجھا جاتا تھا، وہ ان کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ (شہابی حیدر) آپا خالہ کا بیٹا تھا۔ زباب بیگم کا فرزند راسم تھا۔ راسم عرف راسو۔ اپنے کوہ پیما والد تیمور حیدر کی طرح نڈر اور اپنے دادا اسد اللہ کی طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا۔ وہ اس وقت شاید موت کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ آنیہ کو یوں لگا جیسے ایک لاکھ شہیدوں کے لاشے ایک ساتھ اس کی نگاہوں میں ابھر آئے ہیں۔ قطار اندر قطار خونچکاں جسم..... اور ان میں سے ایک گولیوں سے چھلنی جسم راسم کا بھی ہے۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس نے ایسا خطرناک ہتھیار کیوں حاصل کیا تھا؟ وہ کس کو مارنا چاہتا تھا۔ کس کو سالگرہ کا تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا؟ کیا اس سارے معاملے کا تعلق اس کے دوست فاروق سے تھا؟ یا پھر..... وہ ٹانگ سے معذور لڑکی جس کو اس نے پناہ دے رکھی تھی؟ ان گنت سوالات آنیہ کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

اسے لگا کہ اسے راسو کے لیے کچھ کرنا چاہیے..... کل ڈائری کے اوراق سے اسے اور نہار کو بہت سی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم انفارمیشن کسی ''چار کوٹھیاں'' کے حوالے سے بھی تھی۔ کھلونے، فاروق اور سالگرہ کی طرح ''چار کوٹھیاں'' کا لفظ بھی تحریر میں تین چار مرتبہ آیا تھا۔ آنیہ اور نہار کی طرح صدیقی صاحب کا بھی خیال تھا کہ یہ راسو کا کوئی خفیہ ٹھکانا یا پناہ گاہ ہو سکتی ہے۔ اب آنیہ کو یاد آ رہا تھا کہ جن دنوں وہ دنیدھر فورٹ میں پینٹنگز بنا رہی تھی اس نے کسی سے اس ''چار کوٹھیاں'' کا نام سنا تھا۔ یہ جگہ یقیناً راجوری میں ہی کہیں تھی۔

آنیہ کے اندر ایک عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ خود بھی کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کے اندر کی سیلانی روح اسے کچھ کرنے پر اکسا رہی تھی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا جب وہ ایک بار فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر اس پر مضبوطی سے جم جاتی تھی۔ اگلے ہی روز اس نے پاپا کو قائل کر لیا کہ وہ راجوری کے فورٹ میں اپنا ادھورا کام مکمل کرنے کے لیے واپس جانا چاہتی ہے۔''

''نہار بھی جا رہی ہے؟'' پاپا خورشید عالم نے پوچھا۔

''نہیں جی، اب اسے چھٹی ملنا مشکل ہے لیکن میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ماموں دلبر موجود ہیں نا، ان سے کل بات ہوئی ہے۔ بس ماما کی طرف سے ذرا ڈانٹ کا خطرہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں، اسے میں سنبھال لوں گا۔'' وہ مسکرائے۔

وہ اس نظریے کے حامی تھے کہ جوان بچوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیے۔ بس انہیں اچھے برے کا شعور دے دیا جائے۔ اس کے بعد انہیں اپنے راستوں کا انتخاب کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

☆☆☆

قریباً ڈھائی ماہ بعد آنیہ ایک بار پھر راجوری کی فضاؤں میں تھی۔ اس دفعہ وہ اکیلی آئی تھی۔ اس کے لیے اطمینان کی ایک بات یہ بھی تھی کہ آج کل شہابی حیدر راجوری میں موجود نہیں تھا۔ وہ نیو دہلی جا چکا تھا۔ وہاں ایک چینل میں نوکری کر رہا تھا۔ پچھلے ڈھائی تین مہینے میں وہ آنیہ کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا تھا...... بس کبھی کبھی نہار سے ہیلو ہائے کر لیتا تھا۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اس بات کے قائل ہوتے ہیں...... تو نہیں اور سہی...... اور نہیں اور سہی۔

دلبر ماموں نے ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے آنیہ کا استقبال کیا۔ بہر طور ان کے چہرے پر ملال کے موہوم سائے بھی تھے۔ یقیناً یہ یہاں کے کشیدہ حالات کے حوالے سے تھے۔ راجوری سے "پلواما" کا فاصلہ 150 کلو میٹر سے زیادہ نہیں تھا...... پلواما اور سرینگر وغیرہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی، اس نے ہر باضمیر شخص کو رنجور کر رکھا تھا۔ نوجوان بچے مر رہے تھے...... اپاہج اور لاپتا ہو رہے تھے۔ چادر اور چار دیواری پامال ہو رہی تھی۔ وادیِ جنت نظیر پر قابض قوتیں ہر مزاحمت کو کچل رہی تھیں۔

ان حالات میں دلبر سنگھ صاحب کے اپنے پرانے زخم بھی تازہ ہو گئے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد انہوں نے دربار صاحب پر ہونے والے خونی حملے کی بات کی اور سکھوں کے اس قتلِ عام کی بات کی جو اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہوا۔ وہ کشمیر کو انڈیا کے سارے مظلوموں اور حریت پسندوں کے لیے ایک ٹیسٹ کیس قرار دے رہے تھے۔

بہر حال آنیہ نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی اور بس دلبر ماموں کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس نے انہیں یہی باور کرایا کہ وہ اپنی ادھوری پینٹنگز مکمل کرنے کے لیے دوبارہ یہاں آئی ہے۔

تیسرے روز وہ "چار کوٹھیاں" نامی جگہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک رکشے والے نے بتایا کہ یہ شہر کے اندر ایک رہائشی کالونی کا بس اسٹاپ ہے۔"

"یعنی یہاں کوٹھیاں وغیرہ نہیں ہیں؟"

"کوٹھیاں تو ہیں میڈم جی۔ اسی کی وجہ سے تو اسٹاپ کا نام پڑا ہے۔ انگریزوں کے زمانے کی کوٹھیاں ہیں، اب وہاں گودام شودام بنے ہوئے ہیں۔"

آنیہ اسی رکشے پر بیٹھی اور چار کوٹھیاں اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ اس کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ ایک طرح کے خطرے کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ وہ فی الحال صرف احتیاط سے یہاں کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

یہ علاقہ رہائشی تھا مگر رہائشی علاقے کے ساتھ ہی ایک بڑی مارکیٹ بھی موجود تھی بلکہ یہ کئی چھوٹی چھوٹی مارکیٹیں تھیں۔ چاروں کوٹھیاں درمیانے سائز کی تھیں اور کافی پرانی تھیں۔ ان میں فرشی ٹائلز اور سینیٹری وغیرہ کے سامان کے گودام بنے ہوئے تھے۔ کیا ان گوداموں میں سے ہی کسی گودام میں راسو موجود ہوگا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھے اور کسی کوٹھی کے گیٹ پر دستک دے کر سن گن لینے کی کوشش کرے مگر اس میں سنگین خطرات تھے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس چلی آئی۔ وہ پچھلے چار پانچ روز میں درجنوں بار راسو کے پرانے فون نمبر پر ٹرائی کر چکی تھی مگر وہ بند ہی ملتا تھا۔ ماموں دلبر کے گھر آ کر اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ نمبر بند جا رہا تھا۔

اگلے روز وہ مجبوراً پینٹنگ کے سامان کے ساتھ فورٹ جا پہنچی۔ آج اسے یہاں راجوری میں چوتھا روز تھا۔ دلبر ماموں کو شبہ ہو سکتا تھا کہ اس نے اب تک پینٹنگ شروع کیوں نہیں کی۔ قلعے میں پینٹنگ کرتے ہوئے اسے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ ہیلمٹ پہنے ہوئے ایک شخص اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے دھیان سے دیکھا اور کسی حد تک پہچان گئی۔ وہ راسو کا دوست راجا تھا۔ راسو کے اسنوکر کلب کے ساتھیوں میں سے تھا۔

رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ "آپ کو دوبارہ یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اور کون ہے آپ کے ساتھ؟"

"اس بار اکیلی ہی آئی ہوں۔" آنیہ بولی۔ "اور...... وہ...... راسو صاحب آج کل کہاں ہوتے ہیں؟" آنیہ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو پتا ہی ہے، اس پر کیس وغیرہ کا چکر ہو گیا تھا۔ آج کل وہ لاپتا ہے...... ویسے آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اس کے بارے میں؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس یونہی...... شہابی حیدر بھی آج کل راجوری میں نہیں ہے نا۔"

وہ اسٹول گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی باتوں سے آنیہ کو صاف پتا چل گیا کہ وہ اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ جاننا چاہ رہا ہے کہ وہ کس کے ساتھ راجوری آئی ہے اور اس وقت اس کے اردگرد کوئی اور بندہ تو موجود نہیں۔ آنیہ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ کل "چار کوٹھیاں" کے قریب اس کی موجودگی کو نوٹ کیا گیا ہے اور یہ راجا نامی شخص یہاں آ موجود ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ

بھی تھا کہ وہ کل ٹھیک جگہ پر پہنچی تھی۔

آخر میں راجا بولا۔ ''راسو بھائی اس وقت کسی نامعلوم جگہ پر موجود ہیں۔ پر میں کوشش کر کے ان سے آپ کی بات کرا سکتا ہوں۔''

''تو کراؤ۔'' آنیہ نے کہا۔

وہ اردگرد دیکھ کر بولا۔ ''لیکن یہاں نہیں، آپ کو فورٹ سے باہر آنا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں، آپ میری بہن کی طرح ہیں۔''

کچھ پس وپیش کے بعد آنیہ مان گئی۔ اس نے اپنا سامان ایک قریبی کوٹھری میں لاک کیا اور راجا کے ساتھ فورٹ کے پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ ہیلمٹ ابھی تک راجا کے سر پر تھا۔ تاہم ونڈ شیلڈ اس نے اٹھا رکھی تھی۔ آنیہ کو محسوس ہوا کہ وہ چوکس نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ بھی لے رہا ہے جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ کوئی ان کے پیچھے تو نہیں آ رہا۔ وہ فورٹ سے باہر نکلے۔ یہاں راجا کی بائیک کھڑی تھی اور بائیک کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سوزوکی کار بھی کھڑی تھی۔ کار خالی تھی۔ راجا نے اپنے اسمارٹ فون پر ''واٹس ایپ'' آن کیا اور پھر راسو سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فون آنیہ کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی خالی ہے، آپ اس میں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر لیں۔''

آنیہ نے اچھی طرح جھانک کر دیکھا۔ کار واقعی خالی تھی۔ وہ فون تھام کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ سینے میں دل بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وڈیو کال تھی۔ آنیہ نے اپنے سامنے راسو کو دیکھا۔ تصویر والے شیر بچے اسد اللہ کا پوتا۔ وہ کسی بند کمرے میں بیٹھا تھا مگر بیک گراؤنڈ میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھ کر اچھا لگا لیکن آپ کی یہاں آمد بالکل غیر متوقع ہے۔ کیا آپ واقعی صرف پینٹنگ کے لیے آئی ہیں؟''

''یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس کی بھی ایک وجہ ہے، آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔''

''میں پینٹنگ کا کام مکمل کرنے کے لیے ہی آئی ہوں لیکن...... آپ سے بھی...... کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی۔''

''وہ کیوں محترمہ! آپ تو میرے سائے سے بھی دور بھاگتی رہی ہیں؟''

''مجھے آپ کے بارے میں ماموں دلبر صاحب سے کچھ پتا چلا ہے۔ اردگرد سے بھی کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مم...... میں اپنی ناچیز عقل کے مطابق آپ کو کچھ سمجھانا چاہتی ہوں۔''

''زہے نصیب۔'' راسو نے کہا۔ پھر اپنی بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر کہا۔ ''ویسے میرا خیال ہے مس آنیہ خورشید! اب ہم کھل کر بات کر ہی لیں تو اچھا ہے...... آپ...... کل ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' کے آس پاس منڈلا رہی تھیں؟''

''اوہ...... تو میرا یہ اندازہ درست ہے کہ کل مجھے وہاں دیکھا گیا ہے اسی لیے آپ نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ کیا آپ بھی وہیں موجود ہیں؟''

''نہیں، لیکن راجا اور ایک دو دوست موجود ہیں۔ انہوں نے آپ کو پہچانا اور......''

''پھر میرا پیچھا بھی کیا۔'' آنیہ نے بات مکمل کی۔

''بے شک انہیں تجسس سے مجبور ہو کر کرنا پڑا۔''

آنیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''راسم صاحب! یہ سب ایک اتفاق کے تحت ہی ہوا ہے۔ میں کل وہاں تھوڑی سی شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ راجا یا آپ کا کوئی اور دوست وہاں موجود ہوگا اور مجھے دیکھ لے گا۔''

''مس آنیہ! میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا...... لیکن آپ نے وہاں خصوصی طور پر ''چار کوٹھیوں'' کی طرف توجہ دی۔ آپ ان کا جائزہ لیتی رہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہو کہ یہاں کچھ ہے۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''راسم صاحب! آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں ان کوٹھیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہوں گی تو ان کی ساخت اور ایک جیسی بناوٹ کی وجہ سے...... لیکن...... کچھ بھی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا ہے۔ آپ سے رابطہ تو ہو گیا ہے۔''

پتا نہیں کہ آنیہ کے جواب نے راسو کو مطمئن کیا یا نہیں مگر اس کا لب ولہجہ بدستور اپنائیت کا رہا۔ اس نے نہار کور اور دلبر ماموں وغیرہ کی خیریت دریافت کی پھر کہنے لگا۔ ''آپ ایک منٹ کے لیے میری بات راجا سے کروا سکتی ہیں؟''

آنیہ نے کار کی کھڑکی کھولی اور کچھ فاصلے پر موجود راجا کو موبائل فون دکھایا۔ وہ موٹر بائیک کے قریب بیٹھا اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ہیلمٹ اب تک اس کے سر پر تھا۔ وہ آنیہ کے پاس آیا اور موبائل فون لے کر راسو سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے ہوئے وہ دس پندرہ قدم دور چلا گیا۔ دو منٹ بعد واپس آ کر اس نے موبائل آنیہ کو تھما دیا۔

راسو نے کہا۔ ''اس وقت میں راجوری میں ہی ہوں مگر کل کا پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ صبح یہاں سے جانا پڑے۔ پھر کئی دن تک واپسی نہیں ہوگی۔ اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو پھر آج ہی مل لیں۔''

آنیہ نے چند لمحے تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''کہاں مل سکتے ہیں آپ؟''

''آپ کو سب کچھ پتا ہی ہے، میں جہاں ہوں وہاں سے میرا، آپ سے ملنے کے لیے نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ کو بھروسا ہے تو پھر راجا کے ساتھ آجایئے۔ یہ اسی گاڑی پر آپ کو یہاں لے آئے گا۔''

آنیہ نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آج راسو سے نہ مل سکی تو پھر شاید...... اس سے ملنا مشکل ہو جائے گا۔ نہ جانے اچانک اس کے دل میں کیا آئی کہ بہت سے اندیشوں کے باوجود اس نے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، اگر کوئی خطرہ نہیں ہے تو...... میں آجاتی ہوں۔''

یہ جاننے کے بعد کہ وہی اسد اللہ کا پوتا ہے، وہ اس کے لیے ایک عجیب سی اپنائیت محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کیفیت کو خیر، محبت تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر وہ اسے کوئی واضح نام بھی نہیں دے پا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ راجا کے ساتھ سوزوکی کار میں راسو کی طرف جا رہی تھی۔ راجا ڈرائیونگ کر رہا تھا، وہ عقبی نشست پر تھی۔ راجا نے موٹر بائیک وہیں لاک رہنے دی تھی۔ وہ غالباً راجا کے کسی ساتھی کی تھی۔ دوران ڈرائیونگ، راجا بار بار عقب نما آئینے میں اور دائیں بائیں بھی دیکھتا تھا۔ جیسے وہ غیر شعوری طور پر اپنے اردگرد سے باخبر رہنا چاہتا ہو۔ وہ ایسے اندرونی راستے استعمال کر رہا تھا جہاں کسی پولیس ناکے یا فوجی چیک پوسٹ کا احتمال کم سے کم ہو۔ قریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد وہ کل کی طرح آج پھر ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' کے قریب موجود تھی۔ ایک کوٹھی کا گیٹ کھلا اور سوزوکی اندر داخل ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ راسو نے غلط بتایا تھا کہ وہ ''چار کوٹھیاں'' میں نہیں ہے۔ یہ غلط بیانی غالباً اسے احتیاط کے پیشِ نظر کرنا پڑی تھی۔

اس گودام میں فرش اور دیواروں والی ٹائیلوں کا بہت بڑا اسٹاک تھا۔ چھوٹے بڑے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ ایک دو چھوٹے لوڈر بھی کھڑے تھے۔ سوزوکی کوٹھی کے عقبی حصے میں آکر ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ آنیہ، راجا کے ساتھ ذرا جھجکتی ہوئی ایک زینے پر آئی اور کوٹھی کی بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ یہاں خاموشی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں اور ان کے آگے بھاری پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کوٹھی کا یہ حصہ گودام نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کہیں پکنے والے کھانے کی مدھم سی خوشبو بھی آرہی تھی۔ ایک کمرے میں پہنچتے ہی راجا کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور آنیہ کی طرف گھوم کر سخت لہجے میں بولا۔ ''دیکھو مس آنیہ! آپ اپنے لیے مشکل پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آپ کو صاف صاف بتانا پڑے گا کہ آپ کو ''چار کوٹھیوں'' کا پتا کس نے بتایا ہے۔''

آنیہ، راجا کا سرخ چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اسے پہلی بار شک ہوا کہ اس کے لباس کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ بھی موجود ہے۔ ''میں نے کچھ نہیں چھپایا اور آپ مجھ سے سوال جواب مت کرو۔ آپ مجھے یہاں راسو سے ملانے لائے ہو۔''

''راسو بھی آجائے گا، پہلے میرے سوال کا جواب دو تم۔'' راجا آپ سے تم پر آگیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سرخی چمکنے لگی تھی۔ ''شاپنگ والی اسٹوری مت سناؤ۔ تم صرف اس جگہ کے کھوج میں یہاں پہنچی تھیں اور تم اکیلی بھی نہیں ہو۔ ہمیں ڈاج دینے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''مسٹر راجا! آپ تمیز سے بات کرو۔ میں کسی کو دھوکا نہیں دے رہی۔''

''دھوکا اور کسے کہتے ہیں۔'' راجا نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

یہی وقت تھا جب کسی اندرونی کمرے سے راسو برآمد ہوا۔ اس کے شانوں تک جاتے ہوئے بال اب کچھ چھوٹے ہو چکے تھے۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ وہ بپھرے ہوئے راجا اور آنیہ کے درمیان آگیا۔ ''راجا! تم چپ رہو، میں خود بات کرتا ہوں ان سے۔ تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

راجا نے غصیلے انداز میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ آنیہ کو کڑی نظروں سے گھورتا ہوا وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ راسو نے آنیہ کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ''ریلیکس مس آنیہ! ہم ایسے حالات سے گزر رہے ہیں کہ اپنے سائے پر بھی شک کرنا پڑتا ہے...... اور کل آپ کا یہاں آنے کا جو انداز تھا، اس نے ہمیں واقعی ٹھٹکایا ہے۔ ضلع بھر کی پولیس میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور صرف پولیس ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی ہیں، میں کوشش کے باوجود آپ کی اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا کہ کل آپ اتفاقاً......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ

سگریٹ کے لیے اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف گیا مگر پھر آنیہ کی موجودگی کا احساس کر کے وہ رک گیا۔

''آپ کب پہنچی ہیں یہاں راجوری میں؟'' وہ اس سے سوال جواب کرنے لگا۔

آنیہ اس صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ لہٰذا راسو کے سوالوں کے مناسب جواب دیتی رہی۔ وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر سچ کیسے بتاتی؟ وہ کیسے بتاتی کہ زباب منزل میں اس کی گرفتاری کی رات وہ اس کے بیڈروم میں، اور بالآخر اس چور خانے تک پہنچی تھی جہاں اس کا موبائل اور اس کی سیاہ کور والی ڈائری پڑی تھی۔ وہ ڈائری جس میں ایک ناقابلِ فہم زبان میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز بند تھا، یہ حقیقت چھپی ہوئی تھی کہ وہ آیا خالہ کا بیٹا راسو نہیں، وہ حیدر تیملی کا چشم و چراغ ہے۔ زباب منزل اور اپنے باپ دادا کے شاندار ماضی کا اصل وارث۔ بے شک سیاہ گرد پوش والی وہ ساری ڈائری ہی انکشاف انگیز تھی۔ اسی ڈائری نے آنیہ کو یہ بتایا تھا کہ راسو جو بظاہر راجوری ٹاؤن کا ایک آوارہ گرد ہے، دراصل ایک بہت بڑے ''کاز'' سے وابستہ ہے۔ اس کی عام سی شخصیت کے اندر کشمیر کا ایک فریڈم فائٹر چھپا ہوا ہے۔

راسم کے سوال جواب نے طول پکڑا تو آنیہ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ وہ بولی۔ ''راسم! یہ بات درست ہے کہ میں ایک بار آپ سے ملنا چاہتی تھی، آپ سے بات کرنا چاہتی تھی مگر میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس میں کسی بھی طرح کی بُری نیت کو دخل نہیں ہے، نہ ہی اس سلسلے میں کوئی اور میرے ساتھ ہے۔ آپ اس بارے میں جس طرح کا حلف چاہیں مجھ سے لے سکتے ہیں۔''

راسم، راسو نے بڑے دھیان سے اس کی جانب دیکھا۔ آنیہ کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے یکدم شک کی بھول بھلیوں سے یقین کی منزل پر لا کھڑا کیا۔ اس نے آنیہ کی آنکھوں میں جھانکا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''اوکے...... آئی ایم سوری، میں اس بارے میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا...... لیکن مجھے...... راجا کو ذرا مطمئن کرنا ہوگا۔''

آنیہ خاموش رہی۔ اس کی پلکوں پر ایک دو موتی اٹکے ہوئے تھے۔ راسو نے مزید کہا۔ ''یہ گودام راجا کا ہی ہے۔ میرا قریبی دوست ہے۔ غصے کا تھوڑا تیز ہے لیکن دل کا اچھا ہے۔''

آنیہ کو وہیں چھوڑ کر راسو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد راسو اور راجا کے جھگڑنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ آنیہ کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ پہلے تو دونوں ہی بلند آواز میں بولے پھر دھیرے دھیرے راجا کی آواز مدھم ہونے لگی۔ قریباً پانچ منٹ بعد راسو واپس آگیا۔

''آپ چائے پئیں گی؟'' اس نے نارمل لہجے میں آنیہ سے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ بس دو چار سوالات ہیں جو بڑے دنوں سے ذہن میں کلبلا رہے ہیں، وہ آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''چلیں سوالات بھی کر لیجیے گا مگر چائے تو ہونی چاہیے۔'' اس نے کہا اور دائیں جانب چلا گیا۔ آنیہ کے اندازے کے مطابق کچن اسی طرف تھا۔ آنیہ کا خیال تھا کہ وہاں کوئی عورت بھی موجود ہے۔ ایک منٹ بعد راسو واپس آگیا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ کسی کمرے سے کسی عورت کے بلند آواز میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آنیہ چونک گئی راسو پھر باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی۔ اس نے کچھ نہیں بتایا نہ ہی آنیہ نے کچھ پوچھا۔ وہ اب گفتگو کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے آنیہ سے ڈھائی تین ماہ پہلے کی اس رات کے بارے میں بات کی جب وہ گرفتار ہوا تھا۔ اس نے آنیہ سے پوچھا کہ وہ زباب منزل سے کیسے نکل پائی؟

آنیہ نے اسے مختصراً اس بارے میں بتایا پھر اس سے پوچھا۔ ''راسم! لوگوں کا کہنا ہے کہ نو بیاہتا جوڑے ظہیر اور نادیہ کو آپ نے ہی ٹھیکیدار وغیرہ کے چنگل سے نکالا تھا، کیا یہ درست ہے؟''

''بس اللہ نے مجھے ان کی مدد کا وسیلہ بنا دیا، ورنہ میں اس قابل تو نہیں ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''اور آپ کی گرفتاری بھی اسی وجہ سے ہوئی؟''

''فی زمانہ اچھے کام کا کچھ خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی مقامی پولیس کو بڑی خوشی ہوتی ہے، مجھے مہمان بنا کر۔ کچھ عرصہ پہلے مجھ پر منشیات کا کیس ڈال دیا تھا اور پھر وہ واقعہ تو آپ کی یہاں موجودگی میں ہی ہوا تھا جب کہیں ڈکیتی ہوئی تھی اور مشتبہ افراد میں شامل ہونے کا اعزاز مجھے بھی بخش دیا گیا تھا۔''

اسی دوران میں دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ راسو جلدی سے اٹھا اور چائے والی ٹرے پکڑ لی۔ چائے لانے والی کو دیکھ کر آنیہ کو شدید حیرت ہوئی۔ یہ ایک ٹانگ سے معذور سدرہ احمد تھی۔ آج آنیہ پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی خوب صورت تھی۔ تاہم گہری سیاہ

آنکھوں میں ایک طرح کا دکھ ہلکورے لیتا تھا۔ ''السلامُ علیکم۔'' سدرہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

آنیہ نے وعلیکم السلام کہا اور اٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔ ''آجائیں ناں آپ بھی۔'' آنیہ بولی۔

''نہیں، میں ابھی ذرا کوکنگ کر رہی تھی۔'' سدرہ دوستانہ لہجے میں بولی اور اجازت لے کر لنگڑاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

آنیہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی اور آہ سی بھر کر بولی۔ ''کتنی پیاری ہیں...... لیکن یہ ٹانگ کا نقص...... کیا...... واقعی یہ سیڑھیوں سے ہی گری تھیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' راسو نے مختصر جواب دیا۔ لگتا تھا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا۔

یکا یک آنیہ کا دھیان نو بیاہتا جوڑے کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی۔ ''راسم صاحب! ظہیر اور نادیہ کے بارے میں مجھے بڑا تجسس رہا ہے۔ وہ دونوں خیر خیریت سے تو ہیں ناں؟''

''بالکل خیریت سے ہیں۔''

''لیکن کہاں؟''

''راجوری سے کافی دور...... قریبا 3000 کلو میٹر دور...... بنگلور کے ایک قصبے میں، وہ جگہ ان کے لیے بہت محفوظ ہے۔ کیا آپ انہیں دیکھنا چاہیں گی؟''

''کیسے؟'' آنیہ نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

راسو نے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں ظہیر نے مجھے اپنی یہ وڈیو بھیجی ہے۔'' اس نے وڈیو پلے کر کے موبائل آنیہ کی طرف بڑھا دیا۔ گڑیا سی نادیہ ایک چھوٹے سے مگر آراستہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ بس اس کا عقب نظر آ رہا تھا۔ ظہیر دبے پاؤں پیچھے سے آیا اور ایک دم آواز نکال کر اسے ڈرا دیا۔ وہ چلا کر مڑی۔ آٹے والا برتن بھی گر گیا۔ اس نے پیار بھرے غصے سے ظہیر کی طرف دیکھا۔ اس کے کومل ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے...... تب اچانک اس نے اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھ ظہیر کے چہرے اور گردن پر مل دیے...... اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ظہیر نے کیمرے کا رخ اپنی طرف موڑ کر اپنا آٹے میں سنا ہوا چہرہ دکھایا اور پھر نادیہ کے پیچھے لپکا۔ ''ٹھہر جا بتاتا ہوں تجھے۔'' اس کی آواز ریکارڈ ہوئی۔ پھر کیمرے نے نادیہ کو دکھایا۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہو رہی تھی اور اپنی ساس یعنی ظہیر کی والدہ کے پیچھے جا چھپی تھی۔ یہ ایک منٹ کا وڈیو کلپ ان دونوں کی خیر خیریت کی مکمل تفصیل پیش کر رہا تھا۔

آنیہ کو یہ سب اچھا لگا مگر پھر وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن آپ کو اس کے لیے بھاری قیمت چکانا پڑی۔''

''زیادہ بھاری نہیں۔'' راسو ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ جسمانی ریمانڈ کے دوران میں ہی مجھے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ کورٹ کے احاطے میں ہی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھوڑی سی دھینگا مشتی کر کے میں نکل بھاگا۔''

''اور اب آپ اشتہاری ہو چکے ہیں۔ پولیس اور فوج آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''پولیس اور فوج، اکیلا مجھ کو ہی تو نہیں ڈھونڈ رہی...... ان کو تو اس خطے کے سارے ہی مسلم نوجوان مطلوب ہیں۔ ایک بہانہ نہ ہوگا تو کوئی دوسرا بہانہ ہوگا۔ بس کرنل اروڑا جیسے لوگ سلامت رہیں پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہنا ہے۔''

ایک دم کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ آنیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ابھی آپ نے فون پر، نہار کے ماموں دلبر صاحب کا ذکر کیا تھا...... آپ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا ہے۔''

''صرف انہوں نے ہی نہیں بتایا۔ بہت سے لوگوں کا خیال بھی ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہیں کر سکی۔

''دیکھیں آنیہ، آپ کو جو کہنا ہے کھل کر کہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی کسی بات کا بُرا نہیں مانوں گا۔ اس کے علاوہ یہاں آپ جو کچھ بھی کہیں گی وہ بس ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ...... میرے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں، میں آپ سے جو بات کہوں گا، وہ لوہے پر لکیر ہوگی۔''

آنیہ کی پلکیں بے ساختہ لرز گئیں۔ وہ کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔ یہ ''خاص اہمیت'' والی بات اس نے زباب منزل میں بھی کہی تھی۔

''آپ کس سوچ میں کھو گئی ہیں، بات تو مکمل کر دیجیے۔''

وہ بولی۔ ''لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا تعلق کشمیر کی کسی خفیہ تنظیم سے ہے۔ آپ مسلح جدوجہد میں شریک ہو چکے ہیں...... یا ہونے والے ہیں۔''

''بالفرض ایسا ہے بھی تو اس میں برائی کیا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کو جدوجہد کے بغیر روکا جا سکتا ہے؟ اس وادی کو جابروں کے تسلط سے

آزاد کرایا جاسکتا ہے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن جدوجہد ہتھیار اٹھانے اور خون خرابے کا ہی نام تو نہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ ایک بندے کی آواز چند گھنٹوں کے اندر پوری دنیا میں سنی جاتی ہے تو پھر کیوں نا ہتھیار اٹھانے کے بجائے آواز اٹھائی جائے۔"

"مس آنیہ! آواز تو 72 برس تک اٹھائی جاتی رہی ہے اور اب بھی اٹھائی جارہی ہے لیکن ذرائع ابلاغ کا شور جتنا بڑھ گیا ہے، دنیا اتنی ہی بہری بھی ہوگئی ہے، اب وہ نعروں کی آواز پر نہیں چونکتی، بلکہ شاید گولی کی آواز پر بھی نہیں چونکتی۔ اب وہ دھماکے کی آواز پر چونکتی ہے...... ہمیں نعرے بھی بلند کرنا پڑیں گے اور دنیا کو چونکانا بھی پڑے گا۔"

آنیہ نے حیرت سے راسو کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ راسو جیسے بے ڈھنگے لباس اور اُلجھے بالوں والا بے ترتیب شخص ایسی فلسفیانہ بات بھی کرسکتا ہے۔

آنیہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "راسم صاحب! کشمیر کے لوگوں کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق ملنا چاہیے۔ اس میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں مگر آپ جانتے ہیں قریباً ایک لاکھ افراد اس جارحانہ راستے پر چل کر اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ اگر آپ......"

"پلیز مس آنیہ! مجھے دکھ ہورہا ہے کہ آپ اسے جانیں گنوانا کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لیے جانیں دی ہیں۔ اور جان کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ جان اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔" راسو کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ ایک آواز سن کر چونکی تھیں۔ چونکی تھیں نا؟" "اٹھیے...... آیئے، میں آپ کو دکھاتا ہوں وہ آواز کس کی تھی۔"

اس نے عجب جذب کے عالم میں آنیہ کی کلائی تھامی اور اسے اٹھا کر ایک کوریڈور میں لے آیا۔ نیم تاریک کوریڈور کے آخری سرے پر ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ راسو نے دروازہ کھولا اور آنیہ کو اندر لے آیا۔ یہاں دواؤں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بیڈ پر ایک زخمی عورت پڑی تھی۔ اسے گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس کشمیری عورت کی عمر پینتیس چالیس سال ہوگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ آنیہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ اس کے چہرے پر چیچک یا خسرے جیسے بے شمار داغ تھے۔ کئی جگہ یہ داغ گہرے زخموں کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔

"یہ دیکھو مس آنیہ! پیلٹ گن کا ایک اور شاہکار۔ یہ راجوری میں ہی زخمی ہوئی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے اسی طرح بستر پر ہے۔ اس کا شوہر سات سال پہلے سرینگر میں ایک مظاہرے کے دوران میں شہید ہوچکا ہے۔ اس کا ایک بچہ تھا بابر۔ چار ماہ پہلے راجوری میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا۔ چودہ پندرہ سالہ بابر بھی اس میں شرکت کے لیے نکل گیا۔ اسے پتا چلا تو یہ دیوانی ماں اسے واپس لانے کے لیے گھر سے نکلی۔ اس نے بچے کو تو بچالیا مگر خود پیلٹ گن کا شکار ہوئی۔ کوئی دو سو چھرّے اس کے جسم میں پیوست ہیں۔ ایک آنکھ بھی ضائع ہوچکی ہے۔ اسے بڑی سرجری کی ضرورت ہے مگر یہ جس وقت کسی بڑے اسپتال میں جائے گی، پکڑی جائے گی۔ اب تو یہ شاید ویسے بھی علاج معالجے کی ضرورتوں سے گزرنے والی ہے۔ اس کے جسم میں زہر پھیل چکا ہے مگر اسپتال جانے کے بجائے یہاں مرنا اسے سہل لگتا ہے۔"

آنیہ سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ راسو نے کہا۔ "اور یہ کوئی ایک عورت نہیں مس آنیہ! آپ جانتی ہیں ایسے سیکڑوں لوگ اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔ شدید زخمی ہوکر سسک رہے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو قبرستانوں کی آبادی بڑھا چکے ہیں۔ آپ پنجاب سے آئی ہیں۔ اس آگ کو دور سے دیکھتی رہی ہیں، ہم نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

آنیہ کو یاد آگیا۔ ڈھائی ماہ پہلے جب وہ یہاں راجوری میں ہی تھی، ایک دن اس نے راسو اور شہابی کو کسی زخمی عورت کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ راسو بڑے کرب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے مگر وہ فوراً پکڑی جائے گی...... اس وقت آنیہ نے سوچا تھا کہ شاید وہ کسی جرائم پیشہ زخمی کے بارے میں بات کررہا ہے۔

راسو کی آنکھوں میں آتشیں آنسو چمک رہے تھے۔ غالباً اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ہی وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اسی دوران میں سدرہ لنگڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور گلوکوز کی ڈرپ میں گرتے ہوئے قطروں کا جائزہ لینے لگی۔ (وہ فارمیسی کی طالبہ رہی تھی۔ میڈیکل کی سمجھ بوجھ رکھتی تھی) آنیہ بھی راسو کے پیچھے پیچھے نکل آئی۔ راسو دوبارہ کمرے میں آچکا تھا۔ وہ غمزدہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ آنیہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ویری سوری راسم! آپ کو میری بات سے تکلیف ہوئی ہے، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2020
بانی
معراج رسول
pklibrary.com

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مس آنیہ! یہاں ہر جگہ دردناک کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ انسانیت لہولہو ہو رہی ہے۔ ابھی آپ نے ٹانگ سے معذور سدرہ احمد کو دیکھا۔ آپ کے ذہن میں کئی سوال اٹھے ہوں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسے ہی کچھ سوال آپ کو یہاں کھینچ لائے ہیں۔ میں درست کہہ رہا ہوں نا؟“

آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا پھر ہولے سے بولی۔ ”کہا جاتا ہے کہ یہاں کشمیر میں آپ کا کوئی دوست تھا...... فاروق نام کا...... جو انڈین فورسز کے تشدد کا شکار ہوا۔“

”ہاں، سمجھیں کہ اس سدرہ اور فاروق کی کہانی ایک ہی ہے۔ آپ جاننا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بتاؤں گا، بلکہ سب کچھ بتاؤں گا۔ شاید پھر کبھی یہ موقع نہ ملے۔ مجھے...... مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ آپ اس وقت چل کر میرے پاس آئی ہیں۔ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے کچھ جاننا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں، ہم دونوں کے درمیان ہی رہیں گی۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ آنیہ نے جھکی پلکوں کے ساتھ کہا۔ ”اور راسم! ایک بار پھر سوری۔“

”نہیں آنیہ! سوری کی بات نہیں۔ بہت دیر نہیں ہوئی جب میری سوچ بھی وہی تھی جو آپ کی ہے۔ بالکل یہی خیالات...... فاروق میرا سب سے قریبی دوست تھا۔ ہم نے ایف ایس سی بھی اکٹھے ہی کیا تھا۔ وہ اپنی ایک بہن اور بوڑھے ہوتے والدین کے ساتھ رہتا تھا، ان کا واحد سہارا تھا۔ بے شمار دوسرے کشمیری نوجوانوں کی طرح اسے بھی قابض بھارتی فوج سے نفرت تھی۔ وہ مظاہروں میں شریک ہوتا تھا۔ پوسٹر لگاتا تھا اور مسلح فوجیوں پر غلیلوں سے کنکر برساتا تھا۔ یہ مزاحمت کی ایک کمزور سی شکل ہے لیکن میں اسے منع کیا کرتا تھا، خطروں سے آگاہ کرتا تھا مگر ہماری دوستی ایسی تھی کہ کسی بھی کام میں ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ مظاہروں میں، میں بھی اس کے ساتھ ہی شامل ہوتا تھا۔ فاروق مردانہ وجاہت میں اپنی مثال آپ تھا۔ کالج کی ایک برہمن لڑکی درشانا اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ درشانا خود بھی خوب صورت تھی مگر فاروق سے اس کی روز افزوں محبت اس کی مردانہ وجاہت سے زیادہ اس کے بے مثال اخلاق کی وجہ سے تھی۔ درشانا جانتی تھی کہ ان دونوں کا ایک ہونا مشکل ہے۔ برہمن تو نچلی ذات میں بھی شادی کرنے سے ہچکچاتے ہیں کہاں کہ ایک مسلمان سے پھر بھی وہ اس سے پیار کیے جا رہی تھی۔ درشانا اسی کالج کے ہوسٹل میں رہتی تھی جہاں ہم گریجویشن کر رہے تھے۔ اس دنیا میں ایک نانی اور ماموں کے سوا اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ ماموں بھی روزگار کے سلسلے میں ملائیشیا میں تھے۔

ایک دن فوجی ہمارے محلے کے دو نوجوانوں کو پکڑ کر فوجی کیمپ میں لے گئے۔ انہیں مارا پیٹا گیا، تذلیل کی گئی، مرغا بنایا گیا اور کہا گیا کہ وہ محلے کے ان لڑکوں کے نام بتائیں جو فوجی گاڑیوں پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ جان بچانے کے لیے ان دونوں نے مجبوراً کچھ نام لکھوا دیے۔ ایک روز میں بازار سے گھر واپس آیا تو مسجد کے قریب واقع خالی پلاٹ میں پریشان کن منظر دیکھا۔ محلے کے قریباً بیس لڑکے اور نوجوان دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دھوپ میں کھڑے تھے۔ فوجی ان کی پنڈلیوں پر چھڑیاں رسید کر رہے تھے۔ ان میں فاروق بھی شامل تھا پھر ایک باوردی کیپٹن نے لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ بلند آواز میں ”پاکستان مردہ باد“ کا نعرہ لگائیں۔ دہشت زدہ لڑکوں نے نعرے لگائے۔ جنہوں نے پس و پیش سے کام لیا انہیں پھر چھڑیاں کھانا پڑیں۔

ایک سپاہی نے فاروق کے سر پر چھڑی سے ضرب لگائی اور گرج کر بولا۔ ”اوئے کنجر! تیرے گلے میں کیا پھنسا ہوا ہے۔ تیری آواز اونچی کیوں نہیں نکل رہی؟“

کیپٹن پہلے ہی تپا ہوا تھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور سپاہی سے کہا کہ اسے علیحدہ کرو۔ فاروق کو دوسرے لڑکوں سے علیحدہ کر کے ایک اسٹول پر کھڑا کر دیا گیا۔ کیپٹن نے ایک میگافون فاروق کو تھمایا اور بولا۔ ”اب اس میں بولو اور زور سے بولو لیکن اب نعرہ بدل گیا ہے۔ اب کہو۔ ”میں حرام زادہ ہوں......“ کم از کم دس مرتبہ یہ لفظ بولو۔“

فاروق کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”معاف کر دیں سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بہت احتیاط کریں گے۔“

”معافی کی باتیں بعد میں ہوں گی۔ فی الحال جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“ وہ دہاڑا۔

بیسیوں لوگ کھڑکیوں سے اور دروازوں کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ میں بھی چند افراد کے ساتھ فاصلے پر موجود تھا۔ ان لڑکوں کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاروق کی آواز جیسے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ایک حوالدار نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور میگافون اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیا۔ یکایک فاروق نے میگافون پھینکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ فوجی اس کے پیچھے لپکے...... گلی کی نکڑ پر انہوں نے اسے دبوچ لیا۔ اسے رائفل کے کندوں اور بوٹوں

کی ٹھوکروں سے بُری طرح پٹنا جانے لگا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے، وہ بے طرح لوٹ پوٹ ہورہا تھا مگر اب اس کا اپنا انداز بھی جارحانہ ہورہا تھا۔ وہ سینے کی پوری قوت سے چلارہا تھا...... پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد...... مودی قاتل...... مودی حرامی...... مشتعل فوجیوں نے اس کے منہ میں ریت بھردی اور لہولہان کر کے جیپ میں پھینک دیا۔"

راسم عرف راسو خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر کرب تھا۔ غالباً وہی سنگین مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

"وہ اسے کیمپ میں لے گئے؟" آنیہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں، کہاں لے گئے۔ وہ کسی کو بتاتے تھوڑا ہی ہیں۔ کہا گیا کہ دو چار دن میں چھوٹ جائے گا مگر دو چار دن گزرے، پھر دو چار ہفتے اور پھر مہینے۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ باپ پہلے ہی دل کا مریض تھا، وہ چل بسا۔ ایک بڑا بھائی بال بچے دار تھا۔ وہ فوج کے ڈر سے کہیں غائب ہوگیا۔ بوڑھی ماں بیٹے کی بازیابی کے لیے جوتیاں چٹخاتی رہی اور متعلقہ لوگوں کی منتیں سماجتیں کرتی رہی۔ درشانا بھی ان چند افراد میں شامل تھی جو فاروق کا پتا چلانے کے لیے اپنی سی کوشش کررہے تھے۔ کہا یہی جارہا تھا کہ کیمپ انچارج کرنل آکاش اروڑا ہی اس سلسلے میں کچھ کرسکتا ہے۔ درشانا ایک سفارش کے ذریعے کرنل اروڑا تک پہنچی اور دو تین بار اس کے دفتر جاکر اس سے ملی۔ وہ خوب صورت تھی۔ اروڑا کی نگاہوں کو بھاگئی۔ ایک موقع پر جب وہ اس کے دفتر میں تھی۔ اس نے درشانا سے کوئی نازیبا بات کی جس کا درشانا نے بُرا منایا۔ اروڑا بگڑ گیا اور اسے دھکے دے کر دفتر سے نکال دیا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ مجبور و بے بسی میں کوئی انا باقی نہیں رہتی۔ درشانا بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ پیار نہیں عشق کرتی تھی فاروق سے۔ اس کے لیے ہر حد تک جاسکتی تھی۔ اپنی ہستی تک لُٹا سکتی تھی۔ وہ بے عزت ہونے کے باوجود چند دن بعد پھر کرنل اروڑا سے ملی۔ وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ پتا نہیں، اختیار کے نشے میں کتنی عزتیں پامال کرچکا تھا۔ اس کی بیوی نے چھ سات سال پہلے آتما ہتھیا کرلی تھی۔ اس نے درشانا کو باور کرایا کہ اگر وہ اپنے محبوب فاروق کو موت کے منہ سے بچانا اور آزادی دلانا چاہتی ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ایک بڑی قربانی دینا ہوگی۔ اس نے درشانا سے کہا۔ "میں تم سے پریم کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ اونچی ذات کا ہندو ہوں۔ دولت اور اثر و رسوخ سب کچھ ہے۔ مجھ سے شادی کرلو۔ وہ لڑکا بچ جائے گا۔"

یہ ایک عجیب سودا تھا۔ زندگی اپنے زہر کا تلخ ترین گھونٹ درشانا کو پلا رہی تھی...... اور اس بے چاری نے پی لیا...... اس نے پی لیا۔"

راسم ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہورہے تھے۔

آنیہ نے پوچھا۔ "اس نے اروڑا سے شادی کرلی؟"

"ہاں، باقاعدہ شادی کرلی۔ اروڑا نے اسے بتایا کہ فاروق کشمیر کے بجائے ہماچل پردیش کی ایک جیل میں ہے۔ وہ اسے وہاں سے بخیریت رہا کرائے گا اور یہی اس رُوداد کا سب سے المناک پہلو ہے۔ جب اروڑا یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور خوبرو درشانا سے شادی رچا رہا تھا، فاروق کو جاں بحق ہوئے چار پانچ ماہ ہوچکے تھے۔ وہ بھی ان ہزاروں شہیدوں میں شامل ہوچکا تھا جو قابض فوج کے عقوبت خانوں میں سسک سسک کر دم توڑتے ہیں۔ سفاکی کی انتہا ہے ناں آنیہ! آپ ایک ایسے شخص کی رہائی کے لیے تاوان وصول کرتے ہیں جس کو آپ اپنے ہاتھوں سے مار چکے ہوتے ہیں۔ درشانا نے اپنا تن من جس چیز کے حصول کے لیے کرنل اروڑا کے حوالے کردیا وہ چیز تو موجود ہی نہیں تھی۔ سفاکی اور سنگدلی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ اروڑا ایک ہوس کار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خود سے 22 سال چھوٹی درشانا اب ہر طرح سے اس کی دسترس میں تھی۔ کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ درشانا بار بار اروڑا کو اس کا وعدہ یاد دلاتی رہی۔ وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا پھر ایک روز جب وہ نشے میں دھت تھا اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ...... جو مر گیا ہے، اس کی جان کو کیوں روتی رہتی ہو۔

"اس روز درشانا کو یقین ہوگیا کہ اس کی ساری منتیں سماجتیں اور کوششیں بیکار ہیں۔ فاروق تو اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ وہ اب تک بے صلہ ہی ایک بدبودار بوجھ تلے روندی جاتی رہی ہے، زخمی ہوتی رہی ہے۔ وہ بہت روئی۔ اس کو اپنے گرد و پیش سے نفرت ہونے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایک روز وہ سب چھوڑ چھاڑ کر اروڑا کے گھر سے بھاگ گئی مگر وہ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اُسے پھر پکڑ لایا۔ اس بے چاری کا آگے پیچھے کون تھا، جو اس کی مدد کرتا۔"

راسو کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جذبات کو بمشکل سنبھال رکھا تھا۔ اس نے آنیہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگائی اور دوسرے کمرے میں جاکر چند گہرے کش

لیے پھر سگریٹ بجھا کر واپس آ گیا۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدل رہے تھے۔ آنیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”راسم! مجھے لگ رہا ہے کہ درشانا اور سدرہ ایک ہی لڑکی کے دو نام ہیں؟“

راسو نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”جب دوسری دفعہ درشانا نے اروڑا کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی ایک سنگین دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس نے ایک وزنی رائفل کا بٹ مار کر بیچ درشانا کی ٹانگ توڑ دی۔ کہا یہی گیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ وہ ایک ماہ اسپتال میں زیرِ علاج رہی اور تب پھر اروڑا کے زنداں میں چلی گئی۔ چند دن بعد وہ بیمار ہو گئی۔ وہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گئی تھی اور روتی رہتی تھی۔ اروڑا کا دل بھی بتدریج اس سے بھر گیا تھا۔ اس نے سراسر اپنی شرائط پر اسے طلاق دے دی۔ وہ بالکل بے آسرا تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دنیا کے اس سانپوں سے بھرے جنگل میں بھٹک جاتی، میں اپنے یار فاروق کی نسبت سے اسے زباب منزل میں لے آیا۔ وہ اب تک ایک بہن کی طرح میرے ساتھ رہی ہے۔ یہ کچھ ماہ پہلے کی بات ہے جب درشانا نے اچانک ایک اہم فیصلہ کیا۔ وہ اپنی رضا اور چاہت سے مسلمان ہو گئی۔ اس کا نام سدرہ رکھا گیا۔ میں اپنی اس مسلمان بہن کی ذہنی کیفیت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک طرح سے خود کو مطلقہ نہیں سمجھتی بلکہ فاروق کی بیوہ سمجھتی ہے...... اور باقی زندگی اسی کے نام پر گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی نانی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ماموں بے چارہ بیرونِ ملک ہے اور دنیا کے جھمیلوں سے گھبرانے والا شخص ہے۔“

اچانک کوریڈور کی طرف سے چلانے کی آواز آئی۔ یہ سدرہ ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید راسو کو بلا رہی تھی۔ راسو لپک کر آواز کی طرف گیا۔ آنیہ اس کے پیچھے گئی۔

وہ اس کمرے میں پہنچے جہاں درمیانی عمر کی کشمیری عورت زخموں سے چور نازک حالت میں پڑی تھی۔ اس کی سانس ایک دم ہی اکھڑ گئی تھی۔ سینہ بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ سدرہ نے پکارا۔ ”ان کو آکسیجن چاہیے فوراً...... ورنہ کچھ بھی ہو جائے گا۔“

راسو لپک کر ساتھ والے کمرے میں گیا اور وہاں سے آکسیجن کا ایک سلنڈر گھسیٹ کر لے آیا۔ اسٹینڈ وغیرہ بھی موجود تھا۔ لگتا تھا کہ ایمرجنسی میں پہلے بھی خاتون کو آکسیجن لگائی گئی ہے۔ خاتون کا چہرہ اور ہونٹ بالکل نیلے ہو رہے تھے۔ ان کی دھڑکن بحال رکھنے کے لیے راسو دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ آکسیجن کا ماسک ڈھونڈ رہا تھا۔ ماسک مل نہیں رہا تھا۔ وہ خاتون کو ماؤتھ ٹو ماؤتھ ”بریدنگ“ دیتے ہوئے پکارا۔ ”سدرہ ماسک دیکھو۔ میرے کمرے میں کہیں پڑا ہوگا۔ سدرہ بے چاری لنگڑاتی ہوئی قریبی کمرے کی طرف لپکی۔ آنیہ بھی اس کی مدد کے لیے بڑھی۔ ایک منٹ میں انہوں نے پورے کمرے کو الٹ پلٹ دیا۔ سدرہ بولی۔ ”مجھے لگتا ہے ماسک والا ڈبا اس الماری کے اوپر رکھا ہوا تھا۔“

آنیہ جلدی سے ایک اسٹول پر چڑھی اور الماری کے پیچھے جھانکا۔ نیلے رنگ کا ڈبا الماری کے پیچھے خلا میں گرا ہوا تھا۔ اس نے بازو لمبا کر کے ڈبے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں اسے ایک بڑی گن نظر آئی۔ وہ ایک ہی نگاہ میں پہچان گئی۔ یہ وہی ”M2HB“ تھی جس کا ذکر پروفیسر زیڈ اے صدیقی نے کیا تھا اور تصویر بھی دکھائی تھی۔ آنیہ جلدی سے ماسک اور اس کی نالی والا ڈبا لے کر واپس راسو کے پاس پہنچی۔ راسو نے پلک جھپکتے میں خاتون کو آکسیجن لگا دی۔ بروقت فرسٹ ایڈ ملنے سے ان کے چہرے کی نیلاہٹ کچھ کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سانس کی ابتری بھی کچھ مائد محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے اَن گنت زخموں کا زہر ان کے سارے جسم میں پھیل چکا ہے۔ اب تو شاید باقاعدہ سرجری اور پراپر ”ٹریٹ منٹ“ بھی ان کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سدرہ گلوکوز کی ڈرپ میں کچھ انجکشن لگانے میں مصروف ہو گئی تھی...... چند منٹ بعد مریضہ کی حالت میں افاقہ محسوس ہوا...... اور پھر وہ سو گئیں۔

کچھ دیر بعد آنیہ اور راسو واپس کمرے میں آ گئے۔ گن دیکھنے کے بعد آنیہ کے جسم میں عجیب سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ اس کا یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ راسو ایک نہایت خطرناک راستے پر قدم رکھ چکا ہے اور اب اس کی وجہ بھی بہت حد تک سمجھ میں آ رہی تھی۔ فاروق کی کہانی کشمیر کے اَن گنت نوجوانوں کی کہانی تھی۔ قابض قوتوں کو ان کا ہلکا پھلکا احتجاج بھی گوارا نہیں تھا۔ جابر حکمران ان کے ہونٹ سی دینا چاہتے تھے۔ ان کو مکمل طور پر کچل دینے کے ارادے رکھتے تھے۔ شاید پروفیسر صدیقی نے ٹھیک ہی کہا تھا، آگ کی اصل تپش کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب انسان اس کی لپیٹ میں ہوتا ہے۔

آنیہ نے کچھ دیر مریضہ کے حوالے سے بات کی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”کرنل اروڑا تو شاید اب ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔“

''آنیہ، ایسے لوگ سروس سے ریٹائر ہو بھی جائیں تب بھی ظلم سے نہیں ہوتے بلکہ کئی تو پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص اب کشمیریوں کی زمینوں پر ناجائز قبضے کر رہا ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنا رہا ہے۔ راجوری میں تو پہلے سے بن رہی ہیں اب ایک چمبا ٹاؤن میں بھی شروع کر دی ہے۔'' اروڑا کا نام لیتے ہوئے راسو کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک شعلہ سا دہک جاتا تھا۔ شاید یہ شعلہ ہی اسے ایک بڑی آگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔

آنیہ نے کہا۔'' آکاش اروڑا نے جو کیا، وہ سفاکی اور لاقانونیت کی بدترین مثال ہے اور تو اور اس نے ہوس کاری کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی ایک ہم قوم اور ہم مذہب کو بھی نہیں بخشا۔ میرے پاپا ایک بڑے وکیل ہیں راسم! اگر آپ چاہیں تو وہ آپ کی قانونی مدد کر سکتے ہیں۔ اس بدبخت اروڑا کے سلسلے میں بھی اور ظہیر نادیہ والے مسئلے میں بھی۔ بے شک آپ سے بھی ایک غلطی ہوئی ہے پولیس حراست سے بھاگنے والی مگر اسے بھی تو ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔''

راسم عجیب انداز میں ہنسا۔'' آنیہ! میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہی ہیں لیکن...... میں شاید اس سے کافی آگے نکل چکا ہوں۔ ویسے بھی یہاں کشمیر میں قانون کی جو عملداریاں ہیں، وہ ایک کشمیری ہونے کے ناتے میں آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔''

''لیکن راسم، آپ جیسے باہمت نوجوانوں کی آپ کے کشمیر ہی کو ضرورت ہے۔ آپ اپنی جانوں کو کسی بہتر وقت کے لیے سنبھال رکھیں۔''

''اس سے بہتر وقت کوئی نہیں آئے گا آنیہ! ایک قصاب ہے جو اپنی کند چھری کے ساتھ کشمیر کی شہ رگ پر آن بیٹھا ہے۔ اب بھی سوچتے رہیں گے تو مٹ جائیں گے۔''

''مگر یہ ایک بڑی آگ ہے راسم، تھوڑا تھوڑا پانی آگ کو بجھاتا نہیں ہے، خود ختم ہو جاتا ہے۔''

''مگر وہ دھواں تو پیدا کرتا ہے، جو دور تک جاتا ہے اور ہم یہی دھواں دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔''

''آپ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟'' آنیہ نے اچانک پوچھا۔ راسم کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

''یہ آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ویری سوری...... لیکن ابھی جب میں گیس ماسک ڈھونڈ رہی تھی میں نے آپ کی الماری کے پیچھے ایک خطرناک رائفل دیکھی ہے اور اس کی گولیاں بھی۔''

''آپ کی نظر بہت تیز ہے۔'' وہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''مگر اتنی تیز نہیں کہ آپ کے اندر جھانک سکوں۔''

''ہاں اتنی تیز نہیں۔ ویسے آپ میرے اندر نہ ہی جھانکیں تو اچھا ہے۔ آپ بہت ناراض ہو جائیں گی۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ چہرے پر ہلکی سی شوخی تھی۔

''میں بہت سنجیدہ بات کر رہی تھی راسم، یہ بہت مہنگی رائفل لگتی ہے۔ کہاں سے ملی آپ کو؟''

''نادر چیزیں کہیں نہ کہیں سے تو مل ہی جاتی ہیں۔ آپ کو وہ نایاب تصویر کہاں سے ملی جو آپ نے زباب منزل میں شہابی کو دکھائی تھی؟'' وہ گفتگو کو پھر دوسری طرف لے گیا۔

''وہ جلیانوالا باغ کی تصویر تھی۔ 1919ء میں میرے ایک بزرگ نے اتاری تھی۔ ایک البم میں لگی ہوئی تھی اور پاپا کی ذاتی لائبریری میں موجود تھی۔''

''اب وہ میرے پاس بھی موجود ہے۔'' راسم نے اپنا موبائل فون دکھاتے ہوئے کہا۔''شاید شہابی نے اسے اتنا سنبھال کر نہ رکھا ہو، جتنا میں نے رکھا ہوا ہے۔''

''آپ کو اس میں کیا دلچسپی ہے؟ شہابی کے تو یہ دادا ہیں۔'' آنیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تو پھر میرے بھی دادا ہی ہوئے نا......'' اس نے بات بنائی۔''ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ شہابی نیوز کا بندہ ہے۔ اسے صرف نئی خبروں اور نئی تصویروں سے دلچسپی ہے۔ یہ پرانی چیزوں اور واقعات سے تعلق رکھنے والی رومانیت اس میں نہیں ہے۔''

''آپ میں ہے؟'' آنیہ نے قدرے بے تکلف لہجے میں پوچھا۔

''بہت زیادہ۔ یادوں کو بہت دیر تک سنبھال کر رکھنے والا بندہ ہوں۔'' اس نے آنیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ گڑبڑا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس نے پھر موضوع بدلا۔''ہاں تو آپ بات کر رہی تھیں جلیانوالا کی تصویر کی۔ میں نے گریجویشن کی ہے۔ آگے ماسٹرز کرتا تو ضرور ہسٹری میں کرتا۔ تحریکِ آزادی کے سارے واقعات مجھے یاد ہیں۔ خاص طور سے جلیانوالا کے واقعے نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ جنرل ڈائر بچپن سے ہی میرے لیے ایک مکروہ کردار تھا۔ جب میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ زباب منزل کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے سفید رنگ کے دو ٹٹو پال رکھے تھے۔ ایک بڑا تھا ایک چھوٹا۔ بڑے کا نام میں نے ڈائر رکھ چھوڑا تھا۔ جلیانوالا باغ کے واقعے کی بے شمار تصویریں اور اخباری تراشے

میرے پاس موجود ہیں...... وہ جابر حکمرانوں کے سامنے نہتے لوگوں کی مزاحمت کا ایک یادگار واقعہ تھا۔''

آپ کو اس واقعے میں اس لیے دلچسپی ہے کہ آپ کی رگوں میں اسی شیر بچے کا خون ہے جو اس تصویر میں نظر آتا ہے...... آپ اس کے پوتے ہیں...... یہ بات آنیہ نے زبان سے ادا نہیں کی بلکہ دل ہی دل میں کہی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ سیاہ ڈائری دیکھ چکی ہے اور اس کی اصلیت سے آگاہ ہو چکی ہے۔ وہ راز جو پچھلے کئی برس سے آپا خالہ اور راسم کے درمیان تھا، اب وہ بھی اس میں شریک ہو چکی تھی۔ وہ آپا خالہ کا نہیں، زباب بیگم کا بیٹا تھا۔

اسی دوران میں راسم نے آنیہ سے دومنٹ کی اجازت لی اور زخمی خاتون کو دیکھنے کے لیے کوریڈور والے کمرے میں چلا گیا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اب ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت تک آنیہ لازمی گھر پہنچ جاتی تھی۔ اس نے سوچا دلبر ماموں نے پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ اس نے دلبر ماموں کو فون کیا اور بتایا کہ وہ بارش کی وجہ سے اپنی دوست کے گھر رک گئی ہے۔ اب وہ کھانے پر اصرار کر رہی ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ واپس آجائے گی۔ دلبر ماموں کو مطمئن کر کے وہ خود بھی مطمئن ہو گئی۔ سدرہ واقعی اصرار کے ساتھ اسے کھانے کے لیے کہہ رہی تھی، وہ کشمیری پلاؤ بنا رہی تھی...... ہاں سدرہ، جو بھی درشانا تھی۔

راسم واپس آنیہ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک پڑیا سی تھی۔ اچانک بولا۔ ''ایک مرتبہ میں نے آپ کو ایک سیاہ گلاب دینے کی جسارت کی تھی۔ گلابی کناروں والا گلاب۔ پسند آیا تھا آپ کو؟''

آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے یہ ذکر بے محل لگا تھا۔ راسم نے کہا۔ ''اسی لیے آپ نے گلاب ٹیکسی سے باہر پھینک دیا تھا۔ یہ دیکھیں، میں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' اس نے پڑیا کھول کر آنیہ کو دکھائی جس میں گلاب کی خشک پتیاں تھیں۔ وہ لاجواب سی ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ ''اب تو آپ کو یقین آ گیا ہوگا کہ میں یادوں کو سنبھال کر رکھنے والا بندہ ہوں...... زندگی کی آخری سانس تک۔''

''زندگی کی آخری سانس۔'' اس نے عجیب انداز میں کہا۔ آنیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ سے ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتائیے گا؟''

''آپ پوچھ رہی ہیں تو پھر سچ ہی بتاؤں گا بلکہ سچ بتانا ہی پڑے گا۔''

''کہیں آپ کی اس خطرناک رائفل کا ٹارگٹ......

ریٹائرڈ کرنل اروڑا تو نہیں؟''

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند گہری سانسیں لیں۔ کھڑکیوں سے باہر بارش کی آواز تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے آنیہ کو سرتاپا دیکھا اور جیسے اپنے اندر جذب کر لیا۔ پھر ٹھہری آواز میں بولا۔ ''پتا نہیں کہ پھر کبھی ایسا موقع آئے گا یا نہیں۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھ پائیں گی یا نہیں۔ میں آپ کو کچھ بتا پاؤں گا یا نہیں؟ جی چاہتا ہے آج آپ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں۔ وہ بھی نہیں، جو چھپانا چاہیے۔ آپ سامنے ہیں تو ہر مصلحت بالائے طاق رکھنے کو دل چاہتا ہے۔''

''اس اعتماد کے لیے شکریہ۔ میں اس پر پورا اتروں گی۔''

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''جس روز میں نے اپنے پیارے فاروق کی ہڈیاں ایک قبرستان میں دفن کی تھیں اور روتی سسکتی سدرہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اسی روز میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اروڑا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا مگر اروڑا تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ وہ سروس کے دوران میں بھی سخت سیکیورٹی میں رہتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے گرد سیکیورٹی کا حصار مزید مضبوط ہو چکا ہے۔ گھر، دفتر اور دیگر جگہوں پر درجنوں گارڈز اس کے اردگرد تعینات ہوتے ہیں۔ میں اب تک دو بار اس پر ATTEMPT کر چکا ہوں۔''

یہاں تک کہہ کے راسم خاموش ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ غالباً وہ اپنے دوست راجا کی طرف سے تسلی کرنا چاہتا تھا۔ دروازے اور کھڑکی کو اچھی طرح بند کر کے وہ پھر آنیہ کے قریب آبیٹھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلی مرتبہ ایک کشمیری مجاہد میرے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک ہوٹل کی تقریب میں گھسنے کی کوشش کی۔ وہاں اروڑا موجود تھا۔ گارڈز چوکنے ہو گئے۔ ہمارے اور گارڈز کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ گولی لگنے سے میرا ساتھی شہید ہوا اور میرے کندھے پر بھی زخم آیا۔'' راسم نے اپنا کندھا ننگا کر کے زخم دکھایا تو اس کا گھنے بالوں سے بھرا ہوا سینہ کسی شیر کا سینہ نظر آیا۔

''دوسری کوشش بھی بڑی زبردست تھی مگر خدا کو منظور نہیں تھا، وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ موت جیسے اس باسٹرڈ کو چھو کر گزر گئی۔ مجھے کہیں سے تین ہینڈ گرینیڈ ملے تھے۔ امریکن ساخت کے یہ ''ایم کے ٹو'' نامی ہینڈ گرینیڈ پرانے تھے مگر درست حالت میں لگتے تھے۔ ان میں سے ایک گرینیڈ کو میں نے راجا کے ساتھ جنگل میں جا کر ٹیسٹ کیا اور باقی دونوں

سنبھال لیے۔ ہم دونوں موقع کی تلاش میں رہے۔ یہ موقع ہمیں انڈیا کے پچھلے یوم جمہوریہ پر ملا۔ آکاش اروڑا کی ہاؤسنگ اسکیم میں رات کے وقت آتش بازی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ خود بھی وہاں آرہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اس کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں مزید قریب جانا چاہتا تھا مگر سیکیورٹی کے حصار کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ گارڈینیا کی ایک باڑ کے عقب سے میں نے دونوں گرینیڈ اس پر اچھال دیے تھے۔ دونوں گرینیڈ پھٹے لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اس کا ایک گارڈ ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے۔ اس کی اپنی ٹانگ پر بھی زخم آیا مگر وہ شدید نقصان سے محفوظ رہا۔ اسے میری خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ گرینیڈ دھماکوں کی وجہ سے موقع پر بجلی کا نظام درہم برہم ہوگیا اور میں وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔''

راسم نے ذرا توقف کر کے آنیہ کے تاثرات دیکھے جو ہمہ تن متوجہ تھی، وہ بولا۔ ''اس واقعے کے بعد اروڑا کی سیکیورٹی مزید سخت ہوگئی اور اس سختی میں روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے۔ جب تک یہ شخص اس زمین پر دندناتا رہا ہے، میرے سینے میں ایک نیلی آگ روشن ہے اور یہ مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ یہ جو گن ابھی آپ نے الماری کے عقب میں دیکھی ہے، میں کئی ماہ سے اس کے پیچھے تھا۔ یہ دور تک مار کرنے والی بہترین آٹومیٹک گنز میں شمار ہوتی ہے۔ اس کو ایم ٹو براؤننگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قریباً پونے دو کلومیٹر تک بہ آسانی مار کر سکتی ہے اور اس کی یہی خوبی ہے جو میرے لیے سب سے اہم ہے۔''

''وہ کیوں؟'' آنیہ نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''اب تک میں نے اس مکروہ اروڑا کے سلسلے میں جتنا بھی ہوم ورک کیا ہے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میں اسے راستے میں تو مارنے کی کامیاب کوشش کر سکتا ہوں مگر اس کے کسی ٹھکانے پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہینڈ گرینیڈز والے واقعے کے بعد اس کی سیکیورٹی بہت بڑھ چکی ہے۔''

''راستے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' آنیہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ''کہا ہے نا کہ آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا وہ بھی نہیں جس کو جاننے کی آپ کو ضرورت نہیں۔''

وہ ایک مقفل دراز کے اندر سے ایک سفید کاغذ لے آیا۔ اس پر ہاتھ کی مدد سے ہی ایک نقشہ سا بنایا گیا تھا۔ یہ نقشہ اپنے سامنے رکھتے ہوئے راسم نے آنیہ کو بتایا کہ ہفتے میں تین روز آکاش اروڑا اپنی رہائش گاہ سے اپنی ہاؤسنگ اسکیم کی طرف جاتا ہے اور یہ راستہ اختیار کرتا ہے۔ ہائی وے جیسی یہ سڑک ایک جگہ خم کھاتی تھی اور وہاں اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ ایسا ہی ایک ٹیلا راسم کے لیے ''کمین گاہ'' کا کام دینے والا تھا۔ اس نے سب کچھ ''کیلکولیٹ'' کیا ہوا تھا۔ جہاں راسم کو گھات لگانا تھی وہ ایسی جگہ تھی جہاں اروڑا کی گاڑی اور اس کے آگے پیچھے چلنے والی گاڑیوں کو کم از کم 30 سیکنڈ تک اس کی زد میں رہنا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ بہت اچھا نشانے باز نہیں ہے ورنہ شاید وہ اس گن کے بجائے کوئی اسنائپر وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ بیلٹ کے ذریعے فائر کرنے والی یہ گن ایک سیکنڈ میں کم و بیش 8 گولیاں نکال سکتی تھی۔ بے شک فاصلہ زیادہ تھا مگر راسم کو یقین تھا کہ اس گن کے تین چار برسٹ اروڑا کو اس کے انجام تک پہنچا دیں گے۔

آنیہ نے ہراساں ہو کر کہا۔ ''راسم! یہ بے حد خطرناک کام ہے۔ یہ آپ...... کس راستے پر چل نکلے ہیں؟''

''جب سب راستے بند ہو جاتے ہیں...... تو پھر ایسے ہی راستے نکلا کرتے ہیں۔ یہاں جنگل کا قانون نافذ ہے آنیہ......'' کچھ کہتے کہتے وہ ایک دم رک گیا پھر مسکرایا اور ذرا ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ گن میں نے حاصل کیسے کی؟'' آنیہ بس اس کی طرف دیکھ کر اور پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ''اس طرح کی گنز امریکیوں نے افغان جنگ میں استعمال کی تھیں۔ وہاں لڑنے والا ایک شخص اسے پرزوں کی شکل میں اپنے ساتھ کشمیر لے آیا۔ یہ کافی عرصہ زمین میں دبی رہی ہے لیکن بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ اس شخص کا بیٹا اس گن کے لیے ایک لاکھ روپیا مانگ رہا تھا۔ اس سے کچھ رعایت کروائی ہے۔ اسے خریدنے کے لیے میں نے اپنی ذاتی اشیا اور موٹر سائیکل تک بیچی ہے۔ کچھ دوستوں سے قرض لیا ہے تب یہ اپنی ہو گئی ہے۔'' راسم کی آنکھوں میں جیسے اُمید کے دیے سے جگمگانے لگے تھے۔ آنیہ کو یہ سارا ماحول راسم کی ڈائری سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس ڈائری میں راسم نے اس ہتھیار کو اپنے من پسند کھلونے کا نام دیا تھا۔

بارش اب رم جھم کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ وال کلاک ساڑھے آٹھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ کچن کی طرف خوبرو سدرہ کی زخمی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ راسم نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ ''پرسوں پندرہ تاریخ ہے آنیہ، پرسوں میرے پیارے فاروقی کی سالگرہ ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، میں اپنی شادی اپنی سالگرہ کے دن کر کے ایک انوکھا ریکارڈ

قائم کروں گا۔ جوانی کے کئی خوش رنگ و معصوم منصوبوں کی طرح اس کا یہ منصوبہ بھی قبر کی مٹی میں مل گیا مگر سالگرہ تو موجود ہے۔ میں اپنے یار کو اس سالگرہ پر ایک یادگار تحفہ پیش کروں گا۔ اس شخص کی لاش کا تحفہ جس نے اسے کسی فوجی عقوبت خانے میں سسک سسک کر جان دینے پر مجبور کیا اور کیا پتا، ایسا موقع بھی آیا ہو جب فاروق نے ظلم کرنے والوں سے خود موت کی بھیک مانگی ہو۔ ان سے کہا ہو کہ وہ اسے اذیت نہ دیں، جان سے مار دیں۔ کیا اس طرح موت کی تمنا کرنا کوئی آسان ہوتا ہے مس آنیہ؟...... کیا گاڑیوں کو پتھر مارنے کی سزا اتنی کڑی ہوتی ہے؟ کیا ایک نعرے سے رُوگردانی کا خمیازہ ایسے بھی بھگتنا پڑتا ہے؟...... وہ بھری جوانی میں چلا گیا۔ اس کا باپ مر گیا۔ اس کا بھائی جلاوطن ہو گیا، اس کی ماں نیم دیوانی پھرتی ہے...... اور اس کی مدد کرنے والی کمزور لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہوا جس طرح اس کی قربانی کو مٹی میں ملایا گیا، وہ بھی آپ کے سامنے ہے......"

راسم کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو ہلکورے لینے لگے۔

دونوں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ آنیہ جب یہاں راسم کے پاس پہنچی تھی اس کے خیالات اور تھے مگر اب خیالات اور احساسات بالکل مختلف ہو چکے تھے۔ وقت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں کتنا بڑا انقلاب آیا تھا اس کے اندر۔ پتا نہیں اسے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ظلم کی اور مزاحمت کی ایک ہی کہانی ہے جو ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان سے لے کر اور جلیانوالا سے لے کر آزادیٔ کشمیر تک سبھی یہ کسی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں لگتی تھیں۔ اس نے ایک نظر پھر راسم پر ڈالی جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا...... ہاں، تم وہی ہو جس کو میں ڈھونڈنے نکلی تھی۔ اس نے عجیب کھوئے کھوئے سے آہنگ میں کہا۔ "راسم! میں سمجھ گئی ہوں کہ پرسوں آپ کو ہر صورت اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہے۔ یہی کہہ سکتی ہوں کہ اگر یہ سب ہونا ہی ہے تو اللہ آپ کو کامیاب کرے لیکن اس کے بعد......"

"اس کے بعد میں، اگر بچ گیا، تو کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جاؤں گا۔ یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں آنیہ کہ بہادری اور خودکشی میں فرق ہے۔ کٹر ہندو حکمران کے آنے کے بعد حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ بہت جلد فیصلہ کن مرحلہ آنے والا ہے۔ میں اس فیصلہ کن مرحلے کا انتظار کروں گا۔"

"کھانا تیار ہے بھائی۔" کچن کی طرف سے سدرہ کی آواز آئی۔

"آتا ہوں۔" راسم نے کہا پھر آنیہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "جن لوگوں کی آپ کی زندگی میں اہمیت ہوتی ہے، ان کی دعائیں آپ کے لیے بہت کارگر ہوتی ہیں، آپ بھی میرے لیے دعا کرنا۔"

آنیہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ راسم کو کسی میدان کارزار میں جانے کے لیے الوداع کہہ رہی ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ہلکی سی مسکان کے ساتھ بولا۔ "راجا ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائے گا جو باتیں میں نے آپ کے ساتھ کی ہیں، اس کی بھنک بھی اسے پڑ گئی تو مجھے کچا چبا جائے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" آنیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

راسم کھانا لینے کے لیے کچن کی طرف چلا گیا۔ بارش اب رک گئی تھی۔

☆☆☆

دلبر ماموں سے سلام دعا کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جس راسم سے مل کر آ رہی ہے، وہ اس کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ اسی کے لیے تو جالندھر سے چل کر یہاں راجوری پہنچی تھی۔ وہ برسوں سے اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اس کی دھڑکنوں میں رہتا تھا۔ وہ یہی تھا...... وہ یہی تھا۔ وہ پہلی بار جلیانوالا میں نظر آیا مگر وہ اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں...... سرنگاپٹم میں، میسور میں، جلیانوالا میں، اور پھر غازی علم دین کے جذبۂ حمیت میں، اور عزیز بھٹی کے عزم میں...... اور شیر خاں کی للکار میں، وہ بہت سی جگہوں پر موجود تھا۔ وہ اس کی روح سے عشق کرتی تھی اور اب وہ سراپا اس کے سامنے تھا۔ جلیانوالا کے "شیر بچے" اسد اللہ کا پوتا۔

یکا یک اس کی پیشانی پر پسینا آ گیا۔ اس نے سوچا اگر ابھی نہار کور کا فون آ جائے اور وہ اس سے پوچھے۔ "وہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟ کہیں راسو سے محبت تو نہیں کرنے لگی ہو؟" تو وہ کیا جواب دے گی؟ پھر اس کے شفاف گلابی رخساروں پر آنسو پھسلنے لگے۔ راسم کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ "آنیہ! آپ میرے لیے دعا کرنا۔"

بے شک اسے دعاؤں کی ضرورت تھی۔ وہ ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں سے فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی

ہوگئی۔ رات کے خنک سناٹے میں یہ نماز اور یہ دعا اس کے لیے یادگار تھی۔ وہ اس کی کامیابی اور زندگی مانگ رہی تھی۔ وہی جو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لیے اہم ترین ہو گیا تھا۔

وہ جائے نماز سے اٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے شہابی حیدر کی "ہیلو" سن کر اس کے جسم و جاں میں بیزاری کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے کال منقطع کر دی۔ وہ اس کا نمبر بہت عرصے سے بلاک کر چکی تھی۔ آج اس نے کسی دوسرے نمبر سے رابطہ کیا تھا۔

رات گزری اور پھر صبح ہو گئی۔ آنیہ ایک ایک پل گن کر گزار رہی تھی۔ وہ جانتی تھی راسم کی زندگی کے اہم ترین لمحات قریب آ رہے ہیں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار پھر دن کا اجالا اندھیرے میں اور اندھیرا، اجالے میں بدلا۔ آج پندرہ تاریخ تھی۔ آج کشمیر کے ایک اور گمنام شہید فاروق کی سالگرہ کا دن تھا اور آج ایک اہم واقعے کا دن بھی تھا۔ راسم نے اسے بتایا تھا کہ آکاش اروڑا پر حملہ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوگا، جب وہ اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی سے واپس آ رہا ہوگا اور شام ہونے والی تھی۔ آنیہ کے ہونٹوں پر خاموش دعائیں تھیں اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی بھی جارحانہ طرزِ عمل اور خونریزی کی قائل نہیں رہی تھی مگر جو کچھ وہ اروڑا کے بارے میں سن چکی تھی اور جان چکی تھی، اس کے بعد اس کے دل سے بھی یہی دعا نکل رہی تھی کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی جب دلبر ماموں کی آواز نے اسے چونکایا۔ "آنیہ پتر، اِدھر آؤ...... یہ دیکھو...... یہ ٹی وی پر کیا سماچار آ رہی ہے؟"

آنیہ کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب اٹھی...... اور کب ٹی وی لاؤنج میں پہنچی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

"یہ دیکھو، یہ وہی راسو ہے ناں۔ شہابی کا دوست۔" دلبر ماموں نے جیسے چلا کر کہا۔

آنیہ نے اسکرین کی طرف دیکھا اور سکتہ زدہ رہ گئی۔ اسکرین پر ہیڈ لائن کے الفاظ تھے۔ "سابق کرنل اروڑا قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے۔ حملہ آور راسم عرف راسو اسلحے سمیت گرفتار۔" پھر راسم کی ایک فائل فوٹو بھی اسکرین پر ابھری۔ تب ایک بار پھر نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بولنے لگا۔ "ہم یہ تازہ ترین سماچار آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ ریٹائرڈ کرنل اروڑا جو "درشن ہاؤسنگ سوسائٹی" کے مالک بھی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے سائٹ سے واپس شہر کی طرف آ رہے تھے۔ ان پر گھات لگا کر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بی ایس ایف کی بروقت کارروائی سے یہ منصوبہ ناکام ہوا ہے۔ ملزم راسو کو فاصلے تک مار کرنے والی گن "M2HB" اور گولیوں سمیت پکڑ لیا گیا ہے۔ ملزم نے فرار ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش میں زخمی بھی ہوا۔"

پھر فیلڈ رپورٹر اسکرین پر ابھرا۔ وہ مائیک سمیت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔ یہ وہ ٹیلے تھے جہاں سے راسم کو فائرنگ کرنا تھی۔ فیلڈ رپورٹر نے کہا۔ "جی ہاں، یہ ہے وہ جگہ جہاں سے، طویل رینج کی گن کے ذریعے اروڑا صاحب کے قافلے کو نشانہ بنایا جانا تھا۔ یاد رہے کہ راسم عرف راسو وہی شخص ہے جو کچھ عرصہ پہلے راجوری پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ......"

رپورٹر مسلسل واویلا کر رہا تھا۔ آنیہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اردگرد کی ہر شے گردش میں محسوس ہوتی تھی۔ دلبر ماموں کی آواز جیسے کہیں دور سے اس کے کانوں تک پہنچی۔ "بھئی منڈا تو یہ ایویں سا لگدا تھا۔ پر کوشش جی داروں والی کی ہے اس نے۔ اگر یہ اپنے ارادے میں سپل ہو جاتا تو چنگا بھلا تہلکہ مچا دینا تھا اِس نے۔ یہ جو گن ٹی وی پر دکھا رہے ہیں ناں، یہ بڑی ہیوی ہے جب میں فوج وچ تھا......" وہ بولتے رہے۔ آنیہ ڈگمگاتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن آنیہ گاہے بگاہے کرب کی انتہا کو چھوتی رہی۔ وہ ایک بار پھر راجوری سے واپس جالندھر اپنے گھر آ چکی تھی۔ بہانہ اس نے یہی بنایا تھا کہ باقی کشمیر کی طرح راجوری میں بھی حالات ٹھیک نہیں۔ پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ کرفیو لگنے کا بھی اندیشہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی وقت وہ ہمت کر کے ٹی وی یا اخبار بھی دیکھ لیتی۔ راسم کو اروڑا کا قافلہ گزرنے سے چار پانچ منٹ پہلے ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ یقیناً اس کے ساتھ سخت مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ اخبار میں اس کی ایک تصویر دیکھ کر آنیہ کا دل بے تحاشا رو دیا تھا۔ تصویر میں اس کا بالائی لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرہ دھول سے اٹا ہوا اور ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے اوندھا کر کے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے۔ قریب ہی مسلح فوجیوں کے سیاہ بوٹ دکھائی دے رہے تھے۔ آنیہ نے نہار کے سوا ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنے پاپا کو بھی نہیں۔ پاپا کو بھی ابھی تک اس رُوداد کے اہم ترین موڑ کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا۔ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ البم کی تاریخی فوٹوگراف کا تعلق

شہابی سے نہیں بلکہ راسم سے ہے۔

یہ چوتھے پانچویں روز کی بات ہے آنیہ کے پاپا بڑے غصے کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ وہ آتے ساتھ ہی آنیہ کو بیسمنٹ میں لے آئے۔ ''آنو! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولے۔

''کیا ہوا پاپا؟'' اس نے سہم کر پوچھا۔

''کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری دی ہوئی آزادی کا نتیجہ ایسا نکلے گا۔ یہ کون ہے راسم؟ تمہارا کیا تعلق ہے اِس سے؟''

آنیہ کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ پاپا نے ایک اخبار اس کے سامنے پھینکا۔ اس میں راسم کے حوالے سے خبر تھی اور ہتھکڑی لگی تصویر بھی موجود تھی۔

''راجوری میں اس سے ملتی رہی ہو تم؟ اس کے پاس آنا جانا رہا ہے تمہارا؟''

''پاپا! مم...... میں آپ کو سب بتانا چاہتی تھی۔ شاید آج ہی بتاتی، دراصل......''

اس کے پاپا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں آنیہ اور پاپا کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ بہت گمبھیر تھی۔ اس گفتگو سے آنیہ پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ اس ساری مصیبت کے پیچھے کسی اور کا نہیں شہابی کا ہاتھ ہے۔ اسی نے یہ ٹوہ لگائی کہ وہ راجوری میں دو بار ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' پر پہنچی ہے اور راسم سے ملی ہے۔ کم ظرف تھا وہ۔ اُس نے رقابت کمائی تھی اور اپنی فرسٹریشن نکالنے کے لیے آنیہ کو ڈنک مارا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ راسم تو اریسٹ ہو ہی چکا ہے اس نے آنیہ کے پاپا اور فرحان وغیرہ کو راسم سے اس کے میل جول کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آنیہ نے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا اور پاپا کو یہ بھی بتایا کہ راسم سے خدانخواستہ اس کا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا جس پر انگلی اٹھائی جاسکے۔ پھر اس نے پاپا کو مکمل رازداری کی شرط پر اس بھید سے بھی آگاہ کر دیا جو سیاہ ڈائری کے ذریعے اس پر اور نہار پر کھلا تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ جلیانوالا باغ کی تصویر کا اصل تعلق راسم سے ہے، شہابی حیدر سے نہیں۔ اسے اپنے پاپا پر پورا بھروسا تھا اور اسے یقین تھا کہ جب اس نے کہہ دیا ہے تو پاپا اس راز کو کبھی اپنے سینے سے باہر نہیں نکالیں گے۔

اس کے پاپا کو بھی صورتِ حال کی اس نئی کروٹ نے ایک شاک پہنچایا لیکن ان کا غم و غصہ ان پر اتنا غالب تھا کہ وہ اس رُوداد کی بوالعجبی پر زیادہ غور نہیں کر سکے۔ انہیں شدید دکھ تھا کہ آنیہ کا میل جول اور اس کا جھکاؤ ایک ایسے شخص کی نسبت سے سامنے آیا ہے جو ایک آوارہ گرد کے طور پر پہچانا جارہا ہے اور سنگین ترین کیسز میں ملوث ہے۔ بے شک ہر گھریلو معاملے میں ان کی حمایت آنیہ کے ساتھ ہوتی تھی مگر یہ صورتِ حال ان کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔

دو چار روز کے اندر ہی گھر میں اس طرح کی باتیں گردش کرنے لگیں کہ آنیہ اپنی باقی کی اسٹڈی اگر مکمل کرنا چاہتی ہے تو شادی کے بعد کر لے گی۔ ایک دن ماما نے دوٹوک الفاظ میں آنیہ سے کہا۔ ''آنو! فرحان بہت ڈسٹرب ہے جس طرح کی بات نکلی ہے، وہ تو شاید رشتے سے ہی انکار کر دیتا مگر وہ نیچر کا بُرا نہیں ہے۔ سمجھتا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنایا گیا ہے۔ تمہاری خالہ نے بھی کوشش کی ہے کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس معاملے کو اب زیادہ لٹکایا نہ جائے۔''

''کیا مطلب؟'' آنیہ نے خشک لہجے میں کہا۔

''دیکھو تمہاری خالہ مریم بیمار رہتی ہیں۔ وہ جلد سے جلد تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ......''

''...... کہ میری ساری بے راہ رویوں کو معاف کرنے والے فرحان کو میرا دولہا بنا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟'' آنیہ کی آواز طنز کے سبب زہرناک ہو رہی تھی۔

''آنو! تو کیسی باتیں کرتی ہے؟ وہ سارا گھرانا تجھ سے پیار کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ فرحان......''

''ہاں، ہاں...... کل رات جب وہ کھانے پر آیا تھا، میں دیکھ رہی تھی اُس کا پیار۔ مجھے یوں فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کا سر کیا ہوا قلعہ ہوں اور اب یہ قلعہ اپنے مکینوں سمیت اس کے رحم و کرم پر ہے۔ مجھے ایسا پیار نہیں چاہیے ماما۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ابھی کوئی اس گھر میں میری شادی کی بات نہ ہی کرے تو اچھا ہے......''

وہ اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس گھر میں اسے ہمیشہ اپنے پاپا کا آسرا اور سہارا میسر رہا تھا لیکن اب یوں لگ رہا تھا کہ حالات کے سخت تھپیڑوں نے یہ آسرا بھی اس سے چھین لیا ہے۔

وہ بے حد کرب کے شب و روز تھے۔ ایک طرف گھر کی فضا میں تناؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف راسم کے بارے میں سوچ کر اس کا دل روتا رہتا تھا۔ وہ یقیناً اذیت ناک موت کے شکنجے میں تھا۔ مر چکا تھا یا پھر مرنے والا تھا۔

جان لینے کے لیے ان ظالموں کے پاس ہزار بہانے تھے اور کشمیر کے طول و عرض میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ تو کیا وہ بھی فاروق والے انجام کا شکار ہونے والا تھا اور فاروق نے تو صرف فوجی گاڑیوں کی طرف پتھر اچھالے تھے، راسم کا 'جرم' تو نسبتاً بہت...... بہت بڑا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا اس کے اندر۔ یہ کیسا دیوانہ انقلاب تھا۔ راسم کا نام اس کے سینے میں دھڑکن کی طرح گونجتا تھا مگر یہ انقلاب آیا کس وقت تھا؟ جب راسم موت کی دہلیز پر تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ کوئی بھی کیا کر سکتا تھا؟

ایک دن وہ بیسمنٹ میں تھی جب پاپا ایک مختلف موڈ میں اس کے پاس آئے۔ وہ دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ حالات کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے رہے۔ "میں نے زندگی میں تم سے کچھ نہیں مانگا آنو، آج مانگ رہا ہوں۔ اس دنیا میں کسی کو مکمل آسمان نہیں ملتا ہے۔ کہیں نہ کہیں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ انکار والی ضد چھوڑ دو۔"

وہ پاپا کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔ "ابھی میرے بس میں کچھ نہیں ہے پاپا! آپ مجھے کچھ وقت دیں...... چند مہینے...... میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کروں گی پاپا۔"

"چند مہینے؟" وہ جز بز ہو کر بولے۔ "تمہارے سسرال والے تو چند ہفتے بھی زیادہ سمجھ رہے ہیں اور تمہاری ماما تو صبح سے یہ ضد ہیں کہ شادی ہال وغیرہ دیکھنے کے لیے نکلنا چاہیے۔"

آنیہ نے دکھی نظروں سے پاپا کو بغور دیکھا۔ "پاپا! آپ نے ہی مجھے جھوٹ سے نفرت کرنا سکھایا ہے۔ مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ نہ بلوائیں پاپا...... ابھی مجھ سے نہ بلوائیں پاپا۔" وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

ایک روز اس نے بند کمرے میں پاپا اور فرحان کو بات کرتے سنا۔ فرحان انکشاف انگیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اروڑا کسی معمولی بندے کا نام نہیں ہے خالو جان! راجوری کے پورے ڈسٹرکٹ میں تہلکہ مچا ہوا ہے اس قاتلانہ حملے کی وجہ سے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں پرسوں جموں گیا تھا۔ وہاں اروڑا کا پی اے ملا۔ اس نے بتایا ہے کہ تفتیش کا دائرہ دوسرے علاقوں تک پھیلایا جا رہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اس معاملے میں...... خدانخواستہ...... کسی حوالے سے آنیہ کا نام آ گیا تو عذاب بن جائے گا۔ میں نے کل اپنے ٹریول ایجنٹ سے بات کی ہے۔ آنیہ کا پاسپورٹ تو بنا ہی ہوا ہے نا؟"

آنیہ کے پاپا نے اثبات میں جواب دیا۔

"اگر آپ کی رائے ہو تو شادی کے فوراً بعد میں آنیہ کو لے کر لمبے ٹور پر نکل جاؤں پھر حالات دیکھ کر آئندہ کا سوچا جا سکتا ہے۔"

آنیہ کا خون کھولنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی جائے اور فرحان سے کہے کہ وہ اپنی منحوس صورت لے کر بار بار یہاں نہ آئے اور اپنے یہ قیمتی مشورے بھی اپنے پاس رکھے مگر وہ اس پر عمل نہ کر سکی۔

اسی رات آنیہ کو گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ کال راجوری سے تھی۔ دلبر ماموں کے مسلمان ملازم خیرو کی آواز اس نے صاف پہچان لی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "آنیہ بی بی! آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، ہاں بولو چاچا خیرو۔"

"بی بی جی! راسم صاحب......"

"ہاں...... کیا ہوا راسم کو؟" وہ تڑپ گئی۔

"راسم صاحب اس وقت میرے پاس ہیں۔ بہت سخت زخمی ہیں۔ یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ وہ اس وقت یہاں میری بیٹی کے گھر میں موجود ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو چاچا خیرو۔ راسم اور آپ کے پاس......"

"میں فون پر زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ آپ کو اس لیے کال کی ہے کہ آپ کے ابا جان ایک بڑے وکیل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طرح ان کی مدد کر سکیں۔ راسم صاحب بڑی بُری حالت میں ہیں اور کسی بھی وقت دوبارہ پکڑے بھی جا سکتے ہیں...... کیا آپ اس وقت راجوری میں ہی ہیں؟"

آنیہ کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے ہیجانی کیفیت پر قابو پایا اور خیرو سے چند ضروری باتیں پوچھیں۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ سینے میں اس کا دل کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ سوا گیارہ کا عمل تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔ "چاچا خیرو، میں صبح تک تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔ تم اپنا فون آن رکھو مگر اب کہیں کال نہیں کرو گے اور نہ گھر سے نکلو گے۔"

☆☆☆

آنیہ بس کے ذریعے راتوں رات جالندھر سے راجوری پہنچ گئی۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے بس پاپا کے لیے ایک رقعہ چھوڑا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک ارجنٹ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اس کے

بارے میں فکر مند نہ ہوا جائے۔ جونہی موقع ملا، وہ کال کر کے اپنی واپسی کے بارے میں بتائے گی۔ اس نے پہلی بار نہار کو بھی بے خبر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے مسلسل سوال جواب کا سامنا کرنا پڑے اور جھوٹ بولنا پڑے۔

وہ سرتاپا ایک کریم کلر چادر میں تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ راجوری ٹاؤن پہنچ گئی۔ ایک رکشے کے ذریعے اسے مطلوبہ پتے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خیرو کی بیٹی کے گھر سے کافی پہلے ہی رکشے سے اتر گئی۔ یہ ٹاؤن کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع تھے۔ یہاں چنار اور چیڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔

آنیہ کی دستک پر ڈرے ڈرے سے خیرو چاچا نے دروازہ کھولا اور آنیہ کو جلدی سے اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔ یہ گھر دو چھوٹے کمروں اور ایک ڈھارا نما جگہ پر مشتمل تھا۔ فروٹ کے کچھ خالی اور کچھ بند کریٹ یہاں وہاں پڑے تھے۔ خیرو کی جواں سال بیٹی اور داماد بھی گھر میں موجود تھے۔ داماد کا نام امیر حمزہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ بظاہر وہ ایک پھل فروش اور کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔

"راسم کہاں ہے؟" آنیہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"بہت تکلیف میں ہیں۔" خیرو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "رات دوسرے پہر سے جاگ رہے تھے، ابھی اونگھ آئی ہے۔ ویسے آپ دیکھ لیں۔" اس نے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ نیم تاریک کمرے میں میلے کچیلے بستر پر کوئی کسمسایا۔ آنیہ نے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھی اور اس کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ آنکھیں سوج کر بند ہو چکی تھیں۔ ہونٹ پھٹے ہوئے اور چہرے پر بڑے بڑے نیلے داغ تھے۔ آنیہ نے جیسے کراہ کر دروازہ پھر بند کر دیا۔

رات کو خیرو چاچا نے کہا تھا، یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ راسم صاحب یہاں موجود ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کل شام تک آنیہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ مستقبل قریب میں راسم کی کوئی خبر پا سکے گی۔ وہ ڈھارا نما جگہ پر خیرو چاچا اور اس کے داماد حمزہ کے ساتھ آن بیٹھی۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف نلکے کے پاس خیرو کی بیٹی کچھ خون آلود پٹیاں دھو رہی تھی۔ یقیناً ان کا تعلق بھی راسم سے ہی تھا۔

خیرو چاچا اور امیر حمزہ نے جو کچھ بتایا، وہ واقعی تحیر خیز تھا اور کسی کرشمے کی جھلک دکھاتا تھا۔ ایک چھوٹا فوجی ٹرک، سات آٹھ "خطرناک" قیدیوں کو کسی جگہ سے کسی دوسرے ٹارچر سیل میں منتقل کرنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ حمزہ کے گھر سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل سے گزرتے ہوئے یہ ٹرک ایک چھوٹی بارودی سرنگ سے ٹکرایا اور الٹ گیا۔ کچھ فوجی اور کچھ قیدی زخمی بھی ہوئے۔ افراتفری اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر تین چار قیدی موقع سے دور جانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں راسم بھی تھا۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا، خشک پتوں سے اٹے ایک گڑھے میں گرا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں پڑا رہا۔ یہ جگہ حمزہ کے گھر سے ڈھائی تین سو میٹر دور تھی۔ حمزہ کی نظر زخمی راسم پر پڑی۔ تب وہ نہیں جان سکا کہ وہ کون ہے؟ ہاں اتنا ضرور جان گیا کہ بھارتی سورماؤں کا کوئی معتوب ہے۔ وہ اسے کمر پر لاد کر اپنے گھر لے آیا۔ راسم کو پہچاننے کے بعد اس نے اپنے سسر یعنی خیرو چاچا کو بھی اطلاع دی اور وہ بھی یہاں پہنچ گیا۔

امیر حمزہ نے کہا۔ "علاقے میں سرچ آپریشن جاری ہے۔ ہماری بستی سے بھی ایک پارٹی ہو کر گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم زیادہ دیر محفوظ رہ سکیں گے۔"

خیرو چاچا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "کل کی رات تو جیسے تیسے کٹ گئی ہے...... مگر مجھے نہیں لگتا کہ آج کی رات بھی کٹ سکے گی۔"

حمزہ بولا۔ "اس کے علاوہ راسم صاحب کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ انہیں طبی امداد کی ضرورت ہے ورنہ زخم زیادہ خراب ہو جائیں گے۔" آنیہ کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ حمزہ جیسے اچھل کر رہ گیا۔ خیرو چاچا کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ صحن میں موجود چاچا کی بیٹی لپک کر اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔ حمزہ نے آنیہ کو بھی اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ چند لمحے بعد یہ دیکھ کر آنیہ کی جان میں جان آئی کہ دروازہ کھلنے پر اندر داخل ہونے والے ماموں دلبر سنگھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح جین شرٹ اور پگڑی میں تھے۔ وہ ہنستے مسکراتے اندر آئے اور خیرو چاچا کو دیکھ کر بولے۔ "اوئے خیرو! او میرے سجن پیارے! تم نے تو کبھی چھٹی کیتی ہی نہیں، کل کی ہو گیا؟"

"کک...... کچھ نہیں مالک۔ بس وہ ذرا......" خیرو گڑبڑا گیا۔

"اوئے فون پر بھی تیری آواز کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگدی تھی۔ اسی لیے میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ تے سوچیا کہ

تیری خیر خبر وی لیندا جاؤں۔"

تبھی ان کی نظر تکیے کے پاس رہ جانے والی چند خون آلود پٹیوں پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گئے۔ "خیرو! یہ کیا ہے بھئی؟ کسی کو سٹ شٹ (چوٹ) لگ گئی ہوئی ہے؟ اور تم سارے...... سہمے سہمے سے کیوں لگدے ہو؟"

اگلے تین چار منٹ میں سب کچھ ہی ماموں دلبر پر کھل گیا۔ آنیہ کی موجودگی بھی راز نہیں رہی...... اور سب سے بڑا اور سنگین سرپرائز زخمی راسم۔ وہ ہکا بکا تھے۔ اب خیرو اور حمزہ نے بھی کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ آنیہ نے بھی یہاں اپنے آنے کے بارے میں وضاحت کی۔ سب کچھ جاننے کے بعد اور راسم کی لرزہ خیز حالت دیکھنے کے بعد دلبر صاحب گہری سوچ میں کھو گئے۔ آخر گہری سانس لے کر بولے۔ "خیرو! تم نے یہ سب کچھ مجھ سے چھپایا۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مالک! مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں ناراض نہ ہوں۔ ویسے بھی میں اس خطرناک معاملے میں آپ کو شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آنیہ بی بی کو تو اس لیے فون کیا کہ ان کے ابا جی ایک بڑے قانون والے ہیں۔"

"اس کے ابا جی اک وڈے قانون وال ہیں...... اور دلبر سنگھ تو ایک چوڑا چمار ہے، دو ٹکے کا بندہ۔ یہ کسی کے کام کہاں آسکدا ہے؟" دلبر سنگھ نے طنز کا تیر چھوڑا۔ خیرو چاچا ہکلا کر رہ گیا۔ دلبر سنگھ نے سینہ چوڑا کیا اور دبنگ آواز میں بولے۔ "یہ خون پینے والے بھارتی درندوں کا نوچا ہوا شکار ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ یہ جگہ کسی طرح بھی اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ اس کو پناہ کی لوڑ ہے...... اور میں اسے پناہ دوں گا۔"

"مم...... مگر سرکار۔" خیرو پھر ہکلایا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ یہ میرے ساتھ جائے گا...... اور تم بھی آنیہ پُتر۔ تم لوگ دروازہ اندر سے بند رکھو۔ میں گڈی لے کے آرہا ہوں۔" وہ عزم سے بولے۔

☆☆☆

پورے چاند کی رات تھی۔ چنار کے پیڑ ہولے ہولے خنک ہوا میں لہرا رہے تھے۔ آنیہ، زخمی راسم کے بستر کے قریب موجود تھی۔ دلبر ماموں نے اپنے لیے سخت ترین خطرات مول لیتے ہوئے بھی راسم کو پناہ دی تھی۔ وہ ان کے ہی گھر میں موجود تھا مگر یہ گنجان آبادی کا وہ گھر نہیں تھا جہاں وہ اور نہار رہتی رہی تھیں۔ یہ دریائے تاوی کی دوسری جانب قدرے کشادہ علاقے میں دو منزلہ گھر تھا۔ اچھا بنا ہوا تھا۔ یہاں زیادہ تر گھر ایک کینال کے تھے یا اس سے بڑے تھے۔ دو مساجد کے بلند مینار نظر آتے تھے۔ ایک کالج کا بوائز ہاسٹل تھا۔ جس کے قریب ایک پلے گراؤنڈ تھا اور ایک بڑا باغ تھا۔ اس علاقے کو مقامی لوگ "باغ" کے نام سے پکارتے تھے۔ آنیہ پچھلے دس روز سے یہاں راسم کے ساتھ موجود تھی۔ وہ شروع میں تو راسم کی طرف نظر بھر کر دیکھتے ہی نہیں تھی۔ ان کا دل خون ہونے لگتا تھا۔ ظالموں نے بے پناہ تشدد کیا تھا اس پر۔ پورا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ہونٹ کٹ گئے تھے۔ جبڑے کو نقصان پہنچا تھا۔ وہ کوشش کر کے بڑی مشکل سے ایک دو الفاظ ہی بول سکتا تھا۔ ایک دن آنیہ نے اس کی ٹانگیں اور پاؤں دیکھے تو خود کو بمشکل رونے سے روک سکی تھی۔ اس کی رانوں پر یقیناً رولر پھیرا گیا تھا۔ وہاں بڑے بڑے نیل تھے اور خون جم کر رہ گیا تھا۔ اب آٹھ دس روز گزر چکے تھے پھر بھی اس کے پاؤں پر ورم موجود تھا۔ اس کے تلوؤں پر اتنی ضربات لگائی گئی تھیں کہ اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ تاحال اندرونی ضربات کی وجہ سے اسے پیشاب کرنے میں سخت دقت محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے صرف سیال خوراک دی جا رہی تھی۔ اس مسلمان ڈاکٹر کا انتظام دلبر ماموں نے ہی کسی طرح کیا تھا۔ انہیں ان ڈاکٹر صاحب پر پوری طرح اعتماد تھا۔ وہ روزانہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور آتے تھے...... راسم کے زخموں کو ٹریٹ کرتے تھے اور انجکشن وغیرہ لگاتے تھے۔

اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر دلبر ماموں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اشارے سے آنیہ کو باہر بلایا۔ دلبر ماموں بھی آج کل اسی گھر میں قیام پذیر تھے۔ تاہم خیرو پہلے والے گھر میں تھا۔ ماموں کسی وقت وہاں کا چکر لگا آتے تھے۔ یہاں کھانا وغیرہ آنیہ ہی پکا رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دلبر ماموں نے کہا۔ "دھی رانی! ابھی تمہاری ماما کا فون پھر آیا ہے۔ وہ بار بار مجھ سے تمہارے بارے وچ ہی پوچھتی ہیں۔ مجھے بار بار جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے۔ آج تو وہ رونے ہی لگ پڑیں۔ کہنے لگیں کہ ویر جی! کسی بھی طرح آنو کو تلاش کرو۔ ہم نے تو اس کی شادی کے دن رکھے ہوئے تھے۔"

"دلبر ماموں! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ بے شک ان کا فون ہی نہ سنیں۔ میں جانتی ہوں وہ "اوور ری ایکٹ" کر رہی ہیں۔ ورنہ پاپا کو میں فون پر پوری تسلی دے چکی ہوں اور وہ بڑی حد تک میری بات سمجھ بھی چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں راجوری کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں اور پوری طرح خیریت سے

ہوں۔"

"تم نے راسم کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں...... مگر اس وجہ سے کہ یہ راسم کی سیکیورٹی کا معاملہ ہے۔ ورنہ ماموں، وہ بھی میرے اور راسم کے بارے میں تقریباً سب کچھ جان چکے ہیں۔"

دلبر ماموں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "یعنی وہ جان چکے ہیں...... کہ تم راسم میں انٹرسٹ لے رہی ہو؟"

"ہاں ماموں۔" وہ بے باکی سے بولی۔ "پاپا نے ہمیشہ مجھے سچ بولنا سکھایا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سچ بھی کبھی بہت تلخ ہوتا ہے۔ ان کی تربیت کے مطابق میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ کیسے بول دوں۔ کیسے کہہ دوں کہ خالہ زاد فرحان مجھے بطور شوہر قبول ہے؟ وہ مجھے قبول نہیں ہے دلبر ماموں۔"

دلبر ماموں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے، جیسے اس کی بے باک، سیلانی طبع کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تب طویل سانس لے کر بولے۔ "مجھے لگدا ہے میری یہ دھی رانی ایک بڑے کٹھن رستے پر چل پڑی ہے۔ اس رستے پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ راسم اب ان لوگوں کی ہٹ لسٹ پر اوپر کے ناموں میں آچکا ہے...... رب کرے کوئی چمتکار ہو جائے، ورنہ وہ اسے چھوڑیں گے نہیں۔ میری سمجھ وچ تو تمہاری یہ باتیں بالکل نہیں آرہی ہیں۔"

"زندگی موت تو اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ماموں! اور آپ بھی مانتے ہیں کہ راسم اور اس جیسے دوسرے لوگ برسوں جس "کاز" کے لیے تکلیفیں سہہ رہے ہیں، وہ اب فائنل اسٹیج پر ہے۔ اب اس کشتی نے کسی نہ کسی کنارے لگنا ہے۔"

دلبر سنگھ جی نے کھوئے لہجے میں کہا۔ "رب سوہنے نے چاہا تو لگے گی کنارے...... اور سب کی کنارے لگیں گی۔" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئے۔ "دیکھو کیا الٹ پھیر ہے۔ اس جلیانوالا باغ کی تصویر کا تعلق شہابی حیدر سے ہے۔ ہم اسے کیا سمجھتے تھے اور وہ کیا نکلا ہے۔ راسم ہمارے نزدیک آوارہ گرد اور اجڈ تھا مگر اس نے وہ کام کیا ہے جو "شیر بچے" کی نسل میں سے کسی کو کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے کہ راسم کی گرفتاری کے وقت کیا ہوا تھا؟"

"مجھے تو وہی پتا ہے جو خبروں میں آیا ہے۔"

"خبروں میں یہ نہیں آیا نا کہ اس نے خالی ہتھ تین بھارتی فوجیوں کو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ وہ تو ان کی خوش قسمتی کہ ایک فوجی کے سروس پسٹل سے گولی چل گئی اور آواز سن کر کچھ اور فوجی بھی وہاں پہنچ گئے۔ دست بدست لڑائی وچ اس دن گن ایک کھڈے وچ گر گئی تھی نہیں تو اس نے چھاننی کر دینے تھے آٹھ دس بندے......"

اسی دوران میں اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔ "دیکھو اسے۔" دلبر ماموں نے کہا۔

آنیہ لپک کر اندر گئی۔ راسم تکیے سے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنیہ نے فوراً اس کے سر کے نیچے ایک کشن رکھا۔ نیند میں غالباً اس کا دایاں ہاتھ میز سے ٹکرایا تھا۔ اس ہاتھ کی دو انگلیاں ٹوٹ چکی تھیں اور زخم تھے۔ ہاتھ ٹکرانے سے خون رس آیا تھا۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟" آنیہ تڑپ کر بولی۔

راسم نے بجھی بجھی نظروں سے اُسے دیکھا۔ "اوگاڈ...... اوگاڈ...... آپ ابھی تک گئی نہیں؟" وہ کربناک انداز میں اٹک اٹک کر بولا۔ "آپ کیوں...... خود کو اور...... اپنے گھر والوں کو عذاب میں ڈال رہی ہیں؟"

وہ اس کی زخمی انگلیوں پر نئی پٹی لپیٹتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ سے کہا ہے نا، مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں نے پاپا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ اس بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں۔"

اس نے سخت بے قراری میں سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔ آنیہ اس کے بالوں بھرے فراخ سینے پر ہاتھ چلانے لگی۔ اسے تھپکنے لگی۔ کھانسی کی شدت کم ہوگئی مگر کھانسی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ آنیہ نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور عقب میں بیٹھ کر اسے اپنے جسم کی ٹیک فراہم کی۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہوگیا۔ "آنیہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ تم اور دلبر سنگھ خود کو کیوں مار رہے ہو میرے ساتھ...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر زیادہ ہمدردی امڈ رہی ہے تو کسی طرح راجا کو اطلاع کر دو۔"

"میں نے آپ کو صبح بھی بتایا تھا راسم۔ راجا سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بھی پکڑا گیا ہے یا پھر روپوش ہو گیا ہے۔ مجھے تو سدرہ کی فکر ہے۔ آپ نے ابھی تک اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"اسے میں نے گرفتاری سے پہلے وہاں سے نکال دیا تھا۔" وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "وہ محفوظ جگہ پر ہے۔" کھانسی کی وجہ سے راسم کے مضروب سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہنے لگا۔ آنیہ اس کے عقب میں بیٹھی تھی۔ بازو آگے کر کے ایک بار پھر اس کا سینہ سہلانے لگی۔ گاہے

گا ہے وہ اس کے سر کے اُلجھے بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی۔

وہ دھیمی آواز میں رک رک کر بولنے لگا۔ ''آنیہ میرے دل میں آپ کا مقام بڑا اونچا ہے۔ خود کو اسی مقام پر رہنے دیں۔ میں نے آپ کو بہت چاہا ہے مگر آپ کی قربت کی خواہش کبھی نہیں کی۔ میں...... کبھی بھی آپ کی ان عنایتوں کے قابل نہیں تھا اور اب تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ ہم...... میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت آئی تو میں...... مر کر بھی چین نہ پا سکوں گا۔ پلیز آپ چلی جائیں یہاں سے۔''

''راسم! آپ خود کہتے ہیں، زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرے مقدر میں کوئی تکلیف لکھی ہے یا موت آنی ہے تو وہ سات دروازوں کے پیچھے بھی آ سکتی ہے۔''

وہ جیسے کراہ کر رہ گیا۔ اس میں بولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے بالوں میں اپنی حنائی انگلیاں چلاتی رہی۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا...... پھر سو گیا۔ وہ اسی طرح اسے بازوؤں میں لیے بے حرکت بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی اس کے سر کے بالوں پر پیار سے بوسہ دیتی رہی۔ وہ انوکھی لڑکی تھی۔ اس نے ایک انوکھے وقت میں، انوکھی محبت کی تھی۔ دور کہیں وادی میں فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ آرمی کے کھوجی کتے شور مچا رہے تھے...... چنار زخمی ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ابھی راسم کو دیکھ کر گیا تھا۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی مگر سینے پر لگی ہوئی چوٹیں تکلیف دیتی تھیں اور تلوے اس بُری طرح زخمی تھے کہ اس کے لیے پاؤں پر کھڑے ہونا مشکل تھا۔ شروع میں تو اس سے ایک لفظ بولنا بھی مشکل تھا مگر اب وہ اٹک اٹک کر بول لیتا تھا۔ آنیہ کے بے حد اصرار پر وہ اسے اپنی قید و بند کے حالات بتا رہا تھا۔

''پکڑا تو فوجیوں نے ہی تھا مگر پھر وہ کسی نجی ٹارچر سیل میں لے گئے تھے۔ وہاں وہ بد بخت اروڑا بھی دو تین بار آیا۔ ایک بار وہ ٹھیکیدار نرائن بھی اس کے ساتھ تھا۔ اروڑا کو تو مجھ سے کئی تکلیفیں ہیں مگر ٹھیکیدار نرائن کو سب سے بڑی پریشانی اور تکلیف یہی ہے کہ میں نے شادی شدہ جوڑے (ظہیر اور نادیہ) کو کہاں چھپایا ہے۔''

''اروڑا کو کیا کیا تکلیفیں ہیں؟'' آنیہ نے اس کی پیشانی کو گیلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ سب سے بڑی تکلیف تو یہی قاتلانہ حملے کی کوشش ہے پھر اسے بھی ظہیر اور نادیہ والا دکھ ابھی بھولا نہیں۔ اسے اس بات کی بھی ہمیشہ رنجش رہی ہے کہ میں نے اس کی سابقہ بیوی...... یا کہہ لیں کہ...... سابقہ مظلومہ، سدرہ کو اپنے پاس پناہ دے رکھی ہے۔ اروڑا مجھ سے نادیہ اور ظہیر کے علاوہ سدرہ کا اتا پتا جاننے کی کوشش بھی کرتا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے الیکٹرک شاک دیتا رہا ہے اور بولنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بے لباس کر کے برف کے بلاک پر لٹا دیا۔ میں اس دن، تین روز کے فاقے سے تھا۔ اس نے زبردستی میرے منہ میں شراب انڈیلی اور سؤر کا گوشت کھلانے کی کوشش کرتا رہا......''

آنیہ اب گیلے کپڑے سے راسم کے پاؤں صاف کر رہی تھی۔ ان کا ورم ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ پاؤں دیکھ کر آنیہ کا دل رونے لگتا تھا۔ ایسی سفاکی، ایسی سنگدلی؟ پاؤں پر کئی جگہ چھوٹے چھوٹے سیاہی مائل نشان تھے۔ یہ الیکٹرک شاک کی نشانیاں تھیں۔ وہ اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے پاؤں سہلانے لگی۔ اس نے پاؤں سمیٹ لیے۔

''ایسا نہ کیا کریں آنیہ۔'' وہ کراہا۔

اسی دوران میں تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر دروازے پر چھوٹی سی دستک کے بعد دلبر سنگھ اندر داخل ہوئے۔ آج ملازم خیرو بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ آتے ہی بولے۔ ''آنیہ، خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اب راسم پُتر کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ دو چار دن کے لیے تم نیچے چلے جاؤ۔''

''نیچے کہاں ماموں؟'' آنیہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔ تم ضروری چیزیں سمیٹو۔'' وہ بولے۔ پھر خیرو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی آنیہ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ خیرو اور دلبر سنگھ جی نے راسم کو دونوں طرف سے سہارا دے کر بمشکل اٹھایا اور پھر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے ایک عقبی کمرے میں لے آئے۔ ایک چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آنیہ نے پہلی بار دیکھا کہ یہاں سے ایک تنگ سا زینہ نیچے جا رہا تھا۔

چند منٹ بعد آنیہ اور راسم ایک چھوٹے سے تہ خانے میں تھے۔ ''لگتا تھا کہ دلبر ماموں نے ہنگامی بنیادوں پر یہاں راسم اور آنیہ کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ راسم بستر پر لیٹ گیا اور اس کی سانسیں کچھ بحال ہو گئیں تو خیرو کو اس کے پاس چھوڑ کر دلبر ماموں، آنیہ کو باہر لے آئے بولے۔ ''دھی رانی! راجوری میں ہر تھاں (جگہ) راسم کی تلاش ہو رہی ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگا دیے گئے ہیں۔ ان پر راسم کی تصویر بھی ہے۔ اسے ایک بڑے دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے محلے میں بھی ایک جیپ آ کر رکی ہے۔ دس بارہ فوجی ہیں اس کے اندر۔ سنا ہے کہ گھروں کی تلاشی وغیرہ لیں گے۔''

آنیہ جیسے اندر تک لرز گئی۔ ''اب کیا ہو گا دلبر

ماموں؟''

دلبر ماموں سینہ تان کر بولے۔ ''اوئے، میرے ہوندے ہوئے میری دھی رانی کو چھوا کرنے کی کیا لوڑ ہے۔ ایسی کم تیسی ان گیدڑوں کی۔ کوئی تم دونوں کی ہوا کو بھی تو چھو کر دکھائے۔ بس تم دونوں نے تسلی سے یہاں بیٹھے رہنا ہے۔ کوئی کُتّے دا پتر آیا تو سنبھال لوں گا اس کو میں۔''

اس روز تو خیریت ہی گزری۔ وہ رات ان دونوں نے اس چھوٹے سے کمرے میں گزاری۔ یہاں لوہے کی ایک بڑی الماری کے علاوہ ایک چھوٹا بیڈ اور ایک صوفہ تھا۔ ایک اٹیچ باتھ بھی تھا جس میں سیوریج مشین لگی ہوئی تھی۔ اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ جب آنیہ، راسم کو ناشتا کرا رہی تھی، یکایک اوپر تہ خانے کی چھت پر بھاری بوٹوں کی دھمادھم سنائی دی۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئی۔ آنیہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ خیر۔''

راسم بھی تناؤ میں دکھائی دینے لگا۔ آنیہ سیڑھیاں چڑھ کر بیسمنٹ کے دروازے کے قریب پہنچی اور کان لگا کر سننے لگی۔ مدھم آوازیں اس کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ''سرچ وارنٹ کے بغیر یہ سب ٹھیک نہیں ہوندا لفٹین صاحب! آپاں نے بھی فوج کی نوکری بھگتی ہوئی ہے۔ قانون شانون کی تھوڑی بہت جانکاری آپاں کو (ہم کو) بھی ہے۔'' یہ دلبر ماموں کی آواز تھی۔

''اچھا تو جناب بھی فوج میں تھے؟'' لیفٹیننٹ کی آواز آئی۔

''آپ تو ایسے حیرانی سے کہہ رہے ہیں جیسے کسی سکھ کو فوج میں دیکھا ہی نہیں۔ اپنی فوج میں ہم سکھوں کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟''

''کیا مطلب؟'' آرمی آفیسر کی آواز تلخ تھی۔

''مطلب کا پتا تم کو اس وقت چل جائے گا جب خالصے فوج کو چھوڑ گئے، جب انڈین فوج کو ''ہم خالصوں'' کے بغیر پاکستان اور چین سے پنجہ لڑانا پڑا۔'' چند سیکنڈ بعد دلبر سنگھ جی بلند آواز میں ہنسے۔ ''لفٹین صاحب! آپ کا تو رنگ پھیکا پے گیا ہے۔ میں تو ویسے ہی اِک گل کر رہا تھا۔ رب کرے ہماری گورنمنٹ کو عقل آ جائے...... اور اقلیتوں پر اپنا ہتھ ذرا ہولا کر لے، آپ سمجھو کہ اک طوفان ہے جو اندر ہی اندر پل رہا ہے۔''

لیفٹیننٹ کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد وزنی بوٹوں کی دھمادھم بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔

آنیہ طویل سانس لے کر واپس راسم کی طرف آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ قریباً بیس سال پہلے دلبر سنگھ جی نے بطور کیپٹن فوج کی نوکری کیوں چھوڑ دی تھی، ان کی سوچ وہی تھی جس کی ایک جھلک اس گفتگو میں دکھائی دی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی کہ انڈیا کی فوج نے ہمیشہ سکھوں کے بل بوتے لڑائیاں لڑی تھیں۔ وہی سکھ جنہیں گولڈن ٹیمپل میں سیکڑوں کی تعداد میں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور پھر اندرا کے قتل کے بعد سڑکوں پر زندہ جلایا گیا تھا۔ بہت سے زخم بظاہر بھر جاتے ہیں مگر اندر سے کچے رہتے ہیں، رستے رہتے ہیں، تین ہفتے پہلے جب آنیہ جالندھر سے چلی تھی، اس نے اپنی پرانی سم نکال کر پھینک دی تھی اور فون آف کر دیا تھا لیکن اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بذریعہ فون، کم از کم نہار سے رابطہ کرے اور اس سے گھر کے حالات جاننے کی کوشش کرے۔ کل اس نے دلبر ماموں سے کہہ کر نئی سم کا انتظام کرایا تھا۔ سہ پہر کو فون آن کر کے اس نے سب سے پہلے نہار کور کا نمبر ہی ملایا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ تیسری چوتھی کوشش پر نہار نے کال ریسیو کر لی اور آنیہ کی آواز پہچان کر ششدر رہ گئی۔ چند سیکنڈ میں اس نے کوئی نصف درجن سوال آنیہ سے کر ڈالے۔ ان سوالوں کے جواب میں آنیہ نے اسے بس یہی بتایا کہ وہ راجوری میں ایک جگہ موجود ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔

''راجوری میں کس جگہ؟'' نہار نے بے تابی سے پوچھا مگر پھر خود ہی اپنے سوال کو کینسل کر دیا۔ ڈھیلے لہجے میں بولی۔ ''نہیں رہنے دو۔ یہ جانکاری مجھے نہ ہی دو تو اچھا ہے۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں نہار، یہ میرے لیے بہتر ہے اور تمہارے لیے بھی۔''

چند لمحے تک دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر نہار نے ٹھہرے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''آنیہ! تمہارے لیے ایک اہم سماچار ہے..... فرحان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

''کیا؟'' آنیہ تقریباً چلا پڑی۔ اسے سخت شاک لگا تھا۔ وہ سکتہ زدہ سی ہو گئی۔

اس خبر پر یقین کرنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ نہار نے جو کچھ بتایا اس سے انکشاف ہوا کہ یہ واقعہ پانچ دن پہلے ہوا ہے۔ معمولی بات پر فرحان کا کسی سے جھگڑا ہوا۔ بات بڑھ گئی اور مخالف فریق نے اس پر فائر کر دیا جو سیدھا سینے میں لگا۔

"کون تھا وہ؟" آنیہ نے دکھ سے پوچھا۔

"بس کوئی راہ گیر تھا۔" نہار نے جواب دیا۔ پھر کچھ توقف کرنے کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "کہتے ہیں ناں کہ اوپر والے کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے آنیہ جانی، کہ فرحان پر بھی یہ لاٹھی ہی پڑی ہے۔ وہ اپنی حد سے آگے جا رہا تھا۔"

"یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو نہار؟"

"تم تو وہاں بیٹھی ہو۔ تمہیں کیا جانکاری کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے...... فرحان خطرناک ہتھکنڈوں پر اترا ہوا تھا۔ چھ سات روز پہلے وہ مجھ سے بھی ملا۔ اس کو شک تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ تمہارا اتا پتا ٹھکانا معلوم ہے۔ اس نے مجھے صاف سیدھے لفظوں میں دھمکی دی کہ ریٹائرڈ کرنل اروڑا سے اس کے سمبندھ ہیں۔ اگر میں نے اسے تمہارا اتا پتا نہیں بتایا تو وہ بالآخر اروڑا کو بتانے پر مجبور ہو جائے گا کہ آنیہ کا اس بھگوڑے راسم سے ملنا جلنا تھا اور یہ وہی ہے جس نے آنیہ کو عین شادی سے پہلے جالندھر سے بھگایا ہے۔" کچھ مزید تفصیل بھی نہار نے بتائی۔

آنیہ سناٹے میں رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کا خالہ زاد اس حد تک گر سکتا ہے۔ نہار نے مزید کہا۔ "تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ اس نے ایک دن پہلے بھی دھمکی تمہارے پاپا کو بھی دی تھی...... اور ساتھ میں انہیں ایک ہفتے کی مہلت کا بھی کہا تھا۔ شاید اسی کو رب کی کرنی کہتے ہیں۔ مہلت سے پہلے اس کی اپنی مہلت ختم ہو گئی۔ دس پندرہ روز پہلے اس نے نئی گاڑی نکلوائی تھی۔ اس پر جا رہا تھا۔ تھوڑی بہت پی پلا بھی رکھی تھی۔ راستے میں ایک موٹر بائیک والا گاڑی کی سائڈ سے ٹکرایا اور دروازے پر اسکریچ ڈال دیا۔ بس اسی اسکریچ سے بات بڑھی اور فرحان کے پران لے گئی۔ فرحان نے مشتعل ہو کر بائیک والے کو تھپڑ مارا۔ اس نے پستول نکال کر سیدھا فائر کر دیا۔"

آنیہ ششدر تھی۔ نمود و نمائش کو بے پناہ اہمیت دینے والا، آخر نمود و نمائش کی بھینٹ ہی چڑھ گیا تھا۔ دھمکی والی جو بات نہار نے بتائی تھی، وہ کبھی کبھی آنیہ کے دماغ میں بھی آئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی، کہیں کوئی ایسی اسٹیج نہ آ جائے کہ فرحان اپنی اصلیت بتانے پر تل جائے۔ اس کے زیادہ تر یار انے ہندو امیر زادوں سے ہی تھے۔ اپنے طور طریقوں میں بھی وہ بس نام ہی کا مسلمان تھا۔ نہار نے آنیہ کو بتایا کہ آنیہ کے گھر والوں کو بھی فرحان کی اس اچانک موت کا صدمہ تو ہوا ہے لیکن فرحان کی اصلیت چونکہ ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اس واقعے میں شاید کہیں راحت کا ایک پہلو بھی ہے۔

اگلے روز دل بہت کڑا کر کے آنیہ نے پاپا سے کال ملائی۔ پاپا بھی اس رابطے پر ششدر ہوئے۔ آنیہ نے انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی ایک بار پھر یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ ان کی تربیت میں پروان چڑھنے والی بیٹی ہے۔ کسی بھی جگہ ہو، اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرے گی۔ وہ واضح طور پر آنیہ سے بہت خفا تھے۔ اس کے دس فقروں کے جواب میں ایک آدھ لفظ ہی بول رہے تھے۔ آنیہ نے فرحان کی ناگہانی موت پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔ اس موقع پر پاپا سے ایک دو فقروں کا تبادلہ ہوا۔ ان کی بات سے پتا چلا کہ کم از کم وہ اس بات کے قائل تو ہو چکے ہیں کہ آنیہ کو فرحان کی دلہن بنانے والی سوچ بالکل غلط تھی۔ وہ اس قابل ہرگز نہیں تھا۔ آٹھ دس منٹ کی گفتگو میں پاپا نے آنیہ سے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہے، نہ ہی آنیہ نے بتایا۔ شاید دونوں ہی یہ بات سمجھ رہے تھے کہ اس حوالے سے فی الحال خاموش رہنا بہتر ہے۔

سات آٹھ روز ہو چکے تھے۔ آنیہ اور راسم مسلسل اسی چھوٹے سے بیسمنٹ میں تھے۔ آنیہ بس کسی وقت کسی ضروری کام سے ہی باہر نکلتی تھی۔ راسم کسی وقت گم صم سا ہو جاتا تھا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ وہ فاروق کو اس کی سالگرہ پر اپنا من چاہا تحفہ نہ دے سکا۔ اپنی وہ رائفل کھو جانے کا بھی اسے بہت دکھ تھا جو اس نے بہت جتن کر کے حاصل کی تھی۔ دیگر حالات جوں کے توں تھے۔ خیر وہ اب مستقل طور پر اس گھر میں شفٹ ہو چکا تھا۔ کھانا پکانا وہی کر رہا تھا۔ دلبر ماموں کا زیادہ وقت بھی اسی پُرسکون کوٹھی میں گزر رہا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والے اور خوش خوراکی سے ناتا نہ توڑنے والے شخص تھے۔ اس کوٹھی کے آس پاس بھی زبردست تناؤ موجود تھا۔ گرد و نواح میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیتے رہتے تھے۔ کسی وقت کہیں سے اِکا دُکا فائر کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ اس کے باوجود دلبر ماموں اپنے حال میں مگن رہتے تھے۔ وہ تہ خانے سے باہر آئی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ دلبر ماموں ایک بڑی تھالی میں موتی چور کے لڈو رکھے اہتمام سے کھا رہے تھے۔ "یہ کیا ہے ماموں؟" آنیہ نے ذرا ناراضگی سے کہا۔

وہ جواب میں بولے۔ "حیرت کی گل ہے بھئی! جالندھر کی لڑکی موتی چور دیکھ کر کہہ رہی ہے کہ یہ کیا ہے

ماموں۔ بمبئی جالندھر کا موتی چور لڈو تو ولایت تک مشہور ہے۔"

"مگر آپ کی ڈائٹنگ؟"

"ڈائٹنگ والے فلسفے پر میں نے کافی غور کیا ہے دمی رانی۔ دراصل بندہ صرف خوراک کھانے سے ہی تو موٹا نہیں ہوندا ہے اور بھی کئی اک چیزیں ہیں۔ اب دیکھو خوشی بھی تو بندے کو موٹا کرتی ہے نا۔ اب ذرا سوچو یہ امان اللہ اور سہیل احمد کے اسٹیج ڈرامے بھی تو نرا "ہاسا" اور نری خوشی ہی ہیں ناں۔ میں کھانا چھڈ بھی دوں لیکن یہ ڈرامے تو نہیں چھڈ سکدا۔ اس کا مطلب ہے موٹا تو میں نے ہونا ہی ہونا ہے......"

دلبر ماموں کی بات کو ایک دم بریک لگ گئے۔ کسی فوجی گاڑی کا تیز ہوٹر سنائی دیا تھا۔ دونوں ساکت بیٹھے یہ آواز سنتے رہے پھر گاڑی آگے نکل گئی۔ دلبر ماموں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "بھائیا خورشید عالم سے بات ہوئی؟"

"ہاں ماموں، دو تین دفعہ رابطہ ہوا ہے۔ کچھ نرم تو ہو گئے ہیں......مگر......"

"اوئے، ہو جائے گا...... ضرور ہو جائے گا نرم۔ تیرے پریم میں شکتی ہے اور مجھے وشواس ہے، یہ شکتی ایک دن ضرور کام دکھائے گی۔ ویسے بھی پاپا تیرا دل کا بہت چنگا بندہ ہے۔ ایسے لوگ یہ بات چنگی طرح سمجھدے ہیں کہ جیون صرف اِک دار ملدا اے۔ اس کو دل کی بات مان کر گزارنا چاہیے۔ سنسار جو کہے وہ کہندا رہے۔"

آنیہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر انہوں نے ذرا توقف کر کے آنیہ سے پوچھا۔ "اور انہوں نے تیرے بارے میں دوسروں کو کیا بتایا ہوا ہے کہ آنیہ کہاں ہے؟"

"یہی کہ فائن آرٹ کا ایک کورس کرنے کے لیے دہلی گئی ہوئی ہے۔"

کچھ دیر بعد جب آنیہ بے آواز چلتی ہوئی تہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچی تو راسم جاگ رہا تھا اور اس نے تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ آہٹ سن کر وہ چونک گیا اور آنیہ کو لگا جیسے اس نے جلدی سے کوئی چیز تکیے کے نیچے چھپائی ہے۔ وہ راسم کے پاس آن بیٹھی اور اس کے زخمی ہاتھ کے ناخن .... بڑی احتیاط سے تراشنے لگی۔ اسی دوران میں اس نے صفائی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا راسم کے تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ یہ قریباً چار انچ ضرب دس انچ کا ایک رنگین اسٹیکر تھا۔ شاید خیرو کہیں باہر سے لے کر آیا تھا۔ اس پر ٹوٹی ہوئی زنجیر کی تصویر تھی۔ نیچے ایک نعرہ درج تھا۔ ہم نہیں مانتے...... ظلم کے ضابطے۔ اس نعرے کے ساتھ راسم نے اپنے انگوٹھے کے تازہ نشان سے مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ یہاں روشنائی تو نہیں تھی، بس اس کا خون تھا جو مختلف زخموں سے رس کر پٹیاں بھگوتا رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی زخم سے انگوٹھا تر کر کے اس نے یہ نشان لگا دیا تھا۔

"کیا جدوجہد کا کوئی اور راستہ نہیں؟" آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

"میرے لیے اب یہی راستہ رہ گیا ہے آنیہ۔ مجھے مارنا ہے یا مر جانا ہے۔ میرا فاروق ہر روز مجھ سے پوچھتا ہے، کیا ایک نعرہ نہ لگانے کی سزا اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔ کیا میری جان اتنی ہی سستی تھی؟ میرا قاتل اتنا طاقتور کیوں ہے؟ وہ کیوں اب تک اس زمین کے سینے پر دندناتا پھر رہا ہے؟ مجھے اپنے فاروق کو جواب دینا ہے، آنیہ! مجھے آخری سانس تک کوشش کرنی ہے۔"

"مگر...... وہ فی الحال آپ کی پہنچ سے دور ہے، دیوار سے ٹکرا کر خود کو شدید نقصان پہنچا لینا کہاں کی دانشمندی ہے راسم؟"

"کچھ قلعوں کو سر کرنے کے لیے بار بار جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ سومنات پر بھی تو کسی نے اَن گنت حملے کیے تھے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ آنیہ نے بھی بحث مناسب نہیں سمجھی۔ اسے خدشہ تھا کہ اسے پھر کھانسی شروع ہو جائے گی۔ وہ اس کے ورم زدہ پاؤں کے ناخن کاٹتی رہی۔ اپنے کومل ہاتھوں سے اس کے پاؤں کو سہلاتی رہی۔ وہ چہرے پر عجیب کیفیت لیے چپ چاپ لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں مضبوطی سے بند کر رکھی تھیں۔ وہ جب بھی اسے یوں خاموش دیکھتی تھی، اس کے ذہن میں اس کے پہلے موبائل فون پر دیکھا ہوا وہ شعر یاد آ جاتا تھا جو اس نے اس کی تصویر کے نیچے لکھ رکھا تھا۔

خطا تو جب ہو کہ ہم حالِ دل کسی سے کہیں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

اچانک تہ خانے میں اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ راسم نے بے تاب ہو کر کہا۔ "آنیہ، آپ کہاں ہیں؟"

وہ اس کے پاؤں کی طرف سے اٹھ کر سرہانے کی طرف آ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ نہ جانے اسے کیوں لگا کہ وہ جس بات کو کئی دنوں سے کہنا چاہ رہی ہے اور جو اس کے

ہونٹوں تک آتے آتے رک جاتی ہے، اب کہی جا سکتی ہے۔

اس نے راسم کے ہاتھ کو اپنے کومل ہاتھ میں رکھا اور عجب کیفیت میں اسے اپنے رخسار تک لے گئی۔ اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنے گداز رخسار پر دباتے ہوئے وہ مستحکم آواز میں بولی۔ ''راسم! میں چاہتی ہوں کہ آپ کا ہاتھ ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

یوں لگا جیسے راسم کے ہاتھ پر بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کھینچا اور طیش سے بولا۔ ''آپ اپنے ہوش میں تو ہیں؟ کیا دیوانوں جیسی بات کر رہی ہیں۔ مم...... مجھے آپ سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔''

''نہیں راسم، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ حالات جو بھی ہیں۔ جیسے بھی ہیں، میں آپ کی زندگی میں آنا چاہتی ہوں۔''

راسم غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر اسے شدید کھانسی ہونے لگی۔ آنیہ نے ہاتھ چلا کر ٹارچ ڈھونڈی اور اس کی روشنی میں راسم کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا مگر اس کے زخمی چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ آنیہ کف سیرپ لانے کا بہانہ کر کے بیسمنٹ سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

چھ سات روز تہ خانے میں گزارنے کے بعد دلبر ماموں ایک بار پھر راسم اور آنیہ کو اوپر بڑے کمروں میں لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ بہرحال اتنی احتیاط انہوں نے ضرور کی تھی کہ اس مرتبہ انہیں کوٹھی کے دو عقبی کمرے دیے گئے تھے۔ راسم کی حالت کی وجہ سے آنیہ اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سوتی تھی۔ وہ ایک ''صوفہ کم بیڈ'' استعمال کر رہی تھی۔ راسم کچھ کچھ ناراض تھا۔

ایک رات وہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے پاپا سے ''واٹس ایپ'' پر رابطہ کیا۔ یہ وڈیو کال تھی۔ آنیہ نے سلسلۂ کلام وہیں سے شروع کیا جہاں سے پچھلی رات چھوڑا تھا۔ آج اس نے پاپا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی جھولی میں آنسو بارش کے قطروں کی طرح گر رہے تھے۔ ''پاپا! آپ نے مجھے سچ بولنا سکھایا...... اور سچ یہی ہے کہ میں راسم سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کی بیٹی کبھی کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہ فیصلہ بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے میں نے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پاپا! اگر راسم میری زندگی میں نہ آسکے تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ میں آپ ہی کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں، کوئی نہیں آئے گا۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

خورشید عالم خاموش تھے۔ اُن کے چہرے پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے، ان کی بیٹی ہمیشہ سے انوکھی راہوں پر چلتی رہی ہے مگر وہ جتنی انوکھی اور جدا تھی، اتنی ہی گہری بھی تھی۔ اس کے فیصلے آسانی سے بدلتے نہیں تھے۔

وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔ ''پاپا! اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ میں انہیں ان کے ارادوں سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں اور...... آپ کے تو تعلقات ہیں، SOURCES ہیں، آپ ہمیں باہر بھجوا دیجیے گا۔ ہم ان سارے بکھیڑوں سے نکل کر کہیں دور بھی تو جا سکتے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ گرجے۔ ''آنیہ! بچہ نہیں ہوں میں۔ لولی پاپ دکھا دکھا کر مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہارے لیے اپنے دل میں موجود تمام تر محبت اور رعایت کو بروئے کار لا کر سوچوں تو بھی تمہاری اس سنگین حماقت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

''پاپا! وہ کوئی مجرم نہیں ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو ظلم کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہزاروں، لاکھوں کشمیریوں کی آواز بنے ہوئے ہیں......''

''شٹ اَپ...... شٹ اَپ۔'' وہ پھر دہاڑے۔ ''مجھے پولیٹیکل سائنس مت پڑھاؤ۔''

اس نے روتے روتے کسی ننھی بچی کی طرح پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''سوری پاپا...... سوری...... مگر میں کیا کروں؟''

''ڈوب مرو۔ دفع ہو جاؤ جہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم سمجھیں گے کہ مر گئی ہو...... مر گئی ہو۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا مگر وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھی رہی۔ روتی رہی...... اور روتی رہی۔ رات کا باقی حصہ اس نے جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ وہ ماہی بے آب تھی جس نے کبھی کچھ نہ کہا ہو اس کا تو مارا ہوا پھول بھی پتھر لگتا ہے۔ یہ شاید اس کی زندگی کی کربناک ترین رات تھی۔ اگلی صبح وہ اپنے فون پر ایک ٹیکسٹ میسج دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ میسج ابھی صبح سویرے اس کے پاپا کی طرف سے آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ''کال می۔'' آنیہ نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ انہیں واٹس ایپ پر کال کی۔ پاپا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر ان کے چہرے پر آنیہ کی محبت ایک پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع منظر تھا۔ وہ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اب یہ رونا دھونا بند کرو...... ٹھیک ہے...... تم جیسا

کہہ رہی ہو، ویسا ہی ہوگا۔"

اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا تھا، رونا دھونا بند کرو، وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنی پیشانی موبائل کی اسکرین پر رکھ دی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پاپا کی گود میں سر رکھ رہی ہے۔

☆☆☆

واقعات میں یکا یک تیزی آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہر کام جلدی جلدی اور ڈرامائی انداز میں ہو رہا ہے۔ شکر کا مقام تھا۔ شہابی کی طرف سے مزید کسی خدشے نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی عداوت، فرحان کی عداوت سے کم ہی رہی ہے۔ وہ ایک ڈنک مارنے کے بعد اس سارے معاملے سے الگ تھلگ ہو گیا تھا جس روز راسم نے از خود منہ ہاتھ دھویا اور پاؤں پر آہستہ آہستہ وزن ڈالتا ہوا کھڑکی کی طرف گیا، آنیہ بھی کندھے سے کندھا ملا کر اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ شام سفیدے اور چیڑ کے درختوں پر اتر رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں چوٹیاں تھیں اور چنار کے پیڑ تھے...... اور ان سے آگے...... کافی آگے، سرینگر تھا...... وہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہاں جو شعلے بھڑک رہے تھے، ان کی حدت محسوس کی جا سکتی تھی۔ سامنے سے گزرنے والی اندرونی سڑک پر کسی فوجی گاڑی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایسی گاڑیاں ہر گلی کوچے میں نظر آتی تھیں۔ "آٹھ تو لاکھ" کی نفری کچھ کم تو نہیں ہوتی۔

آنیہ نے کہا۔ "پھر آپ نے کیا سوچا؟"

"کس بارے میں؟"

"آپ جانتے ہیں، کس بارے میں۔"

راسم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اپنے طیش کو دباتے ہوئے بولا۔ "آنیہ! آپ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ کیا آپ ایک لاش سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"ایک زندہ انسان سے کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ شاید، مجھے لاش میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر آپ کا یہ جواب حتمی ہے تو پھر...... مجھے بھی زندہ رہنے کی زیادہ خواہش نہیں ہے۔ میں جلدی مرنا چاہوں گی۔" اس نے آخری الفاظ انگلش میں کہے تھے۔

"اپنی جان لینے کی دھمکی دے رہی ہیں؟"

"مسلمان ہوں۔ حرام موت کیوں مروں گی۔ مجھے کوئی ہتھیار دے دیں۔ ان انسان نما درندوں میں سے دو چار کو مار کر خود بھی مٹی اوڑھ لوں گی بلکہ اگر آپ کا جواب حتمی ہے تو یہ کام میں ابھی کر سکتی ہوں۔"

"آپ فضول بکواس کر رہی ہیں۔ میں ایسے فلمی مکالموں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔" اس نے بیزاری سے کہا اور صوفے پر آن بیٹھا۔

وہ کچھ دیر تک عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر الماری کی طرف گئی۔ وہ جانتی تھی۔۔۔۔ ماموں دلبر نے حفاظت کے خیال سے راسم کو ایک کولٹ پسٹل دے رکھا ہے۔ اس نے تہ در تہ رکھے کمبلوں اور چادروں کے نیچے سے وہ بھرا ہوا پسٹل نکال لیا۔ راسم کا پارا بھی ایک دم چڑھ گیا۔ وہ کراہ کر بولا۔ "ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے ابھی جاؤ۔ اسی وقت جاؤ۔ مار دو، دو چار کو اور خود بھی سکون پا لو تم۔" وہ پہلی بار اسے آپ کے بجائے "تم" کہہ رہا تھا۔

وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ دھڑام سے بند کر لیا۔ وہ آنیہ سے اس لہجے میں بولنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ جو کچھ کہتی تھی اسے سن کر اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ یکا یک اس کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر کوٹھی کے گراسی لان کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ آنیہ نے ایک چادر لپیٹ رکھی تھی اور سیدھی مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ دلبر سنگھ غالباً سو رہے تھے۔ خیرو کچن میں مصروف تھا۔ وہ کسی بھی لمحے گیٹ کے پار پہنچ سکتی تھی اور سڑک پر یقیناً کم از کم ایک فوجی گاڑی تو ضرور موجود تھی، کیا وہ ہوش کھو بیٹھی تھی؟ وہ اپنے پاؤں کی شدید تکلیف کو فراموش کر گیا۔ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی گیٹ سے آٹھ دس قدم دور تھی جب وہ پکارا۔ "آنیہ...... رک جاؤ۔"

وہ پلٹی اور راسم کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کانپتے جسم کے ساتھ اس کے قریب پہنچا۔ آنیہ کے گال پر اس کا طمانچہ بڑا زوردار تھا۔ آواز دور تک گئی پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ وہ لڑکھڑا کر "ڈرائیووے" پر گر گئی۔ پستول اس کی چادر سے نکل کر گھاس پر لڑھک گیا۔ خیرو اندر سے بھاگتا ہوا آیا۔ راسم نے پستول اٹھا کر شرٹ کے نیچے لگا یا۔ اسی دوران میں دلبر صاحب بھی اپنے بھاری جسم کو جھلاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ وہ ہکا بکا تھے۔ راسم نے دلبر سنگھ جی کو دیکھا تو آنیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سنبھالیے اِسے، اس کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔" پھر وہ لنگڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

رات کو جب وہ کھڑکی کے قریب خاموش کھڑا تھا، وہ کھانے کی ٹرے لیے ہوئے اندر آئی۔ اس کا ایک گال سوجا ہوا تھا۔ نچلے ہونٹ پر زخم تھا۔ اس نے جھک کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ اسی روزمرہ کے لہجے میں بولی۔ "دوا کا وقت ہو

جائے گا۔ کھانا کھا لیجیے۔''

وہ گم صم اس کی طرف دیکھتا رہا، جیسے سوچ رہا ہو، کیا چیز ہے یہ لڑکی؟ پھر گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اِدھر آؤ میرے پاس۔''

وہ اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ وہ عجیب کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔ ''اور مارنے کو دل چاہ رہا ہے؟'' اس نے ایک دل گداز سادگی کے ساتھ پوچھا۔

راسم کا دل رو دیا۔ اس نے جیسے تڑپ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کے بالوں، پیشانی اور رخساروں پر بوسے دینے لگا۔ پھر وہ بھی سسک پڑی۔ اس کے کشادہ سینے میں جذب سی ہو گئی۔ وہ کراہا۔ ''مجھے معاف کر دو آنیہ! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا...... ہرگز نہیں۔''

''آپ کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ میری جان لے سکتے ہیں۔'' وہ روح کی گہرائی سے بولی۔

''آنیہ میں کیا کروں؟ تم نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بڑی سرعت سے ہوا۔ آنیہ کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلی تھی۔ چل ہی نہیں سکی تھی۔ ایک دن آنیہ کے پاپا (بیرسٹر خورشید عالم) نے فون پر اس سے پوچھا کہ کیا ان کا یہ شک درست ہے کہ وہ دلبر سنگھ جی کے پاس ہی رہ رہی ہے؟ وہ پاپا سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور اس نے نہیں بولا۔ اس سے آگے نہ پاپا نے پوچھا نہ اس نے بتایا اور یہ رازداری ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھی۔ پاپا کو صرف اتنا پتا تھا کہ وہ راجوری ڈسٹرکٹ میں کہیں ہے۔ پاپا نے براہِ راست دلبر سنگھ جی سے بات کی۔ دونوں میں دیر تک جذباتی گفتگو ہوئی۔ آخر آنیہ کے پاپا نے حلفیہ طور پر ماموں دلبر سنگھ کو آنیہ کا سرپرست قرار دیا اور انہیں اجازت دی کہ وہ اس کا نکاح اس کی مرضی کے مطابق کر دیں۔ نکاح کے لیے آٹھ دن بعد کی تاریخ بھی انہوں نے خود ہی مقرر کی۔

راجوری سمیت کشمیر کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ مودی کی مسلم کش پالیسیوں نے ایک ہیجان سا برپا کر دیا تھا۔ راجوری حالانکہ سرینگر سے فاصلے پر تھا پھر بھی یہاں دن رات سڑکوں پر انڈین فوجی دندنانے لگے تھے۔ وہ راتوں کو گھروں میں گھستے، خواتین کو ہراساں کرتے۔ نوجوان لڑکوں کے موبائل اور شناختی کارڈ زبردستی لے جاتے اور انہیں حکم ملتا کہ وہ ایک یا دو روز بعد قریبی فوجی کیمپ میں رپورٹ کریں۔ علاقے میں راسم کی تلاش بھی زور و شور سے جاری تھی۔ خیرو کا کہنا تھا کہ اس علاقے (باغ) کی تقریباً ہر دیوار پر راسم صاحب کی تصویر نظر آتی ہے۔

یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت کچھ ہو جائے گا۔ جو ڈاکٹر صاحب راسم کو دیکھنے آتے تھے، انہوں نے ہی ایک نہایت قابلِ بھروسا نکاح خواں کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ آنیہ کے سرپرست کا کردار، دلبر سنگھ جی نے خیرو کو سونپ دیا تھا۔ خیرو گھر کا ملازم نہیں فرد ہی سمجھا جاتا تھا۔ خیرو کا داماد امیر حمزہ اور اس کا بھائی گواہ بنا لیے گئے۔ بالکل آخری وقت میں آنیہ کے پاپا اس کی ماما کو بھی فون پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ حسبِ اندیشہ کافی رونے دھونے کے بعد ماما نے آنیہ کو یہ تاکید کی کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے سامنے کم از کم ایک شرط ضرور رکھے اور وہ یہ کہ یہ سارا گورکھ دھندا چھوڑ کر اس کے ساتھ بیرونِ ملک جانے کو تیار ہو جائے گا۔ آنیہ بس ''ہوں، ہاں'' میں جواب دیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ہوا کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ راسم کے سینے میں بھڑکتا رہتا تھا، وہ اس سے آگاہ تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کی ماما وڈیو کال سے اٹھ کر چلی گئیں۔

اب دلبر ماموں بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح جلد سے جلد ہو جائے۔ وہ اس وادیٔ کشمیر کی ایک نسبتاً پرسکون اور گلابی شام تھی، جب تین بار ''قبول ہے'' کہا گیا اور دو پیار کرنے والے ایک ہوئے۔ آنیہ خورشید بڑی سادگی کے ساتھ آنیہ راسم بن گئی۔ نکاح نامے میں راسم کا نام راسم حفیظ لکھا گیا تھا مگر وہاں موجود لوگوں میں صرف وہ جانتی تھی کہ وہ راسم حفیظ نہیں راسم تیمور ہے۔ اس کا نسب کہیں اور جا کر ملتا ہے۔

وہ تھوڑے دن تھے لیکن بڑے خوب صورت تھے۔ کسی حسین سپنے جیسے۔ وہ آنیہ کو چاہتا تھا مگر اس کے پیار سے انکار کرتا تھا۔ اب اس نے اقرار کیا تھا تو اقرار کا حق ادا کر دیا تھا۔ چاہا تھا تو اس طرح ٹوٹ کر چاہا تھا کہ وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ یک جان دو قالب ہو گئے تھے اور یہ کوئی عارضی کیفیت نہیں تھی۔ اس میں جو گہرائی تھی اس کی شدت کو وہ دونوں ہی محسوس کر سکتے تھے۔

آدھی شب کا وقت تھا۔ راجوری کی پہاڑیوں پر رم جھم ہو رہی تھی۔ آنیہ، راسم کے سینے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''کچھ

عرصہ پہلے دیکھی ہوئی ایک نیوز یاد آجاتی ہے۔ بیرونِ ملک تم جیسی کسی دیوانی لڑکی نے پھانسی کے ایک مجرم سے شادی کی تھی۔ یہ شادی اس کے "ڈیتھ سیل" میں ہوئی تھی۔"

اب وہ دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے تم کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔ آنیہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ "راسم! تم خود ہی تو کہتے ہو، جو پل ہم گزار رہے ہیں وہی ہمارا ہے۔ نہ جانے والے پل پر ہمارا اختیار ہے نہ آنے والے پر۔"

"آنیہ! میں اب ٹھیک ہو چکا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے جانے کا وقت قریب آ رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ عجب گمشدہ آواز میں بولی۔

"تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

ہوا نے چنار اور چیڑ کے اونچے پیڑوں میں سسکی سی بھری۔ آسمان سے پھر موتی برسنے لگے وہ اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ "کم از کم میری ایک بات تو مانو راسم...... مجھے...... اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ اس کے ریشمی رخساروں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے کیا پتا، یہ "آنے والا" کب آئے گا...... اور بیٹا ہوگا یا بیٹی؟"

وہ اُس کے سینے میں منہ چھپا کر نم دشرگیں لہجے میں بولی۔ "جو بھی ہوگا، تمہارا ہوگا...... اور میرا ہوگا۔ میں بس یہی چاہتی ہوں۔" آنسو راسم کے سینے کو بھگو رہے تھے۔

"آنیہ! مجھے کمزور مت کرنا پلیز۔"

"نہیں کروں گی، کبھی نہیں کروں گی۔ جو کہنا تھا، کہہ چکی۔ اب مزید کچھ نہیں کہوں گی۔ اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔" وہ اس کے اندر جذب ہوتے ہوئے بولی۔

اس نے اسے اپنی مضبوط، مہرباں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ دونوں ایک ریشمی اندھیرے میں گم ہو گئے...... کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے۔ دور کہیں پہاڑوں میں کسی وقت کوئی فائر ہوتا تھا اور اس کی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر در و دیوار سے ٹکراتی تھی۔

...... دن گزر رہے تھے...... آنیہ کو لگتا تھا کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ایک وعدہ راسم کو پکار رہا ہے۔ ایک آواز ان دونوں کی جدائی کا اعلان کر رہی ہے۔ خوشی کے پھول کے ساتھ یہ درد کا ایک بے رحم کانٹا تھا جو ہر وقت اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ راسم کے بیشتر زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ صرف انگلیوں پر بینڈ ایج موجود تھی۔

اس نے کئی مہینوں سے شیو نہیں کی تھی۔ اب اس کی باقاعدہ، سیاہ چمکیلی داڑھی تھی۔ مونچھیں کافی بڑی اور گھنی ہو چکی تھیں۔ ایک دن آنیہ پر انکشاف ہوا کہ وہ مونچھ داڑھی کیوں بڑھا رہا ہے۔ وہ نہا کر باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے اپنے بیڈ پر، نیلی پگڑی والے ایک سکھ نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چلا اٹھتی، اسے پتا چلا کہ وہ کوئی اور نہیں خود راسم ہے۔ لباس اور پگڑی وغیرہ نے اس کا حلیہ حیران کن طور پر تبدیل کر دیا تھا۔

اسی دن شام کو وہ شاید اپنے آپ کو چیک کرنے کے لیے ہی موٹر بائیک پر سوار ہو کر کوٹھی سے باہر چلا گیا (یہ موٹر بائیک اس کوٹھی کے اندر سے ہی اسے ملی تھی) وہ جب تک واپس نہیں آیا، آنیہ کا دل اس کے سینے میں بے کل پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہا۔ وہ واپس آیا تو اس کے کندھوں پر ایک براؤن گرم چادر تھی۔ کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ "راسم! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ایسے باہر کیوں چلے گئے؟"

"بڑا فائدہ ہوا ہے۔ چلو اندر آؤ تمہیں بتاتا ہوں۔" وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک چھوٹا باکس بھی تھا۔ شاید کھانے کی کوئی چیز تھی۔ "پتا ہے کہاں سے آ رہا ہوں؟" اس نے کہا۔ "زباب منزل سے۔ شہابی کی امی جان زباب خالہ سے مل کر آیا ہوں۔ شہابی کی امی جان کو زباب خالہ ہی کہتا ہوں۔"

"اوہ گاڈ! زباب منزل چلے گئے تھے؟" وہ از حد حیران ہوئی۔

جواب میں راسم نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یوں تھا......

آج مہینے کا پہلا جمعہ تھا۔ زباب بیگم اس موقع پر زباب منزل سے باہر آئی تھیں اور ایک شامیانے میں موجود لوگوں میں خیر خیرات تقسیم کرتی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا اور دور سے کھڑا انہیں دیکھتا رہا تھا پھر اس نے مزید ہمت کی تھی اور خیرات لینے والوں کی قطار میں لگ گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکا۔ اپنی باری پر اسے بریانی والا باکس ملا اور چادر کا یہ پیکٹ ملا۔ پیکٹ اس نے جان بوجھ کر گرایا اور پیکٹ اٹھاتے ہوئے زباب بیگم کے پاؤں کو چھوا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔

آنیہ نے پوچھا۔ "اپنی والدہ (آپا خالہ) سے نہیں ملے؟"

"نہیں، وہ اندر تھیں۔ اُن سے ملنا مشکل تھا۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔

آنیہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ پس پردہ کیا ماجرا ہے۔ اسے ہمیشہ سے زباب بیگم سے انسیت تھی۔ شاید اپنی ماں (آپا خالہ) سے بھی زیادہ وہ ان کے قریب تھا۔ اب تو اس پر یہ عقدہ بھی کھل چکا تھا کہ وہی اس کی اصل ماں ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب وہ انہیں حقیقت بتا کر جدائی کا صدمہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کسی وقت آنیہ کو لگتا تھا کہ وہ ہر چیز کو بیگانی سی نظر سے دیکھتا ہے۔ جیسے کوئی مسافر کسی نئی منزل کی طرف گامزن ہو اور سامان باندھے، پلیٹ فارم پر بیٹھا ہو۔ غالباً یہی سبب تھا کہ بیتے ہوئے دنوں میں وہ ماں کو ماں نہیں کہہ سکا تھا اور پھر آنیہ کو 'اپنی محبت' کہنے سے کترا تا رہا تھا۔

اس نے گتے کا باکس کھولا۔ اس میں خوشبودار بریانی تھی اور بریانی کے اوپر پانچ چھ سیخ کباب رکھے تھے۔ ''یہ کباب بھی اسی بریانی میں تھے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''نہیں، یہ گڈ لک ریستوران سے لیے ہیں۔ بندہ راجوری آئے اور گڈ لک ریستوران کے سیخ کباب، دہی کے رائتے کے ساتھ نہ کھائے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے۔''

اس نے بتایا۔ ''ریستوران کے مالک عمر رسیدہ، مگر خوش باش میاں بیوی ہیں۔ میاں کی عمر قریباً نوے برس اور بیوی کی پچاسی برس ہوگی۔ اب یہ یہاں کی ایک روایت بن گئی ہے کہ نوجوان شادی شادہ جوڑے اپنی شادی کی سالگرہ پر ریستوران میں جاتے ہیں۔ کباب آرڈر کرتے ہیں اور واپسی کے وقت عمر رسیدہ جوڑے کے ساتھ تصویر اترواتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چلو......'' وہ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔

ماحول کے شیشے پر چوٹ سی پڑی۔ آنیہ کے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ وہ راسم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے سوچا کہ ہم دونوں تو شاید کبھی اس ریستوران میں نہ جاسکیں، چلو یہ کباب ہی سہی۔''

دونوں کا دل جیسے ایک دم بھر گیا تھا۔ کبابوں کی مہک، بریانی کی خوشبو، کھڑکی سے جھانکتا ہوا چاند، کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ دونوں بُت سے بنے وہاں بیٹھے رہے۔ آنیہ کی آنکھوں میں کاجل پھیلنے لگا۔ اس نے ڈبا بند کر کے فریج میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلیں، کل کھالیں گے۔''

اگلے چھ سات روز بھی اسی طرح گزرے۔ دکھ کے پانیوں میں راحت کے چند چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی آئے۔ آنیہ کے بہت منع کرنے کے باوجود راسم اپنے اس پگڑی اور داڑھی مونچھ والے بھیس میں دو بار گھر سے باہر بھی گیا۔ بے شک آنیہ دلی طور پر اس کی ''بے خوفی'' کی پرستار تھی مگر فی الوقت اسے یہ بے خوفی...... بے پروائی کے زمرے میں محسوس ہوتی تھی اور اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دلیر ماموں نے بھی اسے اس حوالے سے محتاط رہنے کا کہا تھا۔ کبھی کبھی آنیہ کو لسانیات کے ماہر، پروفیسر زیڈ اے صدیقی کی کہی ہوئی ایک بات بھی یاد آتی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ کشمیر میں فریڈم فائٹنگ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں ہمیشہ شہادت کی بہت سی ''ویکینسیاں'' ہوتی ہیں۔ امیدواروں کو مایوسی نہیں ہوتی۔ اپلائی کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال کے اندر ان کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ یہ سب یاد آتے ہی آنیہ کا دل ڈوبنے لگتا تھا......

ایک روز آنیہ جب کچن میں اس کے لیے اس کی پسندیدہ، مکئی کی میٹھی روٹی بنا رہی تھی، اسے لگا کہ وہ کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت اس کی طرف سے متفکر رہتی تھی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا لیکن مایوسی ہوئی۔ وہ شاید کشمیری میں بات کر رہا تھا مگر پھر اس پر انکشاف ہوا کہ یہ کشمیری بھی نہیں ہے۔ یہ وہی ''جناتی'' زبان تھی جس میں اس کی ڈائری لکھی گئی تھی۔

اس روز ناشتے کے بعد دونوں میں دیر تک بحث ہوئی اور آنیہ نے کسی نہ کسی طرح اس سے عارضی طور پر وہ کولٹ پسٹل لے لیا جو اسے ہر وقت اضطراب میں مبتلا رکھتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کسی دن راسم یہ پستول لے کر نکل جائے گا اور کچھ کر بیٹھے گا۔ سہ پہر کے وقت وہ سو رہا تھا۔ آنیہ نے وہ پستول چھپا دیا۔ اس کے لیے اس نے ویلوٹ کا ایک براؤن لحاف ایک کونے سے ادھیڑا اور بڑی صفائی سے پستول اس کی روئی میں گھسیڑ دیا۔ یہ لحاف استعمال نہیں ہوتا تھا۔ آنیہ کی ذہنی کیفیت ان دنوں عجیب ہو گئی تھی۔ اسے ہر وقت راسم کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

تب ایک روز جب وہ دونوں خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے، راسم نے اسے بتایا۔ ''کل ایک دوست صبح چار بجے والی فلائٹ سے راجوری آرہا ہے۔ اس سے ملنا اشد ضروری ہے۔ صبح چار بجے کے قریب نکلوں گا اور بس اسے ریسیو کر کے آجاؤں گا۔''

''وہ بھی ساتھ آئے گا؟'' آنیہ نے پوچھا۔

راسم نے نفی میں جواب دیا اور بتایا کہ صرف ریسیو کرنا ہے۔ آنیہ پھر ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اسے قائل اور مطمئن کیا، بولا۔ ''صبح سویرے

نکلنا ہے اس لیے تمہیں جگاؤں گا نہیں؟"

وہ صبح تین بجے اٹھا تھا، اس نے آنیہ کو سویا ہوا سمجھا تھا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر چلا گیا تھا اور تب ہی آنیہ لپک کر ویلوٹ کے لحاف تک پہنچی تھی۔ وہ کٹا پھٹا ہوا تھا۔ اس میں پستول موجود نہیں تھا۔

آنیہ کا طویل فلیش بیک ختم ہوا۔ وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے، ماضی کے دریچے میں جھانکتے ہوئے، آنیہ نے قریباً دو گھنٹے گزار دیے تھے۔ کئی ماہ کے مناظر ترتیب وار اس کی نگاہ کے سامنے سے گزرے تھے اور وہیں آ کر رک گئے تھے جہاں سے آغاز ہوا تھا۔...... وہ ڈبل بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے باہر سفیدے کے پیڑ خاموش کھڑے تھے۔ ادھ کھلی الماری میں سے وہ لحاف بھی جھانک رہا تھا۔ جسے راسم نے پھاڑا تھا اور اس میں چھپایا گیا پسٹل نکال کر لے گیا تھا۔ سامنے کھڑکی کی چوکھٹ پر اسٹیکر چسپاں تھا۔ "ہم نہیں مانتے ظلم کے ضابطے" اوپر ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر کا عکس تھا اور نیچے انگوٹھے کا وہ نشان تھا جو سیاہی سے نہیں خون سے لگایا گیا تھا۔

وہ طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اجالے کی سیندھ لگنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھی تو پاؤں کی ایک ایڑی میں سخت درد محسوس ہوا۔ یہ چوٹ اس دھکے کی نشانی تھی جو راسم نے اسے موٹر بائیک سے دور ہٹاتے وقت دیا تھا اور پھر اندھیرے میں اوجھل ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اروڑا کی طرف نہیں جا رہا، ابھی وہ کسی اور کام سے جا رہا ہے مگر آنیہ کے دل کی گواہی تھی کہ فی الوقت اروڑا کے سوا اس کے ذہن میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ اروڑا بہت بڑا شخص تھا، اس کی پہنچ سے بہت دور تھا مگر وہ اب بھی اس تک پہنچنے کی اپنی سی کوشش کرنا چاہتا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔

آنیہ کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ وہ دل ہی دل میں پکاری۔ "راسم! تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کم از کم اس وقت تک مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے جب تک میرا "اکیلا پن" ختم نہ ہو جائے۔ اور تم "آنے والے" کا انتظار کیے بغیر ہی چلے گئے ہو۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی مہندی کی طرف دیکھا۔ اپنی ٹوٹی ہوئی ست رنگی چوڑیوں پر نگاہ دوڑائی...... "راسم! ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو میری ہتھیلی میں حنا کی خوشبو بھی ماند نہیں پڑی۔"

دلبر ماموں کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور آنیہ نے جلدی سے آنسو پونچھے۔ وہ اندر چلے آئے۔ "دھی رانی! موٹر سائیکل کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ماموں! رات کو راسم لے کر گئے ہیں۔ کوئی ضروری کام تھا ان کو۔ کہتے تھے شام تک آ جاؤں گا...... اور ہو سکتا ہے کہ صبح ہی آ جاؤں۔"

"اوہو، یہ منڈا بھی نا......" انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اسے پتا بھی ہے کہ تھاں تھاں، دیواروں پر اس کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔" انہوں نے موبائل فون پر راسم کا نمبر پریس کیا۔ آنیہ جانتی تھی، اس کا نمبر بند ہوگا...... اور وہ واقعی بند تھا۔

ناشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے قراری سے بند کمرے میں چکراتی رہی، اس کے خشک ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ "یا اللہ! میرے سہاگ کی حفاظت فرما۔ یا اللہ اس کی مشکلیں آسان کر۔"

اسے کچھ پتا نہیں تھا، وہ کہاں گیا ہے۔ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے صبح واپس آ جانے کا کہا تھا۔ اب دس بجنے والے تھے۔ اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ یکا یک خبروں کو پَر لگ گئے۔ نیوز چینلز چنگھاڑنے لگے، ہر طرف تہلکہ سا مچ گیا۔ اطلاع دی جا رہی تھی کہ وہ مارا گیا ہے...... ہاں، وہ مارا گیا تھا...... اروڑا مارا گیا تھا۔ اسے اس کے بیڈ روم میں تیز دھار آلے کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ آنیہ اور دلبر سنگھ جی، بت بنے ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ نیوز کاسٹر چلا رہے تھے۔ فیلڈ رپورٹرز تازہ ترین اطلاعات دے رہے تھے۔ نامعلوم مسلح شخص ایک سکھ سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں اروڑا کی رہائش گاہ میں جا گھسا تھا۔

ایک چینل پر نیوز ریڈر نے ہیجانی آہنگ میں کہا۔ "اور یہ دیکھیے...... یہ سی سی ٹی وی فوٹیج ہمیں ابھی ابھی موصول ہوئی ہے۔ اس میں آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ حملہ آور دو تھے۔ ایک پک اپ میں موجود تھا۔ دوسرے نے باؤنڈری وال کے قریب سے گارڈ کو چھاپا اور گھسیٹ کر پک اپ میں لے گیا۔"

سی سی ٹی وی میں دکھایا جا رہا تھا۔ حملہ آور جس نے اپنا چہرہ پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا، بہت وحشت سے گارڈ...... پر جھپٹا۔ اسے گھما کر باؤنڈری وال کے ساتھ دے مارا۔ پھر اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر سیاہ رنگ کی ہائی روف میں لے گیا۔

آنیہ کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ وہ حملہ آور کی

نیلی پگڑی، اور لباس دیکھ چکی تھی۔ اسّی نوّے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ راسم ہے۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ اس نے دلبر ماموں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی ہیجان تھا۔ فوٹیج میں اوپر کی طرف کلاک چل رہا تھا۔ سیکنڈ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ منظر کٹ ہوا۔ قریباً پانچ منٹ کے وقفے سے جو دوسرا منظر فوٹیج میں ابھرا، وہ سیاہ پک اَپ (ہائی روف) کا تھا جو رینگ کر باؤنڈری وال کے قریب پہنچی تھی پھر اس کی چھت پر ایک ہیولا نظر آیا۔

نیوز ریڈر بلند آواز میں بولا۔ ''اور یہ دیکھیں ناظرین...... غور سے دیکھنے پر پتا چلتا ہے کہ حملہ آور اب سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں ہے اور پک اَپ کی چھت پر چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ دیکھیں...... کتنی دیدہ دلیری ہے...... وہ چھت سے باؤنڈری وال پر چڑھ کر اندر کود رہا ہے۔'' نیم تاریکی میں ایک سرخ دائرہ حملہ آور کی نشاندہی کر رہا تھا۔

دلبر ماموں کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا۔ وہ مختلف چینلز بدلتے رہے تھے۔ ایک چینل پر اس منظر کی فوٹیج تھی جس میں حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے اروڑا کی رہائش گاہ سے باہر نکل رہا تھا۔ کلاک سے پتا چل رہا تھا کہ یہ واردات صرف پانچ چھ منٹ میں مکمل ہو گئی ہے۔ کوٹھی کے اندر سے تین چار فائر سنائی دیے۔ پھر ایک ہیولا سا باؤنڈری وال پر نظر آیا اور باہر کود گیا۔ آگے کے مناظر اتنے واضح نہیں تھے کیونکہ ''ہائی روف'' اب اندھیرے میں تھی۔

''آخر اس نے مار دیا۔'' دلبر ماموں سنسنی خیز آواز میں بولے۔ ''یہ وہی ہے...... وہی ہے۔'' پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھے۔ ''دھی رانی! یہ بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ اس کا ری ایکشن بڑا سخت ہو گا۔ اب تمہارا اوپر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم نیچے بیسمنٹ وچ چلی جاؤ۔ آؤ میرا پُتر۔''

آنیہ کے زرد رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ سینے میں تلاطم تھا۔ دلبر ماموں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لے کر بیسمنٹ کی طرف آ گئے۔ نیوز کاسٹر کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''ابھی ابھی تازہ سماچار آئی ہے کہ اس گھٹنا میں دو گارڈز کی موت ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہے۔ فورسز نے پورے علاقے کو محاصرے میں لے لیا ہے۔''

دلبر سنگھ جی نے آنیہ کو بیسمنٹ میں بٹھایا، پھر لوہے کی الماری کا تالا کھولا اور اس کے اندر سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکال لی۔ ایک نظر دیکھ کر ہی آنیہ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی رائفل ہے۔ وہ آنیہ کا شانہ تھپک کر بولے۔ ''پریشان نہیں ہونا آنیہ پُتر! کوئی تم دونوں کا بال بھی بیکا نہیں کر سکدا۔''

تب وہ ایک بار پھر راسم کو فون ملانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ آنیہ نے سوچا، اسی طرح کچھ عرصہ پہلے راسم نے ڈرے سہمے جوڑے ظہیر اور نادیہ کی مدد کی تھی، آج دلبر ماموں راسم اور اس کے سامنے ڈھال بنے ہوئے تھے۔

دلبر ماموں نے جہاں سے آٹومیٹک رائفل نکالی تھی وہاں ایک ٹیلی اسکوپ بھی پڑی ہوئی تھی۔ آنیہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اسے دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔ دلبر ماموں جا چکے تھے۔ اس نے وہاں موجود چھوٹا ٹی وی آن کر لیا۔ اب ''زی ویوز'' بھی آ رہے تھے۔ ایک تبصرہ نگار کہہ رہا تھا۔ ''بالکل...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس گمبھیر گھٹنا میں بھی راسم عرف راسو کا رول ہو۔ یہ ہمارے اداروں کی ناکامی ہے کہ وہ ابھی تک مفرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس کے کسی سکھ ساتھی کی کارروائی ہو......''

دوسرے تبصرے نگار نے قطع کلامی کی۔ ''دیکھیں، اب تو اس بات کے بھی واضح اشارے مل رہے ہیں کہ غالباً وہ خود ہی سکھ نوجوان کے بھیس میں تھا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق حملہ آور نے وہاں جو نعرے لگائے ہیں، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس نے اپنی شناخت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی......''

چینل میں موجود ایک صحافی نے کہا۔ ''آکاش اروڑا صاحب کی ہتھیا جس بے رحمی سے کی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہتھیارے کے اندر کتنی نفرت چھپی ہوئی تھی۔ اروڑا صاحب کے شریر پر چاقو کے کم از کم پندرہ گھاؤ موجود ہیں۔ ان کا سارا بیڈ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ کچھ اس طرح کی جانکاری بھی دی جا رہی ہے کہ شاید ان کی باڈی کو ''ڈیمیج'' بھی کیا گیا ہے...... غالباً ایک بازو کو۔''

یکایک تہ خانے کی چھت سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ یہ بھاری بوٹوں کی آوازیں تھیں۔ تب فوجیوں کے بولنے اور دلبر ماموں کے گرجنے برسنے کی صدائیں آئیں۔ پھر یوں لگا کہ شاید انہیں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد تصدیق بھی ہوئی۔ وہ لوگ انہیں گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

آنیہ کا دل گھبرانے لگا۔ معدے میں اینٹھن ہو رہی تھی پھر اسے قے شروع ہو گئی۔ کل رات بھی اسی طرح کی کیفیت ہوئی تھی جب راسم نے اسے متلی کی دوا دی تھی...... یہ سخت بے چینی کا وقت تھا۔ آنیہ نے ٹی وی بند کر دیا۔ لائٹ

آف کر دی مگر پھر نہار کی کال آ گئی۔ ساری خبریں اس تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ وہ راسم اور آنیہ کے حوالے سے سخت فکر مند تھی...... پھر پاپا کا فون آیا۔ آنیہ کوشش کے باوجود کال اٹینڈ نہیں کر سکی۔ اس نے جواباً بس معذرت کا میسج بھیجا اور اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔

سہ پہر کے وقت تھوڑی سی راحت اس وقت ملی جب اسے پتا چلا کہ دلبر ماموں پولیس اسٹیشن سے گھر واپس آ گئے ہیں۔ غالباً ان کا ''سابق فوجی ہونا'' ان کے کام آیا تھا۔ آنیہ اُن سے ملی۔ وہ اپنے لیے قطعاً خوف زدہ نہیں تھے۔ انہیں بس آنیہ اور راسم کی فکر تھی۔

تہ خانے میں آنیہ نے جائے نماز سنبھال لی تھی اور راسم کے لیے مسلسل دعا گو تھی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ تہ خانے کے دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ دوسری طرف دلبر ماموں تھے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اسے لگا کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے جو دعائیں وہ مانگ رہی تھی، وہ رنگ لائی ہیں۔ دلبر ماموں کے ساتھ راسم موجود تھا۔ اس کے سر پر نیلی پگڑی تھی اور اس نے خود کو براؤن رنگ کی گرم چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے حلیے میں جو تھوڑا سا فرق آیا، وہ یہ تھا کہ ایک رخسار پر چوٹ کا نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا۔

دلبر ماموں نے اسے اندر دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ باہر سڑک سے گزرتی ہوئی فوجی گاڑیوں کے مخصوص ہارن سنائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ایمبولینس بھی شور مچاتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ دلبر ماموں واپس چلے گئے۔ آنیہ تڑپ کر راسم کے گلے لگ گئی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''دیوانی ہوئی ہو آنیہ! یہ رونے کا نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ اس سؤر کو چیر ڈالا ہے میں نے۔'' اس کا سینہ اندرونی جوش سے کچھ اور بھی فراخ نظر آنے لگا تھا۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

اس نے راسم سے الگ ہو کر اسے دیکھا۔ اسے راسم کی آنکھوں میں شعلے نظر آئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ دیکھا نا، گرا دیا نا سومنات کو۔ اس کی سیاہ جیکٹ کی اندرونی جیب کافی پھولی ہوئی تھی۔ آنیہ نے ٹٹولا۔ کوئی نرم سی چیز تھی۔ ''یہ کیا ہے؟''

راسم نے ذرا تذبذب کے بعد سبز رنگ کا ایک شاپر نکالا۔ اس میں کچھ تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں بولا۔ ''دل چاہتا تھا کہ تمہیں یہ دکھاؤں...... مگر...... شاید تم ڈر جاؤ گی۔''

''مگر ہے کیا؟''

وہ پھنکارا۔ ''اس بے رحم قاتل کا ہاتھ......'' آنیہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہاں آنیہ اپنے اس ہاتھ سے اس بدبخت نے میرے فاروق کو تڑپا کر مارا تھا اور پھر سدرہ کے سر سے عزت کی چادر اتاری تھی۔ اسی ہاتھ سے اس نے ٹھیکیدار نرائن کے سامنے، مجھے برف کے بلاک پر ننگا لٹایا تھا۔ میں اس حرام زادے کی لاش کا تو کچھ نہیں کر سکا مگر اس ہاتھ کو آوارہ کتوں کی خوراک ضرور بناؤں گا۔''

آنیہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو پھر ردِعمل میں ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہیں۔ باہر باغ کالونی کی کسی گلی میں اوپر تلے تین چار فائر ہوئے اور پھر آوارہ کتوں کا شور سنائی دینے لگا۔

وہ عجب رات تھی، وہ اکٹھے تھے، ایک دوسرے کے بالکل قریب...... مگر جیسے سیکڑوں میل دور تھے۔ آنیہ نے اس کی طرف کروٹ لی، پھر اس کا دایاں ہاتھ اپنے سرد رخسار اور تکیے کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔ ''راسم! تم نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک میں ''اکیلی'' ہوں۔ تم کچھ نہیں کرو گے پھر تم کل رات کیوں نکل گئے؟''

''میرا دل کہتا ہے کہ تم اکیلی نہیں ہو...... اب نہیں ہو۔'' وہ بھی کھوئے لہجے میں بولا۔

وہ چونک سی گئی۔ سر اٹھا کر نیم تاریکی میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس کو کل رات بھی تو متلی ہوتی رہی تھی۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا سا گیا۔ وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہاں آنیہ! یہ تمہاری طبیعت کی خرابی بھی ہو سکتی ہے مگر میرا دل...... میرا وجدان کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسی وجدان اور یقین کے سہارے میں کل چلا گیا تھا۔''

وہ کتنی ہی دیر کچھ نہ کہہ سکی۔ اپنے وجود کے اندر کسی اور وجود کی شروعات کا احساس اس کے لیے بڑا انوکھا تھا۔

وہ موضوع بدل کر بولا۔ ''کاش کشمیر آزاد ہو جائے اور وہ آزاد فضاؤں میں پیدا ہو۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بول ہی نہیں سکی۔ اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''بھارت کا یہ مسلم کش حکمران جس طرح کے ظلم توڑ رہا ہے، لگتا ہے کہ اب صبح قریب ہے۔ لوگوں میں ایک بے تاب لہر پیدا ہو رہی ہے۔ کشمیری نوجوان سروں پر کفن باندھ رہے ہیں۔ راجا نے کل ایک عجیب شعر سنایا جو دل پر نقش ہو گیا ہے۔

ہم نے اندھی رات میں توڑا فصیلِ خوف کو
صبح کی پہلی کرن تک یہ حوالہ جائے گا۔''

باہر سرد ہوا چناروں میں سرسرا رہی تھی۔ آنیہ نے

پوچھا۔ "راسم، کل راجا بھی تمہارے ساتھ تھا؟"

"ہاں، گاڑی میں وہی تھا۔ تمہیں پتا ہے، وہ کون ہے؟" وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "پیلٹ گن سے چھلنی ہونے والی خاتون ناہید کا چھوٹا بھائی، بڑا پیار کرتا تھا اپنی آپی سے۔ مزاحمت اور جدوجہد کے یہ سلسلے ایسے ہی رشتوں ناتوں اور جذبوں سے جڑے ہوئے ہیں۔"

بولتے بولتے اچانک راسم کے ذہن میں نہ جانے کیا آیا، کہنے لگا۔ "آنیہ! کسی وقت سوچتا ہوں، ازخود گرفتاری دے دوں۔"

"پلیز راسم۔" آنیہ نے سسک کر کہا اور اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اگلی صبح مزید تہلکہ خیز تھی۔ اخبار چلا رہے تھے۔ نیوز چینلز پر بھی سخت شور تھا۔ انڈین فورسز نے پورے علاقے میں نہایت سخت سرچ آپریشن کیا تھا۔ گھر گھر تلاشی لی گئی تھی۔ انہوں نے بڑی بے رحمی سے پندرہ سے زائد کشمیریوں کو مار ڈالا تھا۔ بے شمار گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ چادر اور چار دیواری پامال کی گئی تھی۔ آنیہ نے گوگل پر سرچ کر کے کوئی پاکستانی نیوز چینل ٹیون کرنا چاہا مگر ایک بار پھر انٹرنیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے ٹرانزسٹر ریڈیو پکڑا اور پاکستانی نیوز سننے میں کامیاب رہی۔ ریڈیو کے مطابق شہید ہونے والے کشمیریوں کی تعداد بیس سے کم نہیں تھی۔ علاقے سے چار سو کے قریب افراد گرفتار کیے گئے تھے۔ دو قریبی دیہات سے انڈین فوجی تین کشمیری لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے، ان پر سہولت کاری کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایریا میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ شہادتوں کی وجہ سے پورے راجوری میں شدید غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔

آنیہ کو لگا کہ راسم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ دوپہر تک آنیہ کو خوف محسوس ہوا کہ وہ جذبات کے دھارے میں بہہ کر پھر کہیں نہ نکل جائے۔ اس نے دلبر ماموں سے کہہ کر موٹر بائیک غائب کروا دی اور انہیں راسم کی طرف سے پوری طرح چوکس کر دیا۔ آج اسے پتا چل رہا تھا کہ کل رات اس نے اچانک یہ بات کیوں کہی تھی کہ وہ اپنی گرفتاری دینا چاہتا ہے۔ شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں اروڑا کے قتل کا ردعمل بے گناہوں کے لیے جان کا خطرہ نہ بن جائے۔

آکاش اروڑا کے قتل اور پھر پچیس کے قریب بے گناہ کشمیریوں کی شہادت کے بعد علاقے میں زبردست انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ راجوری کی گلیوں میں چھوٹے احتجاج ہوئے تھے۔ ٹائروں کو آگ لگائی گئی اور فوجی گاڑیوں پر سنگ باری ہوئی تھی۔ اب لوگ ایک بڑے اور منظم احتجاج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ باغ کالونی میں جہاں ایک ہی گلی میں سات لوگوں کو شہید کیا گیا، ایک بڑا مظاہرہ کیا جائے گا۔ جمعے کے روز ہزاروں لوگ جمع ہوں گے اور پُرامن طور پر اس درندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے۔

یہ اضطراب قریبی علاقوں تک بھی پھیل گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ کلگام اور اننت ناگ سے بھی لوگ قافلوں کی صورت یہاں پہنچیں گے۔ بوائز ہاسٹل سے آگے ایک بڑا پلے گراؤنڈ تھا جس کے ساتھ ایک وسیع میدان بھی تھا۔ یہ اجتماع یہیں پر ہونے والا تھا۔ میدان سے کچھ فاصلے پر شمال کی طرف ایک فوجی کیمپ تھا جس کے گرد خاردار باڑ لگی ہوئی تھی۔ مقامی انتظامیہ کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ راجوری میں اتنا بڑا جلسہ ہو۔ دیکھنے والے یہ سوچ سکتے تھے کہ اگر یہاں اتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو سکتے ہیں تو پھر سرینگر اور پلواما جیسے علاقوں میں کتنے بڑے پیمانے پر احتجاج ہو سکتا ہے۔ لہٰذا خبریں یہی آ رہی تھیں کہ یہ اجتماع ہونے ہی نہیں دیا جائے گا۔ دوبارہ کرفیو لگا دیا جائے گا یا پھر بڑے پیمانے پر مزید گرفتاریاں کر لی جائیں گی۔ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ سخت گیر ہندو ڈی سی اس پلے گراؤنڈ اور میدان میں پانی چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جوں جوں رکاوٹ کی اطلاعات آ رہی تھیں توں توں لوگوں کا غم و غصہ اور جوش بڑھ رہا تھا۔ وہ بدمست انڈین فوجیوں کی طرح خون خرابا نہیں کر رہے تھے، لوٹ مار کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، صرف بھارتی فوجیوں کی حد سے بڑھی ہوئی سفاکی کے خلاف عوامی طاقت کا پُرامن اظہار چاہتے تھے۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مقامی لیڈران بھی احتجاج کے اس پروگرام میں پیش پیش تھے۔

آنیہ دیکھ رہی تھی۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں راسم عجیب کیفیت میں رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے سینے میں جیسے نیلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے پل پل کی خبر رکھے ہوئے تھا۔ دوپہر کو دلبر سنگھ جی تہ خانے میں آئے۔ انہوں نے راسم کو بتایا۔ "مقامی کشمیری رہنماؤں اور انتظامیہ میں ایک ایگریمنٹ ہوا ہے۔ انتظامیہ کو پوری طرح وشواس دلایا گیا ہے کہ اس احتجاج کے دوران میں

لوگ بالکل شانتی کے ساتھ رہیں گے۔ گارنٹی دی گئی ہے کہ کوئی ایک شیشہ نہیں ٹوٹے گا، ایک گملا خراب نہیں ہوگا۔ چار بجے سہ پہر کے بعد چند تقریریں ہوں گی اور اس کے بعد مغرب سے پہلے پہلے لوگ شانتی کے ساتھ منتشر ہو جائیں گے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے دلبر جی، کیا واقعی ایسا ہو سکے گا؟" راسم نے پوچھا۔

"ہندو مہاشے پر وشواس کرنا تو مشکل ہے مگر یہ باوردی جانور اڑتالیس گھنٹے پہلے پچیس بے گناہوں کی ہتھیا کر چکے ہیں۔ ہر طرح کا ظلم ڈھا چکے ہیں۔ اب شاید ان کے اندر خون کی پیاس تھوڑی سی گھٹ (کم) پڑ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "پُرامن" "پروٹیسٹ" کی آگیا دے رہے ہیں۔"

"دلبر جی! کیا پتا وہ دہری چال چل رہے ہوں۔ ایک طرف احتجاج یعنی جلسے کی اجازت دے رہے ہوں، دوسری طرف لمبی چوڑی گرفتاریاں کر لیں۔"

"یار لوگوں نے اس کا بندوبست بھی کیتا ہویا ہے۔" دلبر جی جوش سے بولے۔ "جن کی گرفتاریاں ہو سکدی ہیں ان میں سے زیادہ تر رات سے ہی روپوش ہو گئے ہیں۔ رب نے چاہا تو اپنے کچھ سکھ جتھے بھی اسی جلسے میں شریک ہوں گے۔ راجوری والے جتھے کے آگو (لیڈر) دلجیت سنگھ فوج کے زمانے سے میرے یار ہیں۔ وہ بھی رات سے زیرِ زمین ہیں۔ عین ٹائم پر اپنے لوگوں کے ساتھ یہاں باغ میں پہنچ جائیں گے۔"

دلبر سنگھ جی کے گلے کی رگیں جوش سے پھولی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کشمیر کی آزادی میں انہیں خالصتان کی آزادی کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔ شاید اسی لیے ایک روز انہوں نے کہا تھا۔ صرف کشمیر کی کشتی ہی نہیں، ساری کشتیاں کنارے لگیں گی۔

جمعرات کی شام ٹیک باغ کے جلسے اور اجتماع کی خبر ایک اہم ترین خبر بن چکی تھی۔ راجوری میں بھی ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ مقامی کشمیری رہنماؤں کی طرف سے بار بار اعلان کیا جا رہا تھا کہ یہ قطعی طور پر ایک پُرامن احتجاج ہو گا۔ لہٰذا سب لوگ ایسے شر پسندوں سے ہوشیار رہیں جو اس زبردست عوامی اجتماع کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

رات کو آنیہ کا پریگنینسی ٹیسٹ کا نتیجہ آ گیا تھا۔ وہ واقعی امید سے تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی لیکن خوشی کے ہر پھول کے ساتھ غم کا وہی زہریلا کانٹا بھی تھا جو سوچ کی پوروں کو زخمی رکھتا تھا۔ اب وہ آزاد ہے، اب وہ چلا جائے گا...... وہ سوچ رہی تھی۔ کیا یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرے گا کہ جو اس دنیا میں آنے والا ہے، وہ کون ہے؟ کیا وہ اس کی شکل دیکھنے کا انتظار بھی نہیں کرے گا؟ اس کا دل درد سے بھر گیا۔

رات کو اسے کافی دیر متلی ہوتی رہی۔ پھر واش روم میں منہ ہاتھ دھو کر اور اپنے بال سمیٹ کر وہ راسم کے قریب بستر پر آن لیٹی۔ "راسم، کل تم بھی مظاہرے میں جاؤ گے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے آنیہ؟"

"نہ جاؤ نا، ابھی اروڑا والا معاملہ تازہ ہے۔ تمہارے لیے بہت خطرہ ہوگا۔"

"خطرے والی بات اچھی کہی ہے تم نے۔ کہاں خطرہ نہیں ہے میرے لیے؟ اس ہجوم میں تو میرے لیے سب سے کم خطرہ ہوگا۔" اس نے سامنے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو...... یہ کچھ لوگ کل والے جلوس کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ یہ کوئی دو سو موٹر سائیکل سوار تو ہوں گے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ وہاں ہزاروں میں کسی کو کون پہچان سکتا ہے اور پھر، اب تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ یہ ایک مکمل پرامن مظاہرہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جلسہ گاہ کے باہر چند ٹائر جلائے جائیں گے یا دو چار پتلے نذرِ آتش ہو جائیں گے۔"

"اور پھر اس کے بعد......؟" آنیہ نے پوچھا۔ "یعنی آنے والے دنوں میں؟"

"اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ گمبھیر آہنگ میں بولا۔ "میں وقت سے پہلے کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے ہولے سے آنیہ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "اگر کچھ ہو جائے تو تم پاپا کے پاس جالندھر چلی جانا۔ میرا خیال ہے کہ برقع میں سفر کرتے ہوئے تمہیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے خیرو کو ساری بات سمجھا دی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دلبر جی خود تمہیں چھوڑ آئیں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو راسم! میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔" وہ رو دی۔

"آنیہ، میری جان! تمہیں اپنے دل کو مضبوط کرنا ہو گا۔ تمہارے پاس میری امانت ہے اور وہ تمہیں شاید مجھ سے بھی زیادہ پیاری ہو۔ اسے سنبھالنا ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے۔"

"لیکن راسم! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا اور مرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے پیار سے آنیہ کا رخسار سہلایا۔ "اب تم نے یہ آپشن کھو دیا ہے آنیہ، تمہیں اب زندہ رہنا ہے۔ دلیری کے ساتھ اور مجھے پتا ہے تم رہو گی۔ تم نے مجھے بتایا تھا تم ہمیشہ دلیری کی پرستار اور متلاشی رہی ہو لیکن اب تم خود دلیر بنو گی۔ تمہارے وجود میں جو موجود ہے وہ تمہیں دلیر بنائے گا۔ تمہیں اور ڈھنگ سے جینا سکھائے گا، مجھے پورا یقین ہے۔"

اچانک لائٹ چلی گئی۔ تاریکی چھا گئی۔ ٹی وی آف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری۔ دستک ہوئی۔ خیرو ایک شمع دان اندر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ کل کے جلسے کے لیے لوگ بڑے پیمانے پر تیاری کر رہے ہیں۔ برہان وانی شہید کی تصویروں اور دیگر شہیدوں کی تصویروں والے بینرز تیار ہو رہے ہیں۔ پلے گراؤنڈ کے ساتھ والے وسیع میدان میں اسٹیج تیار کیا جا رہا ہے۔ خیرو خود بھی پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔

راسم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو جلیانوالا باغ یاد آ رہا ہے۔ شاید وہاں بھی اس سے ملتی جلتی صورتِ حال ہوگی۔ وہی جبر اور وہی صبر، وہی بربریت اور وہی مزاحمت۔ دور بدل جاتے ہیں، مقام بدل جاتے ہیں مگر جنگ تو وہی رہتی ہے۔"

آنیہ نے کن انکھیوں سے راسم کا چہرہ دیکھا...... وہ جانتی تھی یہ کون بول رہا ہے؟ یہ جلیانوالا کے اسد اللہ حیدر کا خون بول رہا تھا۔ اسے ایسے ہی بولنا چاہیے تھا۔

ایک بار پھر اس کی سوچوں کی پوروں کو غم کا نکیلا کانٹا لہولہان کرنے لگا۔ اس نے لیٹے لیٹے راسم کے مضبوط شانے سے ماتھا ٹیکا اور بھرائی آواز میں بولی۔ "راسم! جس راہ پر چل پڑے ہو، اس سے کوئی واپسی بھی ہے یا نہیں؟"

وہ گم صم سا ہو گیا۔ چند لمحے کے لیے آنیہ کو یوں لگا جیسے وہ کوئی جواب ہی نہیں دے گا پھر وہ بولا۔ "جب تک سانس تب تک آس۔ ناامیدی تو کفر کہلاتی ہے۔ ہم نے آزاد ہونا ہے۔"

"مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ راسم۔ مجھے صاف صاف بتاؤ پلیز۔ تمہیں تو پتا ہوگا جو راہ اختیار کر لی ہے، اس میں واپسی کا امکان کیا ہے؟"

وہ عجیب انداز میں مسکرایا۔ "زندگی موت کی 'ریشو' جاننا چاہتی ہو۔" پھر وہ اٹھا۔ شمعدان میں چھ شمعیں روشن تھیں۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری بجھا دیں۔ بس ایک شمع کا فیتہ ذرا سلگتا رہنے دیا۔ فیتے کے اوپر ایک چنگاری سی چمک رہی تھی۔ "ریشو تو بس یہی ہے آنیہ۔"

وہ اپنے گرم آنسوؤں سے اس کا شانہ بھگونے لگی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ یہ آخری رات ہے۔ اس آخری رات میں وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ وہ قول دے چکی تھی، کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اگلے روز راسم صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ آنیہ نے اسے نماز پڑھتے دیکھا پھر اس نے اپنی داڑھی درست کی اور بڑی بڑی مونچھیں تقریباً صاف کر دیں۔ اس نے کل رات ہی کہا تھا کہ وہ جلسے میں جانے کے لیے ایک مسلمان کی شکل میں ہی نکلے گا۔ آنیہ نے بڑے اہتمام سے ناشتا بنایا تھا مگر اس نے فقط چند لقمے ہی لیے...... پھر وہ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے آنیہ سے کچھ رُوئی اور سُوئی دھاگا مانگا تھا۔ دوپہر کے وقت آنیہ نے دیکھا کہ وہ انڈین وزیر اعظم کا ایک پُتلا سی رہا ہے۔ اس نے کشمیر کا ایک جھنڈا بھی تیار کر رکھا تھا۔ آنیہ نے دلبر ماموں کی آواز سن کر دروازے کی جھری سے آنکھیں ہٹائیں اور بیسمنٹ سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا، دلبر ماموں نے ایک مسلمان پینٹر سے ایک بڑا بینر تیار کروایا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "گجرات کے قسائی کو اب اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہوگا۔"

☆☆☆

آنیہ کو گم صم دیکھ کر راسم نے کہا۔ "گھبراؤ مت، دعا کرو جلسہ خیریت سے گزر جائے۔ شام کو تمہارے پاس ہوں گا۔"

سہ پہر کو ہی مظاہرین کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں نعرہ زنی کرتی ہوئی جلسہ گاہ کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ دلبر ماموں اور خیرو بھی نکل چکے تھے۔ راسم بھی تیاری میں تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر سفید گول ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بڑا، ریشمی رومال اس نے نقاب کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے چھت پر گیا تو آنیہ کو اپنا ایک شک رفع کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے انڈین وزیر اعظم کا نارنجی رنگ کا پُتلا دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔ پُتلے کے اندر ایک آٹومیٹک رائفل مع گولیوں والی بیلٹ کے چھپائی گئی تھی۔ یہ وہی رائفل تھی جو دلبر ماموں نے چند دن پہلے خطرے کے وقت بیسمنٹ والی الماری سے نکالی تھی۔

راسم واپس آیا تو آنیہ نے پُتلے کی طرف اشارہ کیا اور

چلا اٹھی۔ ''راسم! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا ارادے ہیں تمہارے؟ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ ہرگز نہیں جانے دوں گی۔''

''آنیہ'' وہ گرجا۔ ''اس بحث کا وقت نہیں ہے، یہ صرف احتیاط......''

''جھوٹ مت بولو۔ خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔''

اس نے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ راسم اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر یکایک اس نے اسے دھکا دیا اور پُتلے سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی، وہ اسے باہر سے لاک کر چکا تھا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگی۔ راسم کو پکارنے لگی، وہ آہنی گرل اور جالی والی کھڑکی کی طرف لپکی۔ وہ دوسری طرف کھڑا تھا۔ ''راسم! تم دھوکا دے رہے ہو مجھے۔ جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ تم شام کو واپس نہیں آؤ گے...... تم...... کبھی واپس نہیں آؤ گے۔''

وہ ٹھہری آواز میں بولا۔ ''آنیہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں یہ گن میں صرف احتیاط کے طور پر لے جا رہا ہوں۔ یہ ایک پُرامن جلسہ ہے لیکن ہمارا دشمن دھوکے باز ہے۔ اس پر مکمل بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کی طرف سے کچھ نہیں ہوگا تو پھر ہماری طرف سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''اور اگر کچھ ہو ہی گیا تو؟'' وہ کھڑکی سے منہ لگا کر چلائی۔ ''کیا تم، آج ہی خود کو گولیوں سے چھلنی کروا لو گے؟ آج ہی ہتھکڑیاں پہن کر پھانسی کی کوٹھری کی طرف چل پڑو گے؟''

اس کی آنکھوں میں شعلہ بھڑکا۔ وہی یادگار شعلہ جو جلیانوالا کی ایک دیوار کے پاس گرے ہوئے دس سالہ لڑکے کی آنکھوں میں نظر آیا تھا۔ وہ عجیب الوہی لہجے میں بولا۔ ''آنیہ! وہ بھی ایک باغ تھا جس کی تصویر تمہارے پاس ہے اور یہ بھی باغ ہے لیکن اس بار نہیں...... ہاں اس بار نہیں۔''

''کیا اس بار نہیں؟'' وہ پھر چلائی۔

''اگر اس طرح کی کہانی یہاں بھی دہرائی گئی...... تو میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔ تم دیکھ لینا میں یہ ہونے نہیں دوں گا......''

وہ بلک اٹھی۔ ''راسم! تم گولیاں چلاؤ گے؟ خون بہاؤ گے؟''

''گولیاں تو چل رہی ہیں، خون تو کشمیریوں کا بہہ رہا ہے۔ اب اسے روکنا ہے، کسی بھی طرح روکنا ہے۔''

اس نے الوداعی نظروں سے دیکھا اور تیزی کے ساتھ کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

یہ بہت بڑا جلسہ تھا۔ ہزاروں لوگ تھے۔ ان میں خواتین اور بچوں کی بڑی تعداد بھی تھی۔ یقیناً سب کے سینے سلگ رہے ہوں گے مگر اپنے قائدین کی ہدایت کے مطابق وہ سب پُرامن تھے۔ ہاں ان کے کتبوں اور بینرز سے ان کے اندرونی غم و غصے کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ ایک بڑے بینر پر لکھا تھا۔ ''بے شک نعرے بھی ہوں گے...... لیکن اب للکارے بھی ہوں گے۔''

ایک بینر جو جگہ جگہ نظر آ رہا تھا اس پر مقبول بٹ، برہان وانی اور نصیر احمد پنڈت کی تصویریں تھیں۔ نیچے سرخ روشنائی سے درج تھا۔ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے۔ دو اور نعرے بار بار فضاؤں میں گونج رہے تھے، وہ یہ تھے۔ ''ہم نہیں مانتے...... ظلم کے ضابطے'' اور ''کشمیر بنے گا پاکستان''۔ جلسہ گاہ کے اردگرد عمارتوں کی چھتوں پر اور کیمپ کی جانب بہت سے فوجی شوٹر بالکل چوکس موجود تھے۔ وہ چاروں طرف گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

آنیہ بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑی پردے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اسے جلسہ گاہ کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی کھڑکی کی جالی کاٹ کر بمشکل کمرے سے نکل سکی تھی۔ جلسہ گاہ میں ایک جوشیلا نوجوان اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر موجود تھا۔ وہ اپنے سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ ''لے کے رہیں گے۔'' سیکڑوں لوگوں نے جواب دیا۔ ''آزادی'' وہ پھر پکارا۔ ''میں مر بھی جاؤں تو'' سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ ''آزادی'' وہ پھر دھاڑا۔ ''میری قبر پر لکھنا'' جواب آیا۔ ''آزادی''

''ذرا زور سے بولو...... آزادی...... دل کھول کے بولو...... آزادی......''

آنیہ سنتی رہی۔ رگوں میں لہو سنسناتا رہا۔ کہیں پس منظر میں نغمہ گونج رہا تھا۔ دنیا کے منصفو، سلامتی کے ضامنو! کشمیر کی جلتی وادی میں بہتے ہوئے خون کا شور سنو۔

اور پھر کچھ دیر بعد تقریریں شروع ہو گئیں۔ لوگ بڑے نظم و ضبط سے سنتے رہے۔ کہیں کوئی یورش نہیں تھی، کوئی اُتھل پتھل نہیں تھی۔ اس کی امید بندھنے لگی کہ سب کچھ خیر و عافیت سے اختتام پذیر ہو جائے گا۔ تقریریں ختم ہوں گی تو لوگ نماز مغرب سے پہلے منتشر ہو جائیں گے اور پھر...... پھر

وہ بھی چلا آئے گا۔ خدا کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ وہ ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی کر کے دکھا دیتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ آج رات کا کھانا وہ اور راسم پھر اکٹھے کھاتے۔ پھر مستقبل کے بارے میں سوچتے۔ پھر حالات کی بے رحم دیواروں کے اندر سے زندگی کا کوئی در نکالنے کی کوشش کرتے۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا گیا اور آنیہ کی امید کی روشن کرنیں طلوع ہوتی گئیں۔ اچانک اسے اس ٹیلی اسکوپ کا خیال آیا جو ایک روز اس نے بیسمنٹ کی الماری میں دیکھی تھی۔ وہ اپنے سفید گلابی پاؤں سیڑھیوں پر احتیاط سے رکھتی، تیزی سے نیچے آئی اور وہ لونگ رینج کی دوربین لے کر پھر تیسری منزل کی اس کھڑکی تک چلی گئی۔ وہ ہزاروں کے ہجوم میں راسم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ کوشش کے باوجود وہ اسے دیکھ نہیں سکی۔ تاہم ایک جگہ اس نے دلبر ماموں کو ان کی سرخ پگڑی کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ بڑی محویت سے تقریر سن رہے تھے۔ اب جلسہ آخری مراحل میں تھا۔

اچانک ایک دھماکا ہوا۔ یہی لگا کہ کسی بڑی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا ہے مگر اس آواز کی وجہ سے لوگوں میں یکا یک ہلچل پیدا ہوئی۔ دائیں جانب کے ہجوم میں کچھ بھگدڑ سی نظر آئی۔ آنیہ نے دیکھا کہ کچھ لوگ مخالف سمت میں بھاگے۔ اس جانب کچھ دوری پر فوجی کیمپ بھی تھا۔ فائر کرنے والوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا (اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بہانہ انہوں نے ٹائر بلاسٹ کی شکل میں خود ہی ''تخلیق'' کیا تھا۔ درحقیقت اتنا بڑا اجتماع ان سے ہضم ہی نہیں ہو پایا تھا) پہلے کچھ ہوائی فائرنگ کی گئی اور آنسو گیس پھینکی گئی تب دفعتاً سیدھی فائرنگ ہونے لگی۔ آنیہ کا دل اچھل کر گلے تک آ گیا۔ اس نے نہتے لوگوں کو زخم کھاتے دیکھا۔ قیامتِ صغریٰ کا سا منظر نظر آیا۔ جہاں چند لمحے پہلے ہزاروں لوگ تھے، وہاں اب کربناک آوازوں، افراتفری کی لہروں اور بھاگ دوڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹیلی اسکوپ آنیہ کی آنکھوں سے لگی تھی...... اور یہی وہ لمحے تھے جب اس نے دو نوجوانوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک راسم تھا......

ہاں وہ راسم ہی تھا۔ اس کے سر سے ٹوپی اتر چکی تھی۔ لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے پاس وہی رائفل ''اے کے 57'' تھی۔ وہ جوابی فائر کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر ان قاتلوں کو نشانہ بنا رہا تھا جو نہتے لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ آنیہ نے کچھ انڈین فوجیوں کو ''ہٹ'' ہو کر چھتوں سے گرتے دیکھا۔ جو فوجی دستہ زمین پر تھا، وہ بھی اس اچانک جوابی کارروائی سے بدحواس ہوا۔ وہ فوجی آڑ کی تلاش میں پیچھے ہٹے۔ ان کی رائفلیں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئیں۔ اسی دوران میں بے شمار لوگوں کو بھاگنے اور جانیں بچانے کا موقع مل گیا۔ آنیہ کی نگاہیں راسم پر چپکی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے گولی لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ اس کی گن اس کی گرفت سے نکل کر دور لڑھک گئی۔

''راسم۔'' آنیہ چلا کر رہ گئی۔ چند لمحوں کے لیے اس کا جی چاہا وہ دوڑتی ہوئی جائے اور زخمی راسم کے پاس جا پہنچے، اپنے جسم کو اس کی ڈھال بنا دے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ کرب کے عالم میں اس نے ٹیلی اسکوپ پھر آنکھوں سے لگائی۔ زخمی حالت میں راسم نے اپنی گن پھر اٹھالی تھی۔ اس کے جسم پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ گولی اس کے سینے یا کندھے پر دائیں جانب لگی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔ دونوں پلٹ کر فائر بھی کر رہے تھے پھر وہ جلسہ گاہ سے باہر ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ آنسو گیس کے دھوئیں نے دیکھنا محال کر رکھا تھا مگر آنیہ کی اشک بار نگاہیں اپنے راسم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ راسم اور اس کا ساتھی اب ایک خم دار گلی میں بھاگ رہے تھے۔ کچھ مسلح فوجی ان کے پیچھے لپک رہے تھے، کسی بھی لمحے وہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے۔ انہیں کیا فکر تھی اگر کوئی اور بھی گولیوں کی زد میں آتا۔ کچھ آگے جا کر راسم اور اس کا ساتھی علیحدہ ہو گئے۔ راسم بائیں جانب والی ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے لپکنے والے موت کے ہرکاروں کو جُل دینا چاہتا ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکے گا؟ آنیہ سوچ رہی تھی اور اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ کسی وقت دو تین سیکنڈ کے لیے آنیہ کی نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتا تھا، پھر نظر آنے لگتا تھا۔

پھر وہ آنیہ کو بہت فاصلے پر نظر آیا۔ وہ اب بھی بھاگ رہا تھا لیکن اب اس کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے سامنے گھنے درخت تھے...... اور پھر پہاڑیوں کا طویل سلسلہ تھا۔ یکا یک آنیہ نے دیکھا، ایک جانب سے دو موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے۔ راسم جھپٹ کر ایک سوار کے عقب میں بیٹھ گیا۔ آنیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی اسکوپ کا فوکس درست کیا۔ اس نے دیکھا یہ موٹر سائیکل سوار راجا تھا۔ دوسرا موٹر سائیکل سوار خیرو کا داماد امیر حمزہ تھا۔ اس کے

ماتھے پر ''اللہ اکبر'' کے الفاظ والا ہیڈ بینڈ نظر آرہا تھا۔ وہ تھوڑا آگے گئے تو ایک موٹر بائیک مزید ان میں شامل ہو گئی۔ اس پر بھی دو کشمیری نوجوان سوار تھے۔ انہوں نے چہروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر کوئی لمبوتری چیز جھول رہی تھی...... ہاں وہ راکٹ لانچر تھا...... ایسا ہی راکٹ لانچر دوسرے سوار کے کندھے پر بھی تھا۔ وہ برق رفتاری سے پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گاہے گاہے مڑ کر عقب میں بھی دیکھ لیتے تھے۔ وہ پیچھے آنے والے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے اور ان میں راسم بھی تھا لیکن فی الحال خطرہ کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے...... وہ پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ آنیہ کی ٹیلی اسکوپ اب بھی ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ اپنی رائفلیں لہرا رہے تھے...... وہ نعرے لگا رہے تھے...... اور وہ دور جا رہے تھے۔ پہاڑیوں میں گم ہو رہے تھے...... جب ہونٹ سی دیے جائیں، جب آنکھیں اندھی کر دی جائیں، جب دھڑکنوں کو زنجیر کر دیا جائے تو پھر ایسے ہی ویرانے، جانبازوں کو پناہ دیا کرتے ہیں...... اور پھر انہی ویرانوں میں سے ایک دن آزادی کا مسکراتا ہوا سورج طلوع ہوتا ہے۔

ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھ کر آنیہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آج شام اور آنے والی شاموں میں اب یہاں کسی کو نہیں آنا۔ وہ شہادت کا راہی تھا اور اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

انڈین فورسز کی طرف سے اسٹیج کیے جانے والے اس سنگین ہنگامے میں پانچ کشمیریوں کی جان گئی اور کچھ زخمی ہوئے۔ یہ قیمتی جانوں کا نقصان تو بے شک تھا مگر جتنا اندیشہ کیا جا رہا تھا، اتنا نہیں تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ عین موقع پر بھارتی فوجیوں کو اپنی پڑ گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ بھارتی فوجیوں نے اپنی چار لاشیں اٹھائی ہیں اور کئی زخمی بھی ہوئے ہیں۔ جلسے کے شرکا میں سے جو لوگ زخمی ہوئے تھے ان میں سے ایک دلبر سنگھ جی بھی تھے۔ ان کی ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ بھارتی فوجی انہیں مارتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک ''قیدی گاڑی'' میں ڈال کر لے گئے تھے۔ دلبر جی آخر تک ست سری اکال کے پُرجوش نعرے لگاتے رہے تھے۔ شام کے بعد آنیہ کو راسم کا لکھا ہوا خط ملا۔ یہ چھوٹا سا خط وہ بیڈ کے سرہانے کے نیچے رکھ گیا تھا۔

☆☆☆

دو ماہ گزر چکے تھے۔ آنیہ اپنے شہر جالندھر واپس آ چکی تھی۔ پاپا ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔ ماما بہت کم بات کرتی تھیں۔ آنیہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ نہار کی کال آئی۔ آنیہ اسی کال کا انتظار کر رہی تھی۔ کل آنیہ نے الٹرا ساؤنڈ اور بلڈ ٹیسٹ کرایا تھا۔ نہار نے کہا۔ ''آنیہ جانی! رپورٹ آ گئی ہے مبارک ہو...... رب نے چاہا تو بیٹا پیدا ہوگا۔''

آنیہ کے جسم میں سنسناہٹ جاگی۔ دل عجیب گداز سے بھر گیا۔ وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی الماری تک پہنچی۔ ایک مقفل دراز کھول کر اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ یہ وہی خط تھا جو راسم نے جاتے ہوئے لکھا تھا۔ وہ اسے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

''آنیہ! کشمیر کی غلامی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ آزادی کی صبح ضرور طلوع ہوگی۔ بہت جلد ایک ایسا سورج نکلے گا جو سہانے موسموں کی نوید دے گا۔ اس صبح مجھے بھی یاد کرنا...... بھول نہ جانا۔ ارے تم تو پھر آنکھوں میں موتی لے آئی ہو...... اچھا چلو...... دوسری بات کرتے ہیں...... اس دن وہ چھ شمعیں بجھ گئی تھیں لیکن ایک شمع کے سرے پر ایک چنگاری تو موجود تھی ناں۔ چلو اتنی ہی امید سہی۔ جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی اور میں تب تک زندہ بھی ہوا تو تمہارے پاس لوٹ آؤں گا...... ہاں آنیہ! بس یہ دو ہی شرطیں ہیں، آزادی کی صبح اور میری زندگی...... اور اگر نہ آ سکا تو تم پوری طرح آزاد ہو۔ ایسی صورت میں بس ایک ہی درخواست ہے میرے بچے کو میرا نام اور میرا کام بھولنے نہ دینا۔ اللہ حافظ۔

آنیہ نے آنکھیں پونچھیں۔ خط کو تہ کر کے پھر سے بڑی احتیاط کے ساتھ دراز میں رکھا، کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ سردی کی یخ بستہ رات دھیرے دھیرے در و بام پر اتر رہی تھی۔ یہ گرم بستروں میں جانے کا وقت تھا۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے دور شمال کی طرف دیکھا۔ اس کی ''نگاہِ تصور'' کے سامنے کشمیر کی وادی آئی۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے درمیان کچھ گونجتی ہوئی آوازیں اس نے سنیں۔ بارود کی آوازیں، لہو کے بہنے کی آوازیں، اور للکارنے کی آوازیں...... اور پھر کچھ مناظر اس کے تصور میں ابھرے۔ کچھ سربکف مجاہد اپنے ہدف پر عقابوں کی طرح جھپٹ رہے تھے، پلٹ رہے تھے، پھر جھپٹ رہے تھے۔ وہ لہو لہو تھے اور پکار رہے تھے۔ ''لے کے رہیں گے آزادی...... لے کے رہیں گے آزادی۔''

❖❖❖

جعلی مقابلہ

تمکین رضا

مقابلہ کرنے کے لیے جنگ کرنا پڑتی ہے... اور جیتنے کے لیے مخالف سے بھرپور مقابلہ کرنا پڑتا ہے... مشکلات کے کڑے امتحان سے گزرنے کے بعد اس کی زندگی میں اب ٹھہراؤ آیا تھا... لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا... اچانک ہی اس پُرسکون ٹھہراؤ میں طوفان آگیا...

اپنے دیس سے دور بسنے والے تارکین وطن کی کٹھن مجبوریاں

جہاز آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا اور تھوڑی دیر میں اس کے پہیے زمین کو چھونے والے تھے۔ پرائیویٹ سراغ رساں ولی کوستا نے کھڑکی سے میامی بیچ کے ساحل پر نیلگوں پانی کو دیکھا۔ وہ اٹلانٹک سٹی میں ایک مفرور شوہر کو تلاش کر کے گھر واپس آرہا تھا۔ وہاں کا سمندر گہرا نیلا اور برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اب اس کی آنکھیں نیچے گرم پانی کی لہروں پر جمی ہوئی تھیں۔

دو منٹ بعد جہاز کے پہیوں نے زمین کو چھوا اور ولی

نے اپنا فون آن کر دیا۔ اس کے لیے وائس میل پر ماں اور چھوٹے بھائی ٹونی کے پیغامات تھے جو مقبول ڈانس کلب Caliente کا مالک تھا۔ یہ ہسپانوی زبان کا لفظ ہے جس کا انگریزی ترجمہ ہاٹ ہے۔ ولی وہاں بھی سیکیورٹی انچارج تھا۔ آخری پیغام امیگریشن اٹارنی ایلس آرڈن کا تھا جو اکثر و بیشتر اپنے کیسز کی تحقیقات کے لیے ولی کی خدمات حاصل کرتی رہتی تھی۔ ''مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنے مشن میں کامیابی ہوئی ہو گی۔ یہاں پہنچتے ہی مجھ سے رابطہ کرو۔ میرے پاس ایک کلائنٹ ہے جسے تمہاری مدد کی فوری ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کیس تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔''

ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آ کر ولی کار میں بیٹھا۔ ابھی وہ پارکنگ لاٹ سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایلس کا فون آ گیا۔ ''میں کوستا بول رہا ہوں۔'' ولی نے کہا۔

''خوش آمدید ولی بوائے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''

ولی نے اسے بتایا تو وہ بولی۔ ''اگر تم گاڑی میں ہو تو سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آ جاتے۔ بالکونی میں بیٹھ کر میرے ساتھ بیئر پیو اور ہم اس نئے گاہک کے بارے میں کچھ باتیں بھی کر لیں گے۔''

بیس منٹ بعد ولی نے ایلس کی بلڈنگ پر گاڑی روکی۔ وہ تیسری منزل پر رہتی تھی جہاں سے دریائے میامی صاف نظر آتا تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھی مشروب کے گھونٹ لے رہی تھی اور اس کی نظریں ایک چھوٹے کارگو جہاز پر تھیں جو کیریبین کی طرف جا رہا تھا۔

ایلس سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوب صورت عورت تھی اور عمر میں ولی سے چند برس ہی بڑی ہو گی۔ اس وقت اس نے سفید بلاؤز اور نیلی جینز پہن رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح دلکش نظر آ رہی تھی لیکن اس نے سختی سے ایک پالیسی بنا رکھی تھی کہ کسی بھی صورت میں کام اور ذاتی زندگی کو آپس میں نہیں ملانا۔ ولی نے کئی مرتبہ اپنے معاملات کا رخ ذاتی زندگی کی طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا چنانچہ وہ بھی اس سے صرف کام کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

''مجھے اپنے اس نئے کلائنٹ کے بارے میں بتاؤ۔ اس کی کیا کہانی ہے؟ وہ مرد ہے یا عورت؟''

''ہاں وہ مرد ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو کہ میں کہاں سے شروع کروں؟'' اس نے ولی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میرے کلائنٹ نے مائننگ انجینئر کی تربیت لی ہے پھر وہ سرنگیں بنانے کا ماہر بن گیا جو کہ لاطینی امریکا کی جیلوں سے سیاسی قیدیوں کے فرار میں استعمال ہوتی تھیں۔ نصف کرہ کی تاریخ میں جو جیل توڑنے کے بڑے واقعات ہوئے اس میں اس کا اہم کردار تھا۔ کیا تمہاری دلچسپی کے لیے اتنا کافی نہیں ہے؟''

ولی سیٹی بجانے کے انداز میں بولا۔ ''یہ تو محض خلاصہ ہے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

ایلس مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ''اس شخص کا تعلق یوروگوئے سے ہے، تم جانتے ہو کہ یہ کہاں ہے؟''

''ہاں، دوسرے لاطینی امریکی ممالک کی طرح ساٹھ اور ستر کی دہائی میں وہاں بھی غربت کے خلاف تحریک چلی۔ وہ غریب علاقوں میں گئے۔ وہاں انہوں نے سوپ کچن کھولے اور بھوکے لوگوں کو مفت کھانا فراہم کیا۔ تعلیمی پروگرام شروع کیے اور انہیں سیاسی طور پر منظم کیا۔ اس تحریک میں کسی قسم کے تشدد کا عنصر نہیں تھا لیکن فوجی لیڈروں نے انہیں کمیونسٹ قرار دے کر جیلوں میں بند کر دیا۔ ان پر بدترین تشدد کیا گیا اور کچھ کی موت واقع ہو گئی جس کے نتیجے میں ان کے دوسرے ساتھی ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ اس میں دونوں طرف کے لوگ مارے گئے اور مزید افراد کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔''

ایلس لاطینی امریکا کے ممالک کی حالیہ تاریخ سے واقف تھی۔ اس کے پاس ان میں سے تقریباً ہر ملک کے لوگ امیگریشن کے لیے آتے تھے اور اس نے دہشت کی کئی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس نے بیئر کے مزید گھونٹ لیے اور اپنے خوب صورت ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''جیسا کہ میں نے کہا کہ انہی دنوں لاطینی امریکا کے تمام ممالک میں یہ تنازعات سر اٹھانے لگے جس کے نتیجے میں مزید خونریزی ہوئی۔ ان میں یوروگوئے کے باغی نمایاں تھے کیونکہ انہیں ایک خصوصی مہارت حاصل تھی جس کی بدولت وہ لاطینی امریکا اور دنیا بھر میں سرخیوں کا عنوان بن گئے۔''

''سرنگوں کی کھدائی؟ گریٹ اسکیپ کی طرح۔''

''بالکل لیکن انہوں نے یورپ میں نہیں بلکہ لاطینی امریکا میں کارروائیاں کیں جس طرح اس فلم میں جنگ عظیم دوم کے قیدیوں کو دکھایا گیا تھا۔ بہت مختصر عرصے میں انہوں نے دو بڑی کارروائیاں کیں۔ پہلی مردوں اور دوسری عورتوں کی جیل میں کی گئی اور ان کے سو سے زیادہ لوگ رہا ہو گئے۔ یہ صورتِ حال حکومت کے لیے شرمندگی کا باعث

تھی اور دنیا بھر کے اخبارات میں اس کا چرچا ہوا۔ لیکن اس کے فوراً بعد فوج نے سخت ایکشن لیا اور ان گروپوں کو زیرِ زمین جانا پڑ گیا۔ ان میں سے کئی مارے گئے اور کچھ ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ میرا کلائنٹ بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

"اور وہ یہاں پہنچ گیا؟"

"نہیں، وہ سیدھا یہاں نہیں آیا۔ اس نے دوسرے کئی ملکوں میں قیدیوں کو آزاد کرانے کے لیے خفیہ گروپوں کے ساتھ کام کیا تاوقتیکہ اس نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ زندگی بہت خطرناک ہے۔ اس لیے وہ یہاں چلا آیا۔ یہ تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے تب سے وہ تعمیراتی کام کر رہا ہے جس میں پانی کے پائپ، کیبل اور دوسرا زیرِ زمین کام شامل ہے۔ اس نے اپنی انجینئرنگ کی مہارت کو یہاں استعمال کیا اور اچھی زندگی گزارنے لگا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہاں بھی سرنگیں کھود رہا ہے لیکن اس میں کوئی قانونی مسئلہ نہیں۔"

ولی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "پھر اس کا کیا مسئلہ ہے جبکہ وہ ایمانداری سے کام کر رہا ہے؟"

"اسے حال ہی میں کچھ لوگوں نے پہچان لیا جو غیر قانونی کاموں میں ملوث ہیں، انہیں زیورات کی دکانیں لوٹنے میں مہارت حاصل ہے اور وہ اسے بلیک میل کر رہے ہیں کہ ان کی اگلی مہم میں سرنگ کھود کر ان کا ساتھ دے۔"

ولی منہ بناتے ہوئے بولا۔ "وہ پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتا؟"

"کیونکہ وہ اس ملک میں ایک فرضی نام سے رہ رہا ہے جو اسے جلاوطن کرنے کے لیے کافی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا کئی برسوں تک خفیہ گروپوں سے اشتراک رہا جس پر اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ خوش نہیں ہوگا، وہ اسے فوراً جلاوطن کر دیں گے۔ یہاں اس کے بیوی بچے بھی ہیں اس لیے وہ اس ملک سے نہیں جانا چاہتا۔"

ولی نے ایلس سے امیگریشن قوانین پر بحث نہیں کی۔ وہ شخص ان کی زد میں آ رہا تھا لیکن ولی کو بھی یہ کیس لینے میں کچھ تحفظات تھے۔

"کیا ہمیں ایسے شخص کی مدد کرنی چاہیے جس نے جیل توڑنے کا سلسلہ شروع کیا یا اس میں مدد کی؟"

ایلس کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "اس نے جن لوگوں کو جیل سے نکالا وہ مسلح عسکریت پسند نہیں تھے۔ وہ پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ جیل میں صرف وہی لوگ تھے جن کے نظریات سے حکومت کو اختلاف تھا، اگر کوئی مجھے صرف میرے خیالات کی وجہ سے بند کر دے تو مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص مجھے جیل سے نکالنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرے گا۔ ویسے بھی اس نے بیس سال سے اپنے آپ کو ان سرگرمیوں سے الگ رکھا ہوا ہے اس لیے مجھے اس کی مدد کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

ولی نے مزید بحث نہیں کی۔ ویسے بھی اسے کام کی ضرورت تھی۔ "اس شخص کا نام کیا ہے؟"

"یہاں وہ رابرٹ کواوڈ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارے لیے اتنا جاننا ہی کافی ہے۔"

"اور اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"ہمیں کسی طرح ان بڑے لوگوں کو روکنا ہوگا کہ وہ رابرٹ کو اس ڈکیتی میں حصہ لینے پر مجبور نہ کریں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے ان کا ساتھ نہ دیا تو وہ اس کی اطلاع امیگریشن حکام کو دے دیں گے۔ تمہیں ان لوگوں کو ایسا کرنے سے روکنا ہوگا کیونکہ اب سے تقریباً چھتیس گھنٹوں بعد اس کارروائی کا منصوبہ ہے۔ اس لیے تمہیں تیزی دکھانا ہوگی۔"

ولی اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولا۔ "میں اتنے کم وقت میں یہ سب کیسے کروں گا؟"

ایلس اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے لیکن اتنا جانتی ہوں کہ ولی کوستا بہت ہی ذہین، ہوشیار اور زبردست قوتِ اختراع کا مالک ہے۔ تمہیں خود ہی اس بارے میں سوچنا ہوگا۔"

ولی اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔ "دوست! تم نے کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی۔"

ایلس نے کوئی جواب نہیں دیا اور دریا کی طرف دیکھتی رہی۔

☆☆☆

ایلس نے اپنے کلائنٹ کو فون کیا اور وہ اسی روز رات نو بجے ولی سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ رابرٹ نے اس ملاقات کے لیے کیوبن کافی کیفے کا انتخاب کیا جو ساؤتھ ویسٹ آٹھویں اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ولی اس جگہ سے واقف تھا۔ میامی پولیس میں ملازمت کے دوران جب اس کی نائٹ شفٹ ہوتی تو وہ وقت گزاری کے لیے اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور اب بھی کبھی کبھی وہاں سے گزرتے ہوئے کافی پینے کے لیے اس کیفے میں چلا جاتا۔

"یہ جگہ اس جیولری اسٹور سے بہت قریب ہے جسے وہ لوٹنا چاہ رہے ہیں۔" رابرٹ نے فون پر بتایا۔ "اس

طرح میں تمہیں وہ دکان دکھا سکوں گا۔''

ولی پہلے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اپنی گاڑی پارک کی اور ہمیشہ کی طرح بیرونی کاؤنٹر پر ایک اسٹول لے کر بیٹھ گیا۔ اس کا چھوٹا سا کچن کافی مشینوں، جوسر بلینڈر اور دیگر کھانا بنانے کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف شیشے کے شوکیس میں پیسٹریاں رکھی ہوئی تھیں۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک بھاری بھرکم درمیانی عمر کی عورت بلانکا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ برسوں سے وہاں کام کر رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ولی سے پوچھے بغیر اس کے سامنے ہسپانوی کافی رکھ دی اور اس سے ہسپانوی زبان میں باتیں کرنے لگی۔

چند منٹ بعد رابرٹ بھی آ گیا اور ولی کے برابر والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ولی نے اسے غور سے دیکھا کہ وہ کس طرح سرنگ کھودنے کا ماہر بن گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ، گال پچکے ہوئے اور لہراتے ہوئے سیاہ بال تھے۔ اس کا قد پانچ فٹ تین انچ سے زیادہ نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب ولی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پنجے جسامت کے اعتبار سے بڑے تھے۔ اس کے پنجوں میں یہ مضبوطی کلہاڑی اور بیلچہ چلانے سے آئی تھی۔

بلانکا اسے بھی جانتی تھی۔ اس نے رابرٹ کے سامنے کافی رکھ دی۔ اس نے سڑک کے دونوں جانب دیکھا جیسے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا ہو پھر وہ ولی سے مخاطب ہوا۔

''مس آرڈن کا کہنا ہے کہ شاید تم میری مدد کر سکو۔''

ولی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں کوشش کر سکتا ہوں لیکن پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ تم اس مشکل میں کیسے گرفتار ہوئے؟''

''میں نے اس مصیبت کو دعوت نہیں دی۔ دراصل یہاں میری ایک جاننے والی خاتون ہے جو یورو گوئے میں میری محبوبہ بھی تھی۔ اسے میرے بارے میں سب معلوم ہے۔ اس نے کئی سالوں تک کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن ایک رات نشے میں آ کر میرے ماضی کے بارے میں سب کچھ اگل دیا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بات کس طرح پھیلی اور کیسے ان بدمعاشوں تک پہنچ گئی لیکن ایک ہفتہ قبل میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اس شخص سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس نے میرے سامنے اس ڈکیتی کی تجویز پیش کی۔''

ولی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ شخص کون تھا؟''

''وہ آسکر روبیل کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ کم از کم اس نے مجھے یہی بتایا۔ وہ کیوبا کا رہنے والا ہے اور ان لوگوں میں شامل ہے جو کئی برس پہلے یہاں آئے تھے جب فیڈرل کاسترو نے اپنی جیلیں خالی کرنے اور انہیں میامی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

رابرٹ 1980ء کے شروع کی بات کر رہا تھا جب ہزاروں کیوبن جلاوطنی اختیار کر کے کشتیوں کے ذریعے میامی پہنچے۔ کاسترو نے اس ہجرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جیلوں کے دروازے کھول دیے اور عام مجرموں کو بندرگاہ تک پہنچا دیا تاکہ وہ بھی ہجرت کر سکیں، یہ اس نے ایک طرح سے میامی سے انتقام لیا تھا۔ آئندہ چند برسوں میں یہ جرائم پیشہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے عذاب بن گئے۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر منشیات کی تجارت، قحبہ گری، بھتہ خوری اور دیگر جرائم شروع کر دیے۔ ان میں سے کئی ایک گرفتار ہوئے اور بہت سے آپس کی لڑائی میں مارے گئے۔

ولی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''گویا یہ شخص روبیل اس تباہی کے باوجود بچ گیا اور ابھی تک جرائم میں ملوث ہے۔''

''ہاں، وہ اور اس کا ساتھی سولس جو پرانا جرائم پیشہ ہے، زیورات کی دکانوں اور گھروں میں ڈکیتی کے ماہر ہیں۔ اس بار ان کا ہدف لٹل ہوانا میں واقع یہ جیولری اسٹور ہے۔''

''اور وہ وہاں تک سرنگ کھودنے کے لیے تم سے مدد مانگ رہے ہیں؟''

''ہاں، بالکل یہی بات ہے۔''

ولی منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ میامی میں کوئی شخص سرنگ کھود سکے۔ یہاں زیرِ زمین پانی کی سطح بہت بلند اور زمین کی سطح سے بہت قریب ہے اسی لیے یہاں کسی گھر میں تہ خانہ نہیں ہے۔ تم پانی میں سرنگ کھودو گے؟''

رابرٹ نے اپنی شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، اس کاؤنٹی کی ننانوے فیصد عمارتوں اور گھروں کے لیے یہ بات درست ہے۔ مجھے اپنے کام کے دوران پائپ بچھاتے اور بجلی کے پائپ ڈالتے ہوئے اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کچھ علاقے سطحِ سمندر سے تھوڑا سا بلند ہیں اور ان بدمعاشوں نے ایسے ہی علاقے میں ایک جیولری اسٹور تلاش کر لیا ہے۔ درحقیقت اسٹور کے مالک نے

زیرِ زمین ٹھوس سطح کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں ایک تہ خانہ بنایا ہے جس میں وہ اسٹور بند ہونے کے بعد اپنی قیمتی اشیا رکھتا ہے۔"

"ان بدمعاشوں کو یہ معلومات کیسے ملیں؟"

"روبیل کا کوئی جاننے والا کاؤنٹی کنسٹرکشن ڈپارٹمنٹ میں ہے جس کے پاس اس عمارت کے نقشے ہیں۔"

"اس کا بھی اس میں کوئی مفاد ہوگا؟" ولی نے پوچھا۔

"ہاں، اسے بھی اس ڈکیتی میں سے حصہ ملے گا۔" رابرٹ نے کہا۔

"یعنی اگر تمہیں شامل کرلیا جائے تو ڈکیتی کی رقم چار لوگوں میں تقسیم ہوگی۔"

رابرٹ بولا۔"میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی یقین نہیں کیا کہ یہ لوگ مجھے حصہ دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ جیسے ہی ان کے ہاتھ زیورات لگے، وہ بیلچے سے میرا سر پھاڑ کر فرار ہوجائیں گے۔"

ولی مسکرا دیا۔ وہ خود بھی کیوبن تھا اور یہ شخص اپنے ہم وطنوں کی خوبیاں بیان کررہا تھا لیکن ولی جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مال ملنے کے بعد یہ بدمعاش کتنے لالچی اور خوفناک ہوسکتے ہیں۔

"وہ اسٹور کہاں ہے جہاں ڈکیتی کرنے کا پروگرام ہے؟" ولی نے پوچھا۔

رابرٹ نے 815 اسٹریٹ کے مغرب میں اشارہ کیا۔ وہ جگہ کال اوچو کہلاتی تھی۔

"وہ تقریباً دس بلاک کے فاصلے پر ہے۔ میں تمہیں دکھا دوں گا۔"

انہوں نے کافی ختم کی اور رابرٹ، ولی کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ علاقہ لٹل ہوانا کا تجارتی مرکز تھا لیکن اس وقت ایک بار اور دو موٹیل کے علاوہ سب دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ ٹریفک بھی بہت کم تھا۔

وہ جیولری اسٹور ایک چھوٹی مارکیٹ میں تھا۔ رابرٹ نے اس جگہ سے سوفٹ دور گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ ولی نے کار کھڑی کرکے لائٹس بجھا دیں۔

"وہ اسٹور پہلی منزل پر ہے۔" رابرٹ نے بتایا۔

وہ دومنزلہ عمارت تھی اور اس میں تقریباً بیس دکانیں اور دفاتر تھے۔ اس علاقے میں تارکینِ وطن کی اکثریت تھی اور وہاں کی دکانوں میں بھی اس کی جھلک نظر آرہی تھی۔ وہاں ایک امیگریشن وکیل کا دفتر، سیل فون کی دکان، کیوبن بیکری، لنچ کاؤنٹر، کورین نیل سیلون اور ٹیٹو پارلر شاپ بھی تھی۔

پہلی منزل پر آخری کونے میں وہ جیولری اسٹور تھا۔ اس پر کنگ جیولرز، کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا اور شیشے کے دروازے پر یہ عبارت درج تھی۔"ہم سونا اور پرانے زیورات خریدتے ہیں۔"

اس دکان کا نام کنگ جیولرز تھا لیکن ولی کو اس میں کوئی شاہانہ انداز نظر نہیں آیا اور اس نے رابرٹ سے بھی یہ بات کہہ دی۔

"ہاں، لیکن اس کا کاروبار بہت اچھا چل رہا ہے۔ انقلاب سے پہلے اس کی فیملی کا ہوانا میں جیولری اسٹور تھا اور اب بھی بہت سے پرانے کیوبن اس کے پاس اپنے زیورات بیچنے کے لیے آتے ہیں۔"

ولی نے اس جگہ کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ اب اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ رابرٹ نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"اب اس کے برابر میں دیکھو۔"

وہ جگہ جیولری اسٹور سے چوڑائی میں دوگنا تھی اور اس کی حفاظت کے لیے کوئی جنگلا نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی شیشے کی کھڑکی پر سنہرے حروف میں گرجا کا نام لکھا تھا۔

"یہ تو کوئی پروٹسٹنٹ چرچ ہے۔" ولی نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" رابرٹ بولا۔"اور یہ اس منصوبے کا اہم حصہ ہے۔"

ولی کی بھویں تن گئیں۔"واقعی، وہ کیسے؟"

"جیولری اسٹور اتوار اور پیر کو بند ہوتا ہے جبکہ چرچ میں اتوار کو سارا دن عبادت ہوتی رہتی ہے لیکن پیر اور منگل کو یہ خالی ہوتا ہے۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ اتوار کی شب عبادت ختم ہونے کے بعد چرچ میں داخل ہوکر وہاں سے اسٹور کے گودام تک سرنگ کھودی جائے۔ اس کام میں اتوار کی رات اور پیر کا سارا دن لگ سکتا ہے اور منگل کی صبح جب جیولر دکان کھولے تو اس سے پہلے ہمیں اپنی کارروائی مکمل کرنی ہے۔"

ولی نے اس جگہ کا بغور معائنہ کیا اور دیکھا کہ چرچ کی کھڑکیوں پر پردے نہیں ہیں اور کوئی بھی کھڑکیوں سے اندر دیکھ سکتا ہے۔

"جب ایک بار وہ بدمعاش اندر داخل ہوگئے تو وہ کس طرح اپنے آپ کو مال میں آنے والے لوگوں کی

نظروں سے محفوظ رکھ سکیں گے؟''

رابرٹ نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک منٹ کے لیے گاڑی سامنے لے کر آؤ، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

ولی نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور گاڑی بالکل چرچ کے سامنے کھڑی کر دی۔ وہ تقریباً تیس مربع فٹ کا ایک کمرا تھا جس میں فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے کی طرف ایک نسبتاً اونچا اسٹیج تھا جس پر ڈائس رکھا ہوا تھا۔ ایک جانب ڈرم اور موسیقی کے کئی اسٹینڈ موجود تھے۔ عقبی دیوار میں لکڑی سے بنی ہوئی ایک گز لمبی صلیب لٹک رہی تھی۔

''صلیب کے بائیں جانب دیکھو۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''کیا تمہیں وہاں کوئی دروازہ نظر آ رہا ہے؟''

ولی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رابرٹ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دروازہ عمارت کے عقب میں واقع ایک تنگ اسٹور میں کھلتا ہے۔ اس کے پیچھے بھی گلی میں جانے کے لیے عقبی دروازہ ہے۔ منصوبے کے مطابق اس دروازے سے یہ لوگ اندر داخل ہوں گے اور اس محدود جگہ میں اپنا کام کریں گے۔ اس لیے انہیں سامنے یا پیچھے کہیں سے بھی نہیں دیکھا جا سکے گا۔ گلی کے دوسری جانب ایک خالی جگہ ہے اس لیے وہاں بھی انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔''

ولی نے کار آگے بڑھائی اور وہ لوگ واپس کافی بار میں آ گئے۔ ولی نے پوچھا۔ ''انہیں اسٹور کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''کیونکہ وہ پہلے ایک دفعہ اندر داخل ہو چکے ہیں۔ روبیل اور سولس نے عبادت میں شرکت کی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں ولی کے چہرے پر جما دیں۔ ''کیا تم میری مدد کر سکتے ہو مسٹر کوستا؟ ہمارے پاس صرف چند گھنٹے ہیں۔''

ولی نے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یہ کام اس طرح انجام دینا ہو گا کہ انہیں تم پر شبہ نہ ہو کہ تم نے ہی یہ خفیہ منصوبہ ظاہر کیا ہے ورنہ وہ تمہاری رپورٹ کرنے میں بالکل دیر نہیں لگائیں گے۔''

رابرٹ نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے اس بارے میں سوچنا ہو گا۔'' ولی نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ روبیل یا وہ دوسرا آدمی کہاں رہتا ہے؟''

رابرٹ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، وہی ہمیشہ میرے گھر پر آئے یا ہماری ملاقات کسی پبلک جگہ پر ہوئی تھی لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ روبیل کل سروس کے دوران چرچ آئے گا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہفتہ وار شیڈول میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ اتوار کی شب اور پیر کے روز وہاں کوئی نہیں ہو گا۔ ان میں سے کوئی ایک کل رات مجھے لینے کے لیے آئے گا۔''

''وہ دونوں دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں؟''

رابرٹ نے دونوں کا حلیہ تفصیل سے بتا دیا جسے ولی نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔

''کیا وہ کام کے دوران اسلحہ لے کر چلتے ہیں؟ کیا انہوں نے تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا؟''

رابرٹ نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''روبیل نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کبھی اسلحہ لے کر نہیں جاتے۔''

ولی نے اس کی بات پر غور کیا۔ وہ تقریباً سچ ہی کہہ رہا تھا۔ پولیس کی ملازمت کے دوران اس کا واسطہ کئی ایسے لوگوں سے پڑا تھا۔ پیشہ ور چور کبھی بھی آتشی ہتھیاروں کو استعمال نہیں کرتے تھے کیونکہ اگر وہ پکڑے گئے تو انہیں جیل میں زیادہ عرصہ گزارنا ہو گا اور وہ دس یا بیس سال کے لیے قید ہو جائیں گے۔ اس نے رابرٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم گھر جاؤ لیکن کل صبح دس بجے چرچ سروس شروع ہونے سے پہلے مجھے اسی جگہ پر ملنا۔ ہمیں اپنے طور پر کچھ نگرانی کرنی ہے۔ امید ہے کہ میں یہ اندازہ لگا سکوں گا کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔''

رابرٹ نے اس سے معاوضے کے بارے میں پوچھا تو اس نے اسے ایک دن کا کم سے کم معاوضہ بتا دیا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ''تم میری جان بچا رہے ہو مسٹر کوستا۔'' پھر وہ کار سے اترا، اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

ولی اپنے گھر گیا۔ اس نے اپنے لیے ایک گلاس بیئر تیار کیا اور اس مسئلے کے بارے میں غور کرنے لگا کہ رابرٹ کو ان مجرموں کے رحم و کرم پر چھوڑے بغیر کس طرح اس ڈکیتی کو ناکام بنایا جائے۔ سوچتے سوچتے اسے نیند آنے لگی لیکن وہ اس سوال کا جواب تلاش نہ کر سکا۔

دوسری صبح اس نے شیو اور غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کیا اور کچھ دیر بعد اس نے کار چرچ کے سامنے کھڑی کر دی۔ رابرٹ بھی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں

نے گاڑی کے شیشوں میں سے عبادت گزاروں کو صبح کی سروس کے لیے آتے ہوئے دیکھا۔ ان میں کنوارے، شادی شدہ فیملیز بھی شامل تھے۔ ان سب نے اتوار کی مناسبت سے بہترین لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان میں اکثریت ہسپانوی لوگوں کی تھی۔

دس بجے سے کچھ پہلے ایک کار پارکنگ لاٹ میں آکر رکی۔ اس میں سے درمیانی عمر کا ایک آدمی برآمد ہوا۔ رابرٹ نے ولی کو کہنی ماری۔ ''یہی ہے روبیل۔''

اس کا قد درمیانہ، کندھے ڈھلکے ہوئے، سر سے گنجا لیکن داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور رم گلاس لگا رکھے تھے۔ رابرٹ کی طرح وہ بھی دبلا پتلا تھا اور آسانی سے تنگ جگہوں پر کام کر سکتا تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی قمیص اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ شاید چور ہونے کی وجہ سے اس نے گہرے رنگ کے کپڑوں کو ترجیح دی ہو۔ وہ چرچ میں داخل ہوا اور آخری قطار میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں اندر جارہا ہوں۔'' ولی نے کہا۔ ''تم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ میری واپسی سے پہلے باہر آجائے تو تم اس کا تعاقب کرنا اور معلوم کرنا کہ وہ کہاں رہتا ہے پھر مجھے لینے کے لیے واپس آجانا۔''

رابرٹ نے پُراعتماد انداز میں سر ہلایا۔ وہ ایک بار پھر طویل عرصے بعد کسی خفیہ کارروائی میں شامل ہو رہا تھا۔ ولی نے سڑک پار کی۔ چرچ کے دروازے سے گزرا اور پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ روبیل کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا جو پیچھے کی قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔

پادری نے ڈائس کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ بھاری جسم اور سفید بالوں والا لاطینی امریکن تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے پیچھے بینڈ کے تین آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ڈرم، گٹار اور آرگن بجانے والے تھے۔ انہوں نے ہسپانوی زبان میں اپنے سازوں کے ذریعے ایک دعائیہ نظم سنائی۔

پادری نے بھی اپنی بائبل ڈائس پر رکھی اور ان کے ساتھ مل کر گانے اور تالیاں بجانے لگا۔ چند لمحوں بعد پادری اسٹیج کے پیچھے گیا۔ دروازہ کھولا اور اسٹور سے ایک طنبورہ لے کر آیا اور بینڈ بجانے والوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

ولی کن انکھیوں سے روبیل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چور گانا گانے اور تالیاں بجانے میں شریک نہیں تھا بلکہ اس کی نظریں دروازے پر تھیں۔ وہ اس وقت تک دروازے کو دیکھتا رہا جب تک کہ ایک سازندے نے اسے دوبارہ بند نہیں کر دیا۔

عبادت گزار کورس کی شکل میں گانا گا رہے تھے اور اظہارِ مسرت کے طور پر انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے تھے۔ روبیل کے برابر میں کھڑی ہوئی عورت وارفتگی میں اس پر جھک گئی۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ روبیل نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنے بازوؤں کو کندھے تک لے گیا لیکن اس کی یہ حرکت مصنوعی تھی۔ وہ وہاں محض اس جگہ کا جائزہ لینے آیا تھا۔

جب گانا ختم ہوا تو پادری وعظ دینے کے لیے ڈائس پر گیا اور بائبل کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے اوپر لے گیا پھر اس نے اپنا وعظ شروع کیا اور حوالے کے لیے ایک کے بعد ایک بائبل کے مختلف حصے پڑھنا شروع کر دیے۔ تمام سامعین محویت کے عالم میں اس کا وعظ سن رہے تھے اور تائید میں سر ہلا رہے تھے لیکن روبیل نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ اپنے اردگرد کی جگہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اسے کسی ایسے الارم کی تلاش تھی جس پر اس کی نظر نہ گئی ہو۔

ایک اور گانا ختم ہونے کے بعد پادری نے اس ہفتے کی عبادات کے شیڈول کا اعلان کیا۔ اتوار کی سروس رات آٹھ بجے ختم ہوئی تھی اور اس کے بعد اگلی عبادت کے لیے بدھ کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پادری نے کچھ اور نصیحت آموز باتیں کیں لیکن روبیل کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے جو جاننا تھا وہ اس نے سن لیا۔ وہ خاموشی سے قطار سے نکلا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ ولی نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ اپنی کار میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رابرٹ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کچھ فاصلہ رکھ کر روبیل کا تعاقب شروع کر دیا۔

ولی وہیں رک کر رابرٹ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں گانے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن وہ گہری سوچ میں غرق تھا اور اس کا دماغ رابرٹ کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ وہ چرچ کی عقبی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے پیچھے اسٹور میں دیکھنا چاہ رہا ہو جہاں یہ کارروائی ہونے والی تھی۔

یہ ایک خطرناک حل تھا اس لیے اس نے اس پر دوبارہ سوچنا شروع کیا، اگر روبیل اور اس کا ساتھی مسلح ہوئے تو یہ منصوبہ فوراً ہی ناکام ہو جائے گا۔ یہ منصوبہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا تھا جب وہ ہتھیاروں کے بغیر

آتے۔ جیسا کہ رابرٹ نے بتایا تھا کہ وہ پیشہ ور چور ہیں اور کسی مہم میں ہتھیار ساتھ لے کر نہیں جاتے۔ بہر حال اس میں بھی خطرہ تھا لیکن ولی کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ مسلح ہوئے تب بھی وہ ان کا مقابلہ کرے گا۔ وہ رابرٹ کو زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ اسے پسند کرنے لگا تھا اور اس سے ہمدردی بھی تھی۔ وہ روبنل کی بلیک میلنگ کو قابلِ مذمت سمجھتا تھا۔ اس لیے ولی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیسے ہی وہ چور اپنی کارروائی شروع کریں گے وہ اسے ناکام بنا دے گا۔

تھوڑی دیر بعد رابرٹ نے اپنی کار سڑک کے پار روکی۔ ولی چپکے سے چرچ سے باہر آیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"کیا تم اس کا پیچھا کرنے میں کامیاب رہے؟"

رابرٹ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، وہ ایسٹ لٹل ہوانا کے ایک رومنگ ہاؤس میں رہتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو وہاں دیکھا۔"

ولی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔ اس دوران میں نے تمہارے مسئلے کا ایک حل تلاش کر لیا ہے۔"

رابرٹ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "وہ کیا ہے؟"

"اس وقت تم ان سے خوف زدہ ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" ولی نے پوچھا۔ "تمہیں ڈر ہے کہ وہ تمہاری زندگی برباد کر دیں گے۔"

رابرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "لیکن آج کی رات گزرنے کے بعد وہ تم سے خوف زدہ ہو جائیں گے میرے دوست اور پھر وہ تمہیں کبھی پریشان نہیں کریں گے۔"

رابرٹ نے بے اعتباری سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو گا؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" ولی نے کہا۔ "تم گاڑی چلاتے رہو۔"

☆☆☆

اس رات ولی آٹھ بجے سے کچھ پہلے چرچ کے باہر سڑک کے تاریک حصے میں موجود تھا۔ اس نے پولیس کے زمانے کی پرانی نیلے رنگ کی یونیفارم پینٹ اور اسی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ برابر والی سیٹ پر اس کا پرانا بغیر بیج کا یونیفارم ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ منصوبہ ناکام ہونے کی صورت میں اس پر کسی آفیسر کا روپ دھارنے کا الزام لگے۔

اس روز کی آخری سروس تھوڑی دیر پہلے ہی ختم ہوئی تھی اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ پادری کو آخری عبادت گزار سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اب ولی کو وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔

صبح چرچ سے جانے کے بعد رابرٹ واپس گاڑی چلاتے ہوئے ولی کے گھر گیا۔ جہاں ولی نے اس کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کی۔ توقع کے مطابق پہلے تو رابرٹ حواس باختہ ہو گیا اور ولی کو اعتراف کرنا پڑا کہ یہ منصوبہ دیکھنے میں خطرناک لگتا ہے لیکن جب ولی نے اس کی خوبیوں کی وضاحت کی خاص طور پر یہ کہ وہ اور رابرٹ کو معلوم ہوگا کہ کیا ہونے والا ہے جبکہ دونوں چور اس سے لاعلم ہوں گے تو رابرٹ مطمئن نظر آنے لگا۔

"تمہارے پاس اور بھی راستے ہیں۔" ولی نے کہا۔ "تم ان سے بچ کر نکل جاؤ۔ اس کے بعد تمہاری فیملی دربدر ہو جائے گی اور تم ساری زندگی بھاگتے رہو گے یا تم وہی کرو جو وہ چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر ڈاکا ڈالو۔ اس میں بھی خطرہ ہے کہ وہ تمہیں حکام کے حوالے کر سکتے ہیں یا پھر وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں، تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے چند گھنٹے ہیں۔"

رابرٹ جو اپنی جوانی میں کئی خطرناک خفیہ کارروائیوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس نے بالآخر یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے آپ کو اس صورتِ حال سے نکالنے کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی ہوگا۔

☆☆☆

اب ولی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پادری کو لائٹس بجھاتے اور بیرونی دروازے کو مقفل کرتے دیکھا۔ اب اس علاقے میں مکمل خاموشی تھی۔ ولی نے اپنا ہیٹ، جیکٹ کے اندر چھپایا اور ٹارچ جیب میں رکھ لی۔ بغلی ہولسٹر میں اس کا ریوالور موجود تھا لیکن اسے امید تھی کہ اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئے گی۔ وہ گاڑی سے باہر آیا اور بلاک کا چکر لگا کر عقبی گلی کے ذریعے چرچ تک پہنچا۔ اس نے سہ پہر میں بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا تب بھی اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس نے چرچ کے بالکل عقب میں وہ خالی جگہ دیکھی جس میں گھنی جھاڑیاں اسے گلی سے الگ کر رہی تھیں۔ وہاں مکمل اندھیرا اور خاموشی تھی۔ ولی نے اپنے آپ کو ایک جھاڑی میں چھپا لیا جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب اسے کچھ دیر اور انتظار کرنا تھا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد اس نے بغلی سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ وہ کار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی پھر لائٹس بجھ گئیں اور انجن بند ہو گیا۔ ایک منٹ بعد تین سائے گلی کے سرے پر نمودار ہوئے۔ ان میں سب سے چھوٹے قد کا رابرٹ، اس سے تھوڑا سا لمبا روبنل اور تیسرا سولس ہو گا۔ ولی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا لیکن وہ ان دونوں کے مقابلے میں بھاری تھا۔ روبنل اور سولس کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تھیلے تھے جن میں غالباً کدالیں اور بیلچے ہوں گے۔

وہ تینوں بہت تیزی سے چلتے ہوئے چرچ کے عقبی دروازے پر پہنچے۔ روبنل نے تالا کھولنا شروع کیا جبکہ باقی دونوں اسے کام کرتا دیکھتے رہے۔ ولی ان سے بیس فٹ کے فاصلے پر چھپا ہوا تھا۔ روبنل کے لیے تالا کھولنا کوئی مشکل نہ تھا۔ اس نے ایک منٹ میں یہ کام کر لیا۔ وہ تینوں اس دروازے سے گزر کر اسٹور میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ ولی کو اب دروازے کے نیچے سے روشنی کی ایک باریک لکیر نظر آ رہی تھی۔ چند منٹوں بعد اس نے کدال چلنے کی آواز سنی۔

اس نے رابرٹ کو بتا دیا تھا کہ وہ اس مرحلے پر اپنا پلان شروع کرے گا۔ اس کے بعد سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا۔ ولی نے ہیٹ سر پر رکھا۔ ٹارچ نکال کر جلائی اور گلی پار کر کے اسٹور میں داخل ہو گیا۔ وہ تینوں جیولری اسٹور سے متصل سرے پر کھڑے ہوئے تھے۔ ولی نے ان کے چہروں پر ٹارچ کی روشنی الی۔

''میں سیکیورٹی گارڈ ہوں۔ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

روبنل اور سولس حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی لیکن رابرٹ نے منصوبے کے مطابق ردِ عمل ظاہر کیا۔ اس نے جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر سائیلنسر لگا ہوا پستول نکالا اور ولی کے سینے کا نشانہ لے کر لگا تار تین فائر کر دیے، ولی غرایا اور ڈگمگانے لگا۔ اس کی ٹارچ زمین پر گر گئی۔ وہ خود منہ کے بل گر پڑا پھر اس نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ روبنل اور سولس اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے تھے اور ان کے چہروں سے خوف جھلک رہا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا پاگل؟ میں نے تمہیں اسلحہ لانے کے لیے منع کیا تھا۔''

رابرٹ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں جیل میں رہ چکا ہوں۔ وہاں دوبارہ نہیں جانا چاہتا۔''

لیکن سولس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی وہ ولی کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے بجائے وہ عقبی دروازے کی طرف بھاگا۔ روبنل بھی اس کے پیچھے تھا۔ رابرٹ کھلے ہوئے دروازے کی طرف گیا اور گلی میں دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد ولی نے کار کے اسٹارٹ ہونے اور ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سنی۔

''وہ چلے گئے۔'' رابرٹ نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

ولی کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیص پر کوئی خون کا دھبا یا گولی کا سوراخ نہیں تھا۔ اس نے گن کی طرف ہاتھ بڑھایا جس میں خالی کارتوس تھے۔ رابرٹ نے وہ گن اسے دے دی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے اوزار تھیلوں میں رکھے۔ لائٹ بجھائی اور دروازہ بند کر دیا اب وہاں صرف کنکریٹ کے فرش پر کھدائی کا ایک ہلکا سا نشان رہ گیا تھا جس پر ولی نے ایک لکڑی کا ٹکڑا رکھ دیا۔

دس منٹ بعد وہ دونوں ولی کے گھر پر تھے۔ ولی نے گلاسوں میں بیئر انڈیلی۔ رابرٹ کا ہاتھ ابھی تک کپکپا رہا تھا۔ ''اب تم سمجھ گئے کہ وہ دونوں تمہیں بھی دوبارہ پریشان نہیں کریں گے۔'' ولی نے کہا۔ ''انہوں نے تمہارے ساتھ مل کر ڈکیتی کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ایک قتل ہو گیا۔ وہ یہی سوچ رہے ہوں گے اور انہیں سزائے موت کا ڈر ہو گا۔ نہ صرف یہ کہ وہ تم سے دوبارہ رابطہ نہیں کریں گے بلکہ مجھے بڑی حیرت ہو گی اگر وہ فوری طور پر میامی سے نہیں گئے۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ نیویارک، لاس اینجلس یا کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں کیوبن بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ اب وہ تم سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے ہیں اور ہم نے یہ سب خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کیا ہے۔''

رابرٹ نے سر ہلا دیا لیکن وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا۔ ''ہمیں ایک بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ ایلس کو یہ نہیں بتانا، آج رات کیا واقعہ پیش آیا۔'' ولی نے کہا۔ ''اگر اسے معلوم ہو گیا تو وہ مجھے مار ڈالے گی۔''

اگلے روز رابرٹ نے ولی کو اس کا معاوضہ مع بونس ادا کر دیا۔ ولی نے چیک اپنے والٹ میں رکھا اور اپنے اطمینان کے لیے اس پتے پر گیا جہاں روبنل اور سولس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس نے مکان کی مالکہ سے پوچھا تو وہ بولی۔ ''وہ دونوں نصف شب کے قریب کچھ بتائے بغیر چلے گئے۔ ان پر ایک ہفتے کا کرایہ باقی تھا اور وہ جاتے ہوئے کلاک ریڈیو بھی لے گئے، چور کہیں کے۔''

❖❖❖

مرحوم قاتل

سرور اکرام

سراغ رساں اور وکیلوں کو ہر دفعہ ایک نئے کیس کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے... کچھ کیس تو ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ غور فکر کے باوجود ان کی پیچیدگی دور نہیں ہوتی... ایک ایسے ہی قاتل و مقتول کا معاملہ...

مرنے کے بعد خود کو کارآمد ثابت کرنے والے شخص کی پُراسراریت

بوڑھے اکرم کو بہت دیر سے کھانسی آ رہی تھی۔ اس کا حلق پیاس سے سوکھ رہا تھا۔ اس نے ملازم کو آواز دی لیکن کوئی نہیں آیا۔ اسے پھر زور کا ٹھسکا لگا۔ اس نے اپنا سینہ تھام لیا۔ ایسا لگا جیسے اس کا دم اُلٹ جائے گا۔ اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔

کمرے میں میز پر پانی موجود تھا لیکن اس کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور اس کا بھتیجا نظیر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ "کیا مصیبت ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "اس وقت بھی چین نہیں ہے۔"

بوڑھے اکرم نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ اس نے میز کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ "اچھا، سمجھ گیا۔ پانی پیو گے؟" نظیر کا لہجہ بہت توہین آمیز تھا۔

اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر اکرم کی طرف بڑھا دیا۔ "لو پی لو۔ کیا یاد کرو گے کوئی ملا تھا۔"

اکرم نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس لے کر منہ سے لگا لیا۔ تھوڑا سا پانی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گر گیا تھا۔ نظیر وہیں کھڑا اس کی بے بسی پر ہنستا رہا۔ پھر اس نے بستر کے پاس آ کر کہا۔ "بڑے میاں کب تک زندگی سے لٹکے رہو گے؟ مجھے بھی لٹکا رکھا ہے۔ اب تو بہت دیر ہو گئی۔ اب تو دوسری دنیا کو سدھار جاؤ۔"

اکرم نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن جلبلا کر رہ گیا۔ وہ صرف اپنے ہاتھ چلا کر رہ گیا۔

نظیر بے رحمی سے ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اکرم نے رونا شروع کر دیا لیکن اس کے آنسو خاموش تھے۔ کوئی آواز نہیں تھی۔

بھائی کی موت کے بعد اکرم نے نظیر کی پرورش کی تھی۔ اس کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ بھابی کی موت تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ نظیر بے سہارا رہ گیا تھا۔ اس وقت اکرم کام آیا تھا، اس نے نظیر کو اپنے پاس رکھ لیا۔ نظیر اور کہاں جا سکتا تھا۔

اکرم کی ایک بیٹی تھی جبین۔ وہ صرف جبین نہیں بلکہ ماہ جبین تھی۔ خدا نے اسے حسن دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اکرم کی بیوی یعنی جبین کی ماں بھی ایک حادثے میں انتقال کر چکی تھی۔

جبین کے لیے اب اکرم ہی سب کچھ تھا۔ اس کی ماں بھی اور باپ بھی۔ اکرم نے دونوں کو ایک ہی جیسے بڑے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا لیکن نظیر کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ نہ جانے کہاں سے بچپن ہی سے اسے جوئے کی لت لگ گئی تھی۔

اکرم ایک صنعت کار تھا۔ اس کی فیکٹری تھی جو بنیان بنایا کرتی تھی۔ ان کے بنیان پورے ملک میں مشہور تھے۔ اس کے علاوہ بہت بڑی ایکسپورٹ بھی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ کاش اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ فیکٹری اس کے حوالے کر دیتا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ صرف نظیر تھا اس کا بھتیجا۔ لیکن اس سے کوئی امید نہیں تھی۔ وہ ایک بے پروا اور آوارہ گرد نوجوان ثابت ہو رہا تھا۔

اس نے تعلیم بھی حاصل کر کے نہیں دی۔ اس کے مزاج میں آوارگی تھی۔ اس نے کئی ایک بار جبین کو بھی اپنے دام میں الجھانا چاہا تھا لیکن جبین مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ اس نے سختی

سے نظیر کو جھڑک دیا تھا۔
تنگ آ کر اکرم نے نظیر کو اپنی فیکٹری میں رکھ لیا تھا۔ اس نے نظیر کو بُلا کر کہا۔ ''دیکھو بیٹا، میں تم سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ تم میرے بھائی کی اولاد ہو۔ میں نے شہیر کو بھی باپ بن کر پالا تھا۔ کیونکہ میں سب سے بڑا بھی تھا اور مجھے اپنی ذمّے داریوں کا احساس بھی رہا ہے۔ اب تم میرے ساتھ ہو۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن بھائی کی نگاہوں میں شرمندہ نہ رہوں۔
''نہیں تایا۔ میں آپ کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔'' نظیر نے گردن جھکالی تھی۔
''بیٹا، میں نے بہت کوشش کی لیکن تعلیم تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔'' اکرم نے کہا۔ ''تمہارا مزاج ہی نہیں ہے پڑھائی کی طرف۔''
''ہاں تایا یہ آپ نے بالکل سچ کہا۔'' نظیر پُر جوش ہو کر بولا۔ ''میرا مزاج ہے بزنس کا۔''
''لیکن بزنس کے لیے تجربہ ضروری ہے۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کوئی دکان کھول کر بیٹھ گئے اور خدا کے سہارے دکان چلتی رہی۔ آج کل مارکیٹ میں بہت کمپیٹیشن ہو گیا ہے۔ سیکڑوں قسم کی پراڈکٹس آ رہی ہیں۔''
''جی ہاں تایا۔ یہ سب میری نگاہوں میں بھی ہے۔''
''اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فیکٹری میں کچھ دنوں کے لیے تجربہ حاصل کرو۔ دیکھو کہ کام کیسے ہوتا ہے۔ مینجمنٹ کیسے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ میں خود تمہیں کوئی فیکٹری کھلوا دوں۔''
''تھینک یو تایا۔'' نظیر خوش ہو گیا تھا۔ ''آپ کو پتا چل جائے گا کہ آپ کا بھتیجا کیا کیا کر سکتا ہے۔''
اکرم دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

''نہیں بھئی، تمہاری یہ دلیل کافی نہیں ہے۔'' جبین نے اپنے دوست سلمان سے کہا۔ اس وقت وہ دونوں لا کالج کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گلابی جاڑے شروع ہو چکے تھے۔ دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ایسی دھوپ خواب آلود ہوا کرتی ہے۔ ایک طرح کی کسل مندی پورے بدن میں گھل جاتی ہے۔
دونوں لا کے طالب علم تھے۔ ان کی دوستی اسی کالج میں ہوئی تھی جو آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو بہت قریب لے آئی تھی۔
سلمان اس سے کہا کرتا۔ ''یار میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ تم کیوں لا پڑھ رہی ہو۔ تمہارے ڈیڈ تو فیکٹری چلا رہے ہیں؟"

"اور تم کیوں پڑھ رہے ہو؟ تمہارے ڈیڈ تو سرکاری آفیسر ہیں۔ تم بھی سی ایس ایس کر کے کمشنر وغیرہ بن سکتے ہو؟"

"جبین مسئلہ یہ ہے کہ میں اس پیشے سے یہ الزام ہٹانا چاہتا ہوں کہ یہ وکیل حضرت تو صرف پیسے بناتے ہیں۔ مؤکل چاہے جہاں بھی جائے۔"

"جانتے ہو، مجھے کیا دکھ ہے۔" جبین نے کہا۔ "دو تین بار مجھے کورٹ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔ ہر شخص پریشان حال ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہتھکڑیاں لگا کر کورٹ لایا جاتا ہے۔ مظلومیت کا نشان بنا ہوتا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ بے چارے کئی مہینوں سے پیشیاں ہی بھگت رہے ہیں۔ ابھی تک ان کا کیس عدالت ہی میں نہیں شروع ہوا ہے۔"

"اسی بات کا تو رونا ہے۔" سلمان نے کہا۔ "وکیل حضرات کی فیس کھری ہوتی رہے۔ انہیں کس بات کا غم ہے۔ کیا تم بھی اسی مزاج کی وکیل بننا چاہتی ہو؟"

"توبہ کرو۔ میرا بس چلے تو یہ قانون ہی بنوا دوں کہ کسی وکیل کو فیس نہ دی جائے۔ حکومت دے گی۔"

"کیا خیال ہے کہ کلاس میں چلیں۔" سلمان نے کہا۔

"آج ہمارا مقدمہ بھی رہ گیا ہے۔"

"چلو کل سہی۔ ویسے بھی ہمارے یہاں تاریخ پر تاریخ تو پڑتی رہتی ہے۔"

ان دونوں کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ کسی پرانے مقدمے کی فائل یا کوئی کتاب لائبریری سے نکالتے۔ صرف اس مقدمے کی نوعیت پڑھتے۔ اس کے بعد اپنے اپنے دلائل دیا کرتے۔ یہ ان کی پریکٹس تھی۔ اس دن بھی ایک الجھا ہوا کیس ان کے سامنے تھا۔ دونوں اپنے اپنے دلائل دے رہے تھے۔

کالج سے فارغ ہو کر سلمان نے پوچھا۔ "جی وکیل صاحبہ، کیا پروگرام ہے؟"

"گھر چلنا ہے۔" جبین نے بتایا۔ "آج ڈیڈ کے کچھ دوست لنچ پر آ رہے ہیں۔ ان سے بھی ملنا ہے۔"

"کہیں معاملہ کچھ اور تو نہیں ہے؟" سلمان نے معنی خیز انداز سے پوچھا۔

"وہ کیا؟"

"ارے بھئی یہی جو ہمارے یہاں ہوا کرتا ہے کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ کب تک گھر بٹھائے رہو گے۔ اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی اس قسم کے لوگ عام طور پر ڈنر پر آیا کرتے ہیں۔ لنچ پر نہیں آتے۔"

"ہاں یہ تم نے لوجیکل بات کی ہے۔" سلمان نے کہا۔

"سی یو۔"

دونوں اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

وہ ایک ورکر تھی۔ ثریا نام تھا اس کا۔ وہ اکرم کی فیکٹری میں کوالٹی چیک کرنے پر ملازمت کر رہی تھی۔

بہت اچھی گزر رہی تھی۔ عام طور پر فیکٹریوں کا ماحول کسی لڑکی کے لیے کوئی زیادہ خوش گوار نہیں ہوتا۔ لیکن اکرم کی فیکٹری کی بات اور تھی۔ یہاں پورا تحفظ حاصل تھا۔ اکرم بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ سب کا خیال رکھا کرتا۔ سب کچھ ٹھیک ہی تھا لیکن پچھلے ایک ہفتے سے وہ بہت بے چین تھی۔ فیکٹری میں ایک نیا منیجر آیا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ اکرم صاحب کا بھتیجا ہے۔ اس کا نام نظیر تھا۔ ثریا کو اس کی نگاہیں بہت عجیب سی لگتیں۔ ان نگاہوں میں ہوس تھی۔ درندگی تھی۔ جیسے پھاڑ کر کھا جائے گا۔ فیکٹری میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب ایک دوسرے کا احترام کیا کرتے تھے۔ لیکن نظیر ایک ایسا آدمی معلوم ہوتا تھا جو موقع ملنے پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

کبھی کبھی تو ثریا اس کی نگاہوں سے خوف زدہ ہو جایا کرتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ موقع پا کر اس کے پاس بھی آ جایا کرتا۔ ثریا اسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ثریا سے بہ ظاہر اس کے کام کے حوالے سے بات کیا کرتا لیکن نگاہیں کچھ اور کہہ رہی ہوتیں۔

ثریا نے ایک اور ورکر لڑکی ناظمہ سے بات کی۔ ناظمہ بھی نظیر کے خلاف بھری بیٹھی تھی۔

"ہاں یار تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ وہ ایک نمبر کا کمینہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار تو اس نے میرے ساتھ بدتمیزی بھی کی تھی۔"

"کیسی بدتمیزی؟"

"اس نے باتوں باتوں میں میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔" ناظمہ نے بتایا۔

"کمال ہے تم خاموش رہیں۔ اکرم صاحب سے شکایت کیوں نہیں کی؟"

"یار یہ مجبوریاں جو ہوتی ہیں نا، یہ ہمیں توڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ کیا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اسے تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کر دیتے۔ اس کے بعد وہ میرے پیچھے پڑ جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ

مجھے جاب چھوڑنی پڑ جاتی اور اس دور میں جاب ملنا کتنا دشوار ہے۔ تم بھی جانتی ہو۔ اس کے علاوہ فیکٹری کے مالک تو بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اب ایک کمینہ ہمارے سروں پر مسلط ہو گیا ہے تو برداشت کرنا پڑے گا۔“

”لیکن کس حد تک؟“

”جب وہ حد سے گزر جانے لگے تو پھر تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔ عزت کی خاطر چھوڑ دینا یہ جاب۔ خدا اور دے دے گا۔“

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن نظیر نے ایک اور حرکت کی۔ اس نے ثریا کو آواز دے کر اپنی طرف بلا لیا۔ ثریا ڈرتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ ”یس سر۔“ اس نے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔ تم مجھے ٹھیک سے جواب کیوں نہیں دیتیں؟“ نظیر نے پوچھا۔

”نو سر۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کام کے بارے میں جو معلوم کرتے ہیں، میں بتا دیتی ہوں۔“ ثریا نے کہا۔

”ارے کام کو گولی مارو۔ ہر وقت کام ہی نہیں ہوتا۔“

”لیکن میں تو یہاں کام ہی کے لیے آتی ہوں سر۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔ تم مجھے ایک اچھی لڑکی لگتی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے لیے کچھ کروں۔ تمہارے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟“

”چار ہیں سر۔ دو چھوٹی بہنیں۔ ماں اور باپ۔“

”گزارا ہو جاتا ہے؟“

”ہو ہی جاتا ہے سر۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم ایسا کرو۔ ہر مہینے مجھ سے دس ہزار لے لیا کرو۔“ نظیر نے آفر کر دی۔

”دس ہزار؟ یہ تو بہت ہیں سر۔ لیکن کیوں؟“

”بس میرا دل چاہا کہ تمہاری مدد کی جائے لیکن انکل کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ثریا نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس نے اکرم صاحب سے شکایت کر دی۔ اکرم صاحب یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے تھے۔ ”کمینہ انسان ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہاں آ کر سدھر جائے گا۔ میں نے اسے اپنے بچے کی طرح پالا ہے۔ بھائی کی موت کے بعد اس کی پرورش کی ہے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا نکلے گا۔ تم خاموش رہو۔ میں اس کی چھٹی کر دیتا ہوں لیکن کسی اور انداز سے۔ ورنہ وہ سمجھ جائے گا کہ تم نے مجھ سے کچھ کہا ہوگا۔ اور وہ تمہارا دشمن بن جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچا دے۔“

فکر کی بات

کسی گاؤں میں ایک بھیڑیا گھس آیا۔

سارے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک بہت موٹی عورت اپنے شوہر سے بولی۔ ”آؤ ہم بھی کہیں بھاگ جائیں، کہیں بھیڑیا اٹھا کر نہ لے جائے۔“

شوہر بولا۔ ”تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، وہ بھیڑیا ہے کرین نہیں۔“

شادی شدہ

کسی نے شادی شدہ آدمی سے پوچھا۔ ”آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟“

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ بولا۔ ”جو میرا دل کرتا تھا۔“

سانس

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! مجھے سانس لینے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر۔ ”تے نہ لے فیر......“

اختیار

اپنے لیے وقت نکالو، لوگوں کی زندگیوں میں دخل اندازی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پاک پروردگار نے عزت اور ذلت دینے کا اختیار اپنے پاس ہی رکھا ہے۔

حقیقت

کچھ لوگ چھوڑ کر جا چکے ہیں، کچھ جانے والے ہیں، کچھ کل کو۔ چلے جائیں گے......شاید یہی زندگی کی حقیقت ہے......

”مقبولیت“

”جہاں کہیں بھی میرے انکل کے پہنچنے کی امید ہوتی ہے وہاں بہت بے تابی سے ان کا انتظار کیا جاتا ہے اور جب وہ پہنچتے ہیں تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ بہت ہر دلعزیز ہیں؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ بہر حال وہ فائر بریگیڈ میں ملازم ہیں۔“

وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

''سر پلیز، میری مدد کیجیے گا۔''
''یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرتی رہو۔''
ثریا واپس آگئی۔ اس نے اپنا کام سنبھال لیا تھا لیکن ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔
دو دن بعد ہی اکرم صاحب نے کسی اور مسئلے پر نظیر کی چھٹی کر دی تھی۔ وقتی طور پر یہ معاملہ ختم ہو گیا تھا۔
☆☆☆
سلطان کا دل چاہتا تھا کہ وہ نظیر کو گولی مار دے۔ دس لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی۔ نظیر نے اس سے دس لاکھ ادھار لے رکھے تھے۔ سلطان جانتا تھا کہ نظیر کا تایا کتنا دولت مند ہے۔ اور اس کی ساری دولت نظیر ہی کو ملنے والی ہے۔ اسی لیے اس نے کبھی تقاضا بھی نہیں کیا تھا لیکن اب بہت دن ہو چکے تھے۔
اس نے نظیر کو پکڑنے کے لیے فیکٹری کا رخ کر لیا۔ فیکٹری میں داخل ہو کر اسے پتا چلا کہ باس نے فیکٹری سے نظیر کی چھٹی کر دی ہے۔ سلطان کو اپنی رقم ڈوبتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔
فیکٹری سے فارغ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کے تایا اس سے ناراض ہیں۔ ایسی صورت میں دس لاکھ رقم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا نظیر کے گھر پہنچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نظیر اپنے تایا ہی کے ساتھ رہتا ہے۔
گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے اس کا پیغام نظیر کو پہنچا دیا۔ کچھ دیر بعد نظیر اندر سے آگیا تھا۔ سلطان کی آمد نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ ''بھائی تم یہاں کیوں آگئے؟'' اس نے سلطان سے ملتے ہی پوچھا۔
''سیدھی سی بات ہے۔ اپنے پیسے لینے آیا ہوں۔''
''مل جائیں گے پیسے۔ میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔''
''لیکن وقت بھاگا جا رہا ہے۔'' سلطان غرایا۔ ''اب بہت ہو گئی۔''
''بس بھائی۔ تھوڑی سی مہلت اور دے دو۔ میں اپنے تایا سے مانگ کر دے دوں گا۔''
''کس تایا سے؟ جس نے تجھے اپنی فیکٹری سے بھی نکال دیا ہے۔ وہ دس لاکھ دے دے گا؟''
''تمہیں کس نے بتایا؟''
''میں فیکٹری سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔'' سلطان نے کہا۔
نظیر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ''ہاں یار، وہ ذرا سی کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ گھریلو مسئلہ تھا۔''
''خیر مسئلہ جو بھی ہو۔ میرا مسئلہ تو میری رقم ہے۔ وہ دے دو۔ میں دوبارہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔''
''سلطان بھائی۔ بس ایک ہفتے کی مہلت مانگ رہا ہوں۔'' نظیر نے کہا۔ ''کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر دوں گا۔''
''بندوبست؟'' سلطان مسکرا دیا۔ ''تم کو دے گا کون؟ خیر تم جو بھی کرو۔ میں اب چلتا ہوں۔''
سلطان چلا گیا۔ نظیر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کے گرگے کیا کیا کر سکتے ہیں۔
خوف نے اس کے اعصاب کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ کئی بار سلطان کے ہاتھوں لوگوں کو زخمی ہوتے اور بُری طرح مار کھاتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے پاس رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اکرم صاحب سے بات کر لے۔ وہی اس کے کام آسکتے تھے۔ اس کا ارادہ تو کہیں اور جانے کا تھا لیکن وہ فیکٹری پہنچ گیا۔
لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اکرم صاحب لنچ اپنے ہی کمرے میں کرتے ہیں۔ جب سے اسے فیکٹری سے فارغ کیا گیا تھا، اس کے بعد وہ پہلی مرتبہ فیکٹری میں داخل ہو رہا تھا۔
اکرم صاحب اپنے کمرے میں ہی تھے۔ نظیر کو دیکھ کر وہ چونک گئے۔ ''کیوں خیریت تو ہے؟ یہاں کیوں آئے ہو؟''
''تایا، آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ میری عزت کا سوال ہے۔''
''اوہو، تو تمہاری بھی عزت ہو گئی ہے، چلو بتاؤ۔ کیا کام ہے؟''
نظیر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ ''تایا مجھے دس لاکھ کی ضرورت ہے۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔
''دس لاکھ؟ تمہارا خیال ہے کہ دس لاکھ چھوٹی سی رقم ہوتی ہے؟''
''نہیں تایا، میں جانتا ہوں کہ ایک بڑی رقم ہے لیکن میری ضرورت ایسی ہے کہ میں اس کو ٹال نہیں سکتا۔''
اکرم صاحب کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر تلخ ہو کر بولے۔ ''میاں! تمہارے لیے جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ کر چکا ہوں۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سوری۔ ہاں، اتنا کر سکتا ہوں کہ تم فیکٹری سے دو لاکھ لے جاؤ۔ میں کیشیئر سے کہہ دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''
نظیر سناٹے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ دو لاکھ؟ صرف دو

لاکھ۔ اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ سلطان تو اس کی جان لے لے گا لیکن کچھ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا بہتر تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اکرم صاحب کے دفتر سے نکل کر کیشیئر کے پاس پہنچ گیا۔

بڑی خوشامدوں اور منتوں کے بعد سلطان نے اس شرط پر پیسے لیے تھے کہ وہ ہر مہینہ ایک معقول رقم اسے واپس کیا کرے گا۔

نظیر بہت بوجھل دل کے ساتھ واپس آیا تھا۔ اس شام اس کے لیے ایک اور بُری خبر موجود تھی۔

اکرم صاحب نے جبین کا رشتہ کر دیا تھا۔ جبین کا کلاس فیلو ہی تھا۔ سلمان نام تھا اس کا۔ اس شام سلمان اپنے گھر والوں کے ساتھ آنے والا تھا۔

نظیر کے سارے خواب برباد ہو گئے تھے۔ اس نے خود جبین سے شادی کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ اس میں حرج ہی کیا تھا۔ وہ اسی گھر میں رہتا تھا۔ اکرم صاحب کی نگاہوں کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ اگر جبین سے شادی ہو جاتی تو اسے سب کچھ مل ہی جاتا۔ ایک تو اکرم صاحب کی موت کے بعد ان کا سارا ترکہ جبین کو ملتا۔ پھر خود اسے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا۔ بعد میں جبین کی دولت بھی اسی کے کام آتی لیکن اس خبر نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

☆☆☆

وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ جبین اور سلمان کی شادی ہو گئی۔ اکرم صاحب نے بہت دھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔

شادی کا سارا انتظام نظیر نے سنبھال لیا تھا۔ اکرم صاحب نے اس کی تعریف بھی کی تھی۔ ''بیٹا! تم نے جبین کی شادی میں جو کچھ کیا ہے، وہ میرا سگا بیٹا بھی ہوتا تو شاید نہیں کرتا۔''

''تایا کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟ اور جبین میری بہن نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں؟ خدا تم کو خوش رکھے۔''

شادی کے ہنگاموں سے فرصت پا کر نظیر پھر سلطان کے پاس پہنچ گیا۔ مہینے کی مہلت ختم ہونے والی تھی۔ اور ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہوا تھا۔

''سلطان بھائی، میں نے بوڑھے کو اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ کس طرح؟''

''میں نے اس کی بیٹی کی شادی میں اپنا دن رات ایک

کر دیا تھا۔ سارا انتظام ایسا سنبھالا کہ بوڑھا مجھ سے خوش ہو گیا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اب تم پیسے مانگو گے تو مل جائیں گے؟"

"ہاں، سولہ آنے۔" نظیر نے بتایا۔ "تم دیکھ لینا وہ خود ہی مجھ سے بات کر کے مجھے چیک دے دے گا۔"

"چلو کچھ دن اور دیکھ لیتا ہوں۔ اگر اب بھی تم نے پیسے نہیں دیئے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ نہ جانے کیوں میں ہمیشہ تم پر ترس کھا جاتا ہوں۔ ورنہ میرے بندوں کو تو جانتے ہی ہو۔ ذرا بھی مروت نہیں کرتے۔"

"ہاں سلطان بھائی میں جانتا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں تمہارے بندوں کے ڈر سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ جو سچ ہے وہی بتا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں کچھ دن انتظار کر لیتا ہوں۔"

نظیر نے اکرم صاحب سے پیسوں کی بات کی۔ "تایا! میں ان ہی دس لاکھ کے چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔ آپ نے مہربانی کی تھی۔ دو لاکھ دیے تھے۔ وہ جا کر دے دیے تھے۔ اب صرف آٹھ لاکھ رہ گئے ہیں۔ وہ بھی ہو جائیں تو میری زندگی اس عذاب سے چھوٹ جائے۔"

اکرم صاحب کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک ہنکاری لے کر بولے۔ "چلو، میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ لیکن آئندہ سے ایسی حماقت کا کام مت کرنا۔"

لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ اکرم صاحب کو اسی رات برین ہیمرج ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نظیر بول کر چلا گیا تھا۔ اکرم کی بے بسی ان کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ گھر میں ایک ملازمہ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

برین ہیمرج ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ برین ہیمرج کے بعد اکرم کو فالج کا اٹیک ہو گیا تھا۔ دو مہینے تک اسپتال ہی میں پڑے رہے تھے۔ نظیر ان کی حالت دیکھ دیکھ کر کھولتا رہا تھا۔ اگر یہی سب کچھ اس بوڑھے کے ساتھ کچھ دنوں کے بعد ہو جاتا تو اس کو پیسے تو مل جاتے لیکن سارا معاملہ الٹا رہ گیا تھا۔ سلطان نے تو کہہ دیا تھا۔

"بس بھائی اب بہت ہو گیا۔ میں نے تمہارے تایا کا ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے اب پیسے چاہئیں۔"

"سلطان بھائی خود میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ بوڑھا تو بستر سے اٹھنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ وہ تو بول بھی نہیں سکتا۔ آنکھوں کے اشارے سے بات کرتا ہے۔ اب کس طرح وہ مجھے چیک لکھ کر دے گا؟"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ گھر میں تو اتنی رقم ہو گی نا۔ وہی چوری کرو۔"

نظیر اکرم کے کمرے میں کئی بار جا چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بستر کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک بڑی تجوری ہے۔ جو اس کی موجودگی میں کبھی کھولی نہیں گئی۔ ہو سکتا ہے اکرم صاحب اس میں پیسے رکھتے ہوں۔ بینک کے علاوہ گھر میں بھی بہت کچھ ہونا چاہیے۔ سلطان نے ایک رستہ بتا دیا تھا۔ وہ اسی رات اکرم صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کی آہٹ سُن کر اکرم نے آنکھیں کھول دیں۔ نظیر نے کمرے کی لائٹ آن کر دی۔

اکرم کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ وہ پلکیں پٹ پٹانے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ کیا حرکت ہے۔ لیکن صرف غوں غاں کر کے رہ گئے۔ یا جو کچھ بول رہے تھے وہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔

"بڑے میاں۔" نظیر نے توہین آمیز لہجے میں مخاطب کیا۔ "تم تو مجھے چیک وغیرہ دینے سے رہے۔ اور اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم اپنی تجوری کی چابی مجھے دے دو۔ میں اپنے حصے کے پیسے خود نکال لوں گا۔"

اکرم نے انکار میں گردن ہلانی شروع کر دی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم چابی نہیں دو گے۔ چلو میں خود ہی نکال لیتا ہوں۔"

نظیر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چابی تکیے کے نیچے ہی رکھی تھی۔ اس نے وہ چابی اٹھالی۔ اکرم زور زور سے غوں غوں کرنے لگے۔۔۔۔ نظیر چابی لے کر تجوری کے پاس چلا گیا۔

☆☆☆

پورے گھر میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔

سلطان آج ایک خطرناک ارادے سے اکرم کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسے ہر حال میں نظیر سے اپنی رقم وصول کرنی تھی۔ گیٹ پر اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ اگر گارڈ ہوگا بھی تو وہ اپنی کوٹھری میں سو رہا ہوگا۔ پھر بھی اس نے احتیاط کے طور پر پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

جس کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کمرے کی ایک بڑی سی کھڑکی کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔ اس نے کھڑکی کے پاس آکر جھانک کر دیکھا۔ اکرم صاحب اپنے بستر پر تھے اور نظیر تجوری کے پاس بیٹھا ہوا تجوری سے نوٹوں کی گڈیاں نکال

رہا تھا۔

نظیر نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اکرم صاحب کی تجوری اتنی بھری ہوئی ہوگی۔ بہت کچھ تھا اس میں۔ کرنسی نوٹ۔ نہ جانے کتنے پرائز بونڈز۔ وہ بھی چالیس چالیس ہزار کے۔ اس کے اندازے کے مطابق کروڑوں کا خزانہ اس تجوری میں موجود تھا۔

"واہ بڑے میاں۔" اس نے ہنستے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ "کیا فائدہ ہوا ایسی دولت کا۔ اب یہ سب میرے کام آئے گا۔ کہہ رہا تھا تایا کچھ مجھے دے جاؤ۔ تمہاری زندگی کا کیا بھروسا لیکن تم سے تو دس لاکھ بھی نہیں نکل رہے تھے لیکن اب یہ سب کچھ میرا ہے۔ ہے نا؟"

اکرم صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ شور کرنا چاہتے تھے لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ انہوں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ ان کی عادت تھی کہ بھرا ہوا پستول اپنے پاس ہی رکھتے تھے۔ انہوں نے کسی طرح پستول اٹھالیا۔

نظیر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کا دھیان تجوری کی طرف تھا۔

اکرم صاحب نے اچانک جھٹکے لینے شروع کر دیے۔ ان کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ان پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔

سلطان یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک تو اسے نظیر سے اپنی بقایا رقم لینی تھی لیکن اب بہت کچھ وصول کرنا تھا۔ اتنی دولت تو وہ نظیر کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک دلچسپ کیس تھا۔ قاتل سلطان گرفتار ہو چکا تھا۔ گولیاں چلنے کی آواز نے گارڈ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ چوکیدار کو ساتھ لے کر اندر کی طرف دوڑا۔ سلطان اکرم صاحب کی کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دونوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

وہ شور کر رہا تھا۔ میں نے نہیں مارا۔ میں نے نہیں مارا لیکن دونوں نے اسے بے بس کر کے اس کے ہاتھ سے اس کا پستول چھین کر اسے ایک طرف باندھ کر ڈال دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے حواس میں تھا۔

اندر کمرے میں نظیر کی لاش پڑی تھی۔ وہ کھلی ہوئی تجوری کے پاس ہی پڑا ہوا تھا اور بستر پر اکرم صاحب تھے۔ اور وہ بھی مر چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بھی ایک پستول تھا۔

جبین اور سلمان کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا۔ پولیس پہنچ گئی تھی۔

سلطان کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ وہاں بھی وہ یہی بولے جا رہا تھا۔ "میں نے نہیں مارا۔ نہیں مارا ہے میں نے۔ ہاں میں اس گھر میں نظیر کے چکر میں گیا تھا۔ اس نے میرے پیسے لے رکھے تھے۔ وہ وصول کرنے گیا تھا۔"

اس کیس کو سلمان ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اب باقاعدہ پریکٹس کرنے لگا تھا۔ اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "می لارڈ۔ اگر اجازت ہو تو میں اس کیس کے حیرت انگیز پہلو کی طرف اشارہ کروں۔"

"اجازت ہے۔"

"جناب عالی! یہ آدمی لاکھ مجرم سہی۔ لیکن نظیر کا قتل اس نے نہیں کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تفتیش کے مطابق سلطان کے پستول سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی۔ گولی اس پستول سے چلائی گئی جو اکرم صاحب کے ہاتھ میں تھا۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں..."

"جی جناب۔ میں یہی کہہ رہا ہوں کہ قتل خود اکرم صاحب نے کیا ہے۔ اور وہ بھی اپنی موت کے بعد۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہی ہوا ہے جناب۔ اکرم صاحب کی موت گیارہ بج کر دس منٹ پر ہوئی تھی۔ میڈیکل رپورٹ یہی بتاتی ہے اور نظیر کا قتل گیارہ بج کر تیس منٹ پر ہوا ہے۔"

"پھر یہ کیسے ہو گیا؟ کیا اکرم صاحب نے اپنی موت کے بعد نظیر کا خون کیا؟"

"جی جناب۔ ایسا ہی ہوا کیونکہ ان کی موت کے بیس منٹ بعد ان کی لاش پر rigor mortis کا عمل شروع ہوا۔ اس عمل میں جسم کے عضلات سکڑنے لگتے ہیں۔ تشنج کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اتفاق سے پستول اکرم صاحب کے ہاتھ ہی میں تھا۔ یہ عمل شروع ہوا اور انگلیاں سکڑتی چلی گئیں۔ اور پستول سے نکلنے والی گولیوں نے نظیر کی جان لے لی۔ ہم اس کیس کو مرحوم قاتل کا نام دے سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں "میک گرائل" کی کتاب "اناٹومی اینڈ فزیالوجی" کا حوالہ دے سکتا ہوں۔"

"یعنی یہ ایسا کیس ہے۔ جس میں قاتل کو سزا اس لیے نہیں دی جا سکتی کہ اس نے اپنی موت کے بعد خون کیا ہے۔"

"جی جناب۔ ایسا ہی ہے۔ اس میں مقتول مجرم ہے کیونکہ وہ اپنے ہی گھر میں ڈاکا ڈال رہا تھا۔ اور قاتل بے گناہ ہے کیونکہ اس نے یہ قتل خود اپنی موت کے بعد کیا ہے۔"

❖❖❖

پیش بیں

ماہ رخ ارباب

کوئی ایک سانحہ پے در پے ایسے واقعات کا سبب بنتا چلا جاتا ہے کہ سانس لینے کی مہلت مشکل ہوتی چلی جاتی ہے... ایک حادثے سے شروع ہونے والی مستقل بیں کہانی... چوٹ نے اس کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا تھا... وقت گزرنے کے ساتھ اس میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں... آگہی اور انہونی جیسی کیفیات نے اسے وقت سے پہلے ہونے والے واقعے کی اطلاع دینی شروع کردی۔

بھسم کردینے والی چنگاریوں کو بجھانے میں ناکام ہوجانے والے خون گزیدہ کے کارنامے

''انسانی ذہن ایک پیچیدہ مشین ہے۔ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے لیے اس کا محض کچھ فیصد حصہ ہی استعمال کرتا ہے۔ اگر دماغ کی سو فیصد صلاحیتیں بروئے کار لائی جائیں تو دنیا کا نقشہ......'' کی بورڈ پر تیزی سے چلتے اس کے ہاتھ، کرسی گھسیٹے جانے کی آواز سے تھم گئے۔

''کیا لکھ رہے ہو؟'' مہک نے کرسی سنبھالتے ہوئے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔

''آرٹیکل مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' خاور نے تھکی تھکی آنکھوں کو مسلتے ہوئے جواب دیا۔

''علیزہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔ میں اسے مزید اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ جیسے خدشہ ہو کہ وہ اس کی بات رد کر دے گا۔ خاور نے ٹیبل پر رکھے چائے کے کپ کو دیکھا اور گہری سانس لی۔ اس پر بالائی کی سیاہ سی تہ جمنے لگی تھی۔ وہ اب اسے نہیں پی سکتا تھا۔ اسے مہک کو قائل کرنے میں ہمیشہ ہی دقت ہوتی تھی۔

''مہک! اسے کچھ وقت دو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کی یادداشت آہستہ آہستہ پختہ ہوگی۔ ابھی تو چوٹ بھی تازہ ہے۔'' خاور کچھ بے بسی سے بولا تو لہجے میں اپنی معذوری اور بے کسی کا دکھ آنچ دے رہا تھا۔

''خاور! میری ایک ہی بیٹی ہے اور میں اس ڈاکٹر کے علاج سے مطمئن نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ اور دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جو میں کہوں گی تمہیں ماننا ہوگا۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔

''او کے، ہم ایسا ہی کریں گے۔'' خاور نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''جاؤ تم سو جاؤ مجھے کچھ اور دیر لگے گی۔'' وہ دوبارہ سے ادھورے آرٹیکل کی جانب متوجہ ہوتا ہوا بولا۔

''نہیں میں یہیں انتظار کرتی ہوں۔'' وہ کمرے کے ایک کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ٹیبل پر کوئی سائنس میگزین رکھا تھا۔ وہ دماغ کے متعلق ایک آرٹیکل نکال کر پڑھنے لگی۔ آج کل ان دونوں کی دلچسپی کا محور و مرکز دماغ اور انسانی نفسیات کی گتھیاں ہی تھیں۔

جب آدھے گھنٹے بعد خاور نے اپنا کام مکمل کر کے پلٹ کر دیکھا تو وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو چکی تھی۔

☆☆☆

تین افراد پر مشتمل یہ خاندان ہمیشہ سے ان مصائب کا شکار نہیں تھا۔ خاور ایک اچھے ادارے میں سیلز کے شعبے سے وابستہ تھا۔ جاب کی سیکیورٹی نہ ہونے کے باوجود اچھی تنخواہ سے وہ خوش تھا۔

جب اس بائیک حادثے میں جہاں اس نے اپنی ٹانگ زخمی کروا کر نوکری بھی گنوائی، وہیں اس کی پانچ سالہ بیٹی کے سر پر لگنے والی چوٹ نے اس کی یادداشت کو شدید متاثر کیا تھا۔

اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی یوں ادھورا ہی رہ گیا کہ وہ چیزیں یاد نہیں رکھ پاتی تھی۔ ایسے مشکل وقت میں جب

بینک میں موجود جمع جتھا تیزی سے خرچ ہو رہا تھا۔ مہک ہی تھی جس نے اسے وقت گزاری اور کچھ آمدنی کے لیے شوقیہ سے پروفیشنل رائٹر بننے کی جانب توجہ دلائی تھی۔ اور اب وہ کئی بڑے کثیرالاشاعت اخبارات میں باقاعدگی سے معاشرتی حوالوں سے کالم اور مضامین لکھ رہا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔

☆☆☆

''ماما! ہاتھ ملائیں۔'' وہ بڑے مہذب انداز میں ایک ہاتھ آگے بڑھائے کھڑی تھی۔ مہک نے پیار سے اس کی جانب دیکھا۔ پیلی فراک میں بھورے بالوں کی اونچی سی پونی باندھے وہ شرارتی انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں بھئی تمہیں ہاتھ ملانے کا اچانک خیال کیوں آیا'' اس نے کندھے پر پھسلتے دوپٹے کو ٹھیک کیا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

علیزہ کا ہاتھ چھوتے ہی ایک ہلکی سی برقی رو اس کے جسم سے گزر گئی۔

اس کے ڈر کر ہاتھ پیچھے کرنے پر علیزہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کی جزوی طور پر متاثرہ یادداشت کا عمل صرف نئی باتیں یاد رکھنے میں حائل تھا۔ پچھلی تمام زندگی اسے جزئیات سمیت یاد تھی۔ اس طرح اس کی تعلیم تو متاثر ہو رہی تھی مگر بظاہر وہ کمزور حافظے کی ایک عام سی بچی ہی محسوس ہوتی تھی۔

''علیزہ گندی بچی! تم نے کچھ ٹرک کیا نا؟'' مہک نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ ڈپٹ کر پوچھا۔

''ماما! یہ رنگ ہے۔ اس سے شاک لگتا ہے۔ بابا نے ابھی بیلون والے سے دلوایا...... انہوں نے کہا اور تو کوئی بے وقوف نہیں بنے گا۔ ماما پر آزمانا۔ ہی ہی ہی۔''

اس نے خاور کی کہی بات جوں کی توں اس تک پہنچائی۔ ''اچھا! تم ٹھہرو میں ٹھیک کرتی ہوں تم دونوں کو۔ میں بیوقوف ہوں۔'' مہک نے تلملا کر چیخ اٹھایا۔ اچانک علیزہ کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''ماما یہاں سے ہٹ جائیں۔ آپ کھانا نہ بنائیں۔''

''کیا؟'' مہک نے کندھے سے بار بار پھسلتا ریشمی دوپٹا پھر ٹھیک کیا۔ اس کی تمام توجہ کھانا پکانے کی جانب تھی۔

''ماما یہاں آگ لگ جائے گی۔'' وہ ہر دم مسکراتی بچی اس پل بالکل سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''علیزہ یہاں سے جاؤ۔ تنگ مت کرو۔'' اب کے مہک کچھ سختی سے بولی۔ وہ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی پھر

دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مہک نے ایک نظر پلٹ کر اسے دیکھا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ اسے معلوم تھا وہ اچھی باتوں کی طرح ناگوار چیزیں بھی کچھ ہی دیر میں بھول جاتی ہے۔ تب اسے داہنی آنکھ کے پردے پر غیر معمولی روشنی کی جھلملاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے تھوڑا سا گھوم کر دیکھا اور حواس باختہ ہو کر چیخ اٹھی۔ اس کا ریشمی دوپٹا نہ جانے کس طرح جلتے چولھے کے کنارے سے اٹک کر تیزی سے جلنے لگا تھا۔ اس نے خوف سے لرزتے ہوئے دوپٹا گلے سے نوچا اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے چرمراتے ہوئے دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہاں ایک سیاہ جلا ہوا ڈھیر سا رہ گیا تھا۔

اس نے چولھا بند کیا اور تیزی سے باہر کی جانب لپکی تاکہ خاور سے بات کر سکے۔ وہ اس وقت اپنی وہیل چیئر دروازے کے پاس رکھ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ تاکہ باہر کی دنیا سے بالکل ہی لاتعلق نہ ہو جائے۔ حادثے کے بعد وہ شدید ڈپریشن اور مایوسی کا شکار تھا۔ بعض اوقات خودکشی کے متعلق بھی سوچنے لگتا۔ باہر نکلنے کے لیے اسے نفسیاتی معالج کی ضرورت پڑی تھی۔ یہ اسی کا مشورہ تھا کہ اسے عام لوگوں سے بچنے اور تنہائی کی زندگی گزارنے کے بجائے ان کے درمیان رہنا چاہیے۔

اس معاملے میں وہ ڈاکٹر شاہد کا دل سے شکر گزار تھا۔ جس نے اس کا محض مریض سمجھ کر نہیں بلکہ دوستانہ بنیادوں پر علاج کیا تھا۔

علیزہ پر چونکہ باہر جانے کی پابندی تھی لہٰذا وہ اس وقت خاور کے سامنے ہی لان میں کھیلتی رہتی۔ مگر اس وقت وہ وہاں بھی موجود نہیں تھی۔

مہک نے اِدھر اُدھر بچی کی تلاش میں نظر گھمائی، آس پاس اسے نہ پا کر خاور سے پوچھنے کا ارادہ ترک کرتی ہوئی پھر سے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

''پاپا!'' وہ مصروف سے انداز میں ٹی وی کی تاروں سے اُلجھا ہوا تھا۔ جب ایک باریک سُریلی آواز نے اسے متوجہ کیا۔

''ہاں بیٹا جانی! ہوم ورک ہو گیا؟''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''پاپا۔ آپ اس ٹی وی کو آن مت کریں۔ آپ کو......''

''آہ......ہ......''

علیزہ کا جملہ خاور کی چیخ میں دب کر رہ گیا۔ اچانک لگنے والے زوردار برقی جھٹکے نے اس کا پورا بازو جھنجوڑ دیا تھا۔

''جی بیٹا آپ کچھ کہہ رہے تھے؟'' حواس بحال ہوئے تو وہ بازو سہلاتا ہوا بولا۔

''کچھ نہیں پاپا! میں بس یہ بتا رہی تھی کہ آپ کو شاک لگے گا۔'' اس کے چہرے پر تمکنت تھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں۔ اور خاور نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتا رہ گیا مگر وہ اس واقعے کو ایک بچے کی شرارت سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ تھا۔ تب ہی ایک واقعہ ہوا جس نے اس کی تمام حسیات کو بچی کی جانب مرکوز کر دیا۔

وہ بھی دوسرے دنوں کی طرح بہار کی ایک عام سی صبح تھی۔ خاور اسٹڈی روم میں تھا اور مہک کے اندازے کے مطابق علیزہ اپنے کمرے میں۔ مہک کے میکے میں بھی خاور کی طرح رشتے داروں کی شدید قلت تھی۔ اس کی ایک ہی بڑی بہن تھی۔ جس سے ہر روز تھوڑی بہت بات کرنا اس کی عادت تھی۔ اس وقت بھی وہ صوفے پر دونوں پیر سمیٹے اطمینان سے بیٹھی فلک کو دن بھر کا احوال سنا کم اور سن زیادہ رہی تھی کیونکہ فلک بہت باتونی تھی۔ وہ فون رکھنے لگی تھی جب اسے علیزہ باہر سے آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ کہ اسے اس وقت اصولاً کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔

''ہے علیزہ! خالہ سے بات کرو گی؟''

''یس۔'' وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی صوفے پر آ بیٹھی۔ اسے ہر بچے کی طرح خالہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک فلک سے اپنی دلچسپی کی باتیں کرتی رہی۔ پھر یکدم خاموش سی ہو کر ناک کی سیدھ میں تکنے لگی لیکن مہک اس کی آنکھوں کا خالی پن دیکھ سکتی تھی۔ دراصل وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے اس کا سکتہ ٹوٹا اور وہ نارمل نظر آنے لگی مگر جب بولی تو مہک کو اندازہ ہوا وہ ابھی بھی نارمل نہیں ہے۔

''خالہ! آپ بیٹھ کر بات کیوں نہیں کرتیں۔ آپ سیڑھی سے گر سکتی ہیں۔''

مہک نے چونک کر اسے دیکھا اور بے چین سی ہو کر ریسیور لینے کو ہاتھ بڑھایا تو علیزہ نے ریسیور اسے تھما دیا۔

''ہیلو فلک تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں مگر یہ علیزہ کیا کہہ رہی تھی؟''

اسے دوسری جانب سے فلک کی تشویش زدہ آواز سنائی دی تو

یہ شکار کی ٹرافی نہیں، سیدھی خودکشی ہے گردن میں رسی ابھی تک بندھی ہوئی ہے۔

اس نے سکون کی سانس لی۔

''کچھ نہیں اسے آج کل یونہی تنہا رہتے رہتے کہانیاں بنانے کی عادت ہوگئی ہے۔''

''اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے بھیجو۔ یہ اچھی عادت نہیں کہ وہ تنہا رہتے رہتے نفسیاتی۔'' اس سے پہلے کہ فلک کی بات مکمل ہوتی مہک کو اس کی چیخ سنائی دی اور پھر ریسیور گرنے کی آواز۔

وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی اور کال کٹ گئی۔

''خالہ گر گئیں نا مام۔'' علیزہ وہیں کھڑی تھی۔ مہک جو پریشان سی ہو کر نمبر دوبارہ ڈائل کر رہی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا علیزہ! پلیز بے بی! مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیسے علم ہوا؟ دیکھو یہ جاننا ضروری ہے نا؟'' وہ اسے دونوں کندھوں سے تھامے التجائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''آئی ڈونٹ نو مام، مجھے نہیں پتا۔ مجھے بس نظر آجاتا ہے۔ ایسے ہی۔ اور میں بتاتی ہوں مگر کوئی مانتا ہی نہیں۔'' وہ معصومیت سے کندھے اچکا کر بے بسی سے بولی۔

مہک نے سر تھام لیا۔ اسے فلک کی فکر ہونے لگی تھی مگر اسی وقت اس کی جوابی کال آئی اور اس کی خیریت کی جانب سے تسلی ہوتے ہی وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ خاور سے بات کرنا اب ضروری ہوگیا تھا۔

''مہک فار گاڈ سیک! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بس تنہائی کا شکار ایک بیمار بچی ہے۔ وہ ریکور کر رہی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی مگر تمہاری روک ٹوک اسے مزید بیمار کر دے گی۔ اس کی اسکولنگ؟ اس کے دوست چھوٹ گئے ہیں۔ تم اسے باہر نہیں جانے دیتیں۔ میری موجودگی کے باوجود بھی وہ چار دیواری سے باہر نہیں نکلتی۔ تم اسے پاگل کر دوگی اس طرح۔ اسے جو چوٹ آئی ہے، اسے آپریٹ کرنا ناممکن ہے۔ بس معمولی سی خون کی رکاوٹ ہے جو خود ہی دور ہو سکتی ہے۔ ہمیں بس انتظار کرنا ہوگا ہمارے ہاتھ میں اور کچھ نہیں۔'' مہک کے خدشات سن کر وہ پھٹ پڑا تھا۔ وہ رونے لگی۔

''خاور! وہ خود بخود کیسے ٹھیک ہو جائے گی۔ کیا وہ یونہی تعلیم سے نابلد رہے گی؟ تم، تم اس سلسلے میں ڈاکٹر شاہد سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی تو خاور نے گہری سانس لی۔

''نہیں یادداشت بڑھانے کی مشقیں اس سلسلے میں کام آئیں گی۔ میں ڈاکٹر نعمان سے پھر وقت لے لیتا ہوں تاکہ

تمہاری تسلی ہو جائے۔ مگر مہک ہم شاہد کی فیس افورڈ نہیں کر سکتے اور دوستی میں اس پر زیادہ بوجھ ڈالنا مجھے پسند نہیں۔ حالات یہ ہیں کہ جلد ہی ہمیں یہ معیارِ زندگی برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اکاؤنٹ سے رقم تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ مجھے اس وقت کی فکر ہے جب ہم بالکل خالی ہاتھ ہوں گے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"تم فکر مت کرو۔ ڈاکٹر شاہد نے ہی کہا ہے کہ یادداشت بڑھانے کی مشقوں کے ذریعے ہم کافی بہتری لا سکتے ہیں۔"

"مسئلہ اس کی یادداشت نہیں ہے۔" وہ جو خاموشی سے خاور کی تمام گفتگو سن رہی تھی جیسے سرگوشی میں بولی۔

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟" خاور نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ علیزہ کو کمرے میں ہی لے آئی تھی۔ اور یہ تمام گفتگو اس کے سامنے ہو رہی تھی۔ وہ اسے فلک کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا احوال بتانے لگی جب اسے باہر شور سا سنائی دیا۔

وہ گفتگو ادھوری چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ خاور آہستہ آہستہ چیئر کو چلاتا ہوا باہر نکلا۔ وہ اُن کی پڑوسن تھی۔ جو علیزہ کے ہم عمر ایک بچے کو بازو سے تھامے زور زور سے بول رہی تھی جبکہ مہک جھک کر کچھ تشویش کے عالم میں اس بچے کا ماتھا دیکھ رہی تھی جہاں بینڈ ایج لگی تھی۔

"مسز خاور آپ لوگ کافی سلجھے ہوئے لوگ ہیں مگر یہ رویہ تو قابلِ برداشت بالکل نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں وہ سلائڈ کتنی اونچی تھی جہاں سے اِس نے......" عورت نے علیزہ کی جانب اشارہ کیا۔

"میرے بیٹے کو دھکا دیا۔"

"دیکھیے یہ باتیں فوراً بھول جاتی ہے۔ اس لیے ہم اسے باہر نہیں جانے دیتے مگر آج نہ جانے کیسے باہر چلی گئی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ کسی کو چوٹ نہیں پہنچا سکتی۔ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" مہک شدومد سے علیزہ کا دفاع کر رہی تھی۔

"تو پھر کس نے کیا؟ یہ چوٹ، یہ بینڈ ایج نقلی نہیں ہے۔ میں ابھی کلینک سے آئی ہوں۔ آپ کی بیٹی نے پہلے اسے دھمکایا اور پھر دھکا دے دیا۔ اس وقت وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔" وہ عورت اپنی بات جھٹلائے جانے پر چڑ گئی۔

"جی آنٹی، وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ نیچے کھڑی تھی۔ جب اس نے کہا میں گر جاؤں گا اور پھر نہ جانے کیسے اتنی جلدی مجھے اوپر آ کر دھکا دیا اور پھر نیچے چلی گئی۔" بچہ بھی اس صورتِ حال سے کچھ اُلجھن میں تھا۔ مہک کے تو جیسے کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بچے کی بات سن رہی تھی۔ خاور جو خاموشی سے یہ تمام گفتگو سن رہا تھا مہک کی حالت کا اندازہ کر کے آگے بڑھا۔ اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کر کے معاملہ رفع دفع کیا۔

خاتون کے جاتے ہی مہک نزدیک پڑے صوفے پر ڈھے گئی۔

خاور نے اسے نظر انداز کیا اور علیزہ کے پاس چلا گیا جو اس صورتِ حال سے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

"پاپا! میں نے اسے دھکا نہیں دیا۔ میں ایسا نہیں کرتی۔" وہ خاور کو سامنے دیکھ کر جلدی جلدی صفائی پیش کرنے لگی۔

"تو پھر کس نے کیا؟ تمہیں یاد ہے؟"

"نہیں۔" اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا تو خاور نے اسے اٹھا کر اپنی صحت مند ٹانگ پر بٹھا لیا۔ درد کی ایک تیز لہر اٹھی مگر وہ سہہ گیا۔ وہ کم از کم اپنی بیٹی کا اتنا لاڈ تو اٹھا ہی سکتا تھا۔ جبکہ ذہن لامتناہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"ہاں ٹھیک ہے۔ آنکھیں کھولو۔ ڈرو مت یہ صرف روشنی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ تو سپر مین کی طرح فٹ ہو۔ اب آپ اپنا کام مکمل کر سکتی ہیں۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر علیزہ کی پیٹھ تھپکی جو صوفے پر بیٹھی اپنا چیک اپ کروا رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر کی آمد پر اس کے کمرے سے بلایا گیا تھا جہاں وہ پڑوسن کی آمد کے بعد سے بند تھی۔ اسے ایک نیا پزل دے دیا گیا تھا جو اسے کئی گھنٹے مصروف رکھنے کے لیے کافی تھا۔ وہ ڈاکٹر کی اجازت پا کر دوڑتی ہوئی کچن میں گھس گئی جہاں مہک کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر نے ٹارچ بند کی اور خاور کی جانب پلٹا۔ جو وہیل چیئر پر بیٹھا بظاہر پُرسکون نظر آ رہا تھا مگر کھلتی بند ہوتی مٹھی اس کے اندرونی اضطراب کو ظاہر کر رہی تھی۔

"بظاہر تو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے رپورٹس بھی دیکھ لی ہیں۔ خون کی گلٹی بڑھی نہیں ہے مگر شاید کچھ کم ہوئی ہے۔ بچی کو کوئی اضافی مسئلہ بھی نہیں، سر درد کے علاوہ جو نارمل ہے۔ اس مسئلے کے ساتھ، بے شک اچھا نہیں ہے مگر ہوتا ہے اس طرح۔ مگر مجھے حیرت ہے ان تمام چیزوں کا ان واقعات سے کیا تعلق ہے جو کچھ تم نے بتائے ہیں۔ اس

کی توجیہہ پیش کرنا ناممکن ہے۔''

شام والے واقعے کے بعد خاور نے فوراً ڈاکٹر شاہد کو کال کی تھی۔ اس کی ڈاکٹر شاہد سے بلا معاوضہ مشاورت نہ کرنے کی قسم ادھوری رہ گئی تھی اور اب وہ بچی کا عمومی چیک اَپ کرنے اور رپورٹس دیکھنے کے بعد کچھ اُلجھا ہوا سا بیٹھا تھا۔

''اگر یہ ایک واقعہ ہوتا تو ہم اسے اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر دیتے مگر یہ تسلسل کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ آج کا واقعہ خصوصی طور پر تشویش کا باعث ہے۔ وہ کہتی ہے اسے پہلے سے ہونے والے واقعات نظر آ جاتے ہیں اور فوراً اس کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ کہاں بولنا چاہیے اور کہاں نہیں، اس بات کے رمز سے واقف ہی نہیں۔ نہ ہم اسے فوری جذبات کے اظہار سے روک سکتے ہیں۔ تمہیں اندازہ ہے۔ اگر یہ بات پھیل گئی تو لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے؟ یہاں کالی زبان کی اصطلاح تو ویسے ہی عام ہے۔''

خاور کے لہجے سے جھلکتی تشویش نے ڈاکٹر شاہد کے چہرے پر گمبھیرتا کی چادر تان دی۔ وہ اس مسئلے کو ابھی تک ان کا واہمہ سمجھ رہا تھا۔ ایسے والدین جو اپنی اکلوتی بچی کی بیماری سے حد سے زیادہ حساس ہو چکے تھے مگر خاور کی جسمانی اور ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دباؤ برداشت کر سکتا۔ اسے کچھ نہ کچھ تسلی دینی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں اسے اپنے کلینک لے جا کر مزید کچھ ٹیسٹ کروں گا۔ ہو سکتا ہے یہ مسئلہ دواؤں کے بجائے کسی ایکسرسائز سے حل ہو جائے۔ وہاں میرے ساتھ اور بھی اسامی ڈاکٹرز ہیں، جو اس تبدیلی کے متعلق ہر پہلو پر غور کریں گے۔ تب تک علیزہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھو۔''

''کھانا تیار ہے حضرات!'' مہک کے اعلان پر خاور، جو کچھ کہنے لگا تھا، خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا۔ ڈاکٹر شاہد نے اس کی وہیل چیئر کو تھاما اور ڈائننگ روم کی جانب لے چلا۔

کھانے کی ٹیبل پر شاہد علیزہ سے مستقل ہلکی پھلکی گفتگو کرتا رہا تاکہ اس کے رویے میں کسی قسم کی غیر معمولی تبدیلی محسوس کر سکے۔

اس کی ہلکی پھلکی باتوں سے ڈاکٹر شاہد کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے دور رکھی مچھلی کی ڈش کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

اُلّو اور مچھلی

تازہ خبر ہے کہ رحیم یار خان میں واقع مدر لینڈ گورنمنٹ اسکول کے احاطے میں نایاب نسل کا اُلو پکڑا گیا۔ پچھلے روز خبر آئی کہ کراچی کے ساحلی علاقے میں مچھیروں کے جال میں دو نایاب نسل کی مچھلیاں پھنسی ہیں جن کی جھلی سے وہ تانت بنتی ہے جس سے انسانی جسم کے اندرونی اعضا میں ٹانکے لگائے جاتے ہیں اور جو آپریشن کے بعد خود بخود رفتہ رفتہ گھل جاتے ہیں۔ ہر مچھلی کی قیمت کا تخمینہ 20 لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔ آج کل ملک میں بھی بڑی بڑی مچھلیوں کا شہرہ ہے جو پھسل پھسل کر ہاتھوں سے نکلتی رہی ہیں۔ ان کا حساب کروڑوں بلکہ اربوں کا ہے۔ ایسے کئی ارب پتی، ڈرائیور، خان ساماں اور خدمت گار بن کر عربوں کے زیرِ سایہ پائے گئے ہیں۔ ان سب پر مضبوط جال ڈالنے کے لیے ابراہیم حیدری کے جدی پشتی مچھیروں سے مدد لی جائے تو شاید ان کے پھسل کر نکلنے کا مسئلہ حل ہو جائے۔ رہا اُلو، تو وہ نہایت اُلو تھا کہ پکڑا گیا۔ ملک بھر میں نایاب نسل کے ایسے ایسے قیمتی اُلو پائے جاتے ہیں جن کی مالیت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا...... مگر وہ کبھی بھی پکڑے نہیں جاتے۔ مدر لینڈ اسکول کے عملے اور کراچی کے مچھیروں کی مدد سے نادر روزگار اُلوؤں اور بڑی مچھلیوں کا ہانکا کیا جائے تو ملکی زرِ مبادلہ کے ذخائر کو قابلِ قدر تقویت مل سکتی ہے۔ ہم تو صرف مشورہ دے سکتے ہیں، ان پر عمل کرنا یا نہ کرنا سرکار کی ذمے داری ہے۔

کراچی سے ولید بلال کا تجزیہ

''انکل اسے مت کھائیے۔'' وہ اچانک بولی۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے بچی کو دیکھا۔ مہک اور خاور نے بھی ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''اس میں وہ ہوتا ہے نا۔ وہ جو فش کے اندر ہوتا ہے۔ جو چبھتا ہے۔''

''کانٹا۔'' مہک نے اس کی مشکل آسان کی۔

''ہاں وہی۔ آپ کے گلے میں پھنس جائے گا۔'' وہ اپنا کھانا روکے کچھ پریشان سی ڈاکٹر کو سمجھا رہی تھی۔ خاور نے معنی خیز انداز میں ڈاکٹر شاہد کو دیکھا۔

ڈاکٹر نے مچھلی کی ڈش نزدیک کھینچی اور ایک بڑا سا نوالہ بغور دیکھ کر منہ میں ڈالا۔

''بیٹا کانٹا تو پھنستا ہے۔ اس ڈر سے ہم مچھلی کھانا کبھی نہیں چھوڑتے۔ بہادر بنو۔ مشکل سے ڈرتے نہیں، اس کا

مقابلہ کرتے ہیں۔"
اس نے احتیاط سے مچھلی کو اچھی طرح چبایا اور نگل لیا۔ تمام نفوس یوں خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس کے بخیر نوالہ نگلنے پر ان کی زندگی اور موت کا دارومدار ہو۔ جب اس نے بغیر کوئی ردِعمل ظاہر کیے پانی کا گلاس اٹھایا تو سب نے جیسے سکون کی سانس لی۔
"اب مجھے بتائیں آپ کو کیوں لگا مجھے کانٹا اٹک جائے گا۔ آپ نے کیا دیکھا تھا؟" اس نے کھانے کے بعد علیزہ سے اس کے کمرے میں جا کر بات کرنے کی ٹھانی۔
وہ ابھی تک اپنا پزل سجائے بیٹھی تھی۔
"میں نے دیکھا۔ آپ کا چہرہ ایسا سرخ ہے جیسے سانس نہیں آرہی اور آپ گلا پکڑے کھانس رہے ہیں۔"
"تو آپ نے سوچا یہ مچھلی کھانے سے ہوا؟"
"جی۔" بچی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
"اوکے۔ اب میں جب دوبارہ آؤں گا تب اس پر بات کریں گے۔ اگر آپ کو یاد رہا۔ ٹھیک ہے؟ میں اپنے بیٹے برہان کو بھی لاؤں گا۔ اسے اپنی کلیکشن دکھانا۔"
وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ڈاکٹر کا یقین اپنی سوچ پر پختہ ہو چکا تھا کہ بچی صرف تنہائی کا شکار ہے اور توجہ کی متلاشی۔ اس نے اسپیڈ بڑھا دی۔ اور کچھ ہی دور جا کر اسے رفتار دوبارہ کم کرنی پڑی۔ گاڑی رکتے رکتے اگلی گاڑی کے نزدیک جا ٹھہری۔ آگے دور تک ٹریفک جام تھا۔ اسے یک دم ہی سینے اور آنکھوں میں جلن کا احساس ہونے لگا۔
اس نے گاڑی سے باہر نگاہ دوڑائی تو اندازہ ہوا کہ آس پاس سے گزرتے لوگوں نے بھی چہرے رومالوں سے ڈھانپ رکھے ہیں۔
"بھائی صاحب! سنیے گا۔ یہ ٹریفک کیوں اتنا جام ہے آگے کھدائی ہو رہی ہے کیا؟" اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے ایک شخص کو آواز دی۔
"نہیں جی۔ آگے کیمیکل فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ روڈ بند ہے، بہتر ہے دوسرا راستہ لے لیں۔ آپ کے پیچھے بھی گاڑیاں جمع ہو رہی ہیں۔ پھنس کر رہ جائیں گے۔ یہاں تو سانس لینا مشکل ہے۔" اس شخص نے منہ پر بندھا کپڑا ہٹا کر بات مکمل کی اور تیزی سے دکان کا شٹر گرا کر اسے بند کرنے لگا۔ تمام دکانیں قبل از وقت ہی بند ہو رہی تھیں۔ اس زہریلے ماحول میں کچھ وقت گزرنا بھی مشکل تھا۔ ڈاکٹر کا ہاتھ بے اختیار حلق پر پہنچا اور اسے مسلنے لگا۔ اس نے پیچھے دیکھنے کی نیت سے بیک ویو مرر سیدھا کیا تو نگاہ خود پر پڑی۔ اور تب ایک جھماکے سے علیزہ کی کہی بات اس کے ذہن میں گونج کر رہ گئی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ناک اور آنکھوں سے بہتا پانی اس کی حالت قابلِ رحم بنا رہا تھا۔ اس نے موبائل فون نکالا اور خاور کو کال ملانے لگا۔

☆☆☆

"ماما میں یہ بسکٹ نہیں کھاؤں گی۔" وہ بظاہر سمجھداری سے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے کافی بُردبار نظر آرہی تھی مگر مسلسل مہک کے کان میں بول رہی تھی۔
ڈاکٹر شاہد نے خاور سے بات کر کے دوسرے ہی دن شام میں کلینک سے واپسی پر ڈرائیور بھیج کر علیزہ کو اپنے گھر بلا لیا تھا۔ کل ہوئے واقعے نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ تمام صورتِ حال کو مکمل طور پر سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک پورا دن اس کے ساتھ گزارا جائے۔
اس وقت وہ مہک کے ساتھ جڑ کر بیٹھی سامنے سجی ٹرے میں رکھی اشیائے خورونوش میں سے نقص نکال نکال کر انہیں ایک طرف رکھتی جا رہی تھی۔ مہک کے جھڑکنے کا اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا۔
"علیزہ اپنی حرکتیں بند کرو اور شرافت سے بیٹھو۔"
ڈاکٹر شاہد مسکراتے ہوئے اس کی حرکات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ مہک کی دشواری سمجھتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔
"جی پاپا!" بچہ فرمانبرداری سے باہر آگیا۔
"بیٹا علیزہ آپ کے ساتھ کھیلنے آئی ہیں، انہیں ساتھ لے جاؤ اور دھیان رہے۔ یہ جو بھی کہیں اسے اگنور نہیں کرنا خاص کر جب یہ کسی بات سے منع کریں۔" ڈاکٹر نے تمام بات تقریباً سرگوشی میں کی تھی مگر دوسرے صوفے پر بیٹھی اس کی بیوی نے سب کچھ بخوبی سنا تھا۔
"شاہد کیا کوئی مسئلہ ہے؟" اس نے دبے لفظوں میں پوچھا۔
"نہیں۔" ڈاکٹر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے محض یک لفظی جواب دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس موضوع پر مزید بات نہ کی جائے۔ سمجھدار اور رمز شناس خاتون نے خاموش ہو جانا مناسب سمجھا تھا۔
وہ خاموشی سے دونوں بچوں کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے، وہ شروع ہو گیا۔
"مسز خاور آپ کی اب تک کی بتائی گئی تمام باتیں

میرے ذہن میں ہیں۔ میں نے آج تک کچھ ایسا نہیں دیکھا۔ کسی انسان کو ایسی صلاحیت مل جانا جس کے متعلق وہ خود بھی ناواقف ہو۔ اسے کیسے استعمال کرے اور سوال یہ کہ درحقیقت ہے کیا۔ کوئی نعمت یا عذاب۔ وہ ہونے والے واقعات سے قبل از وقت آگاہ ہوتی ہے۔ یا اس کے کہنے سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ سائنس پر یقین رکھنے والے کے لیے دونوں واقعات کی توجیہہ پیش کرنا ناممکن ہے۔ مگر ہم جدید سائنس کے ماننے والے ہیں جو اَب کچھ ایسی چیزوں پر یقین رکھتی ہے جو نظر نہیں آتیں۔'' اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر گلا تر کیا۔ دونوں خواتین اس کی بات بغور سن رہی تھیں۔

''اب اس بات کو سمجھنا یا کوئی ٹھوس دلیل دینا تو مشکل ہے۔ مگر ایک بات تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی دماغ جو بے شمار طاقت کا منبع ہے۔ اور آپ کی بچی جو ایک بے انتہا ذہین بچی رہی ہے۔ اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ یعنی ایک جانب سے دماغی انرجی کے استعمال کا راستہ بند ہوا ہے تو دماغ نے اس طاقت کو استعمال کرنے کا دوسرا راستہ تلاش کر لیا۔ اسے قدرت کا تحفہ کہیں یا دماغ کی اپج مگر یہ ایسے ہی ہے۔ جیسے ایک اندھے کے محسوس کرنے اور سننے کی صلاحیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔'' ڈاکٹر نے بات مکمل کر کے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کا انداز کسی ایسے مقرر کا سا تھا جو ایک بڑے مجمع سے کامیاب پُرجوش خطاب کے بعد اعصاب کو پُرسکون کر رہا ہو۔

مہک منہ کھولے اس کی بات سن رہی تھی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ علیزہ بیمار نہیں ہے اور یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے؟''

''کم از کم اس کی صحت کے لحاظ سے تو نہیں۔''

''مسز مہک آپ میرے خیال سے بہت زیادہ وہمی ہو رہی ہیں۔ دیکھیں بچی برہان کے ساتھ بھی نارملی کھیل رہی ہے۔'' مسز شاہد نے دونوں بچوں کی جانب اشارہ کیا جو لان میں نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شاہد کے پاس اس کا یہ چکر کافی سودمند رہا تھا۔ ڈاکٹر کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ وہ شام بھی پُرسکون ہی رہی۔ مسئلہ تب ہوا جب واپسی کے لیے ڈاکٹر نے ڈرائیور کو آواز دی۔ علیزہ جو ڈاکٹر کے ساتھ ہی صوفے پر جڑی بیٹھی تھی، اچانک اس کے کندھے پر چڑھ گئی۔

''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو آپ کے کان میں ایک

''یہ ہمارے سیلز منیجر صاحب ہیں۔ یہ کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے سڑک کے راستے اپنے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔''

بات کہوں انکل؟'' وہ تقریباً اس کے کان میں منہ گھساتے ہوئے بولی۔ اپنی دانست میں وہ سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔ یہ اور بات کہ وہ سرگوشی کمرے میں موجود تمام نفوس نے سنی۔

''ہاں بیٹا ضرور بولیے۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔

''انکل آپ کے ڈرائیور انکل کے پاس ایک گن ہے۔ ایک اور انکل نے ان کو دی ہے۔ جو پوپائے جیسا دکھتا تھا۔ آپ نے دیکھا ہے نا پوپائے؟ برہان کی شرٹ پر جو بنا ہے ایسا۔ یہ آپ کی الماری سے آنٹی کی جیولری نکالنا چاہتے ہیں۔ انکل یہ بُری بات ہے نا؟'' اس نے کان پھاڑ سرگوشی میں اعصاب شکن دھماکا کیا تو ڈرائیور کے ساتھ ساتھ مہک بھی اچھل پڑی۔

''علیزہ چپ ہو جاؤ۔ ایسے کسی پر الزام نہیں لگاتے۔'' وہ ایک دم سے علیزہ پر جھپٹی تاکہ اسے چپ کروائے۔

''ماما میں جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ کبھی میری بات نہیں مانتیں۔'' بچی کو بار بار اپنی بات جھٹلایا جانا بُرا لگا تھا۔

''انہوں نے وہ گن گاڑی کی سیٹ کے نیچے رکھی ہے۔ آپ دیکھیے۔ آپ نے رکھی ہے نا انکل؟'' اس نے براہِ راست ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ تو وہ جو ہکا بکا سا ہو کر اس تمام صورتِ حال کو دیکھ رہا تھا شپٹا سا گیا۔

''علیزہ کیا تم نے اسے گن لیتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا؟'' مہک نے پھر مداخلت کی۔ وہ ہر ممکن حد تک بچی کو ایک ناگوار صورتِ حال میں اُلجھنے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر واقعتاً بات وہی ہوتی جو علیزہ نے

دیکھی تو بچی ایک خطرناک مجرم کی نظروں میں آسکتی تھی۔

''یس ماما میں نے دیکھا تھا۔ مطلب آنکھوں سے نہیں مگر دیکھا تھا۔''

''ایک منٹ...... ناصرہ۔ آپ گاڑی کی سیٹس چیک کیجیے گا پلیز۔'' ڈاکٹر نے پاس کھڑی ملازمہ کو مخاطب کیا۔ تو ڈرائیور جو اَب تک خاموش کھڑا تھا، اچانک باہر کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اب بات اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لہٰذا بھاگنا ہی بہتر تھا۔ اس کے فرار نے علیزہ کی بات پر صداقت کی مہر لگا دی تھی۔ ڈاکٹر جیسے جسیم شخص کے لیے اس قدر پھرتیلے انسان کو پکڑنا ناممکن تھا۔

اس لیے اس نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی اور پولیس کو مطلع کرنے لگا۔ خوفزدہ مہک اور ناراض علیزہ کو ڈراپ کرنے البتہ اس دن اسے خود ہی جانا پڑا۔

☆☆☆

فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ خاور تھوڑی دیر تک تو انتظار کرتا رہا مگر شاید مہک کہیں مصروف تھی... یا گھر میں غیر موجود۔

وہ لکھنے میں مصروف تھا اور لکھتے ہوئے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر جانا ہمیشہ کوفت کا سبب بنتا تھا۔ رواں خیالات میں اچانک رکاوٹ آجائے تو سارے تصورات منتشر ہو جاتے ہیں۔

اس نے ایک بار اور فون کو بجنے دیا کہ شاید دوسری جانب موجود فرد مایوس ہو کر کال ہی کٹ کر دے مگر بیل بند ہوتے ہی دوبارہ بجنے لگی۔

''ہیلو خاور بات کر رہا ہوں۔'' سی ایل آئی پر نمبر اجنبی تھا۔

''خاور ہو یا ٹاور، ایک بات کان کھول کر سن لے۔ تیری لڑکی نے شفیق لکلے سے پنگا لیا ہے۔ ابھی جیسے ہی موقع ملے گا ہم اس کا حلیہ بگاڑ دیں گے۔ ہمارا نقصان اب یہ چھٹنکلی پورا کرے گی۔ انتظار کرنا۔'' بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جرائم پیشہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر خاور کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی تھی۔ اس کا ذہن فوراً ہی پچھلی رات ڈاکٹر شاہد کے گھر پر ہوئے واقعے کی طرف چلا گیا۔

مہک نے اسے تمام بات مع اپنے خدشات کے بتائی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگ علیزہ کی وجہ سے ہوئی ناکامی کو بھولیں گے نہیں۔ اور اس کے خدشات من وعن درست ثابت ہوئے تھے۔

''میرے خدا!'' اس نے ریسیور رکھ کر سر تھام لیا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کوئی گھر میں موجود نہیں تھا۔ شاید مہک بچی کو ساتھ لے کر کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ وحشت کے عالم میں مسلسل دروازے کو گھور رہا تھا۔ پھر جیسے کوئی خیال آیا اس نے فون اٹھا کر مہک کو کال ملانی شروع کر دی۔

بیل کہیں قریب سے ہی سنائی دی۔ اس نے متلاشی نگاہ گھر میں دوڑائی تب ہی مہک مسکراتی ہوئی علیزہ کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ اور خاور کو یوں محسوس ہوا جیسے ڈوبتے دل کو قرار آ گیا ہو۔ اس نے مہک کو اس مجرم کی کال سے بے خبر رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنی بچی اور بیوی کی پُرسکون مسکراہٹ ان سے چھین نہیں سکتا تھا۔

''حد ہوتی ہے بے پروائی کی۔'' وہ وہیل چیئر اس کے نزدیک لے گیا۔

''تم لوگ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنا فون بھی لے کر نہیں جاتے۔'' اس کا انداز شکایتی تھا مگر چہرہ مسکرا رہا تھا۔

''ارے یہیں پاس میں گئے تھے۔ کالونی کا چکر لگانے۔''

''چلو اچھا کیا کالونی کو آخری بار دیکھ لیا۔ کیونکہ اب ہم یہاں سے شفٹ ہو رہے ہیں۔'' اس نے دھماکا کیا۔

''کہاں شفٹ ہو رہے ہیں اور کیوں؟'' مہک ہراساں سی ہو گئی۔ خاور کو اسی سوال کی توقع تھی۔

''ہم یہ گھر کرائے پر دے رہے ہیں۔ جب تک میں کوئی مستقل کام نہیں ڈھونڈ لیتا۔ تمہیں معلوم ہے نا پریشانی میں ہمیشہ رشتے ساتھ نبھاتے ہیں۔ میرے رشتے نہ سہی۔ ان کی باقیات تو موجود ہیں۔ ہمیں گاؤں چلنا ہوگا۔''

☆☆☆

وہ ایک اونچی سی سطح چٹان تھی۔ جس کے ایک کونے پر کھڑے ہو کر دیکھا جاتا تو نیچے بھورے پتھروں پر پھیلا سبزہ اور چیڑ وصنوبر کے درخت دور تک بکھرے ہوئے نظر آجاتے۔ یہ جگہ تمدنی زندگی کی آخری لکیر تھی۔ اس سے آگے جنگلی حیات اپنے پورے رنگ میں جلوہ افروز تھی۔

چٹان ایک ڈھلان کی صورت میں نیچے موجود گاؤں تک چلی گئی تھی۔ نہ جانے خاور کے اجداد نے گھر بنانے کے لیے اس الگ تھلگ مقام کا انتخاب کیوں کیا تھا جہاں وسیع وعریض قطعۂ زمین پر بس چند ایک مکانات ہی موجود تھے۔ خاور نے یہاں منتقل ہونے سے پہلے گاؤں میں اپنے والد کے واقف کاروں اور دوستوں سے رابطہ کر کے مکان

کی ضروری حالت بہتر کروالی تھی۔ اب وہ کم از کم رہائش کے لیے تیار تھا۔ بقیہ کام وہاں رہ کر بھی نمٹائے جاسکتے تھے۔ جس میں سرفہرست اس کنارے پر لکڑی کا جنگلا لگانا تھا۔ ایک ایسی فیملی جس میں چھوٹی بچی موجود ہو۔ وہاں کسی قسم کی بے پروائی ہمیشہ کے لیے پچھتاوے کا سبب بن سکتی تھی۔ خاور نے چہار اطراف نگاہ دوڑائی، وہ کافی کوشش کے باوجود ایک ہفتے سے پہلے شہر سے نہیں نکل سکے تھے۔ اس تمام عرصے میں اس نے کسی نہ کسی طرح دونوں ماں بیٹی کو گھر تک محدود رکھا تھا۔

سہ پہر کے وقت یہاں پہنچتے ہی علیزہ جیسے خوشی سے پاگل سی ہوگئی تھی۔ منع کرنے کے باوجود وہ کبھی دوڑ کر ایک طرف جاتی تو کبھی دوسری طرف۔ مزدور سامان اتار کر جاچکے تھے۔

مہک گھر کے اندر سامان سیٹ کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے چہار اطراف نگاہ دوڑائی۔ وہ سہ پہر میں یہاں پہنچے تھے۔ اور اب ڈھلتی شام کے ساتھ موسم میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔ سورج ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے علیزہ کو آواز دی جو چٹان پر موجود خالی مکانات کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ''پاپا! یہ کس کا گھر ہے؟'' اس نے بے ترتیبی سے بنے تین خالی کاٹیجز میں سے ایک کی جانب اشارہ کیا جس کی حالت باقی دو سے کافی حد تک بہتر تھی۔ وہ تینوں کاٹیج وقتاً فوقتاً بنائے گئے تھے۔ جن میں سے سب سے قدیم وہی تھا جس میں ان لوگوں کو رہائش اختیار کرنی تھی۔ اپنے آبائی گھر کی جانب دیکھتے ہوئے اسے ایک پل کو اپنا پورا بچپن وہاں در و دیوار سے جھلکتا ہوا نظر آیا تھا۔ اسے والد صاحب سے ہوئی آخری ملاقات یاد آئی۔ وہ ان سے زوردار بحث کے بعد گھر چھوڑ کر شہر چلا آیا تھا جبکہ وہ اکلوتے بیٹے کے اتنی دور جانے کے خلاف تھے۔ بحث کا مدعا یہی تھا۔ اور اس کے بعد خاور کے فون پر رابطہ رکھنے کے باوجود کبھی انہوں نے اسے اپنے پاس رہنے کو نہیں کہا۔ اسے اپنی ضد اور اکڑ یاد آئی۔ تو نظر بے اختیار وہیل چیئر پر پڑی۔ جو وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا، ذہن از خود اسی جانب اشارے کر رہا تھا۔ اس نے دماغ سے لایعنی سوچوں کو جھٹکا... اور اس ... کاٹیج کی جانب دیکھا جس کی جانب علیزہ نے اشارہ کیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ خالی ہونے کے باوجود اس کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جاتی رہی ہے۔

''یہاں سرمد انکل اور ان کی بیگم رہا کرتے تھے بیٹا۔ اب نہ جانے کہاں ہیں؟''

خیال رکھنا

سہانا موسم تھا اور پُرکیف ہوائیں چل رہی تھیں۔ بیوی نے اپنے شوہر کو پرس سے ٹکٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''سب سے اچھی فلم کہاں چل رہی ہے؟''

''موتی محل سینما میں۔'' شوہر خوش ہو کر فوراً بولا۔

بیوی نے مسکراتے ہوئے ٹکٹ واپس پرس میں رکھا اور کہا۔ ''میں ذرا اپنی سہیلی کے ساتھ فلم دیکھنے جارہی ہوں...... تم منے کا خیال رکھنا۔''

کراچی سے کاشف امان کا خیال

''اوہ۔ آپ انہیں جانتے تھے کیا؟''

''ہاں میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ بہت اچھے لوگ تھے وہ۔ مرید ضرور جانتا ہوگا ان کے متعلق۔ وہ بابا کے علاوہ سرمد انکل کے گھر کے کام کاج بھی نمٹادیا کرتا تھا اکثر۔ چلو پوچھتے ہیں۔ شکر ہے ابھی تک یہیں رہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اس جگہ تمہاری ماما پریشان ہوجاتیں۔''

''اور بابا باقی کے گھروں میں کون رہتا ہے؟''

''بیٹا یہ سمر ہاؤسز ہیں ان کے مالکان یہاں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یہاں سردی ہورہی ہے چلو اندر چلتے ہیں۔''

وہ غیر ہموار راستے پر چلنے میں بہت احتیاط برت رہا تھا۔

سیڑھی کے برابر میں ایک چوبی ڈھلان محض اس کی وہیل چیئر کی آمدورفت کے لیے بنادی گئی تھی تاکہ اسے کسی کی محتاجی محسوس نہ ہو۔

''بیگم صاحبہ آپ لوگ بہت اچھے موسم میں یہاں آئے ہیں۔ بہار شروع ہوچکی ہے اور وادی میں ہر طرف رنگ بکھرے ہیں۔ ایسے موسم میں یہاں گھومنے کا اپنا ہی لطف ہے۔'' وہ اندر داخل ہوئے تو دیواروں پر لگے لیمپوں کی سرخی مائل روشنی میں برتن ڈبوں سے نکالتا ہوا مرید اور انہیں کچن شیلف میں رکھتی ہوئی مہک نظر آئے۔

"تمہاری ماما کی طرح مرید بھی بہت بولتا ہے۔ دونوں کی خوب گزرے گی۔" خاور نے علیزہ کے کان میں سرگوشی کی۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ابھی تک کچن ہی سیٹ ہو رہا ہے۔ لگتا ہے آج بھوکا رہنا پڑے گا۔" اس نے مہک کی جانب دیکھ کر مصنوعی بے چارگی سے کہا تو وہ اونچے سے اسٹول سے نیچے اتری۔

"آج کھانا نہیں بن سکتا مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم آج مرید کے مہمان ہیں۔ یہ لے آیا ہے ٹفن۔"

"ویری گڈ۔" اس نے توصیفی انداز اپنایا تو شلوار قمیص اور اونی ٹوپی میں ملبوس منحنی سے مرید کا چہرہ کھل اٹھا۔ یہاں آنے والے سیاحوں کا گائیڈ بن جانا یا پھر باہر سے رہائش کے لیے آنے والوں کی جز وقتی ملازمت ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ جب تک چٹان پر موجود کاٹیج آباد تھے، اسے کہیں اور جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ مگر اب حالات کافی بدل چکے تھے۔

"بھئی مرید! ایک بات تو بتاؤ۔ یہ پڑوس والے سرمد انکل اور ان کی وائف تو یہاں مستقل رہائش پذیر تھے۔ کہیں اور شفٹ ہو گئے کیا؟" اس نے دیکھا مرید کا چہرہ ایک پل کو افسردگی کی چادر میں لپٹ گیا۔

"مت پوچھیے جی۔ بہت برا ہوا بیچاروں کے ساتھ۔ سرمد صاحب کی بیگم ایک دن اچانک گھر سے غائب ہو گئیں۔"

"غائب ہو گئیں؟" خاور کا منہ حیرت کے مارے پورا کھل گیا۔

"تمہارا مطلب ہے گھر سے چلی گئیں؟"

"نہ جی۔ بالکل غائب۔ جیسے زمین کھا گئی ہو۔ پولیس نے بڑا تنگ کیا جی سرمد صاحب کو۔ کافی دن ان سے پوچھتے رہے۔ بچے تو ان کے تھے نہیں۔ تو کچھ عرصے بعد خود ہی کیس بند کر دیا۔ آپ کے والد صاحب حیات ہوتے تو مجال تھی پولیس ان کو تنگ کرتی۔ بہت گہرے دوست تھے دونوں۔" مرید، خاور کے والد کے دور سے یہیں رہائش پذیر تھا لہٰذا بخوبی خاور کے والدین سے واقف تھا۔

"مگر اب وہ کہاں ہیں؟" وہ اپنی بے چینی پر خود بھی حیران ہوا۔ شاید والدین سے منسلک رشتے اور یادیں انسان کو یونہی بے چین کر دیا کرتے ہیں۔

"نیچے آبادی میں رہنے چلے گئے۔ ہمارے ہی علاقے میں رہتے ہیں اب۔ یہاں ویرانے میں خالی مکان میں رہتے تو پاگل ہو جاتے۔ آپ چلیں گے اُن سے ملنے؟"

اس نے کارٹن کھولتے کھولتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔" خاور نے خوش ہو کر کہا۔ تو اب تک خاموش بیٹھی مہک نے گھور کر دیکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں تنہا کہیں بھی جانے کی۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ کیوں علیزہ؟" اس نے علیزہ کی تلاش میں نگاہ اِدھر اُدھر دوڑائی اور خود کو پُرسکون کرنے کے لیے ایک گہری سانس لی۔ وہ پھر غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"مرید! اور کتنا کھینچو گے یار۔ اور کتنا دور ہے سرمد انکل کا گھر۔ یہ پتھریلے راستے تو جان نکال دیں گے۔ اتنا تو میں یہاں آتے وقت بھی نہیں چلا تھا۔" وہ ران میں اٹھتی ٹیسوں سے کافی بیزار ہو چکا تھا۔ چار افراد کا مختصر سا قافلہ گاؤں کی کچی دیواروں کے درمیان بنی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزر رہا تھا۔ سخت پتھریلی زمین پر نہ چاہتے ہوئے بھی وہیل چیئر جھٹکے کھا جاتی اور خاور تکلیف سے تلملا جاتا۔ آس پاس سے گزرتے لوگ مرید کو دیکھ لیتے تو خاور کو پہچانے بنا سلام جھاڑ دیتے۔

مرید اگلے ہی دن وعدے کے مطابق انہیں سرمد نامی اس پڑوسی کے گھر لے جانے کا وعدہ وفا کرنے آ پہنچا تھا۔ جس کا مہک نے ابھی تک صرف ذکر ہی سنا تھا۔ اور اب وہ کافی متجسس انداز میں اس پہاڑی گاؤں کے لوگوں کے طور اطوار ملاحظہ کر رہی تھی۔

چھوٹے چھوٹے بچے آنکھوں میں تجسس اور اشتیاق لیے انہیں دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔

"خاور تم نے کبھی بتایا نہیں کہ آخر کیا وجہ تھی جو تمہیں اس قدر خوبصورت جگہ اور والدین کو چھوڑ کر یہاں سے نکلنا پڑا۔"

مہک نے اچانک پوچھا۔ جو گلیوں میں کہیں کہیں جھلک دکھاتی ان دور دراز سبزے سے جھانکتی پہاڑیوں کو مسحور کن انداز میں دیکھ رہی تھی۔ پورا گاؤں ہی ایک پہاڑی کی ڈھلان پر واقع تھا۔ اور یہ لوگ بتدریج اس کی اترائی میں جا رہے تھے۔

خاور اس کا سوال سن کر مسکرایا۔

"بابا اسلحے کے بہت اچھے کاریگر اور ڈیلر تھے۔ ہر طرح کا ہتھیار بنانے میں ماہر۔ بقول ان کے اگر بھاری پانی مل جاتا تو وہ ایٹم بم بھی بنا لیتے ہاہا۔ بعد میں مگر انہوں نے صرف دکانداری کو ترجیح دی۔ وہ چاہتے تھے میں ان کا

کام سنبھالوں مگر تم جانتی ہو یہ دو اور دو چار کرنا یا گولی بارود سے کھیلنا میرا مزاج نہیں تھا۔ میں پڑھ رہا تھا اور کوئی صاف ستھری جاب کرنا چاہتا تھا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''بس یہیں سے میرا اُن سے اختلاف شروع ہوا۔ اس کے بعد نہ وہ پیچھے ہٹے نہ میں نے ہار مانی۔ اس علاقے کی معاشرت کے حوالے سے میرا رویہ بزدلی پر مبنی تھا۔ میں ان کے لیے شرمندگی کا باعث تھا اور......''

''یہ لیجیے آگیا میرا آشیانہ۔ اور چند قدم پر سرمد صاحب کا گھر ہے۔ پہلے کہاں چلیے گا؟'' مرید خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ بولا تو منزل پر پہنچ کر ہی بولا۔

''جہاں تمہیں بہتر لگے۔'' اس نے سوچنے کی محنت بھی اسی پر ڈال دی۔

''میرے خیال سے سرمد انکل کے گھر چلتے ہیں۔ مجھے کافی تجسس ہے ان سے ملنے کا۔'' مہک نے جلدی سے مداخلت کی تو مرید نے وہیل چیئر آگے بڑھا دی۔

وہ ایک لکڑی اور پتھروں کی مدد سے تعمیر شدہ چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کاٹیج کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے کار کے مقابلے میں بائیک کی۔ مکان کو صاف ستھرا اور بہتر حالت میں رکھنے کی کافی کوشش کی گئی تھی۔

چھوٹے سے لکڑی کے سبز دروازے کے دونوں اطراف بنی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں پھولوں سے مزین گملے رکھے گئے تھے۔

نیچی سی کھپریل کی چھت پر سرخ اور دیواروں کے سیاہ پتھر کی درمیانی لکیروں پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔ جو آنکھوں کو بھلا محسوس ہو رہا تھا۔

مرید نے آگے بڑھ کر دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک ساٹھ سالہ دراز قد شخص نے دروازہ کھول کر چندھی چندھی آنکھوں سے باہر جھانکا۔

خاور نے انہیں کافی عرصے بعد دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ ایک توانا اور صحت مند انسان تھے۔ مگر اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ وزن کم ہو کر اب وہ کچھ اور طویل قامت محسوس ہونے لگے تھے۔ دروازہ کھولنے پر ان کی پہلی نگاہ ہی مرید پر پڑی تھی۔ اس پر نظر پڑی تو ایک خوشگوار مسکراہٹ نے ان کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا اور تب انہوں نے خاور کو دیکھا اور چہرے پر جیسے قمقمے سے جل اٹھے۔ وہ یقیناً اسے پہچان چکے تھے۔ مرید نے انہیں ان کی آمد کے متعلق بتایا ہوگا۔ یہ خاور کا اندازہ تھا جو بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ وہ آہستگی سے دہلیز

یہ جیل بھرا ہوا ہے۔ قید تنہائی کے دس دس مجرم ایک ساتھ رہتے ہیں۔

عبور کر کے باہر آئے تو ہاتھ میں ایک عدد چھڑی موجود تھی۔ وہ چھڑی ٹیک کر چلتے تھے۔ پُلوں کے نیچے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ اس نے سوچا۔

''یقین نہیں آتا...... سوچا نہیں تھا دوبارہ اکبر کو یوں اپنے سامنے دیکھ سکوں گا۔ تمہیں خدا نے اسی کے سانچے میں ڈھال کر بنایا ہے۔'' وہ اس کے سر کو پیار سے تھپکتے ہوئے بولے۔ اکبر، خاور کے والد کا نام تھا۔ اور وہ سرمد صاحب کے بہترین دوست تھے۔

اگر وہ اسے دیکھ کر جذباتی ہو گئے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ وہ واقعی اپنے والد کی بنی بنائی تصویر تھا۔ نوعمری تک وہ باقاعدہ اپنے والد کے ساتھ ہر کام میں شامل رہا کرتا تھا۔ انہوں نے اسلحہ سازی کا اپنا ہنر تمام کا تمام بیٹے میں منتقل کر دیا تھا۔ مگر وہ یہ بات کبھی کسی کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اکبر صاحب نے موت سے پہلے وہ تمام کاروبار کس کے ہاتھ فروخت کیا۔

''تم آؤ اندر آؤ۔ رکو میں وہیل چیئر اندر لانے کے

لیے کچھ تختہ وغیرہ لاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کھڑا ہو جاتا ہوں مرید کرسی اندر پہنچا دے گا۔" خاور بمشکل مرید کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک بزرگ کو چھڑی کے سہارے ہونے کے باوجود کھڑا ہوا دیکھ کر وہ ویسے ہی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

گھر اندر سے بھی ویسا ہی مختصر تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے سے گزر کر وہ ایک کھلے صحن میں جا پہنچے جہاں درمیان میں لگے سیب کے درختوں پر بیٹھے پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول کے سناٹے کو درہم برہم کر رہی تھی۔

وہیں دو مزید کمرے بھی موجود تھے۔ کمروں کی داہنی جانب شاید باورچی خانہ تھا۔ وہ چھوٹا مگر پرسکون مکان تھا۔ لکڑی کی بھاری سلوں پر بنائی گئی کھپریل کی نیچی چھتوں والے یہ کمرے دن میں بھی تاریک سے محسوس ہوتے تھے۔

"تم لوگ اندر بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ ایک نسبتاً کشادہ کمرے میں انہیں بٹھا کر خود لاٹھی ٹیکتے باہر برآمدے میں اوجھل ہو گئے۔

مہک نے طائرانہ انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ مکان کی بوسیدگی سے قطع نظر مکین کا سلیقہ اور طبیعت کی نفاست ہر شے سے ظاہر تھی۔ کمرے کے فرش کو سرخ قالین نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک جانب رکھے صوفہ سیٹ کو انہوں نے اپنی نشست بنالیا۔ دیواروں پر لگی تختیوں کا جائزہ لیتی اس کی نگاہ صوفے کی عقبی دیوار پر لگی ایک بڑی سی روغنی تصویر پر پڑی۔

"یہ کون ہے خاور!؟"

"یہ سرمد صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں جی۔ بہت ہی نیک دل خاتون تھیں۔ اللہ جنت نصیب کرے۔"

خاور کے بجائے مرید نے جواب دیا۔ مہک نے دوبارہ پینٹنگ کی جانب دیکھا۔ وہ ایک چالیس تا پینتالیس سال کی ایک باوقار خاتون تھیں۔ سیاہ آنکھوں اور ستواں ناک نقشے کی حامل وہ خاتون یقیناً سرمد صاحب کی زندگی میں اہم حیثیت رکھتی تھیں۔ لاٹھی کی آواز پر اس کی توجہ دروازے پر مرکوز ہو گئی۔ وہ سرمد صاحب تھے۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا سیاہ البم تھامے۔

"یہ دیکھو...... اس میں تمہاری تمام تصاویر ہیں۔ اور اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔ میرے پاس بہت سی باتیں تھیں، یادیں تھیں۔ یہ مرید تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ مجھے بہت اچھا محسوس ہوا تمہارے آنے سے۔" وہ خاور کے قریب نشست پر براجمان ہو گئے۔

"سرمد انکل! وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے۔ جب انسان خوش اور مگن ہو۔ اسے کبھی پیچھے رہ جانے والوں کا خیال تک نہیں آتا۔ پلٹ کر تب دیکھتا ہے، جب آگے راستے بند نظر آئیں۔ میرے لیے بھی آگے راستے بند ہونے لگے تب اپنا پیچھا یاد آیا۔"

خاور نے مسکراتے ہوئے بات شروع کی مگر اختتام تک ماضی کی پرچھائیاں نمی بن کر آنکھوں میں جھلملانے لگیں۔

"اکبر بہت یاد کرتا تھا تمہیں...... اور تمہاری ماں بھی۔ اکثر نورین سے تمہاری ہی باتیں کیا کرتی تھی۔" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو کر فرش کو گھورنے لگے۔

خاور بھانپ گیا کہ گمشدہ شریک سفر کی یاد نے یلغار کی تھی۔ اس نے البم پر رکھا ان کی ابھری ہوئی رگوں والا ہاتھ تھپتھپایا۔

"یہ سب کیسے ہوا تھا انکل؟...... کیا آپ لوگوں کے درمیان کوئی بدمزگی ہوئی تھی؟" انہوں نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ وہ مجھ سے جھگڑا تو کجا کبھی بحث تک نہیں کرتی تھی۔ تم جانتے ہو، کس قدر صلح جو تھی وہ۔ بس نہ جانے کیا ہوا۔ وہ سردی شام تھی۔ اکتوبر شروع ہو چکا تھا۔ وہ ویسے تو خود ہی خریداری کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔ یا پھر مرید کو بھجوایا کرتی مگر اس دن وہ کچھ پریشان تھی۔ ذہنی طور پر منتشر۔ مرید بھی غیر حاضر تھا۔ اس کی بیوی کی طبیعت ناساز تھی۔ مجھے ہی جانا پڑا...... کاش میں انکار کر دیتا......" انہوں نے سر جھکا۔ ایک شفاف قطرہ البم کے سیاہ کور پر آ پڑا۔ خاور نے دیکھا مگر کمال خوبی سے نظر انداز کر دیا۔ اگر ایک تنہا بوڑھا اپنی یادوں کے مرقد پر آنسوؤں سے شبنم افشانی کر رہا تھا تو بہتر تھا، اسے ٹوکا نہ جاتا۔ نہ جانے کب سے یہ آنسو کسی ہمدرد کندھے کے منتظر تھے۔

"پھر کیا ہوا انکل؟" اس نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔ لہجے میں زخموں پر رکھے کپاس کے پھاہوں کی سی نرمی تھی۔

"میں جب واپس آیا تو گھر خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا...... وہ یوں غائب ہو چکی تھی جیسے کبھی وجود ہی نہ رکھتی ہو۔ اس کا تمام سامان گھر میں موجود تھا۔ سوائے زیورات کے۔" انہوں نے پانی کا ایک گھونٹ لے کر سلسلۂ کلام

جوڑا۔

''پولیس مجھے تنگ کرتی رہی کہ شاید میں نے اسے مار دیا ہے۔ کسی اور عورت کے چکر میں۔ اولاد کی خاطر۔ پھر مرید مجھے یہاں لے آیا۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ جملہ حاضرینِ محفل ان کی جانب متوجہ تھے۔ مہک نے علیزہ کی جانب دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر بچی نے اپنی فطرت کے خلاف کافی صبر اور سکون کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور گھر سے نکلنے کے بعد سے بجائے سوالات کرنے کے ہر چیز کا جائزہ لینے میں وقت گزار رہی تھی یا شاید دوسرے فطین بچوں کے مانند وہ بھی زیادہ مشاہدے سے سیکھتی تھی۔ بہر حال یہ ایک اچھی علامت تھی۔

''میرے خیال سے مرید تمہیں کچن کا جائزہ لے کر وہاں سے کچھ پیسٹریز وغیرہ لے آنی چاہئیں۔ ہماری ننھی گڑیا پہلی بار یہاں آئی ہے۔ اور ہاں چائے میں چینی ٹھیک سے ڈالنا۔ تم ہمیشہ چینی ڈالنے میں ڈنڈی مار جاتے ہو۔'' وہ اچانک مرید سے مخاطب ہو کر بولے۔

''ٹھیک ہے میں خود کو ظالم ماننے کو تیار ہوں مگر یہ نہ بھولیں کہ آپ کو شوگر ہے بلکہ آپ پیسٹریوں کو بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔'' مرید جاتے جاتے اچانک پلٹا۔ اس کے مخاطب سرمد صاحب تھے۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے بھئی۔'' انہوں نے بیزاری سے ہاتھ ہلایا۔ مرید ہونہہ کرتا ہوا راہداری میں غائب ہو گیا۔

''یہ شخص بوڑھا ہو کر سٹھیا گیا ہے۔ خود کو میری بیوی سمجھنے لگا ہے۔'' انہوں نے مرید کے جاتے ہی خاور کے کان میں سرگوشی کی تو ایک بے اختیار قہقہہ اس کے حلق سے آزاد ہوا۔

واپسی کے سفر میں انہوں نے گاؤں کے کچے پکے راستوں پر تکلیف اٹھانے کے بجائے دوسرا راستہ چُنا۔ گاؤں کے باہر بڑے بازار سے ایک پختہ عمودی سڑک سیدھی پہاڑ کی چوٹی تک چلی گئی تھی۔ مرید انہیں ایک جانب رکنے کا اشارہ کرتا خود ایک گاڑی کی جانب دوڑ گیا۔ تب ہی خاور کو ایک بھاری بھر کم جسامت کا آدمی اپنی جانب آتا نظر آیا۔

''برادر! خاور!'' وہ دور سے چلّاتا ہوا آ رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ دو سو پونڈ سے زائد وزن اور گھنی داڑھی نے اس کی شخصیت کو اچھا خاصا بارعب بنا دیا تھا۔ خاور نے اسے بغور دیکھا۔ آخر یہ کون تھا جو اسے پہچانتا تھا۔ اور تب ہی ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ فرزین گل تھا۔ اس کا

دوست۔ وہ دبلا پتلا لمبا سا نوجوان اب ایک دیو قامت انسان میں بدل چکا تھا۔ یہی وجہ تھی جو خاور اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا مگر اس کی آواز اب تک ویسی ہی باریک تھی جیسی پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اس جسیم وجود کے پیچھے چھپا کوئی اور شخص بول رہا ہے۔

''یار! یہ کیا حال کر لیا تم نے اپنا۔'' خاور کے نزدیک پہنچتے ہی وہ جھک کر اس کے گلے لگ گیا۔ اس کی گرفت میں محسوس کی جانے والی گرم جوشی تھی۔

''سلام آلیکم خواہر۔'' اس نے پیچھے درختوں کی چھاؤں میں کھڑی مہک اور علیزہ کو دیکھا تو ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام جھاڑ دیا۔ مہک نے سر کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ دور کھڑی دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''تم سناؤ۔ یہ گوشت کا پہاڑ بن گئے ہو۔ لگتا ہے کریم چاچا کے بھیڑوں کا گلہ پورا کا پورا تمہارے پیٹ میں سما گیا ہے۔'' خاور نے اس کے پیٹ پر طبلہ بجایا۔ تو وہ نفیس سی آواز میں ہنس دیا۔

سلام دعا کے بعد خاور نے اسے گھر آ کے ملنے کو کہا اور آگے بڑھ گئے۔

''ایک بات کہوں خاور صاحب بُرا نہ مانیں تو......!''

مرید نے اس کے سامنے والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ کچھ دیر خاموشی سے کھڑکی کے پار دیکھتا رہا۔ پھر کچھ عجیب ..... انداز میں خاور سے مخاطب ہوا۔ اس وقت اس کا مؤدبانہ انداز غائب ہو چکا تھا۔ وہ برابری کی سطح پر خاور سے مخاطب ہوا تھا۔ حالانکہ الفاظ میں ایسا کچھ نہیں تھا مگر لہجہ یکسر تبدیل شدہ تھا۔ شاید وہ اس کا قدرتی انداز تھا۔ ورنہ وہ ہمہ وقت خود پر ایک مؤدبانہ سا خول چڑھائے رکھتا تھا۔

خاور نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''خاور صاحب، بڑے صاحب، آپ کے والد نے کبھی مجھے اجنبیت یا غیریت کا احساس نہیں دلایا۔ وہ میرے لیے بڑے بھائیوں کی طرح تھے۔ اور اسی لحاظ سے میں آپ کو چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔ کسی وجہ سے لاعلمی میں آپ کوئی نقصان اٹھائیں تو یہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔'' وہ سر جھکائے دونوں ہاتھوں کو دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔ خاور کو اس کا انداز بے چین کرنے لگا۔

''تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔ اس دل نے بہت کچھ سہا ہے۔ تھوڑا بہت اور سن کر مروں گا نہیں۔'' بات

کے اختتام پر اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی چھلک آئی۔

مرید نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ واضح طور پر مضطرب تھا۔ نہ جانے کیوں۔ پھر ایک گہری سانس لے کر جیسے ہمت کو جمع کیا۔

''یہ شخص فرزین خان، یہ وہی ہے جسے آپ کے بابا نے اپنا کاروبار فروخت کیا۔ آپ شاید یہ بات نہیں جانتے مگر اہم یہ نہیں۔ اہم یہ ہے کہ...... یہ...... یہ شخص مجرم ہے۔ اتنے عرصے سے جیل میں تھا۔ حال ہی میں رہا ہو کر آیا ہے...... اسے گھر بلانا مناسب نہیں ہے......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل بول رہا تھا۔ جیسے یہ ناگوار سچ خاور کے کانوں سے دور رکھنا چاہتا ہو۔ خاور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے لیے اس بات پر یقین کرنا بہت مشکل تھا مگر بتانے والا مرید تھا۔ اس کی بات پر شک کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ دونوں کے درمیان ناگواری خاموشی چھا گئی تھی۔

''کس جرم میں جیل گیا تھا؟'' کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

''ایک عورت سے زیادتی کے جرم میں۔'' مرید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ایک سرد سی لہر خاور کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ وہ خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ذہن فرزین گل کو گھر آنے سے روکنے کے لیے کوئی بہانہ سوچنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ طے تھا کہ اسے گھر جا کر فوراً فرزین کو فون کر کے گھر آنے سے روکنا تھا۔

☆☆☆

''چلو بے بی ہم اس ویرانے کو گلشن میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھوری زمین کچھ جچ نہیں رہی۔ کچھ رنگ ہونے چاہئیں۔'' اتوار کا خوشگوار سا دن تھا۔ مہک باورچی خانے میں گھسی علیزہ کا فرمائشی ناشتا تیار کر رہی تھی۔ جب خاور کو گھر سے باہر دیکھتے ہوئے اس حصے میں سبزے کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

کاٹیج کے باہر بنے ایک چھوٹے سے اسٹور سے باغبانی کا سامان نکال کر اس نے گھر کے عقب میں موجود جھاڑیوں میں ٹڈیوں کا پیچھا کرتی علیزہ کو آواز دی۔ جواباً مکان کے اندر سے لاؤنج کا بھاری سامان سیٹ کرتا ہوا مرید برآمد ہوا۔

''یہاں کی زمین بہت سخت ہے صاحب۔ آسانی سے کسی کو خود تک رسائی نہیں دیتی۔ بڑے پتھر توڑنے پڑتے ہیں۔ مگر اتنی ہی زرخیز بھی ہے۔ ایک بار بیج کو اپنا لے تو اپنی تمام قوت اور نمو اس میں سمو دیتی ہے۔ آپ اکیلے سے نہ ہو گا۔ میں بتاتا ہوں کہاں کیاریاں بنانا مناسب ہو گا۔'' وہ مسکراتا ہوا چوبی سیڑھیاں اتر کر اس سے اوزاروں کا تھیلا تھامتا ہوا بولا۔

''احتیاط سے اس میں پھولوں کے بیج بھی ہیں۔ گر گئے تو سمیٹتے پھرو گے۔''

وہ اپنے کام میں اس درجہ منہمک تھا کہ وہ کس وقت آئی اسے علم تک نہ ہو سکا۔ وہ چونکا تب جب علیزہ نے اس کو مخاطب کیا۔

''پاپا! میں نے کچھ دیکھا...... بہت بُرا۔ ایک ماسک بالکل ڈھانچے جیسا۔ اور ہڈیاں۔'' وہ شدتِ خوف سے کانپ رہی تھی۔

مرید بھی ہاتھ روکے تشویش سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا؟ کیسا ماسک؟ کہاں؟ مجھے دکھاؤ۔''

خاور نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اور خود سے نزدیک کر لیا۔ اسے اس وقت تسلی کی ضرورت تھی۔

''وہ وہاں۔ گھر کے پیچھے۔ جہاں پیلے پھولوں والے پودے ہیں۔''

مکان کے پیچھے کی زمین نسبتاً نرم تھی۔ وہاں آگے خودرو پودوں میں حشرات کی بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں۔

''کہاں کس جگہ دیکھا تھا؟'' خاور نے پوچھا۔

''ادھر اس جگہ۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

''یہاں تو کچھ نہیں ہے بیٹا۔'' مرید نے جھاڑیاں ہٹائیں اور ہنسا۔

''کوئی جانور ہو گا چھوٹا۔''

''مرید انکل! یہاں نہیں زمین کے نیچے دیکھا۔ آپ کو کیسے نظر آئے گا؟'' اس کا لہجہ کچھ تند ہو گیا تو مرید نے نہ سمجھنے والے انداز میں خاور کو دیکھا جو گم صم سا علیزہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد علیزہ نے کافی عرصے بعد پھر سے پرانی بیماری کی علامتیں ظاہر کی تھیں۔ ورنہ بے شمار سرگرمیاں اسے ہر وقت مصروف رکھتی تھیں پھر جیسے اسے ہوش آیا۔

''بیٹا! آپ گھر میں جا کر دیکھو ناشتا تیار ہوا یا نہیں جب تک میں اور انکل مرید مل کر یہاں ماسک ڈھونڈتے ہیں۔ اوکے؟''

اس نے نرمی سے بچی کے چہرے سے بال سمیٹے۔

اس کی بات سے خاور کا ذہن ایک عجیب ہی رخ پر چل پڑا تھا۔ اور اس رخ پر وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کیسے تاثرات تھے کہ بچی جو ضد کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی، خاموشی سے گھر میں دوڑ گئی۔

مرید خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔

''پریشان نہ ہوں خاور صاحب۔ بٹیا ایسے ہی ڈر گئی ہو گی۔ کچھ نہیں ہے یہاں۔''

''تم نہیں جانتے مرید! وہ کیا کہہ رہی تھی۔ ایسا کرو۔ گڑھے کھودنے والا وہ بڑا بیلچہ اور کدال لے آؤ۔'' مرید نے اسے حیرت سے دیکھا مگر کچھ کہنے سے گریز کیا اور خاموشی سے اسٹور کی جانب چلا گیا جہاں چھوٹے بڑے ہر طرح کے بیلچے کدالیں اور دوسرے اوزار موجود تھے۔ اسے خاور کی ذہنی حالت مشکوک محسوس ہو رہی تھی۔

''لے آیا جی اب بتائیں کیا کرنا ہے؟'' وہ ایک کندھے پر بیلچہ اور دوسرے پر کدال رکھے کھڑا تھا۔

''اس جگہ کھدائی کرو۔'' خاور نے ایک جگہ انگلی سے اشارہ کیا یہ وہی جگہ تھی جہاں مرید نے علیزہ کے کہنے پر تلاشی لی تھی۔ وہاں بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کھدائی کے لیے وہ جگہ بہت مشکل تھی۔ اسے مرید کی شکل دیکھ کر رحم آیا مگر چیک کرنا ضروری تھا۔

''خاور بھاؤ آخر آپ ڈھونڈ کیا رہے ہیں......کوئی خزانہ؟'' اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے کھدائی کر رہا تھا۔ اور اب کوئی تین فٹ تک گہرے گڑھے میں کھڑا تھا۔

''میرے خیال سے تم غلط جگہ کھدائی کر رہے ہو۔ تمہیں یاد ہے علیزہ نے اسی جگہ اشارہ کیا تھا۔'' اس نے بے چین ہو کر چہار اطراف نگاہ دوڑائی دھوپ کی حدت اب چبھنے لگی تھی۔

''معلوم نہیں جی، بلا کر پوچھ لیں۔'' مرید نے مفت مشورہ دیا۔

''اسے تو اب تک بھول بھی چکا ہوگا۔ تم یوں کرو آخری بار اس جگہ کھدائی کرو جہاں وہ کھڑی تھی۔ دیکھو وہاں پودے کچلے ہوئے ہیں۔'' اس نے موجودہ گڑھے سے تین فٹ دور ایک جگہ اشارہ کیا۔

''اچھا خاور صاحب آپ بے شک نہ بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے مگر میرا اندازہ ہے کہ آپ گڑھے کھدوا کھدوا کر یہاں درخت لگانا چاہ رہے ہیں مگر یہ بتا دوں جی کہ اتنی مشقت کے لیے یہ وقت بالکل مناسب نہیں، میں نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا۔'' وہ اتنی محنت کے بعد بھی شگفتگی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن لہجے میں بے چارگی چھپی تھی۔

خاور کو یکدم اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ واقعی ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ خالی پیٹ اتنی محنت مرید کی عمر کے انسان کے لیے آسان نہیں۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم باہر آ جاؤ۔ وہاں بعد میں دیکھ لیں گے۔'' اس نے اجازت دی تو وہ بیلچہ باہر اچھالتا ہوا دونوں ہاتھ گڑھے کے کنارے پر رکھ کر باہر کی جانب اچھلا۔ اسی وقت کنارے پر رکھی کدال اس کا ہاتھ لگنے سے گڑھے میں جا گری۔ ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔

''مر گیا۔ ہائے مر گیا۔ میری ٹانگ۔ میرا پیر۔'' وہ پیر پکڑ کر ناچ رہا تھا۔ کدال اس کے پیر پر گری تھی۔ اور اب کھدائی تو کھدائی گھر کے دوسرے کام بھی خاور کو کھٹائی میں پڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔

☆☆☆

''ہم پولیس کو نہیں بتا سکتے خاور! اس طرح کے معاملات میں پڑنے کا نتیجہ تم پہلے بھی دیکھ چکے ہو۔ جب علیزہ نے ڈاکٹر شاہد کے گھر پر اس ڈرائیور کی چوری کی نشاندہی کی تھی۔ ہم کتنا خوفزدہ ہوئے تھے۔ اب تم وہاں کھدائی کر کے دوبارہ اس کہانی کی ابتدا کرنا چاہتے ہو۔ نہیں نہیں یہ اچھا آئیڈیا نہیں، میرے خیال سے جو جیسا چل رہا ہے، اسے ویسے ہی رہنے دو۔ ویسے بھی کیا معلوم وہ کوئی ڈھانچا ہے۔ ہو سکتا ہے ماسک ہی ہو۔'' وہ توس پر جام لگاتے ہوئے جلدی جلدی بول رہی تھی۔ خاور نے علیزہ کے ساتھ صبح میں ہوئے واقعے کی تفصیل مہک کے علم میں لانا ضروری سمجھا تھا۔ اب وہ پولیس کو بلانا چاہتا تھا۔

جبکہ مہک شدت سے اس بات کی مخالف تھی۔ ابھی تو وہ اس حقیقت سے بھی ناواقف تھی کہ شہر سے اس گاؤں میں منتقل ہونے کے پیچھے دراصل کیا وجہ تھی۔ ورنہ اس کا رویہ زیادہ شدید ہوتا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اس جگہ ہم سے پہلے بابا اور اماں رہائش پذیر تھے۔ ایسے میں کیا تمہیں تجسس نہیں کہ معلوم کیا جائے وہاں دراصل کون دفن ہے۔ شاید میرے کسی جدِ امجد کا جسدِ خاکی ہی ہو۔ اس طرح میں اسے بہتر جگہ دفن کر سکتا ہوں۔''

''خدا کے لیے خاور! پلیز یہ وہمی باتیں چھوڑو اور گڑے مُردے مت اکھاڑو۔ یہ کھاؤ۔'' بات کے اختتام پر

اس نے پلیٹ میں توس پٹخا تو خاور بدمزگی پھیلنے کے خیال سے چپ ہو گیا مگر ذہن میں بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

اس نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ زمین کھود کر حقیقتِ حال جاننے کا خیال اس کے ذہن میں پنجے گاڑھ کر بیٹھ گیا تھا مگر وہ کسی کو شریکِ راز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر خاموشی اختیار کرنا بہتر جانا۔ مرید زخمی ہونے کے بعد گھر جا چکا تھا۔ اس نے پورا دن یونہی فضول مصروفیات میں گزار دیا۔ مہک رات کے کھانے کے بعد علیزہ کو لے کر اس کے بیڈروم میں گھس گئی اب وہ کافی دیر تک اس کے ساتھ مصروف رہتی۔ تب اس نے لائٹ اٹھائی اور باہر کا رخ کیا۔ لکڑی کا فرش وہیل چیئر کی وجہ سے آواز پیدا کرتا تھا۔ لہٰذا وہ بہت احتیاط کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ مزید کھدائی کا تھا۔ اور اس کے لیے وہ مرید کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

تمام کھدائی کا سامان وہیں موجود تھا۔ جوشِ جذبات میں وہ گڑھے کے کنارے تک آ تو گیا مگر یہ نہیں سوچا کہ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے وہ یہ مشقت طلب کام کرے گا کیسے۔ حقیقت ہے۔ خیالوں میں تو انسان کے لیے چاند پر جانا بھی مشکل نہیں۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب اس کے لیے عملی طور پر قدم اٹھایا جائے۔ ماحول پر ایک جامد سناٹا طاری تھا۔ آسمان پر دھندلا سا چاند سر ابھارنا شروع ہی ہوا تھا۔ اس کی روشنی ناکافی تھی۔ اس نے طاقتور سرچ لائٹ مٹی کے ٹیلے پر رکھی اور ہمت مرداں مدد خدا کا نعرہ لگا کر کدال اٹھائی۔ حادثے کے بعد اس کا وزن تیزی سے کم ہوا تھا۔ کدال بے حد وزنی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب ایک ٹانگ پر اپنا پورا بوجھ منتقل کیے وہ کھدائی کے لیے تیار تھا۔ کدال سر سے بلند کر کے اسے زور سے زمین پر دے ماری۔ ٹانگ میں درد کی لہر اٹھی تھی یا قیامت آ کر گزری تھی۔ وہ دہرا سا ہو گیا۔ وہیل چیئر کا سہارا لے کر اس پر ڈھیر ہوتے اور سانس اعتدال پر آنے تک اسے یہ تمام مشق ایک حماقت محسوس ہونے لگی تھی۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اس تمام صورتِ حال پر غور کر رہا تھا اور تب ہی اس کی نگاہ ایک متحرک شے پر پڑی۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا مگر سر پر پڑنے والی چوٹ نے مہلت دیے بنا اسے حواس سے بیگانہ کر دیا۔

☆☆☆

وہ کئی گھنٹوں سے اس خالی کمرے میں موجود تھا۔ اس کی درندوں جیسی حسیات کہہ رہی تھیں کہ آج کچھ غیر معمولی ہو گا۔ آخرکار رات کے آٹھ بجے اس کا یہ خدشہ سچ ثابت ہونا شروع ہو گیا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ اس نے جس راز کو کئی سال پہلے دفن کر دیا تھا۔ وہ آشکار ہو سکتا ہے بلکہ خوشی تھی تو اپنے وجدان کے سچ ثابت ہونے کی۔ اس مسئلے سے تو وہ بہت آسانی سے نمٹ سکتا تھا۔ مسئلہ بس یہ تھا اب اسے سب کچھ جلدی جلدی کرنا پڑتا۔ آج سالوں بعد رگ و پے میں پھر وہی سنسناہٹ دوڑنے لگی تھی جو اس دن ہوئی تھی۔ اسے وہ سرد دن یاد آیا۔ نورین کا وہ رونا گڑگڑانا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی معافی مانگنا۔ اس کے کانوں میں جیسے رس گھولنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ پوری طرح اس یاد سے لطف اندوز ہو سکے۔ دنیا کی کوئی موسیقی اس کراہٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو ایک سسکتے ہوئے دہانے سے برآمد ہوتی ہے۔ ہلکے روشن ماحول میں تیز روشنی بکھری تو اس کی بند آنکھوں کے پردوں پر بھی انعکاس پھیل گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور تمسخرانہ انداز میں خاور کو محنت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لیکن جب اس نے کدال اٹھائی تب وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سہارے کے لیے ہاتھ میں تھامی لاٹھی کو دیکھا۔ حقارت سے اسے دور اچھال دیا۔ اب مداخلت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ نہ جانے کتنی دیر تک غافل رہتا۔ لیکن اپنے ساتھ ہونے والی اٹھا پٹخ جلد ہی اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اسے مرید کے کھودے گئے گڑھے میں دھکیل کر اب اوپر سے مٹی ڈال رہا تھا۔

مٹی سے اس کا پورا چہرہ اور جسم بھر چکا تھا۔ آنکھوں میں پڑنے والی ریت نے اسے تقریباً اندھا کر دیا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھوں سے مٹی ہٹا کر ایک آنکھ سے دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت تیزی سے بیلچہ چلا رہا تھا۔ روشنی اس ـــ کے عقب میں تھی۔

ایسے میں وہ صرف ایک سیاہ سائے کے مانند نظر آ رہا تھا مگر اس کی جسمانی ساخت اتنی منفرد تھی کہ اسے پہچاننا خاور کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اسے بس یہ حیرت تھی اتنی جلدی وہ یہاں تک پہنچا کیسے۔ اس کا ذہن تیزی سے چھٹکارے کی سبیل سوچ رہا تھا۔

حملہ آور شاید اسے ہلتے جلتے دیکھ چکا تھا۔

”میں نے تمہیں رعایت دینے کی پوری کوشش کی تھی۔ میں اس مکان سے مسلسل تمہیں دیکھ رہا تھا۔“ سائے نے ہاتھ کے اشارے سے خالی کاٹیج کی جانب اشارہ کیا۔

”مگر بلی کو اس کے تجسس نے مروا دیا..... کتنا اچھا ہوتا تم سب کچھ اپنی جگہ رہنے دیتے۔ لاشوں کو ان کے مدفن سے

نکالنا اچھی بات نہیں ہے۔" وہ اپنی کھرکھراتی آواز میں بولا۔ اس وقت وہ اپنی عمر سے بہت چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

"مگر اتنی جلدی یہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔تم کیسے؟" خاور نے بمشکل جملہ مکمل کیا اور پھر بے تحاشا تھوکنے لگا۔ڈھیر ساری مٹی نے اس کے منہ میں جگہ بنالی تھی۔

"اوہ رہنے بھی دو۔ تمہیں یہ نہیں پوچھنا چاہیے۔یہ کاٹیج میرا دوسرا گھر ہے۔ یہاں مجھے ہر طرح کی آزادی میسر ہے۔ خیر! تمہیں دفن کرنے سے یہ فائدہ تو ہوگا کہ اب نورین یہاں تنہا نہیں ہوگی......اسے ویسے بھی محفلیں پسند تھیں۔" یہ کہتے ہی اس نے بیلچہ سر سے بلند کیا اور بیلچے کی زوردار ضرب نے خاور کو پھر سے بے ہوشی کی دنیا میں دھکیل دیا۔اب وہ دبے قدموں اسٹور کی جانب بڑھ رہا تھا۔اسے کچھ رسیوں اور تیز اوزاروں کی ضرورت پڑنے والی تھی۔

ادھر کمرے کی کھڑکی سے لگ کر باہر دیکھتی علیزہ کے لیے یہ سب ایک نئی سمجھ میں آنے والا منظر تھا۔اس نے صرف ایک کاٹیج سے ایک شخص کو برآمد ہوتے اور گھر کے پچھلے حصے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔تھوڑی دیر بعد وہ ان کے گھر کی جانب بڑھا تب وہ اسے پہچان گئی...... وہ مہک کی جانب گھومی جو اس کی ڈرائنگ بک پر کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑ کر ایک تصویر بنا رہی تھی۔

"ممعلیزہ اگر تم اسے دیکھوگی نہیں تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ کس طرح رنگوں کی ترتیب ایک کولاج کو شیڈ دیتی ہے۔ یہاں آؤ۔"

"ہیلو پیاری لڑکیو!" اس نے چونک کر دیکھا۔وہ مرید تھا۔

مہک کا منہ حیرت سے کھل سا گیا۔دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے وہ دروازے پر بت بنا کھڑا تھا۔وہ کس وقت اندر آیا تھا وہ بے خبر رہی تھیں، حالانکہ کاٹیج کا فرش چلنے پھرنے پر طوفانی آوازیں پیدا کرتا تھا۔صبح زخمی ہونے کے بعد وہ بہت مشکل سے لاٹھی کے سہارے یہاں سے نکلا تھا مگر اب بالکل آرام سے دونوں پیروں پر کھڑا تھا۔

"تم اس وقت؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور یہ بات کرنے کا کون سا انداز ہے۔" مہک کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

وہ یونہی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا مہک کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔یک ٹک اسے گھورتا ہوا۔مہک کو عجیب سا احساس ہوا۔اس نے مرید کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے پر غیر معمولی پن دیکھ کر چونک گئی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتا جنون اور چہرے سے جھلکتی وحشت۔ یہ وہ مرید نہیں تھا جو

بے چارہ

گداگر نے دروازے پر کھانے کے لیے صدا لگائی تو بیوی نے شوہر سے کہا۔ "بھگا دو اس مردود کو!"

"بُری بات ہے۔" شوہر نے اسے سمجھایا۔ "کسی کی اس طرح تحقیر نہیں کرتے، بے چارہ بھوکا ہوگا۔"

"نہیں......وہ اسی قابل ہے۔"

"کیا کیا ہے اس بے چارے نے؟"

"پرسوں میں نے اسے کھانا دیا تھا۔" بیوی نے غصے سے بتایا۔ "کل یہ کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتاب مجھے تھما کر چل دیا اور اب پھر ہمارے دروازے پر کھڑا ہے۔"

لاہور سے انجم خان کی ناراضی

"خراجِ تحسین"

ایک تقریب میں مودی صاحب کا تعارف ایک خاتون سے کرایا گیا تو خاتون بولیں۔ "مجھے آپ کی سب کتابیں بہت پسند ہیں...خاص طور پر وہ کتاب بہت اچھی تھی...کیا نام تھا اس کا...یاد نہیں رہا...کہانی بھی یاد نہیں آرہی...ارے بھئی وہی جس کے ٹائٹل پر ایک ایسی لڑکی کی تصویر تھی جس کی شکل ریما سے بہت ملتی تھی..."

سر جھکائے فرمانبرداری سے ان کا ہر کام کیا کرتا تھا۔

"ماما! اس سے دور رہیں۔ یہ آپ کو مارنا چاہتا ہے۔" اچانک علیزہ چلاتی ہوئی مہک کی ٹانگوں سے چپک گئی۔مہک نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا۔اور تب وہ کمر کے پیچھے چھپایا ہاتھ سامنے لایا جس میں بڑا سا پانا دبا ہوا تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔مگر یہ کرنا ضروری ہے۔" ہاتھ جونہی وار کے لیے سر سے بلند ہوا۔ وہ بچنے کے لیے ایک جانب سمٹی مگر ہاتھ کے نیچے آنے کی رفتار تیز تھی۔سر بچاتے ہوئے کندھا اس کی زد میں آیا۔ایک کربناک چیخ نے ماحول کو دور تک مرتعش کر دیا مگر وہاں کوئی ہوتا تو مدد کو آتا۔وہ درد سے بستر پر لوٹ پوٹ سی ہوگئی۔

"ممعلیزہ بھاگ جاؤ۔" اس نے کندھا ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے بچی کو پکارا۔وہ ماں کی آواز سننے سے پہلے ہی جست لگا کر باہر کا رخ کر چکی تھی۔مرید نے ایک نظر تیر کی طرح باہر جاتی بچی کو دیکھا۔پھر اسے نظرانداز کرتا ہوا مہک کی جانب متوجہ ہوا۔اس ننھی سی جان سے بعد میں بھی نمٹا جاسکتا تھا۔اس ویرانے میں یہ تینوں نفوس اس کے رحم وکرم پر تھے۔

"تم ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" مہک کو اپنی آواز لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کچھ نہیں میری جان! وہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ میں بس تمہاری اس خوبصورت کھال کو اتار کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کو کچھ عرصے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری چیخیں سننا چاہتا ہوں۔ بہت دلفریب ہوتی ہے وہ آواز۔ کسی تیز اثر نشے کی طرح۔ تمہیں بس تھوڑا سا درد ہوگا اور کچھ نہیں۔ چلو اب سو جاؤ۔" اس نے اچانک ایک زوردار گھونسا مہک کے چہرے پر جڑ دیا۔ ایک پل کو اس کی آنکھوں میں کرب کی جھلک نظر آئی۔ دوسرے ہی پل آنکھیں تیر گئیں۔

مرید نے کمرے کے باہر رکھا رسی کا بنڈل اٹھایا اور اچھی طرح اس کی مشکیں کس کر کسی بوری کے مانند اسے کندھے پر اٹھا لیا۔ اسی کے دوپٹے کو اس کے منہ پر باندھ کر اس کی ممکنہ چیخ و پکار کا راستہ وہ پہلے ہی بند کر چکا تھا۔

لاؤنج میں ایک صوفے کے پیچھے چھپی علیزہ اس کی تمام نقل وحرکت دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی ماں کو باندھ کر اس کے کمرے میں لے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خالی ہاتھ برآمد ہوا۔ اب اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

جیسے ہی وہ باہر نکلا، وہ تیزی سے خاور کے اسٹڈی روم کی جانب دوڑی۔ وہاں اس کا فون موجود تھا جس سے وہ اپنی خالہ کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ فون کا استعمال اس کی پرانی یادداشتوں میں محفوظ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مکان کا سامنے کا منظر عیاں تھا۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ کہیں اوجھل ہو چکا تھا۔ اسے حیرت تھی اس تمام عرصے میں خاور کہاں تھا مگر اسے ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا اس کے پاس۔

مرید کسی بھی وقت واپس آ سکتا تھا۔

اس نے تیزی سے کانٹیکٹ لسٹ میں نام ڈھونڈنا..... شروع کیا۔ اسی وقت اسے دوبارہ تختوں پر چلنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ وہ یکدم گھبرا گئی۔ بدحواسی میں موبائل ہاتھ سے چھوٹا تو فون کو پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ کسی انجان نمبر پر چھو گیا اور کال لگ گئی یہ بھی عجیب تھا۔ اس علاقے میں پہلی کوشش میں کال ملنا بذاتِ خود حیرت انگیز تھا۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا، وہ کال لاگ میں کی گئی آخری کال تھی جس کو اس نے ری ڈائل کر دیا تھا۔

"ہیلو کس سے بات کرنی ہے؟" کسی عورت کی آواز ابھری۔ علیزہ اس آواز سے ناواقف تھی۔

"پلیز ہیلپ می۔ ہمیں بچائیں۔ وہ میری ماما کو مار دے گا۔ وہ آ رہا ہے۔" قدموں کی آواز نزدیک آتی جا رہی تھی۔

"کون مار دے گا بیٹا؟ اس کا نام بتاؤ۔" فون اب شاید کسی مرد نے لے لیا تھا۔

"مرید۔" اس نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ کہا اور فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کیونکہ مرید کمرے کے دروازے پر کھڑا اسے خونخوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ فون پھسل کر میز کے نیچے چلا گیا۔

مٹی میں لت پت خاور اس کے کندھے پر لدا ہوا تھا۔ وہ ایک دراز قد شخص تھا اور مرید کے درمیانے قد کاٹھ پر بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

وہ دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگی تھی۔ "کس کو فون لگایا تم نے؟ جلدی بتاؤ۔" وہ چیخا تو بچی دہل کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے گڑیا رانی۔ تم نہیں بتاؤ گی کوئی بات نہیں۔ اب تم یہیں رہو۔ میں آ کر تم سے نمٹتا ہوں۔" اس نے کمرے میں آ کر خاور کو زمین پر پٹخا۔ وہ بے ہوش نہ ہوتا تو چیخ اٹھتا۔ بچی نے دوبارہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر اس بار وہ محتاط تھا۔ اس نے کمرے کو لاک کیا اور تختے چرچراتا ہوا پھر کسی کمرے میں گھس گیا۔

وہ بےفکر تھا کہ یہاں خاور کا کوئی شناسا نہیں۔ جو ہیں وہ کافی فاصلے پر ہیں، انہیں یہاں پہنچنے میں بہت وقت لگ جاتا۔ بس اب اسے ہر کام جلدی جلدی نمٹانا تھا۔ اس نے کمرے کے باہر رکھے تھیلے سے کچھ اوزار برآمد کیے جو وہ اسٹور سے جمع کر کے لایا تھا۔ اس کے ذہن پر خون کا سرخ رنگ مدہوشی طاری کر رہا تھا۔

نورین کے قتل کے بعد سے وہ اس سرور سے محروم رہا تھا مگر اب اسے دوبارہ موقع مل گیا تھا۔ اس نے دھیرے سے مہک کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی اور پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

اسے لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ہر وقت ہر ایک کی سنتا تھا۔ لہٰذا اس وقت وہ خود کو سب سے برتر محسوس کر رہا تھا۔ بازار سے اس کی بے راہ روی کی ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔ مگر یہ طلب کچھ بڑھ چکی تھی۔ ناآسودہ گھریلو زندگی اور بچپن سے کچلی خواہشات نے اس کی نفسیات کو کیسے مسخ کیا تھا، اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو کہ میں تمہارے ساتھ یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ وجہ بہت سادہ ہے۔ مجھے یہ کر

کے لطف آتا ہے۔" اس نے ایک اسکرو ڈرائیور نکالا اور مہک کے گال پر رگڑ دیا۔ منہ پر بندھے دوپٹے نے اسے چیخنے سے باز رکھا البتہ آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی تھی۔

"میں نے دیکھا ہے تم اپنے شوہر سے کس طرح بات کرتی ہو۔" وہ اس کے گال سے بہتے خون کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"تم مجھے بالکل اپنی بیوی اور نورین کی یاد دلاتی ہو۔ اسی کی طرح قابلِ نفرت۔ مرید یہ نہ کرو۔ مرید وہ نہ کرو۔ جیسے مرید کوئی جانور ہو جس کا پٹا ان کے ہاتھ میں ہو۔ اور جب مرید نے اس سے تھوڑی سی رقم مانگی تو وہ کسی کتیا کی طرح چلّانے لگی۔ جیسے میں نے بھیک مانگ لی ہو۔ خیر میں تمہیں بھی اسی طرح سنبھال لوں گا جیسے نورین کو سنبھالا تھا۔ بہت لطف آیا تھا جب وہ اپنے گھٹنوں پر گر کر زندگی کے لیے گڑگڑا رہی تھی۔ میں آج تک اس وقت کو یاد کرتا ہوں۔" اس نے جیسے خیالوں ہی خیالوں میں اس منظر کو دہرایا۔

"آج موقع ملا ہے اس پُرلطف تجربے کو دہرانے کا مگر تم یہ مت سوچو کہ باقی لوگوں کو یونہی چھوڑ دوں گا۔ آہ کتنا اچھا ہوتا تم وہیں رہتے شہر میں...... یہاں نہ آتے۔ اگر آ گئے تھے تو اپنے کام سے کام رکھتے تو شاید تمہارا شوہر اور وہ چھوٹی سی فسادی چڑیل بچ جاتی مگر افسوس تم جیسے والے لوگ خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو۔" اس نے ہلکا سا بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

"بس اب کچھ دیر کی بات ہے۔ اِدھر بیٹھو اور ڈرو مت تمہیں ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں بس تمہیں بے ہوش کروں گا۔ باقی کام یہ اونچی چٹان کرے گی جہاں سے تمہیں نیچے پھینکوں گا۔" اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ مہک اس کے لہجے کے اطمینان پر لرز کر رہ گئی۔ وہ اس شخص کے ساتھ کتنے ہی دن سے تھے اور اس سے بے خبر تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے یقین تھا وہ خاور کو بھی بے بس کر چکا ہے۔ اب تو خدا ہی ان کی مدد کر سکتا تھا۔

کمرے میں خاموشی پا کر مہک نے آنکھیں کھولیں۔ وہ سگریٹ جلا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جلتا ہوا سگریٹ اس پر داغتا اچانک بیرونی دروازے سے جیسے پہاڑ آ ٹکرایا۔ دوبارہ وہی دھماکا خیز آواز ابھری اور دروازہ جیسے زمین پر آ پڑا۔ وہ تیزی سے پانا ہاتھ میں لیے باہر لپکا تھا۔

☆☆☆

مرید کو انہیں کمرے میں بند کر کے گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ جب علیزہ کو کمرے کی کھڑکی پر روشنی کا انعکاس نظر آیا۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی جانب لپکی۔ ایک جیپ تھی جس کے رکتے ہی اس سے ایک شخص ہاتھ میں کوئی ہتھیار لیے برآمد ہوا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہ کسی جسیم ہیولے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب لپکا جب اس کی نگاہ شیشے سے جھانکتی علیزہ پر پڑی۔ اسے رک کر کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کال پر مرید کی تمام باتیں سن چکا تھا۔ جب فون ہاتھ سے چھوٹا تب کال جاری تھی۔ اس نے رکنے کے بجائے جسم کی پوری قوت سے دروازے پر ایک زوردار ٹکر رسید کر دی۔ دروازہ ہل کر رہ گیا۔ ایک اور ٹکر اور پرانے قبضوں سے جڑا دروازہ ایک دھکے میں اندر جا پڑا۔ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی اسے راہداری کے کونے سے مرید ہاتھ میں پانا لیے اپنی جانب دوڑتا ہوا نظر آیا۔

ہر طرح کی ناگہانی کے لیے تیار دماغ نے فوراً ہی دفاعی حکمتِ عملی تیار کی اور اس نے ہاتھ میں تھامی گن کو سیدھا کر کے گولی چلا دی۔ وہ جو ارنے بھینسے کے مانند اس کی جانب دوڑا آ رہا تھا، ایک دم رک گیا مگر گولی چل چکی تھی۔ پہلی گولی نے اس کی ٹانگ کو اور دوسری نے پیٹ کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ ایک ہاتھ پیٹ پر رکھے پہلے دہرا ہوا۔ پھر زمین پر جا پڑا۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے کھلی ہوئی تھیں۔ خون دیکھنے کا شوقین اپنا خون دیکھ کر حیران سا تھا۔ جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کو بھی تکلیف دی جا سکتی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ مرید کے نزدیک پہنچا۔ جو کسی بے ضرر کیچوے کی طرح زمین پر پڑا سسک رہا تھا۔

اس نے تکلیف سے بند ہوتی آنکھیں کھول کر مداخلت کار کو دیکھنا چاہا۔ داڑھی میں چھپا چہرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ وہ اس گھر کا پرانا واقف کار فرزین گل تھا۔

اس نے پیر کی ٹھوکر سے پانا مرید کے ہاتھ سے دور کیا اور کمرے میں بند علیزہ اور خاور کی جانب بڑھ گیا۔ اسے پہلے ہی اس شخص پر شک تھا۔ اگر خاور اُسے گھر آنے سے منع نہ کرتا تو حالات مختلف ہوتے۔

وہ شخص اپنی غلط حرکات اور بے راہ روی کی وجہ سے پورے علاقے میں بدنام تھا۔ گھر میں اس کی ماں، بہن اور بیٹیوں کی موجودگی کے باعث علاقہ مکین اسے جوں توں برداشت کر رہے تھے۔ ورنہ شاید بہت پہلے اسے علاقہ بدر کر دیا جاتا۔

اس نے پُرتشویش انداز میں دروازہ کھولا۔ اس کا ذہن

کسی بھی ناگوار منظر کو دیکھنے کے لیے تیار تھا۔ مگر بندھے ہوئے ہاتھوں اور مٹی سے لت پت وجود کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے خاور اور اس کی گود میں گھسی علیزہ کو دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

"اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ آپ مستقبل سے کتنے آگاہ ہیں، اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ اس آگاہی کو استعمال کیسے کرتے ہیں۔ مستقبل کے لیے کیا منصوبہ بندی کرتے ہیں۔"

علیزہ کو جب بھی آگاہی ملی، ہمیشہ وقوعے سے چند لمحات قبل ملی۔ عملی طور پر ایسی آگہی کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم نے دراصل اس بات سے کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بہرحال ہم خوش ہیں کہ میری بیٹی اس صورتِ حال سے نکل چکی ہے۔ وہ اتنی خوفزدہ ہے کہ لاشعوری طور پر اس پیش بینی کی صلاحیت کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے۔ شاید مستقبل میں بھی یہ واپس آجائے۔ مگر تب تک وہ خود کو سنبھالنا سیکھ چکی ہوگی۔"

وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا بول رہا تھا اور کمرے میں موجود نفوس اسے بغور سن رہے تھے۔ ڈراؤنا خواب ختم ہو چکا تھا۔ تمام زخمی صحت یابی کے بعد گھر واپس آچکے تھے۔ گھر کے پیچھے دفن نورین کے ڈھانچے کی بازیابی سے جو کہانی شروع ہوئی، وہ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ اس شام کی دردناک داستان کی ہر تفصیل پولیس مرید سے اگلوا کر اسے جیل بھجوا چکی تھی۔ ہر بات واضح ہو چکی تھی مگر ایک کانٹا ابھی تک خاور کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

"فرزین یار! یہ تو بتاؤ تم اتنے عرصے جو یہاں رہے تو کبھی جیل ویل بھی گئے ہو کیا۔ سنا ہے یہاں آجکل جو ایک بار جیل نہ جائے اسے بہادر نہیں مانتے۔"

اس کی آخری بات بات سن کر سنجیدگی سے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے فرزین کے ہاتھ سے چائے میں ڈبویا ہوا بسکٹ چھوٹ کر پیالی میں غائب ہو گیا۔ یہ آخری بسکٹ تھا۔ وہ پہلے تو افسوس سے تہ میں جاتے بسکٹ کو دیکھتا رہا پھر اسی افسردہ نگاہی سے خاور کو دیکھا۔

مونچھ یوں پھڑپھڑائی جیسے منہ میں زلزلہ آگیا ہو۔ شاید اس کے اندر غیر پارلیمانی القابات باہر نکلنے کو مچل رہے تھے مگر بولا تو بس اتنا۔

"یارا! تم جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ بات گھماتا کیوں ہے۔ سیدھا سیدھا پوچھو فرزین گل! تم جیل کیوں گیا۔ تو میں بتا دوں گا۔ اب پوچھو؟" وہ اردو بولتا تھا مگر اپنی مرضی کی۔

"فرزین گل تم جیل کیوں گیا؟" خاور نے میکانیکی انداز میں اس کے الفاظ دہرا دیے۔

"اوہ یارا۔ یہ کاروباری باتیں ہیں۔ دنیا کسی کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتا۔ بس دشمنی کا چکر تھا۔ کسی کو ہم نے پھنسایا کوئی ہمیں پھنسایا۔ اب تم کو سکون آیا؟"

"اوہ اچھا اچھا۔ پھر ٹھیک ہے۔" خاور نے جیسے اطمینان کی سانس لی۔

"یہ لو۔" اس نے جیب سے ایک موٹا سا لفافہ برآمد کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"تمہارا امانت۔ تمہارا دکان کا پیسہ۔ جب ہم نے دکان کا قبضہ لیا تب رقم کم تھا۔ اب اس کو سود کے ساتھ واپس کر رہا ہے۔ جیسا ادھر کا رواج ہے۔" سرمد صاحب کے ساتھ ساتھ مہک اور تازہ تازہ وہاں شفٹ ہوئی فلک کا منہ بھی کھل گیا۔

"اہمم......اہمم۔" خاور نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "بات یہ ہے کہ رقم کی تو مجھے واقعی ضرورت ہے۔ مگر صرف اپنی ضرورت کی۔ باقی تمہارے پاس پیسہ زیادہ ہے تو سود کی اضافی رقم نکال کر مرید کے گھر والوں کو دے دو۔"

فرزین گل اسے حیرت سے دیکھتے دیکھتے اچانک مسکرانے لگا۔

اس نے لفافے سے کچھ رقم کم کی اور باقی ٹیبل پر رکھ دی..... کھڑکی سے باہر بچوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے سنا وہ علیزہ تھی جو کئی دن پہلے یاد کی گئی پوئم دہرا رہی تھی۔ اس نے مہک کی جانب دیکھا۔ وہ بھی یہی سن رہی تھی۔ دونوں نے آنے والے بہتر وقت کی چاپ ایک ساتھ محسوس کی تھی۔ ان کی بچی کی یادداشت بہتر ہو رہی تھی۔

"اچھا بچو! میں چلتا ہوں۔" سرمد انکل جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے ٹھہرو۔ میں بھی چلتا ہوں۔" فرزین بھی جلدی سے کھڑا ہوا۔

"ارے نہیں..... فرزین یار تم نکلو بے شک۔ انکل اب یہیں رہیں گے۔ ویسے بھی یہ گھر ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔ کیوں انکل؟ کیا کہتے ہیں آپ؟"

خاور نے کہا تو سرمد انکل جو اس کی بات سن کر حیران پھر پریشان سے ہوئے تھے، آخر میں مسکراتے ہوئے پھر سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

❖❖❖

ایک آوارہ نوجوان کا جذبۂ بے مثال...... گم کردہ راہوں کا عبرت اثر احوال

راستوں سے بھٹکنا بہت آسان ہوتا ہے... مگر بھٹکے ہوئے راستوں سے واپسی کا سفر انتہائی مشکل ہوتا ہے... ایک ایسے ہی نوجوان کی زندگی کے مختلف موڑ... غلط اور غیر قانونی کاموں نے اسے ایسا الجھایا کہ وہ صحیح راہوں کو بُھلا بیٹھا... مگر ابھی دیر نہیں ہوئی تھی... جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی کی خوب صورتی اس کی منتظر تھی...

ناکردہ

احمد جعفری

شکاگو کے جنوب میں تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر، سینٹ لوئیس ہائی وے سے تقریباً ملا ہوا، جانسن ووڈ کے نام سے ایک جنگل ہے۔ جنگل آٹھ میل لمبا اور تین میل چوڑا ہے۔ جانسن ووڈ میں کئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور کئی پہاڑی چشمے ہیں۔ جنگل میں پگڈنڈی ٹائپ کی کچی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

جانسن ووڈ میں درجنوں ایسے گوشے ہیں جہاں محبت کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں موج مستی کرتے ہیں اگر

چشموں میں نہاتے ہیں۔
جنگل کے ایک سائڈ پر کالوں کی بستی ہے جہاں کچے پکے مکانات، غربت، جہالت اور بے روزگاری نے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ایک این جی او نے اس بستی میں ایک اسکول قائم کیا ہوا ہے جہاں صبح نو بجے سے ایک بجے تک کلاسیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ہر طالب علم کو ایک بڑا بیف برگر اور دودھ کا ایک پیکٹ دیا جاتا ہے۔ بہت سے بچے اسکول کے ائر کنڈیشنڈ کمروں میں وقت گزارنے اور بیف برگر کھانے کے لالچ میں اسکول چلے جاتے ہیں۔
سترہ سالہ وکٹر بھی اسی بستی کا رہائشی تھا مگر اس کی جیبیں ہمیشہ ڈالرز سے بھری رہتی تھیں۔ اس نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ شکاگو میں ایک ریئل اسٹیٹ ایجنسی میں کمیشن پر کام کرتا ہے۔ اس کے اصل کاروبار سے کوئی واقف نہیں تھا سوائے بستی کی چند نوعمر لڑکیوں کے۔ اس بستی کی ہر لڑکی جانتی تھی کہ کسی لڑکے کے ساتھ جانسن ووڈ میں جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔
وکٹر کے پاس ایک پرانی کھٹارا سی بائیک تھی۔ وکٹر اسی بائیک پر بستی اور جانسن ووڈ کے درمیان بنی پکی سی سڑک پر گھومتا رہتا تھا۔
چودہ سالہ صحت مند اور قبول صورت باربرا بھی اسی بستی میں رہتی تھی۔ سڑک پر اکثر وکٹر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے گزرتی تھی۔ ایک دن وکٹر نے سڑک پر باربرا کو روک لیا۔
''باربرا کیسی ہو۔ گھر کی کیا حالت ہے۔''
''بہت بُری، باپ کوئی کام نہیں کرتا صرف نشہ کرتا ہے۔ ماں اِدھر اُدھر کام کر کے کچھ پیسے کما لیتی ہے۔ چھوٹی بہن اور چھوٹا بھائی اسکول سے برگر اور دودھ لے آتے ہیں۔ ہم سب کی بُری حالت ہے بالکل تمہاری کھٹارا موٹر سائیکل کی طرح۔''
وکٹر نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ دیکھنے میں کھٹارا لگتی ہے لیکن چلنے میں اے ون ہے۔ میں اسی پر روزانہ شکاگو کے دو چکر لگاتا ہوں۔ اچھا باربرا ایک بات بتاؤ، میرے ساتھ جانسن ووڈ چلوگی؟''
باربرا پہلے شرمائی پھر وکٹر کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔
''وکٹر میں ابھی صرف چودہ سال کی ہوں۔''
''کوئی بات نہیں، تم غربت کے باوجود انتہائی صحت مند اور گڈ لوکنگ ہو۔''
جانسن ووڈ میں جا کر ایک چشمے کے قریب وکٹر نے بائیک روکی اور باربرا کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھنڈ میں لے گیا۔ اس نے باربرا کو گھاس پر لٹایا۔ باربرا نے دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی پھر شانت ہو گئی۔ وہاں انہوں نے بیس منٹ گزارے۔ پھر دونوں چشمے میں نہائے۔ باربرا بہت خوش اور مطمئن تھی۔ وہ نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ وکٹر نے کہا۔
''باربرا تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی، آؤ تمہیں بہترین پزا کھلاتا ہوں۔ تم سے ایک خاص بات بھی کرنی ہے۔''
وکٹر باربرا کو بائیک پر بٹھا کر جانسن ووڈ کی دوسری سائڈ پر لے گیا۔ یہاں کالے اور گوروں کی مکس آبادی تھی۔ لوگ نسبتاً تھوڑے سے خوش حال تھے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے چار کارخانے تھے جن میں پلاسٹک کا سامان بنتا تھا۔ قصبے کے بیشتر لوگ ان ہی کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ روڈ سائڈ پر دوسرے درجے کے بار اور ریسٹورنٹس تھے۔ ایک پزا شاپ بھی تھی۔
وکٹر اور باربرا پزا شاپ کے سامنے چوڑی فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی میز کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وکٹر نے دو اسمال پزا اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔
وکٹر نے کہا۔ ''ہاں باربرا! اب ذرا اپنے گھر کے حالات تفصیل سے بتاؤ۔''
باربرا نے پزا کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔
''بتا تو چکی ہوں، اب کتنی دفعہ بتاؤں؟ میں تو کسی چھوٹے سے اسٹور میں معمولی سا کام بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن کوئی جاب دینے کو آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ ابھی تم انڈر ایج ہو۔ جاب کے لیے کم از کم عمر اٹھارہ سال ہونی چاہیے۔''
''باربرا! میں تمہیں جاب دلوا سکتا ہوں، ہفتے میں تین دن۔ روزانہ پانچ گھنٹے کا کام، معاوضہ کم از کم نو سو ڈالر فی ہفتہ۔''
''ایسا کونسا کام ہے وکٹر جس کا اتنا بھاری معاوضہ ملے گا۔''
وکٹر نے کہا۔ ''کام..... کام وہی جو ہم جانسن ووڈ میں کر کے آئے ہیں۔''
یہ سُن کر باربرا کی شرم سے آنکھیں جھک گئیں اور وہ ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی آمادگی ظاہر کردی۔
''اب تم آمادہ ہو تو میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔ شکاگو میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ یہاں اکثر شوقین مزاج بوڑھے گورے آ کر ٹھہرتے ہیں۔ ان کی ڈیمانڈ ہوتی ہے کالی لڑکی۔ عمر چودہ پندرہ سال۔ صحت مند اور گڈ لوکنگ۔ ان کی

ڈیمانڈ پر تم پوری پوری اترتی ہو۔ اس لڑکی کو صبح گیارہ بجے سے شام چار بجے تک ان کے کمرے میں رہنا ہوتا ہے۔ لڑکی کو پانچ گھنٹے کے چھ سو ڈالر ملتے ہیں۔ ان میں سے تین سو ڈالر میرے ہوں گے۔ مجھے وہاں ہوٹل کے کارکنوں کو کافی پیسے دینے ہوتے ہیں۔ اگر تم اپنے ارادے میں پکی ہو تو کل ہی میں تمہاری بکنگ کرا دیتا ہوں۔ وہاں میرا ایک دوست چارلی ہیڈ پورٹر ہے۔ وہ میرا اسکول کے زمانے کا دوست ہے۔ ہم دونوں نے غربت کی وجہ سے نویں گریڈ کے بعد اسکول چھوڑا تھا۔ اسے فون کرنا ہوگا۔ تم دس بجے تیار ہو کر سڑک پر آجانا۔ میں اپنی بائیک پر تمہیں شکاگو لے جاؤں گا اور واپس بھی اپنی بائیک پر لاؤں گا۔ اب بولو کل کی بکنگ کرا دوں؟"

باربرا نے شرماتے ہوئے اپنی گردن اثبات میں ہلا دی۔ "وکٹر میں تیار ہوں مگر وکٹر اس میں تو بہت خطرہ ہے۔"

"باربرا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ میں وہاں پیسے کس لیے بانٹتا ہوں، تم بے فکر رہو۔"

وکٹر نے اسی وقت سیل فون پر اپنے دوست چارلی سے بات کی اور باربرا کی بکنگ کنفرم کرا دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر وکٹر نے باربرا کو دس ڈالر دیے۔ "لو یہ دس ڈالر رکھو اس سے ٹوتھ پیسٹ، پرفیوم اور لیڈیز کی دوسری چیزیں خرید لینا اور یہ بیس ڈالر اور رکھو اس سے تم سفید اسکرٹ اور سفید بلاؤز خرید لینا، سفید تم پر خوب سجے گا۔ تمہیں صاف ستھرا نیٹ اینڈ کلین ہونا چاہیے۔ باقی تم خود سمجھ دار ہو۔ اب اٹھو میں تمہیں یہیں سے سب چیزیں خریدوا دیتا ہوں۔ یہاں دکانیں سستی ہیں اور چیزیں بھی اچھی مل جاتی ہیں۔"

☆☆☆

دوسرے دن صبح دس بجے باربرا سڑک پر موجود تھی۔ ایک منٹ بعد ہی وکٹر اپنی بائیک پر گلی سے نکلتا نظر آیا۔ اس نے باربرا کے قریب آکر ہلکے سے سیٹی بجائی۔ "واؤ باربرا، آج تو تم لائٹ مار رہی ہو۔ کنٹراس کلر کا لباس تم پر خوب سج رہا ہے، اس بوڑھے انگریز پر تو تمہیں دیکھ کر کپکپی طاری ہو جائے گی۔"

باربرا نے کہا۔ "میں نے ماما کو بتا دیا ہے کہ میں وکٹر کے ساتھ جا رہی ہوں۔ وکٹر مجھے کسی چھوٹے سے اسٹور پر کام دلائے گا۔"

"گڈ، تم آج سے چارلی جنرل اسٹور پر ہفتے میں تین دن کام کرو گی۔ یہ بات ماما کو بتا دینا۔ اب بائیک پر چپک کر بیٹھ جاؤ، میں بہت فاسٹ ڈرائیونگ کرتا ہوں۔ آج تم اس کھٹارا بائیک کا کمال دیکھنا۔"

شکاگو میں ہوٹل پہنچ کر وکٹر نے باہر ہی بائیک ایریا میں اپنی بائیک پارک کر دی اور چارلی کو فون کر دیا۔ ہوٹل کی باؤنڈری میں اوپن ایریا میں میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں جہاں کافی، کولڈ ڈرنکس وغیرہ پینے کے لیے لوگ بیٹھتے تھے۔ قریب ہی چھوٹا سا کاؤنٹر تھا وہاں سے وکٹر نے کولڈ ڈرنک کی دو بوتلیں لیں اور باربرا کے ساتھ ایک میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔

انہوں نے ڈرنک ختم بھی نہیں کی تھی کہ چارلی بوڑھے گورے کو لے کر نمودار ہوا۔ بوڑھے نے دور سے دیکھ کر ہی باربرا کو اوکے کر دیا۔ باربرا اٹھی اور چارلی اور بوڑھے کے پیچھے ہوٹل کی لابی میں داخل ہو گئی۔

دس منٹ کے بعد چارلی واپس آتا ہوا نظر آیا۔ "وکٹر، کمرے تک ساتھ جانے میں فائدہ ہو جاتا ہے۔ بوڑھے نے بیس ڈالر ٹپ دی ہے اور بہت خوش ہے۔ اب تم جاؤ اور ٹھیک چار بجے آجانا۔"

وکٹر نے بھاری ٹپ کے ساتھ کاؤنٹر پر کولڈ ڈرنکس کی قیمت ادا کی اور بائیک لے کر روانہ ہو گیا۔

وکٹر نے اس دوران اسی قسم کی دوسری لڑکیوں کی بکنگ وغیرہ کا کام نمٹایا۔ لنچ کیا اور شام ٹھیک چار بجے دوبارہ ہوٹل کے آؤٹر کافی ایریا میں پہنچ گیا۔ چند منٹ کے بعد باربرا، چارلی کے ہمراہ آگئی۔ وکٹر نے اپنا پرس نکالا اور پچاس ڈالر کا ایک نوٹ چارلی کے حوالے کر دیا۔

چارلی کے جانے کے بعد وکٹر نے کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔ کافی پیتے ہوئے باربرا نے اپنی خفیہ جیب سے چھ سو پچاس ڈالر نکال کر وکٹر کے سامنے رکھ دیے۔ "بوڑھے نے پچاس ڈالر بطور ٹپ دیے ہیں۔"

"میں صرف تین سو ڈالر لوں گا۔ ٹپ کے ڈالر تمہارے ہیں۔ راستے میں تم بیس ڈالرز کی گروسری خریدنا اور اپنی ماما کو دے دینا۔ پچاس ڈالرز اور ماما کے ہاتھ پر رکھنا۔ ان کو بتانا کہ اسٹور والوں نے ایڈوانس دیا ہے۔ اپنے باپ کو بھی بیس ڈالر دے دینا، وہ تمہاری ماما کو تنگ نہیں کرے گا۔ کل تم آرام کرنا پرسوں کے لیے میں تمہاری بکنگ کرا دوں گا۔ اپنے ڈالرز چھپا کر کسی محفوظ جگہ رکھنا۔ چلو اب چلتے ہیں، راستے میں گروسری بھی خریدنی ہے۔"

وکٹر نے بیس ڈالر کا ایک نوٹ گیٹ کیپر کی مٹھی میں چھپا کر دے دیا۔

راستے میں بار برانے گروسری کا سامان اور کچھ لیڈیز سامان خریدااور لدی پھندی گھر پہنچ گئی۔

یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا پھر کسی کی مخبری پر وکٹر پکڑا گیااوراسے چار سال کی جیل ہوگئی۔ چارلی کی خوش قسمتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بچ گیا۔

☆☆☆

وکٹر جب شکاگو کی ریاستی جیل کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ چار سال تک شخصی آزادی کا خاتمہ۔ جانسن ووڈ کے جنگل میں کالی نوعمر لڑکیوں کے ساتھ عیش اور ہوٹل میں بوڑھے گوروں کی طرف سے ڈالرز کی بارش۔ سب کچھ ختم۔ پھر ذہن میں خیال آیا کہ یہ تو ہونا ہی تھا ایک دن۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک گارڈ نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ کوئی شرارت مت کرنا۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر سامنے بنی ہوئی بیرکوں کی طرف لے گیا۔ راستے میں قیدی لان اور لان میں لگے پھولوں کے پودوں کو ٹھیک ٹھاک کررہے تھے۔ ان سب کی نظریں نئے پنچھی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو اشارہ کررہے تھے۔

گارڈ اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں میز کے پیچھے ایک سینئر آفیسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''وکٹر اپنی تمام پاکٹس خالی کر کے سب چیزیں میز پر رکھ دو۔ تمہاری جیب میں کوئی چیز بھی نہیں رہنی چاہیے۔''

وکٹر نے خاموشی سے پرس نکال کر میز پر ڈال دیا۔ پرس میں ایک سو اسّی ڈالرز تھے۔ اس کے بعد سیل فون، بائیک کی چابیاں، سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر بھی میز پر رکھ دیا۔ ''سر اب میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔''

آفیسر نے سب چیزوں کی لسٹ بنائی، سائن کیے اور ایک پلاسٹک کی تھیلی میں رکھ کر سیل لگا دی۔ تھیلی کے اوپر مارکر سے وکٹر کا نام، تاریخ اور وقت لکھ کر تھیلی دراز میں رکھ دی۔

آفیسر کے اشارے پر گارڈ نے وکٹر کی اچھی طرح تلاشی لی اور اس کا بازو پکڑ کر کوریڈور میں بنے واش روم میں لے گیا۔ ''یہاں تمہیں اچھی طرح نہانا ہے۔ اپنے کپڑے یہیں چھوڑ دینے ہیں۔ بدن خشک کر کے اس نیلے دروازے والے کمرے میں داخل ہو جانا وہاں تمہارے اوپر جراثیم کش اسپرے کیا جائے گا اور یہ لو عینک، اس سے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح ڈھانپے رکھنا۔ ناؤ گو۔''

شاور لینے کے بعد نیلے کمرے میں داخل ہوتے ہی وکٹر نے آنکھوں پر عینک جمائی جس نے اس کی آنکھوں کو اچھی طرح سے کور کرلیا۔ کمرے کے وسط میں کھڑے ہوتے ہی سرخ لائٹ آن ہوگئی اور چاروں طرف سے اس پر اسپرے کی پھوار پڑنے لگی۔ یہ عمل دس منٹ تک جاری رہا پھر سرخ لائٹ آف ہوگئی۔ سامنے دروازے پر گرین لائٹ جلنے لگی، اس کے برابر میں ایگزٹ لکھا ہوا تھا۔ وکٹر نے وہ دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ سامنے وہی گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ ایک میز پر براؤن رنگ کا ٹراؤزر اور شرٹ رکھی ہوئی تھی۔ گارڈ کے اشارے پر وکٹر نے وہ براؤن لباس پہن لیا۔

یہ پورا عمل وکٹر کے لیے بہت حیران کن تھا۔ اسپرے کے بعد وہ اپنے آپ کو بالکل بدلا ہوا اور فریش محسوس کررہا تھا۔ وہی گارڈ اسے ڈپٹی جیلر کے آفس لے گیا۔

ڈپٹی جیلر تقریباً نوجوان، نہایت اسمارٹ، چہرے مہرے سے خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی بلیک تھا۔ ڈپٹی اپنے سامنے رکھی وکٹر کی فائل کا بغور مطالعہ کررہا تھا۔ فائل بند کر کے اس نے غور سے وکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا اور دو منٹ تک وکٹر کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر اس نے ہنکارا بھرا۔ ''ہوں، تو تم ہو وکٹر...... وکٹر دی گرلز سپلائیر۔ نویں گریڈ کے بعد تم نے اسکولنگ چھوڑ دی اور کمائی میں لگ گئے۔ آسان کمائی اور نوعمر لڑکیوں کے ساتھ عیش بونس میں، خیر...... خیر، میں تم سے اس وقت زیادہ باتیں نہیں کروں گا بس اتنا کہنا ہے کہ شرافت سے رہو گے تو چار سال آسانی سے کٹ جائیں گے۔ میں تمہیں پریزن سیل (کوٹھری) نمبر 229 میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں تمہارا روم میٹ بہت اچھا آدمی ہے، ہم اسے جوزف دی پریچر کہتے ہیں، وہ تمہیں بہت اچھی باتیں بتائے گا ان پر عمل کرنا، ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس سے کبھی نہ پوچھنا کہ وہ کس جرم میں بند ہے۔ تمام سیل صبح ساڑھے آٹھ بجے آٹو سسٹم کے تحت لاک ہوجاتے ہیں پھر رات کو نو بجے کھلتے ہیں تاکہ سب قیدی اپنے اپنے سیل میں چلے جائیں۔ اس کے بعد سیل خود بخود لاک ہوجاتے ہیں۔ وکٹر یہ لو جیل کے قواعد کا پمفلٹ۔ اسے لائبریری میں جاکر اطمینان سے پڑھنا اور ان پر سختی سے عمل کرنا۔ گڈ بائی۔''

گارڈ وکٹر کا بازو پکڑ کر باہر لے آیا اور لائبریری تک لے جاکر اس کا بازو چھوڑ کر چلا گیا۔ لائبریری میں لائن سے لگے درجنوں ریک تھے جن میں کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی میزوں پر اخبارات اور میگزین تھے۔ کچھ قیدی اخبارات پڑھنے میں مشغول تھے۔ ایک سائڈ پر ایک

دروازے پر ٹی وی ہال لکھا ہوا تھا۔

وکٹر حیرانی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ یکایک ایک کونے سے آواز آئی۔ "وکٹر یہاں آجاؤ، میں ہی تمہارا اسیل میٹ ہوں۔"

وکٹر نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ دُبلا پتلا تقریباً پچاس سالہ شخص تھا۔ وہ بھی کالا تھا اور براؤن لباس میں تھا۔ اس نے اٹھ کر وکٹر سے ہاتھ ملایا اور اسے لے کر ذرا دور کی میز پر چلا گیا۔ "وکٹر میرا نام جوزف ہے، لوگ نہ جانے کیوں مجھے جوزف دی پریچر کے نام سے پکارتے ہیں۔ شاید جیل مینجمنٹ نے مجھے کونسلر کی حیثیت دے دی۔ خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ دس منٹ کے بعد لنچ کے لیے بیل بجے گی۔ تم میرے ساتھ لنچ کرنا، وہیں تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ ڈپٹی جیلر اچھا آدمی ہے۔ اس نے نہایت تفصیل سے مجھے تمہارے بارے میں بریف کیا ہے۔ تمہارے ہاتھ میں جیل قواعد کا پمفلٹ دیکھ رہا ہوں۔ اس کو جیب میں رکھ لو۔ میں اس سے زیادہ زبانی طور پر جیل کے قواعد کے بارے میں بتا دوں گا۔ لنچ کی بیل بجنے والی ہے آؤ لنچ ہال کی طرف چلتے ہیں۔"

دونوں لائبریری سے نکل آئے اور ایک سمت چلنے لگے۔ جوزف نے رک کر کہا۔ "وکٹر داہنی طرف تمہیں کافی بڑا سا میدان نظر آرہا ہے۔ وہاں باسکٹ بال اور والی بال کے کورٹ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فٹ بال کا گراؤنڈ ہے۔ شام پانچ بجے کے بعد قیدی وہاں کھیلنے کے لیے جمع ہو جائیں گے۔"

کچھ دیر کے بعد جوزف نے کہا۔ "وکٹر یہاں بیس بیرکس ہیں جن میں آٹھ سو قیدیوں کی گنجائش ہے۔ ہر قیدی سیل میں دو قیدی رکھے جاتے ہیں۔ سیل میں شاور کموڈ وغیرہ سب موجود ہے۔ رات کو پڑھنے کے لیے ہر بیڈ کے سرہانے چھوٹی سی دودھیا لائٹ ہے جو ہاتھ کے اشارے پر جلتی ہے۔ سوئچ وغیرہ نہیں ہوتا۔"

جب وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو قیدیوں کی لائن لگ چکی تھی۔ وہ بھی لائن میں لگ گئے۔ ایک کھڑکی کے ذریعے کھانے کی ٹرے قیدی کے حوالے کر دی جاتی تھی۔

وہ اپنی اپنی ٹرے لے کر ڈائننگ ٹیبل پر آگئے۔ ہال میں درجنوں ٹیبل تھیں۔

کرسی پر بیٹھ کر وکٹر نے ٹرے میں موجود کھانے کا جائزہ لیا۔ ایک پلاسٹک پلیٹ میں کاغذ میں لپٹا ہوا جمبو برگر تھا اور گرم تھا۔ پانی کی چھوٹی بوتل، فرنچ فرائز، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ۔ ایک گلاس میں کافی تھی، کافی کے گلاس کو کور کیا ہوا تھا تاکہ کافی گرم رہے۔

وکٹر نے سب سے پہلے جمبو برگر کھولا، ڈبل روٹی کے بڑے گول پیس کے اوپر بٹر کا گول پرت رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر بیف کا گول کٹلس، اس کے اوپر پنیر کا گول پرت اور مایونیز... پھر ڈبل روٹی کا دوسرا گول پیس۔

جوزف مسکراتے ہوئے وکٹر کی حیرانی دیکھ رہا تھا۔

"وکٹر حیران نہ ہو۔ قانون کہتا ہے کہ جو کھانا ایک اوسط درجے کا امریکن کھاتا ہے وہی قیدی کو ملے گا۔ ناشتے میں تم دیکھنا دو ابلے ہوئے انڈے، توس، ہنی، مارملیٹ، اورنج جوس کافی وغیرہ سب موجود ہوگا۔ ایک این جی او اچانک وزٹ کر کے کھانا چیک کرتی ہے اس لیے جیل حکام قانون پر پورا پورا عمل کرتے ہیں۔"

وکٹر نے حیرانی سے جوزف کی طرف دیکھا۔

"ہاں وکٹر سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ہر تین مہینے کے بعد ہر قیدی کا مکمل طبی معائنہ ہوتا ہے اور پھیلنے والی بیماری اگر کسی کو ہو تو اس کا تدارک اور علاج کیا جاتا ہے۔"

کھانا ختم کر کے دونوں کافی پینے لگے۔ جوزف نے کہا۔ "وکٹر لوگ کہتے ہیں کہ جیل یاترا بندے کو اور بگاڑ دیتی ہے۔ وکٹر لوگ صحیح کہتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کی مافیا کے لوگ موجود ہیں۔ منشیات نمبر ون پر ہے۔ جواری، قحبہ خانے چلانے والے، اسمگلر وغیرہ یہاں سب کی نمائندگی ہے۔ یہ لوگ مختلف طریقوں سے بندے کو گھیرتے ہیں۔ ادھار منشیات دیتے ہیں اور جب قیدی رہا ہو کر باہر جاتا ہے تو اپنے آپ کو ان کے گرگوں کے شکنجے میں جکڑا پاتا ہے۔ وکٹر بڑی حیرانی سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ جوزف نے کہا۔ "کیوں نہ کافی کا ایک ایک کپ اور پیا جائے۔"

جوزف اٹھ کر گیا۔ ایک کھڑکی پر لکھا تھا، ایکسٹرا ڈرنک، پانی، کافی۔ اس نے کھڑکی پر ناک کیا۔ کھڑکی کھلی جوزف نے دو کافی کا اشارہ کیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ چھوٹی سی پلاسٹک ٹرے میں دو کافی کے گلاس لیے چلا آرہا تھا۔

اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "وکٹر اب حیران ہونا چھوڑ دو۔ تم بتاؤ کہ کس طرف جانا چاہتے ہو بگاڑ کی طرف یا تعلیم مکمل کرنے کی طرف۔ یہاں جیل کی باؤنڈری میں ہی ایک اعلیٰ معیار کا اسکول ہے۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ عمل تمہیں کرنا ہے۔ میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ میں نے دونوں راستے تمہارے سامنے رکھ دیے ہیں۔"

وکٹر سر جھکائے بہت دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''جوزف! میں نے نویں گریڈ کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی۔ میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہوں۔''

جوزف بہت دیر تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا۔''ویل اینڈ گڈ۔ تم اپنے ارادے میں پکے معلوم ہوتے ہو۔ میں لنچ کے بعد ڈپٹی سے ملوں گا اور تمہاری اسکولنگ کا انتظام کر دیتا ہوں۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے، آؤ اٹھو۔ ڈپٹی جیلر کے آفس کی طرف چلتے ہیں۔''

ڈپٹی جیلر کے آفس میں پہنچ کر جوزف نے کہا۔''سر یہ لڑکا جیل کے اسکول میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہے، اس سلسلے میں آپ کے تعاون کا طلب گار ہے۔''

ڈپٹی نے سر اٹھا کر وکٹر کی طرف دیکھا۔''کیوں جوان، تم کیا کہتے ہو؟''

''سر! میں اپنی ہائی اسکول کے لیول کی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد موقع ملا تو گریجویشن بھی کروں گا۔''

''ویل اینڈ گڈ۔'' ڈپٹی نے اپنی سیکریٹری کو مخاطب کیا۔''شیلا پلیز اسکول فون کر کے پوچھو کہ اسکول کی ہیڈ مس کرسٹینا آفس میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ موجود ہو تو اسے بتانا کہ جوزف دی پریچر ایک قیدی اسٹوڈنٹ لے کر آ رہا ہے۔''

دو منٹ کے بعد شیلا نے کہا۔''سر کرسٹینا آفس میں موجود ہے اور پریچر کو ویلکم کرنے کے لیے تیار ہے۔''

''ویل، ویل، تھینک یو شیلا اور جوزف اس لڑکے کو لے کر فوراً اسکول چلے جائیں گڈ بائے۔''

اسکول کی بلڈنگ کافی دور تھی۔ جیل کی ایک چھوٹی سی جیپ نے انہیں وہاں پہنچا دیا۔

اسکول کی ہیڈ کرسٹینا بھی نوجوان تھی۔ تعلق ایک این جی او سے تھا۔ اس نے وکٹر سے مختلف سوالات کیے۔ اسکولنگ کب چھوڑی کچھ یاد ہے۔ اسکول کا نام کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ تم کہتے ہو کہ تم نے نائن گریڈ کلیئر کر لیا تھا۔ بہر حال ہم تمہارا ٹیسٹ لیں گے اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ تمہیں کس گریڈ کا کورس پڑھایا جائے۔''

اس کے بعد کرسٹینا نے ایک اور ٹیچر کو بلایا۔''جولی یہ مسٹر وکٹر ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ نویں گریڈ پاس کر چکے ہیں۔ تم ان کا ٹیسٹ لو، پھر پورا انٹرویو کرو اور مجھے بتاؤ کہ مسٹر وکٹر کو کس گریڈ میں ایڈمٹ کیا جائے۔ یہ مسٹر پریچر کے ساتھ آئے ہیں ان کا حکم ٹال نہیں سکتے۔''

جوزف ہلکے سے مسکرایا اور وکٹر اٹھ کر جولی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد جولی، وکٹر کے ساتھ واپس آئی۔''مس کرسٹینا، ان کو اسکولنگ چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا ہے اس لیے بہت کچھ بھول چکے ہیں۔ ان کو تین ماہ تک نویں گریڈ کا کورس ریوائز کرایا جائے گا پھر اگلے گریڈ یعنی گریڈ ٹین میں پروموٹ کر دیا جائے گا۔''

کرسٹینا نے کہا۔''گڈ، جولی تھینک یو، اب تم جا سکتی ہو۔''

اس کے جانے کے بعد کرسٹینا نے دراز سے پیلے رنگ کا کارڈ نکالا۔ اس پر وکٹر کا نام لکھا، سائن کیے اور اسٹیمپ لگائی۔''لو وکٹر، یہ تمہارا بس پاس بھی ہے اور ایڈمٹ کارڈ بھی۔ بس صبح دس بجے قیدیوں کے بیرکوں کا راؤنڈ لگاتی ہے۔ تمہیں پک کرے گی اور کل سے تمہاری پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ تمہارا لنچ وغیرہ سب یہیں اسکول میں ہوگا۔ پانچ بجے تم اپنی بیرک میں واپس جا سکو گے۔''

جوزف نے مس کرسٹینا کا شکریہ ادا کیا اور دونوں باہر نکل آئے۔

ڈنر کے بعد آٹھ بجے تمام سیل کے دروازے آٹو سسٹم کے تحت کھل گئے۔ جوزف، وکٹر کو لے کر سیل میں داخل ہوا۔ ''دیکھو وکٹر سیدھے ہاتھ والا بیڈ تمہارا ہے۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا سا لاکر ہے۔ اس میں تم اپنا ذاتی سامان رکھ سکتے ہو۔ اب ذرا لاکر کھول کر دیکھو۔''

وکٹر نے بیٹھ کر لاکر کی طرف دیکھا، لاکر کے تالے میں چابیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ وکٹر نے تالا کھولا۔ اندر ٹوتھ پیسٹ، برش، صابن اور بڑا تولیا تھا۔

جوزف نے کہا۔''صبح اگر تم چاہو تو چابیاں ساتھ لے جا سکتے ہو مگر یہ نہ سمجھنا کہ جیل کا عملہ اسے کھول کر تلاشی نہیں لے گا۔ وہ روزانہ ہر لاکر کی تلاشی لیتے ہیں۔ اگر کوئی چیز مل جائے مثلاً منشیات وغیرہ تو قیدی کی خیر نہیں۔''

ساڑھے آٹھ بجے تمام سیل لاک ہو گئے۔ جوزف نے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر کہا۔''وکٹر! کبھی تم نے سوچا کہ ہم کالے لوگ کھیل کود میں نمبر ون کیوں ہیں۔ اولمپک کے گیم ہماری شرکت کے بغیر پھیکے محسوس ہوتے ہیں۔ باکسنگ میں تو ہمارا کوئی ثانی ہی نہیں۔ شکاگو، نیویارک اور دوسرے بڑے شہروں میں محلوں میں باکسنگ کلب ہوتے ہیں، ہر ہفتے مقابلے ہوتے ہیں۔ شرطیں لگتی ہیں۔ جیتنے والے کو تین سو ڈالر ملتے ہیں۔ ارینا میں اترنے والے سب کالے ہوتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ہم ذہنی جمناسٹک یعنی تعلیم سے دور

بھاگتے ہیں۔ کھیل کود میں پڑھنا نہیں پڑتا اس لیے ہماری دلچسپی کھیلوں میں زیادہ ہے۔“

وکٹر بڑے غور سے جوزف کی باتیں سن رہا تھا۔”ہاں مسٹر جوزف یہ حقیقت ہے۔ میں نے بھی تعلیم کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور لڑکیاں سپلائی کر کے ڈالرز کمانے لگا تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔“

”وکٹر! اب بھی تمہارے پاس وقت ہے تم نوجوان ہو، میری خواہش ہے کہ تم جیل کے اسکول میں محنت سے پڑھو اور ہائی اسکول امتیازی حیثیت میں کلیئر کرو۔ روزانہ لائبریری ضرور جایا کرو، کتابیں ہی انسان کا ذہن کھولتی ہیں۔“

”مسٹر جوزف ہائی اسکول کلیئر کرتے ہی میری قید کی مدت ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں گریجویشن کروں گا۔ دو سمسٹر کے پیسے ہیں میرے پاس۔ میرا رجحان قانون کی طرف ہے میں لاء میں ڈگری لوں گا۔“

”وکٹر، مائی سن۔ تمہاری بات سن کر دلی خوشی ہوئی۔ کل سے تمہارا اسکول شروع ہو رہا ہے۔ مافیاز کے جو ایجنٹ یہاں قیدیوں کی شکل میں ہیں؛ ان سے دور رہنا ان سے لڑائی جھگڑا مت کرنا۔ اپنے آپ کو بزی رکھنا یہ خود ہی تمہارے قریب نہیں آئیں گے۔“

☆☆☆

جیل کے چار سال گزر گئے۔ وکٹر نے امتیازی حیثیت کے ساتھ ہائی اسکول کلیئر کر لیا، اب وکٹر کسی بھی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا حق دار تھا۔

ان چار سالوں میں کوئی بھی اس سے ملنے نہیں آیا۔ اس کا کوئی تھا ہی نہیں۔ ماں باپ پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ بھائی، بہن تھے ہی نہیں۔

قید کے آخری سال اس کے بچپن کا دوست چارلی، جو شکاگو کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ملازم تھا، وکٹر سے ملنے آیا۔ جب دونوں جالی لگے پارٹیشن پر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو وکٹر نے بیٹھتے ہی اسے خبردار کر دیا کہ کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا۔ یہاں باتیں سنی جاتی ہیں اور ریکارڈ کی جاتی ہیں، محتاط رہنا۔

باتوں کے دوران چارلی نے بتایا کہ جس مہینے تمہیں جیل ہوئی اسی مہینے میں تمہاری دوست باربرا کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے شوہر اسمتھ کے ساتھ سان فرانسسکو چلی گئی تھی۔ اب اس کی تین سالہ بیٹی بھی ہے۔ اسمتھ بچپن سے تمہارا گہرا دوست تھا۔ وہ شروع ہی سے باربرا کا عاشق تھا۔ سنا ہے کہ اسمتھ سان فرانسسکو کا مشہور وکیل ہے اور ایک بڑی لاء فرم سے منسلک ہے۔

وکٹر نے یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ ہی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔

جب وکٹر جیل سے رخصت ہو رہا تھا تو جوزف دی ٹیچر سے لپٹ کر دل بھر کر رویا۔ ”مسٹر جوزف بلکہ انکل جوزف میں آپ کا انتہائی احسان مند ہوں۔ آپ نے مجھے بھٹکنے نہیں دیا، پورے چار سال سیدھی راہ پر چلایا ورنہ میں جیل سے اور بگڑ کر کسی مافیا کا ایجنٹ بن کر نکلتا۔“

”نہیں میرے بچے، اس میں میرا کوئی احسان نہیں۔ تم نے ارادہ کیا۔ محنت کی اور ایک کامیاب آدمی بن کر یہاں سے نکل رہے ہو۔ آگے بھی تمہیں کامیابی ملے۔ ہاں اگر ایجوکیشن کے سلسلے میں تمہیں جب بھی پیسوں کی ضرورت ہو، سیدھے میرے پاس آ جانا۔“

وکٹر جب جیل کے مین گیٹ سے باہر نکلنے لگا تو اس کی تمام چیزیں اس کے حوالے کر دی گئیں۔ پرس میں ایک سو اسّی ڈالر موجود تھے۔

وکٹر سیدھا جانسن ووڈ کے سامنے کالوں کی بستی پہنچا جہاں اس کا مکان تھا۔ مکان میں اس کی کھٹارا بائیک موجود تھی۔ وہ بائیک نکال کر مین روڈ پر قائم ایک ورک شاپ پر لے گیا۔ اس نے مکینک سے کہا۔ ”میں تعلیم کی غرض سے نیویارک گیا ہوا تھا۔ یہ بائیک چار سال مکان میں بیکار کھڑی تھی۔ ہو سکے تو اسے ٹھیک کر دو۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے۔“

بائیک مکینک کے حوالے کر کے وکٹر سیدھا جانسن ووڈ کے اس گوشے کی طرف گیا... جہاں اس نے ایک سیف ایک اونچے درخت کی جڑ میں دبایا ہوا تھا۔ اس نے مٹی ہٹا کر سیف کو باہر نکالا۔ اس کی چابی درخت کی دوسری طرف چھپائی ہوئی تھی۔ وکٹر نے چابی سے سیف کھولا۔ سیف سو سو ڈالرز کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے تمام نوٹ ایک تھیلے میں بھرے اور کچھ سوچ کر خالی سیف دوبارہ درخت کی جڑ میں چھپا دیا۔

گھر پہنچ کر وکٹر نے نوٹوں کو گنا، کل اکتالیس ہزار ڈالر تھے۔ اس نے دس ہزار ڈالر جیب میں رکھے۔ باقی ڈالرز گھر میں ہی ایک خفیہ جگہ پر چھپا دیے۔

اس کام سے فارغ ہو کر وکٹر باربرا کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے ایک درجن ڈونٹ، نیس کیفے، کافی کا بڑا پیکٹ اور خشک دودھ کا بڑا ڈبا خریدا۔

باربرا کے گھر کی بیل بجانے پر جس لڑکی نے دروازہ

کھولا اسے دیکھ کر وکٹر دنگ رہ گیا۔ اس کے سامنے دوسری باربرا کھڑی تھی۔ اس سے زیادہ صحت مند اور خوب صورت لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ''وکٹر اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں باربرا کی چھوٹی بہن الزبتھ لز ہوں، اندر آ جاؤ۔''

وکٹر جو سامان لے کر آیا تھا وہ اس نے لز کے حوالے کیا۔ ''لز میں حیران ہوں۔ اتنی جلدی تم اتنی بڑی ہو گئی ہو اور خطرناک حد تک خوب صورت۔''

''اتنی جلدی کہاں وکٹر، تم پورے چار سال کے بعد آئے ہو۔ اتنے عرصے کہاں غائب رہے، باربرا تمہیں بہت یاد کرتی ہوئی رخصت ہوئی ہے۔''

''سب بتاؤں گا لز، یہ بتاؤ تمہاری ماما اور باپ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟''

''ماما تو کام سے نکلی ہوئی ہیں اور باپ نشہ کیے ہوئے کہیں پڑا ہوگا۔ اچھا تم بیٹھو، میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔''

وکٹر کرسی پر بیٹھ گیا اور لز کافی بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

وکٹر کے ذہن میں چند لمحوں کے لیے یہ خیال آیا۔ کیوں نہ لز کو بھی جانسن ووڈ کے مخصوص گوشے میں لے جاؤں اور پھر چارلی کے حوالے کر دوں۔ بوڑھے گورے لوگوں سے ڈالرز کی بارش شروع ہو جائے گی، پھر وکٹر کو جوزف دی پریچر سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ اس نے جانسن ووڈ کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔

اتنی دیر میں لز دو مگوں میں بھاپ اڑاتی کافی لے آئی۔ ''وکٹر اتنے سالوں سے کہاں غائب تھے؟''

''لز میں ایک دوست کے ساتھ نیویارک چلا گیا تھا، وہاں اس نے زبردستی ایک اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ وہاں میں نے ہائی اسکول کلیئر کیا اور اب گریجویشن کرنے کے لیے واپس نیویارک جا رہا ہوں۔''

''واؤ، یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ میں نے بھی ساتواں گریڈ کلیئر کر لیا ہے۔ وکٹر تم نے باربرا کو کام دلایا تھا۔ مجھے بھی کوئی چھوٹا موٹا کام دلوا دو نا۔''

وکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ذہن میں پھر سے جانسن ووڈ کی مستیاں ابھرنے لگیں۔

''لز ایک بات بتاؤ، کبھی کسی لڑکے کے ساتھ جانسن ووڈ گئی ہو؟''

لز ہنس پڑی۔ ''میں کسی لڑکے کے ساتھ جانسن ووڈ میں جانے کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں صرف چودہ سال کی ہوں، ابھی تک کسی کے ساتھ جانسن ووڈ نہیں گئی، ہاں تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں، مجھے معلوم ہے باربرا بھی تمہارے ساتھ جانسن ووڈ جاتی رہی ہے۔''

وکٹر پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے سامنے بیٹھی نوخیز اور خوب صورت لڑکی کھلی دعوت دے رہی تھی۔

وکٹر خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ اس کے دماغ میں جوزف دی پریچر اور جانسن ووڈ کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ آخر جانسن ووڈ ہار گیا۔

وکٹر نے کہا۔ ''لز، میں تمہیں ایک چھوٹا سا کام دلوا سکتا ہوں، اس میں جتنی محنت کرو گی انکم بھی اسی لحاظ سے حاصل ہو گی۔''

لز سوالیہ نظروں سے وکٹر کو دیکھنے لگی۔

وکٹر نے کہا۔ ''لز، جانسن ووڈ کی دوسری طرف کالے اور گورے لوگوں کی بستی ہے۔ وہاں اچھی دکانیں ہیں۔ مین روڈ پر میرے ایک دوست کی آئسکریم کی ایجنسی ہے۔ میں اسے فون کر دوں گا اور تمہیں اپنا پرچہ بھی دے دوں گا۔ تم کل اسکول کے بعد اس کے پاس چلی جانا۔ وہ تمہیں ایک چھوٹی آئسکریم کارٹ دے دے گا۔ تم شام کو چھوٹے چھوٹے پارکوں اور گلیوں میں کارٹ لے کر گھومنا اور آئسکریم بیچنا۔ اس کو ڈپازٹ میں دے دوں گا۔ بتاؤ یہ کام تم کر سکو گی؟''

''کیوں نہیں وکٹر، گھر کے خرچے کے لیے کچھ پیسے ہی مل جائیں گے۔''

''لیکن لز تمہیں دو وعدے کرنے ہوں گے، نمبر ایک تم پڑھائی نہیں چھوڑو گی نمبر دو تم کسی لڑکے کے ساتھ جانسن ووڈ نہیں جاؤ گی۔''

''ایگری، پڑھائی مکمل کروں گی اور جانسن ووڈ جاؤں گی تو صرف تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

''لز فی الحال تو میں نیویارک جا رہا ہوں گریجویشن کرنے۔ واپس آ کر دیکھا جائے گا۔ اب میں چلتا ہوں، اپنی ماما کو میرا اسلام کہنا اور یہ پانچ سو ڈالر رکھو اس میں سے کچھ اپنی ماما کو دے دینا۔ باقی تمہارے ہیں۔ اور کل تم ضرور آئسکریم کی ایجنسی جانا، میں چلتا ہوں۔ گڈ بائے۔''

وہاں سے نکل کر وکٹر مکینک کی ورک شاپ پہنچا۔ مکینک نے بائیک اے ون کر دی تھی۔ وکٹر نے بائیک لی اور شکاگو کی سمت روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

امریکا میں ٹو ویلر گاڑی یا کسی بھی قسم کی بائیک ہائی وے یا موٹر وے پر چلانا سخت منع ہے۔ وکٹر ہمیشہ شکاگو ذیلی

سڑکوں کے ذریعے ہی جایا کرتا تھا۔

اکتوبر کے آخر میں یا نومبر کے شروع میں شکاگو شدید سردی اور برف باری کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ برف باری کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔ شدید سردی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ وکٹر پوری طرح گرم کپڑوں میں پیک تھا۔ ہاتھوں پر موٹے دستانے تھے جو بار بار ہینڈل پر پھسل رہے تھے۔ وکٹر بہت محتاط ہو کر بائیک چلا رہا تھا۔

راستے میں ایک کافی ہاؤس دیکھ کر اس نے بائیک روکی اور کافی پینے کے لیے اندر چلا گیا۔ کافی ہاؤس گرم تھا۔

کافی پیتے ہوئے اس نے سیل پر ایک نمبر ملایا۔ یہ نمبر جوزف ڈی پریچر نے دیا تھا۔ فون جس نے اٹینڈ کیا اس نے اپنا نام عون... بتایا۔ اس نے کہا۔ ''وکٹر، کئی دن سے تمہارا انتظار ہو رہا تھا۔ تم ایک ایڈریس نوٹ کر لو، میں اسی ایڈریس پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

وکٹر نے فون بند کیا۔ کافی ختم کی اور شکاگو روانہ ہو گیا۔ وہ شکاگو میں بتائے ہوئے ایڈریس پر بہ آسانی پہنچ گیا۔ یہ بیسمنٹ پلس ٹو کا چھوٹا سا مکان تھا۔ بیل بجانے پر جو لڑکا باہر آیا وہ تقریباً وکٹر کا ہم عمر تھا۔ چہرے مہرے سے خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر وکٹر کو گلے لگایا۔ ''وکٹر میرا نام عون.... ہے۔ جوزف ہٹ میں خوش آمدید۔ بائیک لے کر اندر آجاؤ۔''

جوزف کے نام پر وکٹر نے سوالیہ انداز میں عون... کی طرف دیکھا۔ ''ہاں وکٹر، یہ مکان جوزف ڈی پریچر ہی کی ملکیت ہے جو اس نے ہم جیسے لڑکوں کے لیے رکھا ہوا ہے۔ حیران نہ ہو اندر آجاؤ۔ یہاں دو چیزوں کا داخلہ منع ہے۔ ایک شراب، دوسرے لڑکیاں۔''

اندر آکر وکٹر نے دیکھا پورے گراؤنڈ پر قالین تھا اور گدے پڑے ہوئے تھے۔ چند صوفے بھی تھے۔ مکان میں ہیٹنگ اچھی تھی۔

عون... نے کہا۔ ''وکٹر، شاور لے کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لو پھر کافی کا دور چلے گا اور باتیں ہوں گی۔''

وکٹر شاور لے کر اور کپڑے چینج کر کے نکلا تو عون... کی آواز کان میں پڑی۔ ''وکٹر ادھر کچن میں آجاؤ۔'' کچن ٹیبل پر کافی پیتے ہوئے دونوں باتیں کرنے لگے۔ عون.... نے کہا۔ ''وکٹر تم میرا مسلم نام سن کر حیران ہو گئے ہو گے۔ اصل میں صدیوں پہلے میرے آباؤ اجداد مراکو سے غلام کی حیثیت سے یہاں لائے گئے تھے۔ پہلے ہمارے نام بدلے گئے۔ پھر مذہب بھی بدل دیا گیا۔ جب کالوں کو غلامی سے آزادی ملی تو کچھ کالے دوبارہ مسلمان ہو گئے، کچھ نے اس کو غیر ضروری سمجھا۔ جوزف کے آباؤ اجداد بھی مراکو سے پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ جوزف کی کہانی میں تمہیں ضرور سناؤں گا حالانکہ اس نے منع کیا ہوا ہے۔ جوزف کے بڑے جب غلامی سے آزاد ہوئے تو انہوں نے مچھلی پکڑنے اور فروخت کرنے کا کاروبار شروع کر دیا۔ وہ لوگ مراکو میں بھی مچھلی کے کاروبار سے منسلک تھے۔ جوزف نے چالیس سال کی عمر میں اپنا علیحدہ کاروبار سیٹ کیا۔ دو سال میں ہی اس نے اتنی ترقی کر لی کہ شکاگو کے فش ہاربر کا سب سے بڑا آڑھتی بن گیا پھر ایک خوفناک رات آئی۔ جوزف کسی کام سے دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ اس رات تجارت کے حریفوں کے غنڈوں نے جوزف کے مکان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے جوزف کے ماں باپ، بیوی اور جوزف کے تین بچوں کو قتل کر کے مکان کو آگ لگا دی۔ جوزف اکیلا رہ گیا۔ اس کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ وہ ایک دن شکاگو کی ریاستی جیل کے ڈپٹی جیلر کے پاس پہنچا، اسے اپنی پوری کہانی سنائی اور کہا، میں اس ظالم دنیا میں واپس جانا نہیں چاہتا، مجھے جیل کی نوکری دے دو۔ ڈپٹی بہت اچھا اور ہمدرد آدمی ہے اس نے جوزف کو قیدیوں کے کونسلر کی نوکری دلا دی اور مستقل طور پر پریزنر سیل نمبر 229 الاٹ کر دی۔ ڈپٹی جس قیدی میں سدھرنے کے جراثیم دیکھتا ہے، وہ اسے جوزف کے ساتھ ٹھہرا دیتا ہے۔ جوزف نے پچھلے دس سالوں میں درجنوں قیدیوں کو سدھارا اور ان کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ میں بھی چھوٹے موٹے جرائم کرتا تھا۔ جب پکڑا گیا تو ڈپٹی جیلر نے مجھے جوزف کے حوالے کر دیا۔ میں دو سال اس کے سیل میں رہا۔ میں نے جوزف کے کہنے پر کمپیوٹر پروگرامنگ کا کورس کیا اور اب آئی ٹی میں جلد ہی ڈگری ہولڈر بن جاؤں گا۔ جیل کا پورا عملہ جوزف کی بہت عزت کرتا ہے۔ جوزف کے لاکھوں ڈالرز بینک میں جمع ہیں جس سے وہ ہم جیسے لوگوں کی مدد کرتا رہتا ہے۔ تو وکٹر یہ تھی جوزف کی کہانی جو میں نے مختصر کر کے تمہیں سنائی ہے۔''

وکٹر خاموشی سے جوزف کی روداد سن رہا تھا۔ وکٹر نے بس اتنا کہا۔ ''علی یہ جوزف مجھے انسان نہیں لگتا۔ یہ تو فرشتہ ہے فرشتہ۔''

علی کے پوچھنے پر وکٹر نے بتایا کہ اس کا ارادہ قانون میں گریجویشن کرنے کا ہے۔ دو سمسٹر کے پیسے ہیں میرے پاس۔ بس تم کسی اچھے ادارے میں ایڈمیشن دلا دو۔''

''نو پرابلم وکٹر۔ میں ایک ہفتے میں ہی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ کرا دوں گا۔ تمہاری رہائش یہیں رہے گی۔ یہاں ہم چھ لڑکے ہیں، رات کو سب سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔''

دوسرے ہفتے سے وکٹر کی پڑھائی شروع ہو گئی۔ چار سال میں وکٹر نے لاء میں ڈگری حاصل کر لی اور ایک اچھی لاء فرم سے منسلک ہو گیا۔ اس نے سینئر وکیلوں کے ساتھ کورٹ جانا بھی شروع کر دیا۔ اس طرح مزید دو سال اور گزر گئے پھر اس نے فیصلہ کیا کہ باربرا کی طرف جانا چاہیے۔ اس کا شوہر اسمتھ بھی مشہور وکیل ہے۔ وہ مجھے کسی اچھی لاء فرم میں ایڈجسٹ کرا سکتا ہے۔

وکٹر نے اپنی فرم سے ایک ماہ کی چھٹی لی اور سان فرانسسکو کے لیے فلائی کر گیا۔

☆☆☆

شکاگو سے سان فرانسسکو کافی لمبی فلائٹ تھی۔ جب جہاز نے سان فرانسسکو کے ائرپورٹ پر لینڈ کیا اس وقت امریکن ویسٹرن ٹائم کے مطابق صبح کے 9 بجے تھے۔ وکٹر نے ائرپورٹ کے واش روم میں شیو بنائی۔ نہایت اچھی خوشبو والا آفٹر شیو لوشن گالوں پر ملا۔ کپڑوں پر پرفیوم کا اسپرے کیا اور کرائے کی گاڑی لے کر باربرا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

باربرا کا مکان شہر کے مضافات میں تھا۔ جب وکٹر نے باربرا کے مکان کے سامنے گاڑی پارک کی تو مکان کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ مکان کا رقبہ تقریباً ایک ہزار گز پر مشتمل تھا۔ چاروں طرف چار فٹ اونچی چہار دیواری تھی جس پر لوہے کے خوب صورت سریے لگے ہوئے تھے۔ اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف تین گیراج تھے جن میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ وسیع لان تھا۔ ایک سائڈ پر سوئمنگ پول تھا جس کے کنارے پر ایزی چیئر پر بیٹھی ایک نوعمر لڑکی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ بیچ میں چھوٹا سا خوب صورت مکان تھا۔

گیٹ پر باربرا اسمتھ ہاؤس کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وکٹر نے دل میں کہا' بھئی واہ بہت خوب، عاشق ہو تو اسمتھ جیسا ہو۔'

وکٹر نے گیٹ کی بیل پر انگلی رکھ دی۔ سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی لڑکی گیٹ کی طرف آئی اور گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر وکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ لڑکی کی عمر گیارہ بارہ سال معلوم ہوتی تھی۔ اٹھان غضب کی تھی۔ لڑکی کی شکل باربرا سے ملتی تھی۔

وکٹر نے پوچھا۔ ''بے بی، کیا تم باربرا کی بیٹی ہو؟'' لڑکی کے اثبات میں سر ہلانے پر وکٹر نے کہا۔ ''بے بی میرا نام وکٹر ہے۔ میں تمہاری ماما اور تمہارے ڈیڈی کا دوست ہوں اس وقت سیدھا شکاگو سے آ رہا ہوں۔ اپنی ماما کو بتاؤ کہ وکٹر انکل آئے ہیں۔''

لڑکی گیٹ بند کر کے مکان کی طرف چلی گئی۔ ایک منٹ کے بعد ہی واپس آتی نظر آئی اس کے ساتھ باربرا بھی تھی۔

باربرا وکٹر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ امریکن طریقے سے وکٹر کے گلے لگی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے شاندار ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ باربرا نے کہا۔ ''وکٹر یہ میری بیٹی جنیفر ہے اسے ہم جونی کہتے ہیں، اسمتھ تو کورٹ گئے ہوئے ہیں۔ تم آرام سے بیٹھو، اپنا سامان اندر لے آؤ۔ ملازمہ تمہارا کمرا ٹھیک کر دے گی۔''

جنیفر بڑی دلچسپی سے وکٹر کو دیکھ رہی تھی پھر اٹھ کر سوئمنگ پول پر چلی گئی۔ باربرا نے کہا۔ ''لز کا فون آتا رہتا ہے تمہارا بہت ذکر کرتی ہے۔ تم نے اسے آئسکریم کارٹ دلا کر بہت اچھا کام کیا۔ اب اس نے اپنی دوست سے مل کر مین روڈ پر آئسکریم پارلر کھول لیا ہے۔ اچھی انکم ہو رہی ہے۔ تمہاری بہت شکر گزار ہے، اس نے ہائی اسکول بھی کلیئر کر لیا ہے۔''

''میرا کیا شکریہ، لز نے محنت کی اور اس میں کامیاب رہی۔ اس کے حالات سن کر مجھے دلی خوشی ہوئی۔''

''وکٹر تمہارا دوست اسمتھ تو شام تک آئے گا۔ تم محتاط رہنا۔ اسے یہ تو معلوم ہے کہ میں تمہاری گرل فرینڈ رہ چکی ہوں لیکن میری فائیو اسٹار ہوٹل میں گورے بوڑھے لوگوں کے ساتھ ایکٹی وٹی کے بارے میں وہ قطعی لاعلم ہے۔ تم خیال رکھنا۔''

''باربرا میں یہاں تمہارا گھر اجاڑنے نہیں آیا۔ میں یہاں ایک کام سے آیا ہوں۔ شاید اسمتھ میری مدد کرے۔''

اس کے بعد وکٹر نے باربرا کو پچھلے سات سال کی روداد تفصیل سے سنائی۔ باربرا یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ وکٹر اب وکیل ہے اور ہائی کورٹ کے کیس لیتا ہے۔

شام کو اسمتھ آیا تو گھر میں وکٹر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ''ارے وکی میرے بچپن کے دوست، تم کہاں سے ٹپک پڑے۔ یقین مانو تمہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔''

وکٹر نے کہا۔ ''اسمتھ میں رات کو ڈنر کے بعد تمہیں

پوری تفصیل سے اپنی روداد سناؤں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ میں شکاگو سے کیوں آیا ہوں۔''

رات کو ڈنر کے بعد دونوں دوست سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ کر شراب کی چسکیاں لے رہے تھے اور باتیں کررہے تھے۔ وکٹر نے اسے بتایا کہ وہ اب کامیاب وکیل ہے۔ بار کونسل کا ممبر ہے اور ہائی کورٹ کے کیس بھی لیتا ہے۔

وکٹر نے کہا۔''دوست میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے کسی اچھی لاء فرم میں ایڈجسٹ کرا سکتے ہو تو کرادو۔''

''وکی! میرے تعلقات بہت وسیع ہیں، میں تمہیں یہاں یا شکاگو میں کسی اچھی فرم میں شامل کرادوں گا لیکن میں تمہارے سلسلے میں تین دن کے بعد کام کروں گا۔ کیونکہ میں اور باربرا ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے نیویارک جارہے ہیں کل شام کو۔ جونی یہیں رہے گی، تم اس کا خیال رکھنا۔''

''کیوں نہیں اسمتھ، جونی میری بھتیجی ہے تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اس کا پوری طرح خیال رکھوں گا۔''

دوسرے دن شام کو اسمتھ اور باربرا نیویارک روانہ ہو گئے۔ ان کو سی آف کر کے وکٹر، جونی کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔

صبح کو وکٹر سوئمنگ پول کے کنارے ایزی چیئر پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جونی سوئمنگ سوٹ پہنے پول پر آ گئی۔ وکٹر اس کی خوب صورتی، صحت اور اٹھان دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ دوسری بار بڑا معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے آتے ہی پول میں چھلانگ لگائی اور تیرنے لگی۔ بارہ سال کی عمر میں ہی اس کا جسم ایسا تھا کہ مرد اس کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

آدھے گھنٹے پول میں تیرنے کے بعد جونی پول سے نکل آئی اور ایک گدے پر اوندھی لیٹ گئی۔ اس کے قریب ہی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ جونی نے کہا۔''انکل! اس بوتل میں کریم ہے۔ آپ اس کریم سے میری کمر پر دس منٹ تک مالش کر دیں پلیز۔''

وکٹر اٹھ کر جونی کے قریب بیٹھ گیا اور بوتل سے کریم نکال کر اس کی کمر پر ملنے لگا۔

وکٹر نے پوچھا۔''بے بی اس کریم سے کیا فائدہ ہو گا؟''

''انکل! کریم سے سولر انرجی جسم میں جذب ہو جاتی ہے اس سے جسم میں طاقت آتی ہے اور جسم کے پارٹس ڈیویلپ ہو جاتے ہیں۔''

''بے بی! تمہارا جسم پہلے ہی بہت ڈیویلپ ہے اپنی ماں کی طرح۔''

''انکل! اس کے باوجود لڑکے مجھے ڈیٹ پر نہیں لے جاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم ابھی بچی ہو۔''

''بے بی وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ابھی تم صرف بارہ سال کی ہو جب تم پندرہ سولہ سال کی ہو جاؤ گی تو لڑکے تمہیں شوق سے ڈیٹ پر لے جائیں گے، تم بہت خوب صورت لڑکی ہو۔''

کچھ دیر کے بعد جونی نے کہا۔''انکل! آپ مجھے ڈیٹ پر لے جائیں بوائے فرینڈ کی طرح۔''

وکٹر ہنس پڑا۔''بے بی، میں تمہارا انکل ہوں، میں تمہاری ماما اور ڈیڈی کا دوست ہوں، تمہارا بوائے فرینڈ کیسے بن سکتا ہوں؟''

''انکل! میں ڈرتی ہوں بوائے فرینڈ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ مجھے ایبنارمل لڑکی نہ سمجھنے لگیں۔''

''بے بی یہ ڈر ذہن سے نکال دو، تین چار سال کے لیے ابھی تم بچی ہو۔ میں تمہیں لانگ ڈرائیو پر لے جا سکتا ہوں، انکل کی حیثیت سے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے نہیں۔''

مالش کے دس منٹ گزر گئے۔ جونی اٹھ کر پھر سوئمنگ پول میں کود گئی۔

وکٹر کو اب جونی سے ڈر لگنے لگا تھا، کہیں رات کو یہ میرے بیڈروم میں نہ آ جائے۔

شام کو اس نے ملازمہ سے کہا۔''بے بی اکیلی ہے اور گھبرا رہی ہے۔ اگر تم رات کو بے بی کے کمرے میں رک جاؤ تو تمہیں ایکسٹرا پے منٹ کردوں گا۔''

ملازمہ تیار ہو گئی۔ وکٹر کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ شام کو وکٹر، جونی کو لانگ ڈرائیو پر لے گیا۔ اسے ڈنر کرایا اور اس کی پسندیدہ آئسکریم کھلائی اور رات کو جونی کو ملازمہ کے حوالے کر کے اپنے بیڈروم کی کنڈی لگا کر سو گیا۔

دو دن گزر گئے۔ اسمتھ اور باربرا نیویارک سے واپس آ گئے۔ وکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اسمتھ روزانہ وکٹر کو بتاتا رہتا تھا کہ وہ اس کے مسئلے پر کام کر رہا ہے اور جلد ہی اسے خوش خبری سنائے گا۔

ایک رات وکٹر نے ماحول میں کچھ کھنچاؤ سا محسوس کیا۔ جونی اور باربرا گھر پر نہیں تھیں صرف اسمتھ تھا۔ وہ بھی خاموش اور کچھ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ وکٹر نے کئی دفعہ اس سے پوچھا

کہ معاملہ کیا ہے لیکن اسمتھ نے اسے ٹال دیا۔
گیارہ بجے دونوں نے ڈنر کیا۔ ڈنر کے بعد دونوں شراب کے لوازمات لے کر سوئمنگ پول کے کنارے پر بیٹھ گئے اور مے نوشی میں مشغول ہو گئے۔ وکٹر نے محسوس کیا کہ اسمتھ اسے زیادہ سے زیادہ شراب پینے پر مجبور کر رہا ہے۔ آخر وکٹر نے کہا۔ ''بس بھئی اسمتھ، میں پوری بوتل پی گیا ہوں، اب اور نہیں پیوں گا۔''
یکا یک اسمتھ نے وکٹر کو دھکا دے کر پول میں گرا دیا۔
''ارے اسمتھ! یہ کیا کر رہے ہو؟'' وکٹر نے کہا اور پول سے نکلنے کے لیے کنارے پر آ گیا۔ اسمتھ نے لات مار کر اسے پھر پانی میں دھکیل دیا۔ اب وکٹر پریشان ہو گیا، وہ تیر کر پول کے دوسرے کنارے پر گیا تا کہ باہر نکل سکے۔ اسمتھ اس سے پہلے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پھر لات ماری اور وکٹر کو پول میں دھکیل دیا۔
''اسمتھ! یہ کیا کر رہے ہو، ٹھنڈے پانی میں میرا جسم سُن ہو رہا ہے۔''
''ہاں وکٹر! اس شراب کی یہ خاصیت ہے کہ اسے پی کر پول میں نہایا جائے تو جسم شل ہو جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ڈیتھ ہو جاتی ہے۔ صبح تمہاری ڈیڈ باڈی یہاں تیرتی ہوئی ملے گی۔ کنارے پر شراب کے لوازمات ملیں گے۔ پولیس یہی سمجھے گی کہ تم شراب میں دھت ہو کر پول میں گر گئے اور ڈوب کر مر گئے۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔''
''لیکن اسمتھ تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''
''وکٹر مجھے معلوم ہے کہ تم چار سال کی جیل کاٹ کر آئے ہو۔ مجھے تمہارا جرم بھی معلوم ہے۔ تم نے یہاں آ کر جونی کو بھی نہیں بخشا، وہ تمہاری بیٹی کی طرح تھی۔ تم اسے بھتیجی کہتے تھے۔ وہ بہت کم سن تھی۔ تم نے اس کے ساتھ بار بار وحشی بن کر زیادتی کی اور وہ اب اسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بچ جائے گی لیکن تم نہیں بچو گے، میں تمہاری لاش صبح پول میں تیرتا دیکھنا چاہتا ہوں۔''
وکٹر بڑا حیران تھا۔ ''اسمتھ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں جونی کو بیٹی سمجھتا ہوں۔ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا حالانکہ وہ دو دن دو راتیں میرے ساتھ اکیلی رہی۔ تمہیں شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ اسمتھ پلیز مجھے پانی سے نکالو، میرا جسم سن ہو رہا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ مجھے نکالو۔''
''ہاں وکٹر تم مر رہے ہو۔ تمہیں مر جانا چاہیے۔ تم نے جرم ہی ایسا کیا ہے۔ میری پھول جیسی کمسن بچی کے ساتھ تم نے وحشیانہ پن کیا ہے۔ تمہاری کم از کم سزا موت ہے۔''
وکٹر کو یقین ہو گیا کہ آج اس کی موت واقع ہو جائے گی ناکردہ جرم کی بنا پر۔
یکا یک اسمتھ کی جیب میں رکھے ہوئے سیل کی بیل ہوئی۔ اسمتھ نے نمبر دیکھا اور پول سے ہٹ کر باتیں کرتا رہا۔
وکٹر میں اب اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ تیر کر پول کے کنارے آئے اور باہر نکل سکے۔
فون باربرا کا تھا وہ اسپتال سے بول رہی تھی۔ باربرا نے فون پر بتایا کہ جونی کو ہوش آ گیا ہے۔ دو پولیس آفیسر اس کا بیان لے رہے ہیں۔ جونی نے بیان دیا ہے کہ وہ انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر گھر کی طرف آ رہی تھی کہ ایک سنسان جگہ پر دو لحیم شحیم آدمیوں نے مجھے پکڑا اور جنگل میں لے گئے۔ وہاں دونوں نے بار بار میرے ساتھ زیادتی کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب میں بے ہوش ہو گئی اور اسپتال کیسے پہنچی۔ اسمتھ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہماری بچی اب خطرے سے باہر ہے لیکن اسے اسپتال میں رہنا ہو گا۔''
یہ بات سن کر اسمتھ سکتے میں آ گیا، اس نے فون ایک طرف رکھا اور پول میں کود گیا۔ اس نے نیم بے ہوش وکٹر کو گود میں اٹھایا اور کنارے پر لے آیا۔ پول سے باہر نکال کر اسمتھ نے جلدی جلدی وکٹر کے تمام کپڑے اتار دیے اور تولیے سے اس کا جسم خشک کر دیا۔ پھر اسمتھ بھاگتا ہوا کچن میں گیا اور گرم کافی کی پوری کیتلی مع ایک مگ اور طشتری لے کر آ گیا۔ اس نے کیتلی سے مگ میں کافی نکالی اور طشتری میں ڈال کر وکٹر کو پلانے لگا۔ ''وکٹر جلدی جلدی کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرو اور پی جاؤ، اس شراب کا یہی توڑ ہے۔''
وکٹر غنودگی میں ایک ہی جملہ کہے جا رہا تھا۔ ''میں بے گناہ ہوں اسمتھ، میں بے گناہ ہوں۔''
جب وہ کافی کے دو مگ پی چکا تو اس کے بدن میں جان آنی شروع ہو گئی۔ اس نے اسمتھ کی طرف دیکھا۔
''اسمتھ تم نے یہ سب کیوں کیا، کیوں کیا؟''
اسمتھ نے کہا۔ ''سب بتا دوں گا۔ سب بتا دوں گا۔ تم اور کافی پیو، اس کا یہی علاج ہے۔''
وکٹر ڈگمگاتے قدموں سے اٹھا اور ایزی چیئر پر ڈھے گیا۔ اب وہ مگ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کافی پی رہا تھا۔ اسمتھ نے کہا۔ ''تم کافی پیو، میں تمہارے لیے خشک کپڑے لے کر

آتا ہوں۔"

کپڑے پہن کر وکٹر ایزی چیئر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور کافی کا چوتھا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسمتھ اس کے سامنے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا پھر اسمتھ نے کہا۔ "وکٹر میرے دوست مجھے معاف کر دو، میں اتنا شرمندہ ہوں کہ میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں تمہارے سامنے ہی اپنے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لیتا۔ یہ سب ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ میں نے تمہیں تقریباً مار ہی دیا تھا۔ وہ تو عین وقت پر ہسپتال سے باربرا کا فون آ گیا اور تمہاری جان بچ گئی۔ دوست مجھے معاف کر دو۔"

"اسمتھ زیادہ جذباتی نہ ہو۔ غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

"وکٹر، باربرا اسپتال سے آ رہی ہے اور میں اسپتال جونی کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ میں ہاتھ جوڑ کر تم سے التجا کرتا ہوں کہ باربرا سے پول کی واردات کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اسے افسوس ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں باربرا سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارا کام بھی دو دن میں کرا دوں گا۔"

"نہیں اسمتھ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ طبیعت سنبھلتے ہی میں شکاگو روانہ ہو جاؤں گا اور اپنی فرم جوائن کر لوں گا۔ تم مطمئن رہو میں باربرا کو کچھ نہیں بتاؤں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔"

وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باربرا کی کار سامنے آ کر رکی۔ اس نے اندر آ کر جونی کی حالت کے بارے میں بتایا کہ وہ اب ٹھیک ہے لیکن ابھی تین دن اسپتال میں ہی رہے گی۔

باربرا کے آنے کے بعد اسمتھ اسپتال روانہ ہو گیا۔ وکٹر، جونی کے بارے میں باربرا سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اسے اسمتھ کی حرکت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

دوسرے دن وکٹر، جونی کو دیکھنے اسپتال گیا۔ واپس آ کر اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ اسمتھ اور باربرا سے گلے مل کر ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

شکاگو پہنچ کر اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی صفائی وغیرہ کی۔ ابھی اس کی پندرہ دن کی چھٹیاں باقی تھیں اس نے اچھی حالت والی ایک پرانی کار خریدی اور جانسن ووڈ کے سامنے واقع کالے لوگوں کی بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اس کا آبائی مکان تھا اور لز بھی۔

وہاں پہنچ کر اس نے مین روڈ پر لز کا آئسکریم پارلر تلاش کرنا شروع کیا۔ پارلر اسے جلد ہی مل گیا۔ پارلر کے دروازے پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ الزبتھ شیلا آئس کریم پارلر۔ اس نے پارلر کے سامنے گاڑی روکی اور گاڑی سے اتر کر پارلر کی طرف منہ کر کے کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

پارلر کے کاؤنٹر پر لز موجود تھی۔ وہ بہت غور سے باہر کھڑے آدمی کو دیکھ رہی تھی پھر وکٹر وکٹر کہتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔ وہ وکٹر سے بار بار گلے مل رہی تھی۔ "وکٹر، وکٹر تم آ گئے برسوں بعد آئے ہو۔ آؤ جانسن ووڈ چلیں۔"

وکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں جانسن ووڈ لے جانے کے لیے نہیں آیا۔ میں تمہیں شکاگو لے جاؤں گا شادی کر کے، کیا تم تیار ہو؟"

"واؤ، وکٹر میں تیار ہوں۔ چلو گھر چلو ماما کو یہ خوش خبری سناتے ہیں۔"

لز کی ماما یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئی، وکٹر نے کہا۔ "آنٹی! اب آئسکریم پارلر کا کام آپ سنبھالیں گی۔ لز تو شادی کی رسم کے بعد میرے ساتھ شکاگو جا رہی ہے وہیں ہم ہنی مون منائیں گے۔"

دوسرے دن بستی کے چھوٹے سے گرجا گھر میں شادی کی رسم ادا کی گئی اور وکٹر اسی دن لز کو لے کر شکاگو روانہ ہو گیا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ پچھلے دس سالوں میں اسے کتنے امتحانات کا سامنا کرنا پڑا۔ جانسن ووڈ۔ شکاگو کا فائیو اسٹار ہوٹل۔ ڈالرز کی بارش۔ چار سال کی جیل۔ جوزف دی پریچر۔ اسمتھ اور سوئمنگ پول۔ وکٹر نے دل ہی دل میں دعا کی، گاڈ مجھ میں مزید امتحان کی سکت نہیں ہے۔ میری زندگی پُرسکون گزرے، یہ میری التجا ہے۔

لز شکاگو میں خوب صورت اپارٹمنٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ انہوں نے دو دن تک اپارٹمنٹ کے ہر کمرے میں، ہر گوشے میں ہنی مون منایا۔

دیکھتے دیکھتے ہی دو سال گزر گئے۔ لز ایک منی سی خوب صورت بیٹی کی ماں بن گئی۔ وکٹر کا شمار اب سینئر وکلا میں ہوتا ہے۔ دولت کی ریل پیل تھی لیکن وکٹر جوزف دی پریچر کا پڑھایا ہوا سبق نہیں بھولا تھا۔ غریب اور نادار لوگوں کا کیس بالکل مفت لڑنا اس کا نصب العین تھا۔

❖❖❖

خون آشام

روبینہ رشید

بچپن میں بیتے دن... ارد گرد کا ماحول ذہن و دل پر اپنے اثرات ضرور مرتب کرتا ہے... اس وقت ہر اظہار پر پابندی ہوتی ہے... شفقت... محبت اور تربیت جیسی خوب صورت چھاؤں نہ ملنے سے شخصیت میں جو کمی اور بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے... وہ تاعمر ساتھ رہتی ہے... رگوں میں تازہ خون تیزی سے حرکت کرتا ہے اور جبر کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکا دیتا ہے... ایسے ہی کرداروں کے گرد بُنی کہانی کے اتار چڑھائو... زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اسے ایسا درندہ بنا دیا تھا جس کی پیاس انسانی خون سے ہی بجھتی تھی۔ وہ انسانوں کو جبر... طاقت اور اختیار کی زنجیروں میں جکڑ کے راحت محسوس کرتا... لیکن جب وقت گزرتا ہے تو وقت کا فیصلہ سیاہ دھبّوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے۔

جاسوسی کے مخصوص انداز میں ڈوبی سنسنی خیز واقعات میں الجھی تیکھی کہانی

لندن کے مشہور پارک تک پیدل آیا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوا اور آہستہ قدموں کے ساتھ اس جانب بڑھا جہاں کبھی میں اور سبین گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ لمبے قد اور لمبے بالوں والی سبین جس سے پہلی ملاقات فلائٹ میں ہوئی تھی جہاں وہ ائر ہوسٹس تھی۔ میں لندن آ رہا تھا اور اس کی فلائٹ بھی لندن کی تھی۔

میں اسکالرشپ پر لندن جا رہا۔ جہاں میرا بڑا بھائی ڈاکٹر تھا۔ مجھے اس کے گھر پر ہی قیام کرنا تھا۔ اس کی بیوی اور میری بھابی امریکن تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر رہنے کی پیشکش کی تھی۔ دورانِ فلائٹ میں نے سبین سے ایڈریس کنفرم کرنا چاہا تو اس نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ ''یہ تو ہمارے ہوٹل کے سامنے کا علاقہ ہے۔''

''تم ہوٹل میں رہتی ہو؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے دھیرے دھیرے بادلوں میں سے سورج باہر نکلتا ہے۔

''میرا اپائنٹمنٹ کراچی کا ہے اس لیے جب بھی لندن آتی ہوں میرا قیام اس ہوٹل میں ہوتا ہے جبکہ میری ایک کزن یہاں لندن میں ہے۔'' اس نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اور تمہاری کزن......؟'' میں نے مزید وضاحت چاہی تو ایک بار پھر سے سورج بادلوں میں سے نکل آیا۔

''میری کزن شادی کے تین برس بعد طلاق لے کر اب اسی علاقے میں رہ رہی ہے جہاں تمہارا بھائی رہ رہا ہے۔'' اس کا جواب تھا۔

ہیتھرو ائرپورٹ پر اتر کر میں نے پہلے اپنا سامان لیا اور باہر کی جانب چل دیا۔ مجھے امید تھی کہ بھائی یا بھابی میں سے کوئی ائرپورٹ ضرور آئے گا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے پہلے اُن کے گھر فون کیا لیکن کوئی جواب نہ ملنے کی صورت میں بھائی کے موبائل پر فون کیا جہاں سے جواب ملا کہ ''آپ کو مطلوبہ سہولت حاصل نہیں ہے۔''

میں ہیتھرو کے باہر حیران و پریشان کھڑا تھا کہ مجھے ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔ ''اسد کوئی نہیں آیا؟''

میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ سبین تھی اور اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو پہلی بار میں نے فلائٹ میں

دیکھی تھی۔

''میں نے ان کے گھر فون کیا اور بھائی کے موبائل پر بھی فون کیے لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' اس نے سوال کیا اور میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔

''یہیں پر انتظار کروں گا۔'' میرا جواب تھا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''تم یہاں رکو میں آتی ہوں۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

اس کے آنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر بھائی کے گھر فون کیا۔ اس بار بھابی نے فون ریسیو کر لیا۔

''تم کہاں ہو؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''ہیتھرو ائرپورٹ پر ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔

''تم وہیں رکو ارشد دفتر سے نکل چکے ہیں جیسے ہی وہ گھر پہنچیں گے میں ہیتھرو کے لیے نکل جاؤں گی۔'' ابھی میں بھابی سے بات کر ہی رہا تھا کہ یمین نمودار ہو گئی۔ میں ..... بھابی کو رکنے کا کہہ کر یمین کی جانب دیکھنے لگا۔ ''بھابی ہیں فون پر۔'' میں نے اس سے کہا۔

یمین نے مجھ سے فون لیا اور بھابی سے بات کرنے لگی اور پھر اُن سے کہا۔ ''فکر مت کریں میں اسد کو لے کر آپ کی طرف ہی آ رہی ہوں۔''

میں اور یمین اس ٹیکسی میں سوار ہوئے جو یمین نے کی تھی۔ میرے دونوں سوٹ کیس ڈکی میں بہ آسانی آ گئے تھے۔

''بھائی کے پاس رہنے آئے ہو؟'' ٹیکسی چلی تو اس نے سوال کیا۔

''میں اسٹوڈنٹ ہوں اور اسکالرشپ ویزا پر آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

راستے بھر ہمارے درمیان اسی طرح کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ دورانِ گفتگو اس نے بتایا کہ دو دن آرام کے بعد وہ امریکا کے لیے روانہ ہو جائے گی پھر چار دن کے ریسٹ کے بعد وہ لندن آئے گی یا پھر کراچی چلی جائے گی۔

ہم بھائی کی بلڈنگ پر پہنچے تو یمین نے اپنے موبائل

سے بھائی کے گھر کا نمبر ملایا۔ ''ہم نیچے ہیں۔'' اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا جس کے جواب میں اس نے کہا۔ ''دو بھاری سوٹ کیس ہمارے ساتھ ہیں۔''

''او کے۔'' کہہ کر اس نے مجھے وہیں رکنے کے لیے کہا تھا اور خود فون پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''جواب نہیں آ رہا...... شاید وہ جاب پر ہے۔'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''کون؟'' میں نے اس کے کہنے پر سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔

''میری کزن۔'' اور اس کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ آ گئی۔

''وہ یہاں سے ایک بلاک آگے رہتی ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

ہم دونوں وہیں موجود تھے جب بھابی وہاں پہنچی تھیں۔

میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کیونکہ بھیا نے اُن کی تصویر بھیجی تھی۔ وہ تصویر جس میں وہ مس امریکا کا تاج پہنے تھیں لیکن اس طرح کہ وہ سر پر نہیں تھا۔

''بھابی۔'' میں کہتا ہوا آگے بڑھا۔ اُن سے ہاتھ ملایا اور سین نے بھی آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔

''تم بھی آ جاؤ۔'' بھابی نے سین سے کہا جس پر اس نے معذرت چاہی۔

''میرا ہوٹل زیادہ دور نہیں ہے۔'' اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا لیکن بھابی نے اُسے ''کافی'' کا لالچ دیا۔

''میرے ہاتھ کی بنی کافی پی کر چلی جانا بلکہ میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔'' انہوں نے کہا اور سین تیار ہو گئی۔

ہم تینوں اوپر آ گئے۔ فلیٹ پہلی منزل پر ہی تھا جبکہ نیچے دکانیں تھیں۔ ایک بیگ لے کر میں لفٹ تک آیا تھا اور دوسرا بیگ بھابی اور سین نے اٹھایا تھا۔

فلیٹ ڈیڑھ کمرے پر مشتمل تھا۔ ایک بڑا کمرا جس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا کمرا تھا۔ میرے دونوں بیگ بھابی نے اس چھوٹے کمرے میں پہنچائے جبکہ سین سٹنگ روم میں بیٹھ گئی جس کے سامنے ہی کچن تھا۔ بھابی کچن میں اس کے لیے کافی بنانے میں مصروف ہو گئیں۔

کافی پینے کے بعد سین نے مجھ سے کہا۔ ''پہلے میں نے تمہیں چھوڑا اب تم مجھے ہوٹل تک چھوڑ کے آؤ۔''

''کچھ دیر اور رک جاؤ......'' بھابی نے سین سے کہا لیکن سین اس بار تیار نہیں ہوئی۔

''آپ کا فلیٹ ہائیڈ پارک کے اس طرف ہے اور میرا ہوٹل ہائیڈ پارک کی دوسری جانب۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس کا بیگ اٹھا لیا اور اس نے پرس گلے میں ڈالا اور ہم دونوں سیڑھیوں سے اترنے لگے۔

سڑک کراس کر کے ہم ہائیڈ پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہائیڈ پارک میں داخل ہوئے پھر باتیں کرتے کرتے ہم اس کے ہوٹل پہنچ گئے۔ راستہ ہمارا باتوں میں کٹ گیا تھا۔ ہم ہائیڈ پارک کے سنسان ایریا سے گزرے تو سین نے وہاں اکلوتی بینچ دیکھ کر کہا۔ ''جب میں تنہائی میں بور ہو جاتی ہوں تو یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔''

اس نے مجھے رکنے کے لیے نہیں کہا اور میں اسی راستے سے واپس بھی آ گیا۔ جاتے ہوئے میں نے اس کا موبائل نمبر لے لیا تھا۔ گھر پہنچا تو بھیا پہنچ چکے تھے جب انہیں داستان معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''اس کا نمبر ہی لے لینا تھا۔''

''میرے پاس ہے۔'' میں نے بھابی کے بجائے دخل در معقولات کیا۔

بھابی نے مجھ سے نمبر لیا اور فون کر دیا۔ دوسری جانب سے جواب ملا تو انہوں نے اسے بھی مدعو کرنا چاہا تھا۔

''ہم ڈنر پر جا رہے ہیں۔'' انہوں نے رابطہ قائم ہوتے ہی کہا اور ساتھ ہی اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کہہ رہی ہے میں چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس شرط پر کہ میں جہاں کہوں گی وہاں چلنا ہوگا۔'' بھابی نے فون سننے کے بعد اپنے شوہر کو بتایا۔

''مجھے فون دو۔'' بھیا نے بھابی سے کہا اور ساتھ ہی اس کے ہاتھوں سے فون لے لیا۔

وہ کچھ دیر سین سے باتیں کرتے رہے اور پھر اپنی بیگم سے کہا۔ ''تیار ہو جاؤ تمہارے پاس آدھا گھنٹا ہے۔''

ہم بھیا کی کار میں ڈنر کے لیے نکلے تو بھابی آگے بھیا کے ساتھ آگے کی سیٹ پر بیٹھ گئیں جب سین آئی تو اس کے پاس میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بھیا نے کار اپنے جاننے والے شخص کے ریسٹورنٹ کے سامنے روکی۔ وہاں رش بہت تھا۔ سین نے رش دیکھتے ہوئے کہیں اور چلنے کی فرمائش کی لیکن بھیا نے کہا۔ ''میں سیٹ ریزرو کروا چکا ہوں۔''

ڈنر کے دوران میں ایک موقع ایسا آیا کہ ہم دونوں

اکیلے رہ گئے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم کل کیا کر رہی ہو؟''

''کل ریسٹ ڈے ہے اس لیے صبح لیٹ اٹھوں گی۔'' اس کا جواب تھا۔

''جلدی بیدار ہو جاؤ تو وہاں آ جانا جہاں مجھے چھوڑا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے بھیا اور بھابی؟'' اس نے سوال کیا۔

''بھابی مجھے بتا چکی ہیں کہ دونوں صبح جلدی اپنے اپنے دفتر چلے جائیں گے۔'' میرا جواب تھا۔

''دیکھوں گی۔'' اس نے عجیب انداز میں جواب دیا اور مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔

رات بھابی نے سونے سے قبل یہ بتا دیا تھا کہ مجھے صبح اٹھنے کے بعد کیا کرنا ہے۔ آملیٹ کہاں ڈھکا رکھا ہوگا اور سلائس مجھے فریج سے نکال کر کس طرح مائیکروویو میں گرم کرنے ہوں گے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو کوئی فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ میں سوتے سے اٹھا اور باہر کی جانب لپکا، دروازہ کھولا تو سامنے سین موجود تھی۔

''تم؟'' میں نے کہا اور وہ اندر گھستی چلی گئی۔

''رات مجھے نیند نہیں آ سکی۔ صبح پانچ بجے آنکھ لگی ہی تھی کہ تمہاری آفر یاد آئی اور میں جلدی سے تیار ہو کر آ گئی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''بیٹھو۔'' میں نے لاؤنج میں رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا لیکن وہ تیار نہ ہوئی۔

''بیٹھنے کا وقت نہیں ہے بس جلدی سے تیار ہو جاؤ، تمہیں اپنی کزن کا گھر بھی دکھانا ہے۔'' اس نے کہا۔

مجھے فریش ہو کر تیار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تب تک وہ لاؤنج میں انتظار کرتی رہی۔ ہم اس کی کزن کے فلیٹ پہنچے تو وہ مجھے لاؤنج میں بٹھا کر ناشتا بنانے لگی۔

یہ فلیٹ بھی میرے بھیا کے فلیٹ کی طرح تھا۔ ایک بڑا بیڈروم اس کے ساتھ ایک چھوٹا روم جس میں ایک باتھ روم ایسا بھی تھا جس میں نہانے کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک سنگل بیڈ اس کمرے میں تھا اور ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

ناشتا کرنے کے بعد سین نے کہا۔ ''بیڈروم میں بیٹھتے ہیں۔'' اور ہم اس روم میں آ گئے جہاں ڈبل بیڈ تھا۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ اس نے اچانک سوال کیا۔ ''اسد پاکستان میں تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟'' اور میری گردن نفی میں ہل گئی۔

''چند لڑکیوں نے لفٹ دی تھی لیکن میں کچھ جھجک اور کچھ اپنی شرم کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

میں جب یہ کہہ رہا تھا، اس وقت میرے ذہن میں خالدہ تھی۔ وہ لڑکی جو میرے ساتھ کالج میں دو سال ایک ہی کلاس میں رہی۔ وہ حق بلڈرز والوں کی بیٹی تھی اور مرسیڈیز میں کالج آتی تھی۔ دو برس میں اس نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب میں نے کالج میں صدر کا الیکشن لڑا۔ میری الیکشن مہم کا تمام خرچ اسی نے اٹھایا بلکہ وہ جلوس جو لڑکیوں نے میری حمایت میں نکالا، اسے بھی آرگنائز کرنے میں اسی کی کاوش تھی۔ دوستوں نے مجھے کئی بار کہا کہ خالدہ حق تمہاری گرل فرینڈ بننا چاہتی ہے لیکن میں اس کے باپ کی دولت کی وجہ سے اس سے دور رہا یہاں تک کہ آخری پیپر دے کر کالج پہنچا تو اس نے اظہار کر دیا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو اسے انتظار کرتے پایا۔ ''کیا تیر مار کر آئے ہو؟'' اس نے سوال کیا تھا۔ میں نے کہا۔

''میں کیوپڈ نہیں ہوں۔'' اور اس کا جواب تھا کیوپڈ نہ سہی اندھے تو ہو۔

''مجھے گرل فرینڈ بناؤ گے۔'' سین نے سوال کیا اور میں اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اس کی بولڈنیس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ خود پر قابو پانا میرے لیے بھی مشکل ہو رہا تھا اور بڑھتے بڑھتے ہم نے کئی مراحل سر کر لیے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مسکرا دی تھی۔

''یہ ثبوت ہے کہ میں کنواری تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ ائرہوسٹس اس وقت تک ائرہوسٹس بن ہی نہیں سکتی جب تک وہ کنواری ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی ایسی تھی جیسے ویرانے میں کوئی جلترنگ بج گیا ہو۔

''یہ لمبی داستان ہے۔'' اس نے جواب دینا شروع کیا۔

"میرے والد ائرلائن کے بہت بڑے افسر تھے۔" اس نے کہا اور میں پوری بات سمجھ گیا۔

وہ پہلا دن تھا کہ میں نے سبین کو اپنی گرل فرینڈ کے طور پر قبول کیا تھا۔ اس کے بعد ہم جب بھی ملے ہمارے درمیان یہ ملاپ ضرور رہا تھا۔ کبھی اس کے کزن کے فلیٹ پر اور کبھی میرے بھائی کے فلیٹ پر۔ وہ جب بھی لندن میں ہوتی ہم ضرور ملتے تھے۔ پارک کے اس گوشے میں جہاں اکلوتی بینچ تھی، وہ مجھے فون کر دیتی اور میں پہنچ جاتا تھا۔ کبھی وہ اس بینچ پر انتظار کرتی ہوئی ملتی اور کبھی میں پہلے پہنچ جاتا تو کچھ دیر انتظار کر لیتا۔

☆☆☆

اُس روز میں ہائیڈ پارک کی اسی بینچ پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ وہ اس جانب سے آتی نظر آئی جس جانب اس کا دفتر تھا۔ میں اکیس برس بعد اس بینچ پر بیٹھا تھا۔ ان اکیس برسوں میں وہ میری یادداشت میں کھو گئی تھی...... خاص طور پر اس وقت کے بعد جب میں نے امریکا میں بھابی کی بہن سے شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھابی کی کوششوں سے ہوئی تھی۔ ان کی بہن بھی انہی کی طرح مس امریکا تھی اور اس نے بھی مس امریکا کا تاج اسی انداز سے پہنا تھا جیسے بھابی نے پہن کر تصویر کھنچوائی تھی۔ یعنی سر کے بجائے ماتھے پر سجایا گیا تھا۔

وہ سڑک کے دوسری جانب تھی جب میری پہلی نظر اُس پر پڑی تھی۔ پہلی نظر کے بعد میری نظریں اسی پر جمی رہی تھیں۔ اس نے سڑک کراس کی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آتی چلی گئی۔

"سبین۔" میں نے اسے اس وقت آواز دی تھی جب وہ میرے قریب آ گئی تھی۔ وہ اپنا نام سنتے ہی رک گئی۔

"اسد یہ تم ہو؟" اس نے کہا اور مجھے چھونے کی کوشش کی۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ برف سے بھی زیادہ سرد تھا۔

"تمہارا ہاتھ تو برف سے زیادہ سرد ہے۔" میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

ائرکنڈیشن سے نکل کر آ رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کب آئے؟" سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"آج ہی آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس کا ہاتھ اب بھی میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان ہی تھا۔

وہ میرے برابر اسی انداز سے بیٹھ گئی جیسے اکیس برس پہلے بیٹھتی تھی۔

"دیر نہیں کر دی آنے میں؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"یہ ایک طویل داستان ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا اور وہ خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

"نیویارک ائرپورٹ پر میرے سامان سے ہیروئن نکلی تھی۔" میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"تمہاری پیکنگ تو تمہارے بھائی اور بھابی نے کی تھی۔" میری خاموشی کا وقفہ بڑھنے لگا تو اس نے سوال کر کے اس وقفے کو توڑا۔

"میں نے اُن سے یہی کہا تھا کہ میں اس ہیروئن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟" سبین نے ایک اور سوال کیا۔

"کوئی جواب نہیں دیا اور نہ مجھے رہا کیا۔" میرا جواب تھا۔

"جو سوال و جواب وہ مجھ سے کرتے رہے تھے، اس کی روشنی میں وہ میرے بارے میں معلومات کرتے رہے تھے۔" میں نے جواب میں کہا۔

"پھر کیا ہوا؟" اس نے ایک اور سوال کیا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا سوائے اس کے کہ وہ پہلے سے زیادہ کمزور دکھائی دے رہی تھی۔

"انہیں میرے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جس سے ثابت ہو کہ یہ ہیروئن میری ہو سکتی ہے۔"

"تب تک تم ان کی کسٹڈی میں رہے؟" سبین نے ایک اور سوال کیا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی۔

"کہاں جا رہی تھیں؟" میں نے سوال کیا۔ میں نے یہ سوال نہیں کیا کہ کہاں سے آ رہی ہو۔

"اسی ریسٹورنٹ میں جہاں کبھی میں اور تم کھانا کھاتے تھے۔" اس کا جواب تھا۔ یکدم ہی وہ کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ اس کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھوں میں تھا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو پہلے۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں؟" میں نے سوال کیا اور اس نے کچھ کہنے سے قبل اِدھر اُدھر دیکھا۔

چیخو نہیں، غلطی تمہاری ہے...... بیچ سڑک میں کیوں کھڑے تھے۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' اس نے کہا اور میں نے غور کیا تو پاس سے گزرنے والے مجھے آگے جا کر پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے نکالا اور وہ مجھ سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسے وہ میرے ساتھ نہ ہو۔

''اس بات کو کلیئر کرنے میں پورے تین ماہ لگ گئے تھے کہ اس ہیروئن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں پر ٹوٹا تھا۔

''انہوں نے کراچی میں میرے والدین سے رابطہ کیا انہیں وہاں سے کوئی منفی رپورٹ نہیں ملی پھر وہ بھائی اور بھابی کی طرف گئے۔'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''وہاں سے بھی انہیں وہی رپورٹ ملی جو کراچی سے ملی تھی۔'' سین نے کہا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میں تین ماہ ان کی کسٹڈی میں رہا اس دوران بھابی کے والد نے میرے لیے پوری کوششیں کی تھیں۔'' میں نے کہا تھا۔

''تین ماہ ان کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں؟'' سین کا سوال چبھتا ہوا تھا۔

''بھائی اور بھابی امریکا پہنچے پھر جب ان سے سوال جواب ہوئے تو دونوں نے اپنی نوکریوں کے بارے میں بتایا تب جان چھوٹی۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری بھابی نے تو یہیں پر تم سے اپنی بہن کی بات چلانے کی کوشش کی تھی۔'' سین نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا کہ اسے اتنی پرانی باتیں کیسے یاد ہیں۔

''اس وقت میرے اعصاب پر تم سوار تھیں اس لیے میں نہیں مانا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تین ماہ حراست میں رہنے کے بعد تیار ہو گئے؟'' اس کا سوال میں سمجھ نہیں سکا تھا۔

''اس دوران تقریباً روز بھابی کے والد کسی بڑے آدمی سے مل کر مجھے حراست سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''یہ بات تھی یا کوئی اور بات تھی؟'' اسے شک ہو گیا تھا کہ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔

''حراست سے نکل کر میرا قیام بھابی کے والد کے گھر رہا۔'' میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''کیا ہوا تھا وہاں بھابی کے والد کے گھر؟'' سین نے کُریدا۔

''وہی جو تمہارے ساتھ یہاں ہوا تھا۔ تم نے خود آفر کی تھی اور یہی حال بھابی کی بہن کا بھی تھا۔ اس نے بھی وہی

آفر کی تھی اور جس طرح میں تمہارے آگے بے بس ہو گیا تھا ویسے ہی مجھے اس نے بے بس کر دیا تھا۔'' میرا جواب تھا۔

''تم بے بس ہو گئے تھے یا......؟'' اس نے عجیب سے انداز میں سوال کیا۔

''میں ان تین ہفتوں میں تمہیں فون کرتا رہا تھا۔'' میرا جواب تھا۔

''جب تم بھابی کے والد کے گھر شفٹ ہوئے تب؟'' سین کا سوال تھا۔

''شفٹ ہونے کے بعد بھی میں تمہیں فون کرتا رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں نے تمہاری کالز تمہارے میسجز دیکھے تھے لیکن تب تک میری شادی ہو چکی تھی اور فون میرے شوہر کے قبضے میں تھا۔'' سین نے کہا۔

''تمہاری شادی......؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''تم وہاں امریکا میں شادی کر سکتے ہو تو میں یہاں نہیں کر سکتی؟'' اس نے سوال کے جواب میں سوال کیا اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''میں تو وہاں بلیک میل ہوا تھا تمہاری کیا مجبوری تھی؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مسکرا دی۔

اس کی مسکراہٹ اب بھی ویسی ہی تھی جیسے اکیس برس پہلے ہوا کرتی تھی۔

''تمہاری شادی بلیک میلنگ کی وجہ سے ہوئی تھی اور میری طلاق بلیک میلنگ کی وجہ سے ہوئی تھی۔'' اس نے کہا۔

میری کالز اور میسجز کی وجہ سے؟'' میں نے سوال کیا۔

''شادی کے دو مہینے بعد جب اُسے معلوم ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو اس نے مجھے طلاق کا نوٹس دے دیا۔'' سین نے کہا۔

''اوہ......'' میرے ہونٹوں سے اس سے آگے کچھ نہیں نکل سکا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ میں باپ بن سکتا ہوں۔

''بیٹی ہے۔'' اس کا جواب تھا۔

''میں نے اس کا نام وہی رکھا ہے جو تم نے تجویز کیا تھا نتاشا۔''

''کہاں ہے وہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''میری کزن کے پاس۔'' اس کا جواب تھا۔

''مجھے بچے پالنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا جبکہ میری کزن نے اپنے دونوں بیٹوں کی اکیلے پرورش کی تھی۔'' سین کا جواب تھا۔

''تمہاری کزن اب کہاں ہوتی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بہت عرصہ سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی شاید وہ اب بھی وہیں رہتی ہو جہاں تم نے پہلی بار مجھے......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

میرے لیے اس کی گفتگو سمجھنا محال تھا۔ اس نے بیٹی پیدا کی۔ یورپ میں بچے کی پہچان اس کی ماں کا نام ہوتا ہے پھر باپ کے نام کا نہ ہونا اتنی بڑی قیامت کس طرح ہو گیا کہ اسے طلاق ہو گئی۔

''وہ جو کچھ ہوا تھا، تمہاری خواہش پر ہوا تھا۔'' میں نے کہا اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

''مانتی ہوں کہ جو ہوا تھا، وہ میرے کہنے پر ہوا تھا لیکن تم یہ نہیں جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا تھی۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''کیا وجہ تھی؟'' میں نے سوال کیا جس کا فوری جواب نہیں ملا پھر کچھ دیر بعد اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

''جب میں ٹریننگ پر تھی تب میرے ساتھ کی تمام ائر ہوسٹس اپنا کنوارپن گنوا چکی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ان کی باتیں سن کر میرا بھی دل چاہنے لگا کہ مجھے بھی کوئی اس مرض سے چھٹکارا دلا دے۔'' اس نے کہا اور میرا چہرہ حیرت کی زیادتی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''مشرقی ماحول میں جوان ہونے کے باوجود تم مغربی لڑکیوں کی طرح کنوارپن کو مرض سمجھتی تھیں؟'' میں نے سوال کیا جس کا جواب دینے میں اس نے کوئی دیر نہیں لگائی۔

''وہ جنہوں نے اپنا کنوارپن ختم کروایا تھا، وہ بھی مشرقی تھیں۔'' اس کا جواب تھا۔

''تمہارے راستے میں کیا دشواریاں تھیں؟'' میں نے کہا اور وہ کچھ دیر تو مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''ایک دشواری تو میرے باپ کا عہدہ تھا اور دوسرا میرا سانولا رنگ اور تیسری میری جسامت کہ اس میں کوئی بھی کشش نہ تھی۔'' اس نے تفصیلی جواب دیا تھا۔

''مجھ سے اپنا کنوارپن ختم کروانے کے بارے میں کب سوچا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ایسا زمانہ تھا جب میں کسی بھی ہینڈسم مرد کو دیکھتی

تھی تو اس پر عاشق ہو جاتی تھی، اس کا جواب تھا۔

''اس رات جب ہم ڈنر پر تھے اور تم نے مجھے صبح ملنے کے لیے کہا تھا.... میں ہوٹل پہنچی تو وہاں عجب نظارہ تھا۔'' وہ اتنا کہہ کر رک گئی۔

''کیسا نظارہ؟'' میں نے اس کے طویل ہوتے وقفے پر اس سے سوال کیا۔

''ہمارے جہاز کا پائلٹ میرے بستر پر میری ساتھی ائرہوسٹس کے ساتھ مصروف تھا۔'' اس نے کہا۔

''وہ دیکھ کر تم اگلی صبح اس سے پہلے کہ میں بیدار ہوتا، تم میرے پاس آ گئیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''میں کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہے اِدھر میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اس کھیل میں شامل ہو جاؤں۔ جب میری ساتھی نے دیکھا تو مجھ سے کہا۔

''تم میرے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''اور تم اس کے کمرے میں جا کر سو گئیں؟'' میں نے کہا اور اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔

''وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد میری نیند اُڑ گئی تھی۔ میرے خیالوں میں تم تھے اور تم میرے ساتھ وہی کر رہے تھے جو وہ... پائلٹ اور میری ساتھی ائرہوسٹس کر رہے تھے۔'' اس نے کہا۔

اب میرے پاس کوئی سوال نہیں بچا تھا۔

''تم کھانا کھانے جا رہی تھیں؟'' میں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے کہا اور اس نے منع کر دیا۔

''وہاں کوئی میرے انتظار میں ہے۔'' اس نے کہا اور میں چپ ہو گیا۔

''واپسی پر تمہارا گزر یہیں سے ہو گا؟'' میرا سوال سن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور گردن اثبات میں ہل گئی۔

میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ جاتے ہوئے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کیوں پلٹ کر دیکھتی۔ میں نے کون سا اسے پلٹ کر دیکھا تھا، اس آخری بات کے بعد جب میں نے اسے امریکا پہنچ کر فون کیا تھا۔ بھابی کے والدین اور ان کی بہن مجھے لینے ائرپورٹ کے باہر موجود تھے۔

یہ سچ تھا کہ لندن سے جاتے وقت میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ امریکا پہنچتے ہی اسے فون کروں گا اور کرتا رہوں گا۔ لندن سے روانگی سے قبل میں نے بھابی سے بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کی بہن مجھے پسند آ گئی تو میں اس سے شادی کر لوں گا۔ بھابی اس کے متعلق سب کچھ بتا چکی تھیں یہ بھی کہ وہ کنواری نہیں رہی اور یہ بھی کہ عفت اس سے زیادہ خوب صورت ہے۔

''اب تک واپس کیوں نہیں آئی؟'' میں نے انتظار کرتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

''جس سے ملنے وہ گئی ہے، وہ اس کا نیا بوائے فرینڈ بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اس نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی ہوں۔'' میری سوچ مجھے بھٹکا رہی تھی اور میں بھٹک رہا تھا۔

اندھیرا چھانے لگا تھا اور میں اسی بینچ پر بیٹھا تھا جہاں اکیس برس پہلے ہم بیٹھتے تھے۔ اس نے بہت قسمیں کھائی تھیں۔ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی لیکن جب میں حراست سے باہر آیا اور میرا موبائل مجھے واپس ملا تو میں نے بھابی کے والد کے گھر شفٹ ہونے کے بعد اسے فون کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ امریکا کا یہ پہلا تجربہ میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔

بھابی کے میکے میں شفٹ ہونے کے بعد وہ تیسری رات تھی جب عفت میرے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے بیڈ پر لیٹے دیکھ کر کہا تھا۔ ''باجی مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی ہیں۔ سین کے بارے میں مجھے ایک ایک بات معلوم ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

عفت واقعی خوب صورت تھی۔ بھابی سے بھی زیادہ۔ اپنی بہن کی طرح وہ بھی ''مس امریکا'' تھی۔

''وہ تمہارے بارے میں مجھے بھی بہت کچھ بتا چکی ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

''مثلاً کیا بتا چکی ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''بنیادی بات یہ کہ تم کنواری نہیں ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ کیا بتایا انہوں نے؟'' اس نے کُریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

''یہ کہ تم ان سے چھوٹی ضرور ہو لیکن شروع سے بہت آزاد خیال ہو۔''

''صرف یہ بتایا یا اور بھی کچھ؟'' اس نے کچھ دیر کے توقف کے بعد سوال کیا۔

''تمہارے ساتھ اسکول میں ایک بلیک تھا جس سے تمہاری بہت اچھی دوستی تھی۔'' میں نے وہ کچھ بتایا جو بھابی مجھے بتا چکی تھیں۔

''جوزف کے والد کینیا سے آئے تھے لیکن یہاں آکر انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس سے دوستی اتنی زیادہ تھی کہ تم نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ رہنے چلی گئیں؟'' میں نے کہا اور وہ کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔

''باجی نے یہ تو بتایا کہ میں اس کے ساتھ رہنے چلی گئی لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کتنے عرصہ رہی؟'' اس نے کہا تھا۔

''بتایا تھا تم اس کے ساتھ دو مہینے سے کچھ زیادہ دن رہی ہو۔'' میرا جواب تھا۔

میرا جواب ملنے کے ساتھ اس نے دروازے کی کنڈی لگانی شروع کی۔ کنڈی لگاتے ہوئے اس نے ایک بار پلٹ کر مجھے دیکھا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا اور وہ میرے بستر میں گھس گئی۔

''گھر پر کوئی نہیں ہے۔ سب کسی شادی میں گئے ہیں۔'' اس کا جواب تھا۔

''میں نے گھر والوں کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔'' میں نے کہا اور وہ اپنے جسم کو کپڑوں سے آزاد کرنے لگی۔

اس کا دودھیا بدن دیکھ کر مجھے بھی کچھ ہونے لگا تھا۔ سین کے سانولے بدن کے مقابلے میں اچانک اس کا گورا بدن دیکھ کر مجھے کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔

''چار سال سے پیاسی ہوں۔'' اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ واقعی ورجن نہیں تھی پھر جب ہم فارغ ہوئے تو وہ مجھ سے چپک کر لیٹ گئی، اس کی آنکھیں بند تھیں۔

''چار سال قبل میں اسے چھوڑ آئی تھی۔ ابا نے کوشش کر کے مجھے اپنے دفتر میں نوکری دلوا دی۔ صبح میں ان کے ساتھ جاتی ہوں اور شام میں ان کے ساتھ ہی واپس آتی ہوں۔ دفتر میں ہر وقت ان کی نظروں کے سامنے رہتی ہوں۔'' اس نے اپنی کہانی شروع کی تھی۔

''تو تمہارا کنوارہ پن اس نے نہیں لوٹا۔'' میں نے سوال کیا۔

''دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ میں اس کے ساتھ رہی لیکن جب بھی اس نے کچھ کرنا چاہا میں اسے منع کر دیتی تھی۔'' اس کا جواب تھا۔

''اس کی وجہ......؟'' میں نے اس کے ساتھ لیٹے ہوئے سوال کیا تھا۔

''وجہ یہ تھی کہ میں خوف زدہ تھی، ڈرتی تھی۔''

''دو مہینے تک وہ تمہیں برداشت کرتا رہا؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے سوچنا شروع کیا۔

''دو مہینے برداشت کیا اور پھر ایک دن وہ میری ہی کلاس فیلو کو لے کر گھر آ گیا۔ میرے لیے وہ برداشت کرنا مشکل تھا اس لیے میں نے ان دونوں سے کہا کہ میرے گھر سے نکل جائیں۔'' اس نے بتایا۔

''اور وہ نکل گیا؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''وہ نکل جانے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، اس نے حوصلہ دیا اور وہ سامان پیک کر کے اس کے ساتھ چلا گیا۔'' اس کا جواب تھا۔

''تم نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا؟'' میں نے کہا اور وہ خاموشی سے کوئی جواب دیے مجھے دیکھتی رہی۔

''دس دن میں نے انتظار کیا پھر جب مجھے خبر ملی کہ وہ دونوں شادی کر کے کسی دوسری اسٹیٹ چلے گئے ہیں۔ تو میں نے بھی وہ گھر چھوڑ دیا اور اپنی امی اور ابا کے پاس آ گئی۔'' اس نے کہا۔

''اور تب سے تم یہیں ہو؟'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''جب تک شادی نہیں ہوتی، یہیں رہوں گی۔'' اس نے کہا اور اس کی مسکراہٹ جاری رہی تھی۔

عفت میرے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور میں اس کے ساتھ لیٹا تھا جیسے کبھی سین کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میں نے اس کی مسکراہٹ کو سین کی مسکراہٹ سے مقابلہ شروع کیا لیکن دونوں میں کوئی تقابل نہیں تھا۔ سین مسکراتی تو زمین کی ہر شے مسکرانے لگتی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بادلوں میں سے دھیرے دھیرے چاند نکل آئے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عفت نے مجھے گم صم دیکھ کر سوال کیا اور میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''سر، پارک کا یہ گوشہ خالی کرنا ہوگا۔'' چوکیدار نے مجھے مخاطب کیا اور میں اپنی سوچوں سے باہر نکل آیا۔

''سین نہیں آئی۔'' میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھا جو مجھ سے مخاطب تھا۔

اندھیرا ہونے والا تھا۔ پارک کی روشنیاں جل چکی

تھیں۔ ''ٹھیک ہے......'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے قدم پارک سے باہر کی جانب تھے، اس جانب جہاں کبھی میں اور سیبن اسنیک لینے جاتے تھے۔ اس ریسٹورنٹ کے بوڑھے مالکان ہمیں پہچانتے تھے۔ میں جب وہاں پہنچا تو ریسٹورنٹ کی جگہ بینک تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں پر کوئی بھی پرانی شے نہیں رہی تھی۔

''مجھے اس بینک میں جانا ہوگا۔'' میں نے سوچا۔

''مگر بینک تو اس وقت بند ہوگا۔'' میں نے بینک کے سامنے کھڑے ہو کر سوچا۔

''اس سیکیورٹی والے سے بھی معلوم کر لیتا ہوں۔'' میں نے اپنے اس خیال کے ساتھ بینک میں موجود واحد فرد سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

''میں تو صاحب سیکیورٹی کمپنی کا ملازم ہوں۔'' میرے سوال کے جواب میں اس نے جواب دیا۔

''کب سے ہو وہاں پر؟'' میرا اگلا سوال تھا۔

''جب سے لندن آیا ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا وہ شاید زیادہ بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔

''جب سے لندن آیا ہوں۔'' اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اور لندن کب سے آئے ہو؟'' میرا اگلا سوال تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ اپنی کمر میں لگے اسلحے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''کیوں کر رہے ہیں آپ یہ سوال؟'' اس نے اسلحے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو دوست بات صرف اتنی سی ہے کہ میری ایک دوست تھی سیبن۔'' میں نے بلاوجہ ہی اسے تفصیل بتانی شروع کی۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' اس نے میری بات شروع ہوتے ہی قطع کلامی کی تھی۔

''اکیس برس پہلے میں اس شہر میں آیا تھا۔'' میرا جواب تھا۔

''مجھے تو لندن آئے پندرہ برس ہی ہوئے ہیں۔'' اس کا ہاتھ اب بھی اپنے ہتھیار پر تھا۔

''یہاں جہاں اب بینک ہے، ایک ریسٹورنٹ ہوا کرتا تھا؟'' میں نے بات آگے بڑھائی تھی۔

''اکیس برس میں کون سی چیز اپنی جگہ قائم رہ سکتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن......'' میں نے کہا اور وہ مجھے گھورنے لگا۔

''میں جب لندن آیا تھا تب سے یہ بینک اسی جگہ پر ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کا جواب ایسا نہیں تھا جس سے میری حوصلہ افزائی ہوتی۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔

''اس سڑک پر سب سے پرانی دکان کون سی ہے جسے تم پندرہ برس سے دیکھ رہے ہو؟'' میں نے کچھ قدم آگے جانے کے بعد واپس آتے ہوئے سوال کیا۔

''سڑک پر تو نہیں لیکن آگے جا کر سیدھے ہاتھ پر جو گلی جاتی ہے، اسے میں گزشتہ پندرہ برس سے دیکھ رہا ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔ ''پہلے اس دکان کا مالک کوئی مقامی تھا لیکن بعد میں پاکستان سے آنے والے جوڑے نے خرید لیا۔'' اس نے کہا اور میں آگے بڑھ گیا۔

گارڈ سے گفتگو کے بعد میں روڈ پر کئی جگہ رکا۔ کچھ دکاندار سے بات بھی کی لیکن کہیں سے بھی کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے سیبن کے بارے میں کچھ معلومات ہوتیں پھر میں یہ سوچ کر اس ایڈریس کی جانب بڑھ گیا جس کے بارے میں گارڈ نے بتایا۔ وہاں اس مقام پر اسٹور موجود تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ پاکستان سے آیا ہوا جوڑا اسے چلا رہا ہے تو سیبن کبھی تو اس اسٹور پر گئی ہوگی۔

اسٹور کے کاؤنٹر پر ایک پاکستانی خاتون موجود تھیں۔ ''میں اسد ہوں، اکیس برس پہلے اس شہر میں آیا تھا۔'' میں نے اپنے تعارف میں کہا۔

''میں منیرہ ہوں۔'' خاتون نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مجھے ایک پاکستانی خاتون کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں جو اکیس برس پہلے...... ملکی ائرلائن میں ائرہوسٹس تھی۔ ہماری پہلی ملاقات بھی کراچی سے لندن کی فلائٹ میں ہوئی تھی۔'' میں نے اپنی کہانی مختصر کر کے سنائی۔

''تم ٹھہرو میرے شوہر آتے ہی ہوں گے۔'' اس نے کہا اور ساتھ ہی وہ نئے آنے والے گاہک کی جانب متوجہ ہو گئی لیکن مجھے اس نے فراموش نہیں کیا۔ اسٹور کے دوسرے کونے سے اس نے کوک کی بوتل اسٹور میں موجود لڑکی کے ہاتھوں بھجوا دی تھی۔

میری کوک ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ گاہک کو فارغ کر کے آ گئی۔ ''شاکر راستے میں ہیں بس پہنچنے والے ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''میں انتظار تو کر ہی رہا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ میری بیٹی ہے۔'' اس نے اس لڑکی کا تعارف کروایا جس کے ہاتھ اس نے کوک بھجوائی تھی۔

''کس کلاس میں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آٹھویں پاس کر کے آئی تھی اب میڈیکل کے تھرڈ ائر میں ہے۔'' منیرہ نے جواب دیا۔

''تو دو سال بعد ڈاکٹر ہو جاؤ گی۔'' میں نے کہا اور منیرہ نے کہا۔ ''انشاء اللہ۔''

ہم انہی باتوں میں مگن تھے کہ شاکر پہنچ گئے۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ کچھ حیران ہو گئے۔

''یہ اسد ہیں، اکیس برس پہلے لندن آئے تھے پھر یہاں سے امریکا چلے گئے اب دوبارہ آئے ہیں۔'' منیرہ نے میرا تعارف کروایا۔

''میں ایک خاتون کی تلاش میں ہوں جو ملکی ائر لائن میں ائر ہوسٹس تھیں۔'' میں نے منیرہ کی بات کو آگے بڑھایا۔

''ائر ہوسٹس کی تلاش میں ہو تو اس ائر لائن کے دفتر جاتے۔'' شاکر نے جواب دیا۔

''میں ہائیڈ پارک میں اس بینچ پر بیٹھا تھا جہاں ہم اکیس برس پہلے بیٹھتے تھے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''وہاں اُس سے ملاقات ہوئی تھی؟'' شاکر نے کہا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی۔

''دوپہر میں لنچ ٹائم میں اس سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ یہ کہہ کر رخصت ہوئی تھی کہ جہاں ہم لنچ کرتے تھے، اس ریسٹورنٹ میں جا رہی ہے وہاں کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور وہ اس ریسٹورنٹ میں نہیں تھی؟'' شاکر نے سوال کیا اور میں نے جواب دینے سے پہلے اسے غور سے دیکھا۔

''وہاں ریسٹورنٹ ہی نہیں تھا۔'' میں نے جواب دیا اور شاکر کے چہرے پر حیرت پھیلتی چلی گئی۔

''تم کہہ رہے ہو کہ بین نے آخری ملاقات میں بتایا کہ وہ لنچ کرنے اس ریسٹورنٹ میں جا رہی ہے جہاں تم اور وہ لنچ کرتے تھے لیکن جب تم وہاں پہنچے تو ریسٹورنٹ نہیں تھا؟'' شاکر نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''جہاں ریسٹورنٹ ہوتا تھا اب وہاں بینک ہے۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''خدا کی قسم میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' اس نے کہا اب حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے کی باری میری تھی۔

''اس بینک کے چوکیدار نے مجھے آپ کے اسٹور کا پتا دیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کا مطلب ہے سریندر نے آپ کو اس اسٹور کا پتا بتایا تھا۔'' شاکر نے سوال کیا۔

''میں نے اس کا نام نہیں معلوم کیا تھا۔'' میرا جواب تھا۔

''اس کے والدین برسوں پہلے یہی کوئی ایک صدی پہلے انڈیا سے آسٹریلیا اور وہاں سے آئرلینڈ گئے۔ خود سریندر آئرلینڈ سے پندرہ برس پہلے لندن آیا تھا اور یہاں کی ایک سیکیورٹی ایجنسی میں بھرتی ہو گیا۔'' شاکر نے تفصیل سے سریندر کا تعارف کروایا۔

''اب مجھے کیا کرنا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''رات کا کھانا ہم گھر پر کھاتے ہیں، تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔'' اس نے آفر کی۔

''میرا سامان ہوٹل میں ہے۔'' میں نے کہا، اس میں میری معذرت بھی شامل تھی۔

''تم ذرا کاؤنٹر سنبھالو، میں اس کے لیے فون کر دیتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کا رخ اسٹور میں بنے ایک چیمبر کی طرف تھا۔ اس نے اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

وہ جو بات کر رہا تھا، اس سے ظاہر ہوا کہ جس سے وہ بات کر رہا ہے وہ ائر لائن کا کوئی افسر ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا فون گھمایا لیکن کسی سے بھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

اسی دوران میں رات کے گیارہ بج گئے۔ ان فون کالز کے دوران اس نے ایک کال گھر پر بھی کر لی تھی اور کچھ ہدایات دی تھیں جو ڈنر کے متعلق تھیں۔ وہ شروع میں تو ان نمبروں پر کال کرتا رہا جو اس کے بعد پاکستان سے آئے تھے اور لندن یا اس کے آس پاس مقیم تھے پھر ان نمبروں پر بات کی جو اس کے لندن آنے کے بعد آئے تھے لیکن کسی سے بین کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

''ہم نے پاکستان اس وقت چھوڑا تھا جب سندھ میں جام صادق کی حکومت تھی اور منیرہ ایک سیاسی پارٹی کراچی

کی صدر تھیں۔ پہلے میں دو بچوں کے ساتھ یہاں آیا تھا اور بعد میں منیرہ ایک بچی کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔'' اس نے بتایا۔

سین کی معلومات لینے کے ساتھ ہی وہ نتاشا کے بارے میں بھی معلوم کرتا رہا لیکن کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سین کی کزن کے بارے میں بھی اس نے معلوم کرنا چاہا لیکن نتیجہ وہی رہا تھا۔

شاکر ضد کر کے مجھے اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا جہاں پہلے سے کچھ اس کے جاننے والے موجود تھے۔ ہم ڈائننگ روم میں جمع ہوئے۔ اس دوران وہ سب اپنے اپنے جاننے والوں سے سین کے بارے میں معلوم کرتے رہے لیکن نتیجہ وہی رہا جو اسٹور پر تھا۔

''جب ہم نے وہ اسٹور لیا تھا اس وقت بیشتر اسٹور مقامی لوگوں کے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ صبح نو بجے اسٹور کھولتے تھے پھر ایک بجے سے پہلے بند کر دیتے اور لنچ کے لیے چلے جاتے۔ ہم پہلے لوگ تھے جنہوں نے اسٹور لیا اور پھر اسٹور کی چابی کہیں رکھ کر بھول گئے۔'' شاکر نے بتایا۔

''نو بجے سے پہلے اگر کسی کو کچھ خریدنا ہوتا؟'' میں نے سوال کیا اور وہ ہنسنے لگے۔

''نو بجے سے پہلے اور ایک سے پانچ کے درمیان جس نے کچھ بھی خریدنا ہو وہ انتظار کرتا تھا۔'' شاکر کا جواب تھا۔

''تمہارا اسٹور کب کھلتا ہے؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''تم نے غور نہیں کیا، میں نے کہا تھا اسٹور میں تالا لگا کر چابی کھو دی۔'' اس نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے وضاحت چاہی اور وہ ہنس دیا۔

''اس وقت جب یہاں گھر پر بیٹھے ڈنر کر رہے ہیں، اسٹور کھلا ہوا ہے۔'' اس کا جواب تھا۔

''اور وہاں کون ہے؟'' میں نے مزید وضاحت چاہی تھی اور مہمانوں میں سے ایک نے شاکر کی طرف دیکھ کر اجازت چاہی۔

''یہ ڈنر بھی ان کی سیلز پروموشن کا حصہ ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''صبح سات بجے شاکر اسٹور پہنچ جاتے ہیں۔ بارہ بجے ان کی بیگم اسٹور آجاتی ہیں اور شاکر سامان لینے مارکیٹ چلے جاتے ہیں جہاں سے کبھی وہ گھر آکر کھانا کھاتے ہیں اور شام تک یہیں رہتے ہیں اور اسٹور پہنچ جاتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

''یہ معمول ہفتے کے سات دن رہتا ہے؟'' میں نے اس مہمان سے پوچھا اور اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''ہفتے کے سات دن اور سال کے تین سو پینسٹھ دن۔'' شاکر نے کہا۔

''عید ہو یا کرسمس یہ فیملی چھٹی نہیں کرتی۔'' اسی مہمان نے جواب دیا۔

رات چار بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے ہوٹل ان میں سے ایک صاحب چھوڑ گئے۔ ان سب نے جس جس کو فون کیا ان سے سین کو تلاش کرنے کا کہہ دیا اور ہر کسی نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ضرور کریں گے۔

وہ شخص جو مجھے ہوٹل چھوڑ گیا تھا۔ کوئی اور نہیں بلکہ ائر لائن کا ریٹائرڈ اسٹیشن منیجر تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ صبح مجھے ہوٹل سے لے جائے گا اور ملکی ائر لائن کے موجودہ اسٹیشن منیجر سے ملوا دے گا۔ اس کی اپنی بیوی بھی ائر ہوسٹس رہی تھی۔ اس رات وہ ویلز گئی ہوئی تھی جہاں سے اس کی آمد رات تک متوقع تھی۔

''تم اکیس برس بعد کس لیے اسے تلاش کر رہے ہو؟'' اسے اس پر بھی یقین نہیں آیا تھا کہ سین کی زندگی میں آنے والا میں پہلا مرد تھا۔ میں خاموش میں رہا۔

ہوٹل کے بستر پر لیٹا تو مجھے وہ سب کچھ یاد آنے لگا۔ جو مجھ پر بیت چکی تھی۔ امریکا میں میرا میڈیکل چیک اپ سے لے کر بیوی سے علیحدگی، بھابی اور بھائی کی کینیڈا شفٹنگ، جب بھابی کو ان کی بہن نے اطلاع دی کہ ہم دونوں میں علیحدگی ہو رہی ہے تو دونوں کینیڈا سے امریکا آئے۔ کچھ دن ہمارے ساتھ رہے اور ہم دونوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن نتیجہ علیحدگی ہی نکلا تھا جس کے کچھ عرصے بعد میری بیوی نے اپنے سابقہ بوائے فرینڈ سے شادی کر لی۔ شادی سے پہلے وہ اسلام قبول کر چکا تھا۔ شادی کی راہ میں واحد رکاوٹ یعنی بھابی کے والد اور والدہ بھی نہیں رہے جب تک۔

اگلے روز صبح سویرے رشید ہوٹل پہنچ گیا تھا۔ دو بلاک آگے ہی اس کی رہائش گاہ تھی۔ ہوٹل آنے سے پہلے اس نے مجھے فون کر دیا تھا اور میں تیار تھا۔ سب سے پہلے ہم ائر لائن کے دفتر پہنچے جہاں اسٹیشن منیجر موجود تھا۔

''سین نام کی ایک ائر ہوسٹس تھی تقریباً اس وقت جو

آپ بتا رہے ہیں۔'' اسٹیشن منیجر نے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے رشید کی طرف دیکھا جو رات تک کہتا رہا تھا کہ ''میں نے چیک کرلیا ہے اس نام کی کوئی ائر ہوسٹس کبھی رہی ہی نہیں تھی۔''

اسٹیشن منیجر کے کمپیوٹر پر تھا کہ وہ ٹوٹل چھ ماہ ائرلائن میں رہی تھی اور ایک روز اس طرح غائب ہوگئی کہ دوبارہ نہیں آئی۔

''اس کے غائب ہونے کے کچھ دن بعد اسپتال کا بل آیا تھا جو ائرلائن نے پے کر دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

ہم اس اسپتال پہنچے جس کا بل تھا لیکن اس کے علاوہ وہاں سے کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ ''وہ آئی ضرور تھی لیکن ایک بچی کو جنم دینے کے ساتھ ہی وہ نہیں آئی۔'' البتہ جس خاتون کے ساتھ وہ وہاں سے گئی تھی، اس کا نام اور پتا اسپتال کے کمپیوٹر میں موجود تھا۔ پتا اس کی کزن کا تھا۔ ہم اس ایڈریس پر پہنچے تو وہاں ایک انڈین فیملی تھی۔

''ہم نے جس سے یہ فلیٹ خریدا اس کا نام یہی تھا لیکن اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔'' اس انڈین جوڑے نے بتایا۔

رشید اور میں وہاں سے واپس ہوئے تو اب ہمارے پاس صرف ایک ایڈریس تھا اور وہ ایڈریس اس بینک کا تھا جہاں سے بات شروع ہوئی تھی۔

لنچ کے وقت تک ہم یونہی ہر جگہ سے مایوسی سمیٹتے رہے۔ جب لنچ ٹائم ہوگیا تو رشید نے کہا۔ ''ہم کسی جگہ بیٹھ کر ایک بار پھر سے تمام واقعات دہرا لیتے ہیں کہ ہم سیدھے راستے پر ہیں بھی یا نہیں۔'' اس نے کہا اور میں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

''ایسی پُرسکون جگہ کون سی ہوسکتی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ جگہ میرا گھر بھی ہوسکتا ہے اور ہوٹل میں تمہارا کمرا بھی۔'' رشید کا جواب تھا۔

''ایک تیسری جگہ بھی ہوسکتی ہے اور وہ ہائیڈ پارک کا وہ گوشہ جہاں میں اور سین ملتے تھے۔'' میں نے کہا اور وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

''ہائیڈ پارک کے اس گوشے سے بہتر تو میرا گھر ہی ہوگا۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''تم شاید میرے گھر کو اس لیے مسترد کر رہے ہو کہ میں نے رات میں کہا تھا کہ میری بیوی بچے صبح تک آجائیں گے؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا اور میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

''ہوٹل کا کمرا بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو تم نے کہا کہ سکون کی جگہ......'' میں نے کہا اور اس نے مجھ سے اختلاف نہیں کیا۔

''چلو پھر گھر چلتے ہیں۔'' اس نے پیشکش کی۔

راستے بھر وہ خاموش رہا اور میں خاموش ماضی کو دہراتا رہا۔

سین کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے کسی فلم کی طرح میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ جہاز میں پہلی ملاقات جب میں نے اس سے ایڈریس معلوم کیا تھا پھر ہیتھرو کے باہر کی ملاقات جہاں اس نے مجھے پیچھے سے آواز دے کر مخاطب کیا تھا پھر بھیا بھابی کے فلیٹ پر اس سے ملاقات اور پھر اس کی کزن کے فلیٹ کی ملاقات جہاں اس نے اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا تھا۔ امریکا جانے سے پہلے تک اس سے ملاقاتیں۔

''مجھے اس بوڑھے میاں بیوی کو بھی تلاش کرنا ہوگا۔'' ذہن میں سرگوشی ہوئی۔

''اکیس برس بعد وہ زندہ بھی ہوں گے۔'' میں نے اپنے خیال کی خود ہی تردید کردی۔''

ہم خاموشی سے رشید کے فلیٹ پہنچے اور وہ کچن کی جانب چلا گیا کہ ''میں کافی پیوں گا۔'' اور میں نے ہامی بھر لی۔

رشید کمرے میں کافی کے دو مگ لے کر سامنے بیٹھا ہی تھا کہ میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ہم اب تک غلط راستے پر تھے۔'' میں نے کہا اور اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے سوال کر رہا ہو کہ ''کون سا راستہ غلط تھا؟''

''ہم سین کی تلاش میں تھے جبکہ ہمیں وہاں سے شروع کرنا تھا کہ بینک کی جگہ کس نے انہیں بیچی اور انہوں نے کب بینک کا آغاز کیا۔'' میں نے کہا اور رشید مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ بوڑھا جوڑا لاولد تھا۔'' میں نے کہا اور رشید سوچ میں پڑ گیا۔

''شاید تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' اس نے جواب میں کہا تھا۔ ''میرا اکاؤنٹ اسی بینک میں ہے۔''

اس نے فون اٹھایا اور ڈائل کرنے لگا۔ کچھ دیر تک

انتظار کرنے کے بعد جب دوسری جانب سے فون اٹھایا گیا تو اس نے پوچھنا شروع کیا۔

''شادی سے پہلے تمہارا اکاؤنٹ جس بینک میں تھا، اس کے منیجر کون تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں جاوید شیخ کا۔'' اس نے دوسری جانب سے کیے گئے سوال کے جواب میں کہا۔

''دیکھ لو اپنی ڈائری، میں گھر پر ہوں۔'' اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔

''بیگم تھیں؟'' اس نے فون رکھا تو میں نے سوال کیا۔

''میں اسٹیشن منیجر تھا پہلے جدہ میں اور پھر یہاں لندن میں، وہ ائرہوسٹس تھی اور جب میں نے یہاں لندن میں اسے پروپوز کیا تو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔'' رشید نے بتانا شروع کیا۔

''تم نے سب کچھ جاننے کے باوجود اسے پروپوز ہی نہیں کیا بلکہ شادی بھی کر لی؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دینا شروع کیا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب سے آغاز کیا۔

''وہ اتنی ہی خوب صورت تھی بلکہ خوب صورت ہونے سے زیادہ مظلوم تھی۔'' اس کا جواب آیا۔

''مظلوم......؟'' میں نے ایک لفظ کا سوال کیا اور وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

''فاطمہ کی ماں پارسی تھی اور باپ مسلمان۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''فاطمہ انٹرویو میں پاس ہوئی اور ائرہوسٹس اس وقت بنی جب اس کے والد اور والدہ کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہوا۔ جس میں اس کے والد کا انتقال ہوا اور ماں کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی ضرب لگی کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔''

''اس سے وہ مظلوم کہاں سے ہو گئی؟'' میں نے اس کے رکتے ہی سوال کیا اور اس نے مجھے یوں گھورا جیسے اسے یہ پسند نہ آیا ہو۔

''جب فاطمہ نے ملکی ائرلائن جوائن کی تھی وہ انٹر میں تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی میٹرک میں تھا جبکہ دوسرا آٹھویں اور بہن چھٹی میں تھی۔'' رشید نے کہنا شروع کیا۔

''باپ کے مرنے کے بعد ان کی ذمے داری بھی فاطمہ کے کاندھوں پر تھی۔'' رشید نے کہا اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اس میں مظلومیت کہاں سے آ گئی۔

فاطمہ کا ایک بھائی آج انجینئر ہے اور کینیڈا میں ہے جبکہ دوسرا بھائی ڈاکٹر بننے کے بعد آسٹریلیا میں ہے اور بہن شادی کے بعد یہیں لندن میں ہے۔'' رشید کی بات مکمل ہوئی لیکن میرا سوال اب بھی باقی تھا۔

''دونوں بھائی اور بہن نے فاطمہ سے تعلق ختم کر دیا ہے۔'' رشید نے اپنی بات ختم کی تو مجھے جیسے جواب مل گیا۔

''تمہاری شادی سے پہلے......؟'' میں نے سوال کیا اور اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''ہم نے کورٹ میں شادی کی تھی اس لیے۔'' اس کا جواب تھا۔

میں نے کورٹ میں شادی کرنے کی وجہ جاننی چاہی لیکن اس سے پہلے کہ میں سوال کرتا، فون کی گھنٹی بج گئی۔

''جاوید شیخ یونان میں ہے۔'' دوسری جانب سے کچھ کہا گیا جو رشید نے دہرایا اور ساتھ ہی فون کے مائک کا بٹن دبا دیا اب میں بہ آسانی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔

''اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے سی ای او سے بات کرنے کے لیے فون کر رہا ہے تاکہ وہ ہمارے لیے ملاقات کا وقت لے سکے۔'' فون پر فاطمہ کی آواز آئی تھی۔

''تم ایسا کرو کہ اسے میرا نمبر دے دو۔'' رشید نے ہدایت کی اور فاطمہ نے کہا۔

''میں اب گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔'' زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔''

اس کے بعد فاطمہ نے فون بند کر دیا اور ہم دس منٹ گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

''کورٹ میرج کرنے کی وجہ؟'' میں نے سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''کوئی اور وجہ نہیں سوائے اس کے کہ جب جدہ میں اسے پروپوز کیا تو اس نے مجبوری بتائی کہ اس کی بہن میڈیکل کے آخری سال میں ہے۔ اس کے بعد ایک برس کا ہاؤس جاب ہوگا اور پھر ہم شادی کر سکتے ہیں۔'' رشید کا جواب تھا۔

''لیکن تم دونوں کو ہی شادی کی جلدی تھی؟'' میں نے کہا اور رشید مسکرا دیا۔

''جلدی تو نہیں تھی لیکن دو سال گزرنے سے پہلے ہی میرا یہاں لندن ٹرانسفر ہو گیا۔'' اس کا جواب تھا۔

''فاطمہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کا وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ اب تو تمہاری بہن ڈاکٹر ہو چکی ہے اب کیا اعتراض ہے۔'' رشید نے بتایا۔

''اس نے جواب کیا دیا؟'' میں نے سوال کیا اور وہ کچھ سوچنے لگا۔

''اس کا جواب براہِ راست نہیں بلکہ جاوید شیخ کے ذریعے پہنچا تھا کہ جب تک اس کی بہن کی شادی نہیں ہو جاتی، وہ شادی کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔'' رشید نے جواب دیا۔

''مجھے شبہ تھا کہ اب وہ لندن کی فلائٹ سے انکار کرتی رہے گی اس لیے میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور پاکستان پہنچ گیا۔'' رشید نے کہا۔

اگلا سوال میرے پاس تیار تھا۔ ''وہاں پہنچ کر تم نے اسے تیار کر لیا؟''

''تین دن تک ہمارے درمیان بحث ہوتی رہی۔'' اس نے بتایا کہ اس کے بہن بھائی اس شادی کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' رشید نے کہا۔

''اعتراض کی وجہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں اس سے پہلے ایک شادی کر چکا تھا اور اسے طلاق بھی دے چکا تھا۔ یا یوں کہہ لو کہ اس نے خلع لی تھی جب میں جدہ میں تھا۔'' رشید کا جواب تھا۔ ''رخسار یعنی میری پہلی بیوی سے میرے دو بیٹے تھے۔'' اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''اور خلع کے بعد تم نے ان سے رابطہ کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''خلع کا فیصلہ آنے تک میں نے اس گھر کے کئی چکر لگائے۔ ان کے باپ اور بھائی سے بھی ملا لیکن خلع کا فیصلہ آنے کے بعد میں نے اس فیملی سے مکمل قطع تعلق کیے رکھا۔'' رشید نے جواب میں کہا۔

''مگر تمہارے دو بیٹے تھے اُن کے پاس۔'' میں نے سوال کیا جسے سن کر رشید کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''چھوڑو تم نے کیوں میرے زخم کریدنے شروع کر دیے۔'' رشید نے افسردہ لہجے میں کہا اور مجھے خاموش ہونا پڑا۔

''مجھے اطلاع دی گئی کہ میرے بڑے بیٹے کی طبیعت نامعلوم وجوہات کی وجہ سے خراب رہتی ہے۔ میں گیا لیکن مجھے بیٹے سے ملنے دینا تو دور کی بات ہے، مجھے اسے دیکھنے تک کی اجازت نہیں دی۔'' رشید نے میرے کچھ نہ کہنے کے باوجود کہہ دیا۔

رشید کے ہونٹوں سے آخری لفظ نکلے ہی تھے کہ فاطمہ پہنچ گئی۔ اس نے پہلے مجھے سلام کیا اور بچوں کو کہا کہ سلام کے بعد اپنے کمرے میں جائیں۔

''جاوید شیخ کی کال آئی؟'' اس کا مخاطب رشید تھا۔

''کہاں ہو دو بار تمہارے دیے ہوئے نمبر پر فون کر چکا ہوں لیکن ایک ہی جواب ہے۔ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی اور نمبر سے گفتگو میں مصروف ہے۔'' رشید نے کہا اور فاطمہ کی ہنسی نکل گئی۔

''جاوید شیخ مجھ سے باتوں میں مصروف تھا۔'' فاطمہ نے کہا۔

''کیا معلوم کرنا تھا تمہیں؟'' رشید نے سوال کیا۔

''تم سے بات کرنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ بینک کا موجودہ مالک کسی زمانے میں جاوید شیخ کا بہت اچھا دوست تھا۔'' فاطمہ نے ہمارے درمیانی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ جرمنی سے لندن آتا تو اس کا قیام جاوید شیخ کے یہاں ہوتا تھا پھر جب اس نے شادی کر لی لندن کی ہی ایک لڑکی سے تو اس کے گھر رہنے لگا تھا۔'' فاطمہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

''جس سے کی تھی اُس نے شادی؟'' رشید نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

''اس نے شادی ایک ایسی بیوہ خاتون سے کی تھی جو عمر میں اس سے دو برس زیادہ تھی۔'' فاطمہ نے جواب دیا تھا۔

''پھر تو سلام ہے اس شخص کو۔'' رشید نے پھر سے دخل دیا اور میں بھی مسکرا دیا۔

''شادی سے پہلے وہ ایک کامیاب مصورہ تھی۔ دنیا بھر میں اس کی تصویروں کی نمائش ہوتی تھی اور اسی سے متاثر ہو کر اس جرمن خاتون سے لندن کے ایک ارب پتی نے شادی کی تھی جس سے ایک بیٹا بھی تھا۔'' فاطمہ بولتے بولتے رکی۔

''خاتون نے بیوہ ہو کر شادی کر لی، بیٹے کا کیا ہوا؟'' رشید نے اس کے رکتے ہی سوال کر دیا۔

''جس حادثے میں اس کا شوہر ہلاک ہوا تھا، اسی حادثے میں بیٹا اور اس کی گرل فرینڈ بھی جان سے گئے تھے۔'' فاطمہ نے جواب دیا۔

''یعنی اس ارب پتی کی تمام جائداد بیوہ کے نام پر ہو گئی۔'' رشید نے کہا۔

''گرل فرینڈ تو یورپ میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک وہ جو صرف دوست ہوتی ہیں اور دوسرا وہ جس کے ساتھ رہتے ہیں بغیر کسی قانونی بندھن کے۔'' میں نے کہا اور

فاطمہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''وہ گرل فرینڈ دوسرے معنوں والی گرل فرینڈ تھی۔'' اس کا جواب تھا۔

''بغیر نکاح کے جو بندھن ہوتا ہے، اسے یہاں کا قانون اور معاشرہ تسلیم کرتا ہے اور اس بندھن سے پیدا ہونے والا بچہ بھی معاشرے اور قانون میں حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اپنے ماں باپ کی جائداد میں حصے دار نہیں ہوتا۔'' فاطمہ نے مجھے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں اور ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں ہوں جس کی ماں کا نام سیمن ہے اور جو بغیر نکاح کے بندھن کے اس دنیا میں آئی ہے۔'' میں نے تفصیل میں جائے بغیر کہا۔

میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا تو فاطمہ نے رشید کی جانب دیکھا، دونوں کی نظریں ملیں اور نظروں میں بات ہوئی اور فاطمہ نے اس پر تبادلۂ خیالات کو زبان دی۔

''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ نتاشا آپ ہی کی بیٹی ہے؟'' اس نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔

''فی الحال میرے پاس کوئی ثبوت نہیں صرف سیمن کے وہ الفاظ ہیں جو اس نے مجھ سے پارک میں ملاقات میں کہے تھے۔'' میرا جواب تھا۔

''تمہارے سوال کی دلیل یہ ہے کہ امریکا میں میری طلاق کی وجہ یہ بنی تھی کہ میری بیوی نے عدالت میں وہ رپورٹ پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ باپ بن سکوں۔'' میں نے کہا اور ان دونوں کی نظروں نے ایک بار پھر وہی حرکت کی مگر پہل کرنے میں فاطمہ بازی لے گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''اپنی نامردی کا اتنا واضح اعلان میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔'' فاطمہ نے کہا، اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''تمہاری واحد اولاد کی تلاش میں ہم سے جو بن پڑے گا ہم ضرور کریں گے۔'' رشید نے بیوی کی بات کو آگے بڑھایا۔

''ایک بار تمہاری بیٹی مل جائے تو ڈی این اے ٹیسٹ سے کنفرم ہو جائے گا کہ وہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔'' رشید نے فقرہ مکمل کیا۔

ہماری یہ گفتگو جاری تھی کہ فاطمہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی اس نے مائیک آن کیا تاکہ میں اور رشید سن سکیں۔

''تم نے ٹائم لیا؟'' فاطمہ نے سوال کیا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ کس سے ٹائم لیا لیکن میں اور رشید سمجھ رہے تھے کہ وہ فون کس کا ہے اور وہ کس سے ٹائم لینے کی بات کر رہی ہے۔

''میری اپنے دوست سے بات نہیں ہوئی لیکن اس کی بیوی کو میں نے تمہارا اور رشید کا نمبر دے دیا ہے۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''تم مجھے اس کا فون نمبر واٹس ایپ کر دو۔'' رشید نے بہ آواز بلند کہا تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن کچھ دیر ان کے فون کا انتظار کر لیتے تو بہتر ہوتا۔'' جاوید شیخ نے کہا اور ہم تینوں کو اس کی رائے سے اختلاف نہیں تھا۔ جاوید شیخ سے چند رسمی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن منیجر سید ناصر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

باتوں کے بعد فاطمہ نے فون بند کر دیا تھا۔

فون بند ہونے کے کافی دیر تک ہم تینوں ہی خاموش رہے پھر فاطمہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''وہ جو تم نے اپنے بارے میں بات کی تھی، اس کا بیک گراؤنڈ بتاؤ۔'' اس نے کہا تھا۔

''میری بیوی میری بھابی کی سگی بہن تھی۔'' میں نے گفتگو کی شروعات کی۔ ''اسکول کے زمانے سے ایک بلیک سے اس کے تعلقات تھے۔ اس کے چکر میں وہ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''گرل فرینڈ کی حیثیت سے؟'' سوال کرنے والا رشید تھا۔

''نہیں۔'' میں نے انکار کیا لیکن یہ انکار کافی نہیں تھا۔ انہیں تفصیل بتانی ضروری تھی۔

''ایک تو افریقن تھا دوسرے یہ کہ کینیا سے جب اس کے والدین لائے گئے تھے تب وہ مسلمان تھے لیکن امریکا پہنچ کر انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور وہ کرسچن ہو گئے اور انہوں نے بیٹے کا نام جوزف رکھا تھا۔'' میں نے تفصیل بتانی شروع کی مگر فون کی گھنٹی بج جانے کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھا سکا۔

فاطمہ نے موبائل پر نمبر دیکھا اور فون آن کرنے کے ساتھ اس نے مائیک بھی آن کر دیا۔ ہیلو کہنے کے ساتھ ہی اس نے ایک غیر مانوس زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ کچھ دیر اسی غیر مانوس زبان میں گفتگو کرتے رہنے کے بعد اس نے انگریزی شروع کر دی۔

''ہماری گفتگو دو افراد اور سن رہے ہیں اور دونوں ہی جرمن سے ناواقف ہیں اس لیے بہتر نہ ہوتا کہ ہم انگریزی میں بات کرتے۔'' فاطمہ نے جرمن زبان میں بات کرتے ہوئے اچانک کہا اور دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''کیوں نہیں؟''

''ہمارا ایک دوست امریکا سے آیا ہے۔'' فاطمہ نے میرا تعارف کروانا شروع کیا تھا۔ ''پاکستانی ہے لیکن اکیس برس پہلے اس کے یہاں لندن میں ایک لڑکی سے تعلقات ہو گئے تھے۔'' فاطمہ نے کہا۔

''بہتر ہوتا کہ تم تینوں میرے گھر آجاؤ۔'' فون پر آواز ابھری۔

''لنچ تم تینوں نے نہیں کیا ہوگا؟'' اس نے سوال کیا۔ فاطمہ نے جواب نفی میں دیا تو اس نے کہا۔ ''میرے گھر کے پاس بہت اچھا انڈین ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں سے کھانا منگوا لیتا ہوں۔'' اس نے یہ تصدیق کیے بغیر کہ ہم آرہے ہیں یا نہیں خود ہی سے یہ تصور کر لیا تھا کہ ہم وہاں ضرور جا رہے ہیں اور یہ اس کا اعتماد ہی تھا جو اس نے اپنا ایڈریس بھی لکھوا دیا تھا۔

ہمیں وہاں سے نکلنے میں مزید آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔ فاطمہ نے بچوں کو ہدایات دیں اور گاڑی میں آگئی۔ رشید ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اگلی سیٹ پر تھا۔ لندن کوئی بڑا شہر نہیں ہے لیکن ہمیں وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا تو لگ ہی جاتا تھا۔ راستے میں شاکر کا فون آیا۔ رشید نے اسے بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

''وہاں سے فارغ ہوتے ہی اسٹور کی جانب آجانا لیکن آتے ہوئے فون ضرور کر لینا تاکہ میں اسٹور پر موجود رہوں۔'' اس نے کہا اور رشید نے وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

ہم اس جرمن جوڑے کے فلیٹ پہنچے تو وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے بلکہ ڈائننگ ٹیبل سجی ہوئی تھی۔ کھانے کے دوران میں نے انہیں اپنی کہانی سنائی اور انہوں نے کھانے کے دوران ہی فون کرنا شروع کر دیے۔

''وہ بڑے میاں اور ان کی بیگم کا انتقال تو تمہارے امریکا جانے کے چند ماہ بعد ہی ہو گیا تھا اور ان کی تمام جائداد کا وارث ان کا بھتیجا ٹھہرا تھا۔'' خاتون نے کہا اور میرے پاس یہ اطلاع پہلے سے تھی اس لیے میں نے اس پر کچھ زیادہ اظہارِ خیال نہیں کیا تھا۔ ''اپنے چاچا کی جائداد سنبھالنے ان کا بھتیجا لندن آیا اور یہاں آنے کے بعد یہیں کا ہو گیا۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''اس ایک گھنٹے کے دوران ہم اسے تلاش کرتے رہے تھے۔'' خاتون کی بات کو اس کے شوہر نے آگے بڑھایا۔

''کچھ معلوم ہوا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟'' گفتگو میں وقفہ آیا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔

''وہ خود تو ایسی جگہ پہنچ گیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن اس کی بیوی ہے لیکن وہ امریکا میں ہے اور اسپتال میں ہے۔'' میرے سوال کا جواب تھا۔

''تو کیا اس سے بات نہیں ہو سکتی؟'' فاطمہ نے سوال کیا۔

''ہماری بات امریکا میں اس کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

اس نے بتایا کہ امی کو نیند کے انجکشن دیے گئے ہیں اور وہ سو رہی ہیں۔" فاطمہ کے سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

"وہ بتا رہی تھیں کہ اس ایک مہینے میں امی پانچویں بار اسپتال آئی ہیں جہاں وہ تین بار آئی سی یو میں رہی ہیں۔" بیوی کی بات ختم ہوئی تو شوہر نے تفصیل بتانی شروع کی۔

ہم جب تک وہاں رہے، وہ دونوں باری باری امریکا فون کر کے معلوم کرتے رہے۔ آخری فون پر معلوم ہوا کہ امی بیدار تو ہو گئی ہیں لیکن نیند کی دواؤں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ یاد نہیں آ رہا۔

بات جہاں سے شروع ہوئی تھی پھر وہیں پہنچ گئی تھی کہ آگے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بند گلی میں کھڑا تھا اور درمیان کی دیوار گرانے کی سکت مجھ میں نہیں تھی۔

"ہم ایک بار پھر سے اس پورے معاملے کا جائزہ لیتے ہیں۔" رشید نے کہا اور ہم میز کے گرد بیٹھ گئے۔

ماضی کو دوبارہ دہرایا گیا۔ اس وقت سے جب سین سے ملاقات ہوئی تھی۔ سین کا بھائی اور بھابی کے گھر آنا پھر مجھے اپنے ساتھ اپنی کزن کے فلیٹ پر لے جانا وہاں مجھ سے گرل فرینڈ کے بارے میں سوال کرنا اور خود کو میرے حوالے کرنے سے لے کر میری امریکا سے آمد اور ہائیڈ پارک کی ملاقات پر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پر بات ہوئی۔

"تمہیں اس کی کزن کے فلیٹ تک ضرور جانا چاہیے تھا۔" فاطمہ نے کہا۔

"میں گیا تھا لیکن وہاں کوئی دوسرا جوڑا رہ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ اکیس برس اس کی کزن بھی وہاں رہتی ہو۔" فاطمہ نے کہا۔

"بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔" فاطمہ کی بات پر رشید نے کہا۔

"ہم کل صبح بینک کے ہیڈ آفس جا کر وہ ڈاکومنٹ دیکھیں گے جو ہمارے بینک اور اس ریسٹورنٹ کے مالکان کے درمیان ہوا تھا۔" میزبان نے کچھ دیر جرمنی میں بات کرنے کے بعد ہم سے کہا تھا۔

ان سے رخصت لے کر گاڑی میں بیٹھے تو فاطمہ نے کار آگے بڑھتے ہی کہا۔ "یہ تو سانپ اور سیڑھی کا کھیل ہو گیا۔"

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو کہ ننانوے پر پہنچے تو سانپ نے کاٹ لیا اور کھیل دوبارہ سے شروع ہوا۔" رشید نے اپنے موبائل سے شاکر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

امریکا سے چلتے ہوئے میرے ذہن میں تھا کہ سین کی تلاش کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوگا لیکن لندن آنے کے بعد یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا میں نے سمجھ رکھا تھا۔

یہ احساس بھی تھا کہ ہائیڈ پارک میں جس سے ملاقات ہوئی تھی، وہ واقعی سین تھی یا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا لیکن خواب والا تصور میں مسترد کرتا رہا تھا۔

وہاں میں جتنی دیر بھی رہا تھا، اپنے ہوش وحواس میں رہا تھا۔ نشے کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا اس لیے وہ بھی میرے خیال میں غور کرنے کے قابل نہیں تھا اگر کوئی کہتا کہ "حالتِ نشہ میں وہ تمہارے تصور میں آئے ہوگی۔"

"شاکر ہم لنچ کر چکے ہیں اور اب تمہاری طرف آ رہے ہیں۔" رابطہ ہونے کے ساتھ رشید نے کہا تھا۔

"اس سے کہو ہوٹل آ جائے وہاں زیادہ اطمینان سے بات ہو سکتی ہے۔" میں نے لقمہ دیا اور رشید نے وہی کچھ دہرا دیا۔

"مجھے تم سے نہیں ملنا اور منیرہ ہوٹل نہیں آ سکتی۔" شاکر کا جواب رشید نے مجھے بتایا۔

"آپ مجھے گھر پر اتار دیں۔" کار کچھ آگے بڑھی تو پچھلی سیٹ سے فاطمہ کی آواز آئی۔

"ایسا کرتے ہیں کہ ہم ان کے اسٹور چلتے ہیں تم کار لے کر واپس ہو جانا۔" رشید نے جواب میں کہا۔

"گھر سے فون آیا ہے۔" فاطمہ نے اس کے جواب میں کہا اور رشید اس کے جواب میں خاموش رہا۔

کار نے کچھ دور جا کر موڑ کاٹا اور یوٹرن لیتے ہوئے اس سڑک پر آ گئی جس کی سیدھ میں رشید کا فلیٹ تھا۔ فاطمہ کو ڈراپ کرنے کے لیے ہم اس فلیٹ سے کچھ فاصلے پر تھے کہ فاطمہ کے موبائل پر بیل ہوئی۔

"اچھا...... پھر...... واقعی...... فاطمہ یہ تم اپنے انکل کو بتاؤ۔" فاطمہ نے اپنا موبائل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"انکل آپ چلے گئے تھے لیکن ہم تینوں نے اپنی ڈیوٹیز لگا لی ہیں کہ سین آنٹی اور آپ کی بیٹی کی تلاش میں آپ کی مدد کریں۔" دوسری جانب رشید کی بڑی بیٹی تھی۔

"تھینک یو بیٹا۔" میں نے کہا۔ جذبات سے میری آواز بھاری ہو چکی تھی۔

"ایک کی ڈیوٹی ہم نے لندن کی ٹیلیو ٹیلی فون

ڈائریکٹری پر لگائی اور دوسرے کی اس پر کہ وہ ہمارے جو دوست ہیں، ان سے مدد لیں۔'' وہ بولی۔

''خود میں نے یہ ذمے داری لی کہ فیس بک اور ٹوئیٹر پر اس نام کی تلاش شروع کرنے کے ساتھ پیغام دیا کہ مجھ سے اس نام کی لڑکیاں رابطہ کریں۔'' وہ بول رہی تھی اور میں سوچ میں تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہی تھیں، وہ میں نے کیوں نہیں سوچا۔

''تم فون رکھ دو ہم تینوں تمہارے فلیٹ پر آرہے ہیں۔'' میں نے اس کی گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے کہا اور وہ ''اوکے'' کہہ کر خاموش ہوگئی۔

ہم اس کے فلیٹ پہنچے تو وہ تینوں ہمارے انتظار میں تھے ڈائننگ ٹیبل پر بکھرے کاغذات بتا رہے تھے کہ وہ کیا کرتے رہے تھے۔

تینوں میری کرسی کے پاس اپنی اپنی کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے تھے اور اپنی اپنی کاوشوں کو بیان کرتے رہے تھے۔

''تم نے جو بھی کیا وہ قابلِ تعریف ہے لیکن اس مفروضے پر کوششیں کرتے رہے کہ وہ اکیس برس بعد بھی لندن میں ہوگی۔'' فاطمہ نے دخل دیا تھا۔

''اکیس برس بعد ثنا کم از کم بیس سال کی تو ہوگی۔'' رشید نے بیوی کی بات آگے بڑھائی۔

''بیس برس کی لڑکی ضروری نہیں کہ لندن میں رک گئی ہو۔'' میں نے رشید اور فاطمہ کی بات سمجھتے ہوئے کہا اور تینوں کے چہروں پر مایوسی صاف نظر آنے لگی۔

انہیں توقع تھی کہ ہم ان کے کام کی تعریف کریں گے لیکن ایسا نہ ہونے پر وہ کچھ مایوسی کا شکار ہوگئے تھے۔

گفتگو ابھی جاری تھی کہ رشید کا موبائل بجنے لگا۔ رشید نے اسکرین پر نام دیکھا اور ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''شاکر کا فون ہے۔'' اور فون کان سے لگا لیا۔

''گھر پر ہوں۔'' دوسری جانب سے کیے جانے والے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

''لو بات کرلو۔'' اس نے اپنا موبائل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے فون لے لیا، دوسری جانب واقعی شاکر ہی تھا۔

''کہاں رک گئے؟'' اس نے سوال کیا۔

''واپسی میں رشید کے گھر پر ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور کچھ لمحوں کے لیے خاموشی ہوگئی۔

''جس بیٹی کی تلاش میں تم یہاں موجود ہو، وہ تمہیں ڈھونڈنے امریکا پہنچی ہوئی ہے۔'' شاکر نے کہا اور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

''امریکا تو بہت بڑا ملک ہے۔'' میرے ہونٹوں سے بمشکل اتنا ہی نکل سکا۔

''لندن سے وہ نیویارک کی فلائٹ پر گئی تھی۔'' شاکر نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔

''کیا مجھے نیویارک واپس جانا پڑے گا؟'' میں نے سوچا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ میری ہی بیٹی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم اسٹور پہنچو تو ان سوالوں کے جواب تمہیں خود مل جائیں گے۔'' اس نے کہا اور میں نے فون رشید کی جانب بڑھا دیا۔ رشید سے بھی اس نے شاید وہی کچھ کہا جو مجھ سے کہا تھا۔

''تمہارے پاس نیویارک میں جاننے والوں کے نمبر ہیں؟'' رشید نے مجھ سے سوال کیا اور میں نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

''چلو پھر چلتے ہیں شاکر کے اسٹور کی طرف۔'' رشید نے کہا اور ہم فاطمہ کو فلیٹ پر چھوڑ کر کار میں بیٹھ گئے۔

''رشید نے مجھ سے نیویارک کے نمبروں کے بارے میں سوال کیا تھا تو کار میں بیٹھتے ہی اپنی سابقہ بیوی کو ڈائل کیا۔ مستقل ڈائل کرتے رہنے کے باوجود اس جانب سے فون نہیں اٹھایا گیا۔

''کسے فون کررہے ہو؟'' رشید نے مجھے مستقل ایک ہی نمبر ڈائل کرتا دیکھ کر سوال کیا۔

''اپنی سابقہ بیوی کو فون کررہا ہوں لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''وہ نمبر دیکھے گی تو خود ہی ڈائل کرلے گی۔'' رشید نے کہا اور میں مجیب کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''مجیب ہمارا... پڑوسی تھا اس فلیٹ کا رہائشی جہاں میں عفت سے شادی کے بعد شفٹ ہوا تھا لیکن اس کا نمبر بھی بند تھا۔''

کچھ اور بھی نمبر میرے فون میں فیڈ تھے میں باری باری سب کو ڈائل کرتا رہا لیکن کہیں سے بھی جواب نہیں آرہا تھا۔ کہیں سے جواب نہ ملا تو میں نے بھیا کے نمبر ڈائل کر دیے، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اب ٹورنٹو میں ہیں۔ وہاں دوسری ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا۔ فون اٹھانے والی بھابی تھیں،

انہوں نے ہیلو کہا تو میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''بھائی میں اسد بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کہاں ہو تم؟'' ان کی آواز آئی۔

''میں لندن میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا تو مجھ سے کہا۔

''ایک منٹ رک جاؤ۔ تمہارے بھائی کو بلاتی ہوں۔'' بہنوئی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ہولڈ کرو میں آ رہا ہوں۔'' بھیا کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''اسد کیسے ہو؟'' انہوں نے بغیر ہیلو کہے سوال کر دیا۔

''میں بھیا لندن میں ہوں' اپنی بیٹی کو تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تم اسے وہاں تلاش کر رہے ہو اور وہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے پہلے نیویارک پہنچی تھی جب وہاں سے معلوم ہوا کہ میں اور میری وائف یہاں کینیڈا میں ہیں تو وہ ٹورنٹو چلی آئی۔'' بھیا نے جواب دیا۔

اس دوران ہم شاکر کے اسٹور کے قریب آ چکے تھے۔

''رشید نے کار پارک کی اور نیچے اتر آیا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا کہ میں کار سے اتروں تو وہ آگے بڑھے۔

''آپ کی ملاقات ہوئی اُس سے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہوئی تھی لیکن تمہاری بیوی نے اس کی بات پر اعتبار کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔'' بھیا کا جواب تھا۔

''وہ وہاں کہاں پہنچ گئی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اپنے شوہر سے پٹنے کے بعد اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تو وہ یہاں چلی آئی۔'' ان کا جواب تھا۔

''نتاشا کا کوئی موبائل نمبر ہے آپ کے پاس؟'' میں نے کہا۔

''اس نے جانے سے پہلے نمبر دیا تو تھا مگر وہ کہیں کھو گیا۔'' بھیا نے کہا۔

''عفت کو اس کے شوہر نے کیوں مارا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ جاب سے واپس آئی اور اپنی چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کا شوہر نتاشا سے برسرِ پیکار تھا۔'' بھیا کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے اپنے خیال کو لفظ دیے تو

برتن دھونا بند کرو اور ہینڈز اپ کر کے باہر آ جاؤ۔

بھیا فوری طور پر جواب نہیں دے سکے۔

''جب نتاشا تمہاری اور اپنی ماں کی تصویر لے کر وہاں پہنچی تو عفت نے تمہیں تو پہچان لیا اور اپنے گھر رکنے کے لیے کہا۔ رات میں وہ وہیں رہی تھی اور اگلے دن یہ واقعہ ہو گیا۔'' بھیا نے جواب میں کہا۔

''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ جب میری بیٹی اس کے گھر پہنچی تو اس نے اسے پناہ دی لیکن جب وہ ٹورنٹو آپ کے پاس رکی تو اس نے اسے میری بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا؟'' میں نے سوال کیا اور بھیا نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر کہا۔

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔''

''آپ کے پاس سے وہ کہاں گئی؟'' میں نے کہا اور وہ سوچنے لگے۔

''تم کچھ دیر بعد فون کر لو میں تلاش کر کے جواب دے دوں گا۔'' بھیا نے کہا تھا۔

''میرے پاس سے وہ آصف کے پاس مسی ساگا چلی گئی تھی، اب پتا نہیں کہاں ہو گی۔'' انہوں نے تفصیل سے جواب دیا۔

''یا اللہ خیر اس دنیا میں تو ہی ہے جو اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور کار سے اتر آیا۔

شاکر کے اسٹور پہنچنے تک میں نے تمام رُوداد رشید کے گوش گزار کر دی تھی۔ پھر دوبارہ سے شاکر کے سامنے دہرانی پڑی۔

''وہ تو جب دیں گے تب دیں گے لیکن میں ابھی آپ کو نتاشا سے ملوا دیتی ہوں۔'' منیرہ نے میری باتوں کو

سنے کے ساتھ کہا تھا۔

جب وہ یہ کہہ رہی تھی اسی وقت اس کی بیٹی ایک البم لیے اسٹور میں داخل ہوئی۔

''اس میں کالج کے سالانہ فنکشن کی تصویریں ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

منیرہ نے البم میں سے ایک تصویر نکالی جو پہلے سے ہی الگ رکھی ہوئی تھی۔ ''پہچان لو اس گروپ میں اپنی بیٹی۔'' منیرہ نے وہ تصویر میرے سامنے رکھ دی۔

مجھے اسے پہچاننے میں سیکنڈ لگا ہوگا۔ وہ بین کی کاپی تھی۔ وہی سانولی رنگت اسی طرح کے سیدھے لمبے بال اور وہی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی جو کبھی بین کے چہرے پر ہوتی تھی۔

''یہ تمہارے کالج میں تھی۔'' میں نے اس کی بیٹی سے پوچھا اور اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔

''یہ تصویر دو برس پرانی ہے۔'' شاکر نے کہا تھا۔

''یہ ایک مریض کے ساتھ تھیں جو اس کی خالہ تھیں۔'' اس نے کہا اور میں اس ''لفظ'' تھی پر اٹک کر رہ گیا۔

''کیا اب وہ اس دنیا میں نہیں؟'' میں نے پوچھ ہی لیا، وہ سوال جو میرے ذہن میں تھا۔

''اس تصویر کے دو روز بعد ہی وہ وفات پا گئیں۔'' منیرہ کی بیٹی کا جواب تھا۔ ''اسپتال یہ آئی تھیں اپنے فالج کے علاج کے لیے وہ تقریباً ہو گیا لیکن آخری دن رات میں دل کا دورہ پڑا اور وہ نہیں رہیں۔'' اس نے تفصیلی جواب دیا۔

اس کا جواب ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ میں نے موبائل کے اسکرین پر دیکھا وہاں وہی نمبر تھا جو بھیا کا تھا۔

''آصف سے میری بات ہوگئی ہے نتاشا اب بھی ان کے گھر پر ہے۔'' انہوں نے میرا جواب ملتے ہی کہا۔

''آصف نے میری اس سے بات بھی کروا دی ہے۔'' انہوں نے کہا اور میرے اندر سکون کی ایک لہر سی اترتی چلی گئی۔

''آصف کو میں نے تمہارا نمبر دے دیا ہے، وہ بھی تمہیں رنگ کرنے والا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

اسی دوران میرے فون پر ایک نمبر چمکنے لگا، میں نے جلدی بھیا سے بات مکمل کی اور اس نمبر پر ڈائل کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اس کی کال آگئی۔ ''اسد بول رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے سوال ہوا۔

''آپ آصف ہیں؟'' میں نے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''جی آپ کی امانت میرے پاس ہے۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

جو کچھ آصف نے بتایا، وہ یہ تھا کہ جب بھیا کے گھر سے وہ نکالی گئی تو اس نے اقرا یعنی آصف کی بیٹی کو ڈائل کیا اور اقرا نے فوراً ہی اسے اپنے گھر کی آفر کر دی اور وہ بغیر کوئی سوال کیے وہاں پہنچ گئی تھی۔

''میری پانچ بیٹیاں ہیں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے چھٹی بیٹی گھر بیٹھے دے دی۔''

''میرا پراپرٹی کا کام ہے۔ آپ کی بیٹی نے مجھے میرے کام سے تقریباً فارغ کر دیا ہے۔'' آصف کہتا رہا۔

آصف نے نتاشا سے بات بھی کروا دی اور اسی رات امارات کی فلائٹ سے وہ لندن پہنچ بھی گئی۔ وہ ائرپورٹ سے باہر نکل رہی تھی اور میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں گلے مل کر اس طرح روئے کہ رشید، فاطمہ ان کے بچوں سمیت ہر ایک کی آنکھیں نم تھیں۔ باپ بیٹی کا یہ ملاپ ان سب کے لیے خوشی کا سبب تھا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل جائے لیکن رشید کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ اگلی رات شاکر کے گھر ڈنر تھا۔ اسی رات ہماری نیویارک کی فلائٹ تھی۔

میں عفت کے سامنے ثبوت دینا چاہتا تھا کہ جس بنیاد پر اس نے خلع لیا تھا، وہ غلط تھی۔ مجھ میں باپ بننے کی صلاحیت موجود تھی اور نتاشا اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

فاطمہ کی طرح میرے ذہن میں بھی اس شک نے جنم لیا تھا کہ پارک میں بین نے نہیں بلکہ نتاشا نے ہی مجھ سے ملاقات کی تھی لیکن نتاشا نے اس کی تردید کی تھی۔ ''آپ جس ڈیٹ کا یہ واقعہ بتا رہی ہیں یہ وہی تاریخ ہے جس تاریخ کو میں عفت کے گھر پر اس کے شوہر کا سامنا کر رہی تھی۔ امریکا اور لندن کے وقت میں جو فرق ہے، اسے سامنے رکھیں تو یہ وہی وقت بنتا ہے جب ''امی'' کی روح کی ملاقات ''بابا'' سے ہو رہی تھی۔'' اس نے کہا تھا اور فاطمہ اور میں دونوں اس پر متفق ہو گئے تھے کہ ''جانے والے'' شخص کے کسی اپنے پر برا وقت آ جائے تو روح کو کچھ دیر کے لیے واپسی کی اجازت مل جاتی ہے اور ساتھ ہی قدرت وہ راستے ہموار کر دیتی ہے جس سے آنے والے خطرات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔

❖❖❖

بچھڑے خواب

غلام قادر

زندگی کی پگڈنڈیوں پر آگے بڑھتے ہوئے کبھی کبھی ماضی کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں... یہ آہٹیں بڑی دلفریب لگتی ہیں... ان یادوں سے گزرتے ہوئے ایسی سنگین وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے... ایک ایسے ہی شخص کی زندگی کے مختلف روپ... جوانی میں ہر رنگینی اور سُرور کی مستی نے اپنے حصار میں جکڑے رکھا... پُلوں کے نیچے سے کئی دریا گزرتے رہے... ہوش آیا تو پھر ماضی کی پرچھائیاں سامنے کھڑی تھیں...

جوانی کے جوش اور بے خوفی کی ترنگ میں ڈوبی دل گداز داستاں

رات گہری ہو چلی تھی مگر اس کے باوجود موسم کی شدت میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی تھی۔ جواد کے لیے آج کی رات بھی دیگر تمام راتوں جیسی تھی۔ سرد، آرام دہ اور خوشگوار۔ وہ اپنے آراستہ کمرے میں اپنی پسندیدہ چیئر پر نیم دراز بورس بشمارک کی کتاب ڈاکٹر ژواگو پڑھ رہا تھا۔

وہ رات کو سونے سے قبل سگار اور مطالعے کا عادی تھا۔ اس کی عمر پچاس برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ درمیانی قدوقامت اور مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ خدوخال میں سفاکی نمایاں تھی۔ اُس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں جن میں عیاری اور درشتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے دائیں گال پر ایک لمبے سے زخم کا نشان موجود تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس کا ہاتھ گویا عادتاً اس نشان پر جا ٹھہرتا تھا اور اس ایک لمحے میں اس کے چہرے پر نفرت کی لہر سی آ کر گزر جاتی تھی۔ اس کے لیے آج بھی یہ ایک تازہ زخم تھا جسے چھوتے ہی اسے اپنے دونوں بھائی یاد آ جاتے تھے جنہیں اس نے ایک ہی رات میں کھو دیا تھا۔

وہ رات جسے وہ ان پندرہ سالوں میں لمحے بھر کے لیے بھی فراموش نہیں کر پایا تھا۔ اس رات انہیں ایک ہوٹل اُڑانے کا ٹارگٹ دیا گیا تھا۔ وہ دسمبر کی آخری رات تھی اور ہوٹل میں بہت سارے لوگ موجود تھے۔ اس ایک واردات سے شہر میں فساد تیزی سے پھیلایا جاسکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی منصوبہ بندی مکمل تھی۔ وہ بڑے پروجیکٹس کا کھلاڑی تھا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ بھروسا صرف خونی رشتوں پر ہی کیا جانا چاہیے۔ اس کے دونوں بھائی اس کے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ وہ اپنی کارروائی نمٹانے اندر گیا تھا۔ باہر گاڑی میں اس کے دونوں بھائی اس کے منتظر تھے۔ سب کچھ اس کے حساب سے ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا مگر عین وقت پر نہ جانے کس طرح مخبری ہوگئی اور قانون نافذ کرنے والے خفیہ اداروں کے لوگوں نے ہوٹل پر دھاوا بول دیا۔

انہوں نے نہ صرف اندر موجود تمام لوگوں کو بچا لیا بلکہ اس کے کئی ساتھیوں کو ہلاک بھی کر دیا تھا۔ وہ خود زخمی حالت میں بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ پایا تھا مگر فائرنگ کے نتیجے میں اس کے دونوں بھائی مارے گئے تھے اور وہ ان کی لاشیں بھی حاصل نہیں کر پایا تھا۔ ان دونوں کے مرنے کے بعد اس کی دنیا میں صرف ایک بہن بچی تھی جسے اس نے ہمیشہ ان دھندوں سے دور ہی رکھا تھا۔

اس کے بعد اس نے لاتعداد وارداتیں کیں۔ آج وہ ایک بڑے گروہ کا سربراہ تھا۔ اس کا ایک اشارہ قتل و غارت گری کا سیلاب لے آتا تھا، دنگا فساد ہو یا بم دھماکے یا دہشت گردی کی وارداتیں غیر ملکی دشمن ایجنسیاں سب سے پہلے جواد ہی سے رابطہ کرتی تھیں مگر ہر کامیابی کے بعد یہ نشان اس بڑی ہار کا غم تازہ کر دیتا تھا۔ دروازے کے قریب سے گزرتے گارڈ کے قدموں کی مدھم سی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ آج اس کے پاس بہترین چیدہ گارڈ موجود تھے۔ وہ چار شفٹوں میں کام کرتے تھے اور ہر گھنٹے ان کی نگرانی کا پیٹرن بدلا جاتا تھا۔ جواد ایک محتاط آدمی تھا۔ اس کے دشمن کم نہیں تھے۔ یوں بھی اس کے سر پر کروڑوں کا انعام تھا۔ ملکی خفیہ ایجنسیاں بھی اس کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ پیسے کا لالچ دنیا میں بہت طاقتور ہوتا ہے۔ اور انعام کی ہوس کبھی بھی کسی بھی دوست کو دشمن بنا سکتی ہے۔

اس نے کتاب ساتھ رکھی میز پر رکھی اور بالکونی میں جا کھڑا ہوا، یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اسے یہاں کھڑے ہو کر دور تک دیکھنا اور سگار پینا پسند تھا۔ اس نے سگار سلگایا، پہلا کش لے کر ایک لمحے کو ساکت سا کھڑا رہا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ''بز'' کی ہلکی کی آواز سنی ہو۔ اس نے محتاط نظروں سے چاروں جانب دیکھا، سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی کمین گاہ بہت محفوظ ہے۔ پہاڑی کی اس اونچائی پر اس کے اس مینشن نما مکان کے گرد کافی اونچی دیوار موجود تھی جس کے ہر کونے میں گارڈز کی چوکی تھی جن کے پاس جدید ہتھیار موجود ہوتے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی جانب سلاخوں کی قدرے چوڑی باڑھ پر آہنی نوک دار تاروں کے جھنڈ بندھے ہوئے تھے۔ پندرہ شکاری کتے چاروں جانب گھومتے رہتے تھے۔ گھر کی اندرونی سیکیورٹی اس کے علاوہ تھی۔

''اوہ......'' اچانک کسی مچھر نے اس کی گردن پر کاٹا، اس کے ہونٹوں سے گالی پھسلی۔ گردن کو سہلا کر اس نے سگار کا ایک اور کش لیا۔ عین اسی وقت اسے گردن کی دوسری جانب شدید چبھن کا احساس ہوا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مچھر نے نہیں، کسی شہد کی مکھی نے اسے ڈنک مارا ہو۔ اس نے تڑپ کر گردن کو مسلا۔

گردن کی پچھلی جانب جہاں مچھر نے اُسے کاٹا تھا وہاں اب سخت چبھن اور درد محسوس ہو رہا تھا مگر مسئلہ صرف یہ نہیں تھا۔ اسے اپنے ہاتھ اور کسی حد تک پیر بھی سُن ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ گلے کو گویا کسی نے شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور پورے جسم میں شدید جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بمشکل کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیر منوں وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ جسم پسینے میں شرابور تھا۔ وہ چیخنا چاہ رہا تھا مگر اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی زمین پر گر پڑا۔ درد ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں تیز دھماکے سے گونج رہے تھے۔ اس نے گارڈز کو آواز دینے کی کوشش کی مگر اس بار بھی آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ درد کسی سیلاب کے مانند اس کی رگ رگ میں دوڑتا پھنکارتا تباہی پھیلاتا جا رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا تھا؟'' وہ سوچنا چاہ رہا تھا مگر اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

اس نے دروازے کی جانب دیکھا...... سب کچھ لمحہ بہ لمحہ اس سے دور اور غائب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چند لمحے زمین پر تڑپتا رہا...... پھر ساکت ہو گیا۔

☆☆☆

جواد کے قلعے سے تھوڑی دور جنگل میں واقع ایک کیبن میں تیمور احمد موجود تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قامت، کسرتی جسامت اور شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ایک بے مثال شوٹر تھا۔ اس کے ساتھی اسے بانڈ کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ اس وقت وہ کیبن میں موجود واحد کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رکھی میز پر ایک لمبی سی اسکرین کسی میٹ کے مانند بچھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اسکرین سے منسلک کنٹرولنگ پینل پر جمے تھے اور اس کی نگاہیں اسکرین پر مرکوز تھیں جہاں گہرے اندھیرے کا راج نظر آرہا تھا۔ لمحے بھر کو یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ اس تاریکی میں دیکھ کیا رہا تھا۔ اندھیرے میں اچانک حرکت سی نظر آئی اور ''بز'' کی مدھم آواز کیبن میں گونجنے لگی۔ اس آواز کو سنتے ہی اس نے زوم کا بٹن دبایا۔ اب اسکرین پر ایک مچھر نما کیڑا صاف نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر پُراسرار مگر مطمئن مسکراہٹ تیرنے لگی۔ اس نے سیدھے ہاتھ والے پینل کو حرکت دی۔ چند کیز کو دبایا اور کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کیز دبتے ہی اسکرین پھر تاریک ہوگئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہاں سیکنڈز میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوگیا۔ چند لمحوں بعد کاؤنٹ ڈاؤن بھی رک گیا اور ہرے رنگ کا ایک تیر نظر آنے لگا جس پر ''مشن ڈن'' کے الفاظ چمک رہے تھے۔ وہ مسکرایا اور اس کا ہاتھ پاور کے بٹن کی جانب بڑھا۔ اسکرین آف ہوتے ہی اس نے کنٹرولنگ پینلز کو الگ کیا۔ ایک بٹن دبانے پر وہ پینل ایک چھوٹے سے باکس میں تبدیل ہوگئے۔ اس کے بعد اس نے اسکرین کو کپڑے کے مانند تہ کیا اور اس باکس کے نچلے حصے میں موجود خلا میں رکھ کر باکس بند کر دیا۔

دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے کیبن کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک میز اور کرسی کے سوا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے جیب سے ایک خاص عینک نکال کر پہن لی۔ اس عینک کی وجہ سے وہاں موجود ہر چیز کئی گنا بڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹویزر بھی تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے زمین پر نظر دوڑائی۔ اسے اپنے گوہرِ مقصود تک پہنچنے میں دو لمحے لگے تھے۔ زمین پر ایک باریک سا مشینی کیڑا پڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹویزر کی مدد سے اسے اٹھایا اور مسکراتے ہوئے اسی باکس کی دوسری جانب بنی چھوٹی سی ڈبیا میں ڈال دیا۔

اس کا ''مشن محافظ'' مکمل ہو چکا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا سڑک کی جانب بڑھ گیا جہاں ایک سیاہ رنگ کی پُرتعیش کار اس کی منتظر تھی۔ ڈرائیونگ کے دوران اس کے ذہن کی اسکرین پر گزرے دنوں کی یادیں جگمگا رہی تھیں۔ ایسا ہر بار ہوتا تھا۔ جب بھی وہ کسی ظالم کو اس کے انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہوتا تھا، نینا اور پریا کے مسکراتے چہرے اسے اپنے اردگرد محسوس ہوتے تھے جیسے وہ اسے داد دے رہے ہوں۔ یوں تو نینا اور پریا کی یاد ہر لمحے اس کے ساتھ ہی رہتی تھی اور پھر وہ دھماکا...... جسے وہ اتنے سالوں میں بھی نہیں بھول پایا تھا۔ اس ایک لمحے نے اس کی ساری زندگی کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا تھا۔ کل کا کارپوریٹ آفیسر آج مشن محافظ کے اولین دستے کا مانا ہوا سپاہی بن چکا تھا۔ چار سال پہلے شاپنگ مارٹ میں ہونے والے اس بم دھماکے میں جان سے عزیز بیوی اور بیٹی کو کھو دینے کے بعد تو گویا زندگی کو ہار ہی چکا تھا۔ ''مشن محافظ'' نے اس وقت اسے سہارا دیا تھا۔ ان کی مدد سے ہی وہ اپنے پیاروں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور پھر اپنی بہن رمشا کو ان کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسی حادثے میں وہ، اسد اور رمشا دنیا کے لیے ختم ہو گئے تھے مگر مشن نے اپنی ایک نئی شناخت بھی دی اور اس نئی زندگی کا مقصد بھی۔ رمشا کا خیال اس کے ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ بن کر ابھرا۔ ان برسوں میں اس کی شادی ہوگئی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش باش تھی۔

''مشن محافظ'' بظاہر ایک کلائمٹ چینج اور انوائرمینٹل (ماحولیات اور ماحولیاتی تبدیلیوں) سے متعلق بین الاقوامی جریدہ اور تنظیم تھی مگر درحقیقت اس کا کام ملک اور قوم کو نقصان پہنچانے والے اندرونی اور بیرونی دہشت گردوں اور مجرموں کی بیخ کنی تھی۔ مشن محافظ ملک کے اعلیٰ سیکیورٹی اداروں کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا مگر اس کی الگ جداگانہ حیثیت تھی۔ ملک اور انسانیت کے ان دشمنوں سے نجات دلانا، جنہیں عام حالات اور طریقہ کار کے اندر رہتے ہوئے پکڑنا اور سزا دینا ناممکن ہو، مشن محافظ کا مقصد تھا۔ تیمور اب مشن میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ جواد جیسے کتنے ظالم دہشت گرد اس کے ہاتھوں جہنم میں پہنچ چکے تھے مگر اس کے باوجود ہر ایسے موقع کے بعد اس کا ذہن عجیب سے اسٹریس کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا...... اور سڑک پر نظریں جمادیں۔ وہ اب شہر میں داخل ہونے ہی والا تھا۔

☆☆☆

ملٹن میں اس وقت جشن کا سماں تھا۔

ملٹن کا شمار شہر کے چند بڑے ہوٹلز میں کیا جاتا تھا۔

اس وقت پورا ہوٹل روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ مہمانوں کی آمد مسلسل جاری تھی۔ ملٹن یوں بھی اپنی خوب صورت اور یادگار تقریبات کے لیے مشہور تھا مگر آج تو سجاوٹ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ پورا ہوٹل سنہری روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ داخلی دروازے پر نہایت خوب صورت چمکتی ہوئی روشنیوں سے کافی بڑا 50 کا ہندسہ بنایا گیا تھا جو دور سے نظر آرہا تھا۔

آج ملٹن کی گولڈن جوبلی کی خصوصی تقریب تھی جس میں شہر کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ٹیلی ویژن اور فلم کے مشہور ستارے اپنے پرستاروں کے جھرمٹ میں جھلملا رہے تھے۔ ہر طرف حسن ونور کا بازار گرم تھا۔ اس وقت شہر کا ایک نامور گلوکار اپنے فن کے جوہر دکھا رہا تھا۔ بینکویٹ میں سب کی توجہ اس کی جانب تھی۔ اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا جس کے فوراً بعد چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کوئی زور سے چلّایا۔

''باہر...... باہر نکلو سب...... جلدی......'' ایک بلند آواز ابھری۔

عین اسی وقت پہلے سے زیادہ زوردار دھماکا سنائی دیا۔ اس بار دھماکے کی شدت کی وجہ سے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہوٹل میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا بس ہر کوئی سب سے پہلے وہاں سے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں کتنے ہی لوگ پیروں کے نیچے کچلے جا رہے تھے...... زندگی بچانے کی تمنا، تعلق، دوستی، محبت، انسانیت ہر جذبے پر حاوی ہوتی نظر آرہی تھی۔ لوگوں کی چیخ وپکار اور شور وشرابے کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تیسرا دھماکا ہوٹل کے داخلی دروازے کے قریب ہوا تھا جہاں گولڈن جوبلی کے لیے سجایا گیا 50 کا ہندسہ منہ کے بل زمین پر آگرا تھا۔ لمحے بھر میں گویا سارا منظر تبدیل ہوگیا تھا۔

چاروں طرف سے پولیس سائرن اور ایمبولینس کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

''یہ خاصی عجیب بات ہے آخر اس سے کسی کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟'' انسپکٹر خالد نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ مقصد تو ہوتا ہی ہے، کوئی بھی شخص اس حد تک بے وجہ نہیں جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی کسی سے دشمنی چل رہی ہو مگر مالکان میں سے کوئی منہ کھولنے کو تیار نہیں ہے۔''

ڈی ایس پی تنویر نے سر ہلایا۔ ''عجیب بات یہ ہے کہ ہوٹل میں تین بڑے دھماکے ہوئے مگر ان میں سے کوئی بھی بم دھماکا نہیں تھا۔ دھوئیں اور دھماکے کی تیز آواز نے لوگوں کو خوف زدہ کر دیا جس کے نتیجے میں دو جانیں بھی گئیں اور اتنے لوگ زخمی بھی ہوئے۔''

''یہ خوف اپنی جگہ غلط بھی تو نہیں ہے سر...... ہمارے شہر میں اتنے بم دھماکے ہو چکے ہیں کہ اب پٹاخا بھی خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔'' انسپکٹر شکور نے کاندھے اچکائے۔

''تم درست کہہ رہے ہو۔'' ڈی ایس پی اپنی ٹیم کے ساتھ اس وقت ملٹن میں ہی تھا۔ دھماکے فیک ثابت ہوئے تھے مگر ان سے ہونے والا نقصان حقیقی تھا۔ اسے یقین تھا کہ مالکان اس حوالے سے کچھ نہ کچھ جانتے ہیں مگر وہ ان پر اس سے زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ وہ تعلقات اور اثر ورسوخ والے لوگ تھے۔ اس لیے وہ ان سے صرف اسی قدر بات کر سکتا تھا۔ ان سے زیادہ تفتیش خود اس کے لیے مضرِ صحت ثابت ہو سکتی تھی لہٰذا وہ دال میں کالا محسوس کرتے ہوئے بھی صرف معمول کی کارروائی پر مجبور تھا۔

☆☆☆

تیمور احمد کو مشن محافظ کی عمارت میں داخل ہوتے ہی سلیمان صاحب کا پیغام مل گیا تھا۔ سلیمان صاحب مشن محافظ کے بانی اور سربراہ تھے۔ ان سب کے باس...... وہ تیمور کا بہت خیال رکھتے تھے اور مشن میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ ان کے بعد مشن کا نیا سربراہ تیمور ہی ہوگا۔

''جی سر......'' تیمور سیدھا اُن کے کمرے میں پہنچا۔

''تیمور تمہیں ''جادوگر'' کے بارے میں معلوم ہے؟'' انہوں نے ناک کی پھننگ پر رکھے چشمے کے اوپر سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ طویل قامت اور اکہرے جسم کے مالک تھے۔ عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ سفید بالوں، گہری سوچتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ اب بھی متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔

''جادوگر......؟'' تیمور نے کچھ سوچتے ہوئے دہرایا۔ ''اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہیں۔ اس نے کافی قتل کیے ہیں، کئی بار جیل میں ڈالا گیا اور فرار ہوا۔ ایک دہشت گرد تنظیم سے بھی اس کا تعلق ہے اور شاید ہیومن ٹریفکنگ (انسانی خرید وفروخت) میں بھی ملوث رہا ہے۔''

''ہاں...... نہایت ظالم اور شقی القلب انسان ہے۔ کم از کم پچیس قتل کر چکا ہے۔ عام لوگ تو ایک طرف پولیس

بھی اس سے قدرے خوف زدہ رہتی ہے کیونکہ اس سے قبل جس پولیس افسر نے اسے گرفتار کیا تھا، اس کا پورا خاندان گھر میں لگنے والی آگ سے ہلاک ہو گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا مگر اسے کہیں بھی ثابت نہیں کیا جا سکا مگر اب جو وہ کر رہا ہے، وہ ناقابلِ برداشت ہے۔'' سلیمان بولتے بولتے رکے۔ تیمور خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔'' وہ بچوں کے اغوا اور قتل کے معاملات میں ملوث ہے اور اب اطلاع ملی ہے کہ اس نے کم عمر بچوں کے اعضا خصوصاً بون میرو کی فراہمی کا کوئی کام شروع کیا ہے اور اب اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔'' سلیمان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بچوں کے معاملے میں وہ بہت زیادہ جذباتی تھے۔ مشن کے کتنے ہی نوجوان ایسے تھے جنہیں انہوں نے یتیم خانوں سے گود لیا تھا اور ان کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔'' تم میری بات سمجھ رہے ہو نا، تمہیں ایک دو روز میں اس فائل پر کام کرنا ہے۔''

تیمور نے جواب میں سر ہلایا۔ چند لمحوں بعد وہ سلیمان کے کمرے سے باہر آ چکا تھا۔ اسے آج ہی ریکارڈ روم سے جادوگر کی تمام تفصیلات معلوم کرنا تھیں۔ وہ بہت جادو دکھا چکا تھا اور اب اس کے غائب ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

یہ ساحلِ سمندر کا خوب صورت حصہ تھا جہاں عام افراد کا داخلہ ممنوع تھا۔ اسے بین الاقوامی طرز پر تیار کیا گیا تھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر لاؤنج چیئرز موجود تھیں۔ جن کے ساتھ بمبو کی بنی ہوئی چھوٹی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر خوب صورت ولا نما کاٹیجز بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک قدرے بڑا اور بہت شاندار نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کاٹیج کے پتھروں سے سجے ورانڈے میں اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کے پسندیدہ مشروب کا مخروطی گلاس تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ طویل القامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ گھنگریالے سیاہ بال اس کی شخصیت پر جچ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی داڑھی تھی۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا البتہ اس کی آنکھیں اس کی سفاک طبیعت کی عکاسی کر رہی تھیں۔

وہ طارق شہریار تھا۔ اسے شاہانہ انداز سے رہنا پسند تھا اور اس کے لیے اس کے پاس بے حساب دولت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سے زیادہ تر پیسا یا تو چوری کیا گیا یا اس نے طاقت کے بل پر حاصل کیا تھا یا پھر وہ رقم اسے لوگوں کا خون بہانے کے عوض حاصل ہوئی تھی۔ اسے پیسے سے پیار تھا اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ دنیا میں ایسے لوگوں اور طاقتوں کی کمی نہیں تھی جنہیں اپنے ''مسائل'' کے حل یا ''مقاصد'' کے حصول کے لیے اس کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور اسے ملکی اور بین الاقوامی طور پر اس کے فن کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ فی الحال اس نے ایک چھوٹے سے معاملے میں ''کنسلٹینسی'' کی تھی۔ ملتان میں دھماکوں کے عوض اسے اچھی خاصی رقم ہاتھ لگی تھی اور ایک کامیاب دھمکی کے نتیجے میں اس کے ''کلائنٹ'' کو ہوٹل میں اپنے حصے سے زیادہ مل گیا تھا۔

وہ ٹہلتا ہوا ولا میں داخل ہوا۔ شاہانہ انداز میں سجے کمرے کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ سامنے میز پر اس کا لیپ ٹاپ موجود تھا۔ طارق نے لیپ ٹاپ کھول کر واٹس ایپ کھولا۔ یہ ان کا خاندانی گروپ تھا جس میں وہ اور اس کا بھائی شامل تھے۔ پاس ورڈ ڈال کر وہ گروپ کو اوپن کر پایا تھا۔ اسے خفیہ انداز میں کام کرنا پسند تھا، اس سے اسے تھرل ملتی تھی۔

''چیتا جنگل میں گیا ہے۔'' اس نے پیغام ٹائپ کیا اور اسے بھیج دیا۔ چند لمحوں بعد اسے جواب موصول ہو گیا تھا۔

''جنگل کی کٹائی کر دی گئی ہے۔'' پیغام پڑھ کر وہ مسکرایا۔ اس کے بھائی کا سینس آف ہیومر غضب کا تھا۔ افسوس..... مگر پھر بھی اسے اس کو مارنا ہی تھا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی اسد خان ٹریڈ مل پر دوڑ رہا تھا۔

ان سالوں میں اس کی صرف زندگی اور رہن سہن کا طریقہ ہی نہیں بدلا تھا بلکہ وہ پورا ہی بدل گیا تھا۔ اس کے جسم پر موجود تمام اضافی وزن چھٹ چکا تھا۔ اب وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹا نظر آتا تھا اور پہلے سے بہت زیادہ چاق و چوبند بھی..... کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کہ اگر اس کا سابقہ باس اسے دیکھ لیتا تو کم از کم وہ بے ہوش ضرور ہو جاتا۔

اس کے اور ڈپارٹمنٹ کے لیے اسد خان چار سال پہلے مر چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نہ صرف زندہ تھا بلکہ کسی بادشاہ کے مانند رہ رہا تھا۔

چار سال قبل ایک مجرم سے ٹکراؤ میں وہ شدید زخمی ہو گیا تھا جس کے بعد مشن محافظ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا، اس کے بعد سے وہ مشن کا حصہ تھا۔

بالآخر وہ ٹریڈمل سے اتر آیا۔ گردن میں پڑے چھوٹے تولیے سے اس نے پسینا صاف کیا پھر پانی کی بوتل ہاتھ میں لے کر صوفے پر آ بیٹھا۔ سامنے لیپ ٹاپ کے اسکرین کے روشن ہوتے ہی اسے طارق شہریار نظر آیا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ اسد گزشتہ مہینے بھر سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے اس ولا میں وہ کئی جگہ کیمرے لگا چکا تھا اور اب وہ اس پر پوری کتاب لکھ سکتا تھا۔ مشن محافظ دہشت گردی کی ایک واردات کے بعد اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

”یہ...... یہ کیا کر رہا ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔

طارق سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ولا سے جا رہا تھا۔ اسد بھی لپک کر الماری کی طرف بڑھا اسی دوران میں اس کا فون بج اٹھا۔

”ہیلو......“ اس نے فون کان سے لگایا۔

دوسری جانب کوئی خاتون تھیں جو اسے ریٹائرمنٹ پلان بیچنے پر بضد تھیں۔

”دیکھیے میڈم میں کوئی پلان نہیں لے سکتا۔“ وہ بالآخر سرسراتی آواز میں بولا۔ ”میرے لیے یہ سب چیزیں بیکار ہیں۔“

”کیوں سر......؟“ وہ بولی۔

”کیونکہ مجھے مرے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔“ وہ پُراسرار انداز میں بولا اور فون بند کر دیا۔

فون رکھ کر وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوا مگر اب طارق کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسد نے مختلف کیمرے چیک کیے مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اسد اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

☆☆☆

”جادوگر“ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا، اس کے ہاتھ میں ایک لمبے پھل والا چاقو تھا اور پھر اس نے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاقو تیمور کے سینے میں اتار دیا۔

تیمور اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

”یہ...... یہ...... میں نے کیا دیکھا؟“ اس نے سوچا۔

ایسا اس کے ساتھ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ اس کے اس طرح کے خواب یا ایسے منظر جو وہ لمحہ بھر میں دیکھ لیتا تھا اکثر سچ نکلتے تھے بقول سلیمان صاحب یہ اس کے لیے قدرت کی جانب سے تحفہ تھا۔

اسے اپنی سانس درست کرنے میں ایک لمحہ لگا تھا۔ وہ اس وقت ایک بڑی کار میں تھا جو جادوگر کے دفتر سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ وہ سات بجے کے قریب اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر اب اس منظر نے اس کی نیند پوری طرح اُڑا دی تھی۔ اُسے محتاط رہنا تھا۔

تیمور نے جیب سے سلور 45 نکالا، یہ ایک چھوٹا مگر بہترین ہتھیار تھا۔ اس نے ریوالور کے آہنی لمس کو محسوس کیا اور پھر مسکرا دیا۔

☆☆☆

طارق شہریار جہاز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ہوائی سفر ہمیشہ سے ناپسند تھا مگر انجن کی طاقتور آواز اسے اچھی لگتی تھی۔ اسے طاقت سے محبت تھی اور آج اس کے پاس بہت طاقت تھی مگر شروع سے زندگی اس پر اتنی مہربان نہیں تھی۔ اس کا تعلق ایک بہت غریب خاندان سے تھا۔ اس کا باپ مویشی پالنے اور بیچنے کا کام کرتا تھا۔ وہ انتہائی غصیلی طبیعت کا مالک تھا۔ طارق نے اسے بچپن سے اپنی ماں اور ان سب پر ہاتھ اٹھاتے دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی میں گھر میں سناٹا چھایا رہتا تھا۔ وہ چھ سال کا تھا جب اس کی ماں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ باپ کے ساتھ بھیڑ بکریاں سنبھالتا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر روزانہ پٹنا اس کا معمول تھا۔ وہ اکثر کھلی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل کر دینے کے خواب دیکھا کرتا مگر عملی طور پر یہ ناممکن تھا۔ طارق کو آج بھی وہ رات یاد تھی جب وہ بدل گیا تھا۔ اس نے پہلی بار طاقت کو اس انداز میں محسوس کیا تھا۔ اس شام بھی ابا نے اسے مارا تھا۔ وہ رات میں بھیڑوں کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ اس رات غصہ اس کی رگ رگ میں پھنکار رہا تھا۔ اس کی نظر اپنے قریب بیٹھی بھیڑ پر پڑی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے بھیڑ کی گردن پوری طاقت سے موڑ دی۔ جب کافی دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اس کے ہاتھ اور کپڑے خون سے لال ہو رہے تھے۔ اس کے اردگرد خون ہی خون تھا۔ بھیڑ کی حالت ایسی تھی جیسے اسے کسی درندے نے چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ وہ یکلخت خوف زدہ ہو گیا اور دوڑتا ہوا نہر کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے جسم سے خون کے داغ صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل رو رہا تھا۔ یہ سب اس کے باپ کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو یقین دلا رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دل و دماغ کو بہت تسکین بھی ملی تھی۔ پہلی بار اسے لگا تھا کہ وہ طاقتور ہے۔ اس نے خود کو لعن طعن کی۔ اسے

یقین تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا مگر ہوا اس کے برعکس...... یہ سلسلہ رک نہیں پایا تھا۔

12 سالہ طارق ہر رات خون بہانے لگا تھا۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ یہ کسی بھیڑیے کا کام ہے مگر کوئی بھیڑیا ہوتا تو ملتا...... اپنے مویشی کم پڑنے لگے تو طارق نے آس پاس کے مویشی مارنے شروع کر دیے مگر اس کی پیاس بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ گاؤں میں لوگوں نے مویشی مارنے والے جانور کو سرخ چیتا کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے کوئی بدروح قرار دیتے تھے۔

''سر......'' ائرہوسٹس کی آواز اسے ماضی سے حال میں کھینچ لائی۔

''آپ کچھ لینا پسند کریں گے؟'' وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں طارق کے لیے پسندیدگی نمایاں تھی۔

''ضرور......'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ''آپ کے ہاتھ سے تو کچھ بھی...... ہاں اگر ممکن ہو تو بلیک کافی......''

''ضرور......'' ائرہوسٹس کا چہرہ چمک اٹھا۔

فلائٹ ختم ہونے تک وہ ائرہوسٹس کا نام، نمبر حاصل کر چکا تھا۔ سرخ چیتے کو اپنا نیا شکار مل گیا تھا۔

☆☆☆

اسد نے محتاط انداز میں دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے کوریئر سروس والا موجود تھا۔ اسد نے گہری سانس لی۔

''سر! آپ کا پیکٹ ہے۔'' وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

اسد نے شیٹ پر دستخط کیے اور پیکٹ لے کر اندر آگیا۔

''اس میں ہے کیا......؟'' اسد نے میز پر پیکٹ رکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے وہ پیکٹ کا کور پھاڑ چکا تھا۔ اندر ایک سی ڈی تھی اس کے ساتھ ایک خط تھا جس پر چند سطریں تحریر تھیں۔

''یہ طارق شہریار کی فائل ہے...... وہ بہت خطرناک ہے اور یقیناً کسی بڑے چکر میں ہے، تمہیں محتاط رہنا ہو گا...... اور ہاں تم اب بھی دنیا کے لیے مرحوم ہی ہو......''

''اور جیسے مجھے اس بات کا علم نہیں ہے......'' اسد بڑبڑایا اور لفافے میں موجود دیگر اشیا پر نظر ڈالی۔ اس میں اس کا نیا پاسپورٹ اور ایک اے ٹی ایم کارڈ موجود تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ معلومات اسے مشن کی طرف سے بھجوائی گئی ہیں۔ طارق یہاں سے جا چکا تھا مگر وہ اس کی دسترس سے باہر نہیں تھا کیونکہ اس نے طارق کے ولا میں کام کرنے والی جز وقتی ملازمہ کے ذریعے اس کے والٹ میں ایک چپ چپاں کروائی تھی جس کی وجہ سے اس کی نقل و حرکت سے آگاہ رہنا ممکن ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے لیے دو گھنٹے بعد کی فلائٹ بک کی...... وہ جانتا تھا کہ طارق کہاں گیا ہے۔ اس دوران اس نے وہ سی ڈی دیکھی۔ اس میں طارق شہریار اور اس کے جرائم کے متعلق کافی معلومات موجود تھیں۔ وہ چند بار پکڑا بھی گیا تھا مگر ہر بار کچھ بھی ثابت نہ ہونے کی وجہ سے چند گھنٹوں میں پھر سے آزاد ہوتا تھا۔

اگلے چند گھنٹوں میں وہ اس کا سامنا کرنے والا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ طارق کو حیران کر دے گا۔

☆☆☆

''تو تمہارا خیال ہے کہ تمہارے پاس میرے کام کی کوئی خاص چیز ہے؟'' پرویز نے تیمور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پرویز جادوگر کا اصلی نام تھا۔ تیمور اس وقت اس کے دفتر کم ریسٹورنٹ جو اصل میں ایک اعلیٰ قسم کا جواخانہ بھی نظر آ رہا تھا میں موجود تھا۔ پرویز چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد اور بھاری جسامت کا مالک تھا اور چہرے پر بلا کی کرختگی تھی۔ وہ اپنی میز کے پیچھے گھومنے والی شاندار سی کرسی میں پھنسا بیٹھا تھا۔ اس کا دفتر ایک بڑے سے کمرے پر محیط تھا جس میں میز کرسیوں کے علاوہ...... بڑا سا سیاہ صوفہ سیٹ، میز، قیمتی قالین موجود تھے۔ کمرے میں انٹیک مجسمے اور سامان سے سجاوٹ کی گئی تھی جو جادوگر کے پرانی اشیا میں دلچسپی کو ظاہر کرتا تھا۔ کمرے میں سب سے زیادہ منفرد چیز اس کے پیچھے موجود دیوار تھی جس پر اوپر سے نیچے تک اخبار کی مختلف کٹنگز پر مبنی وال پیپر بنایا گیا تھا۔ تیمور کی پہلی نظر اسی پر پڑی تھی۔

''دولت مند جوڑے کا پُراسرار قتل...... بم دھماکے میں 32 افراد ہلاک۔ شہر سے دو دنوں میں 7 بچوں کا اغوا، 19 سالہ لڑکی بازار سے اغوا کر لی گئی۔ شہر کا بڑا بینکر اپنے والٹ میں مردہ پایا گیا۔''

اس نے اپنے جرائم کو پورٹ فیلیو بنا کر وہاں اس کی باقاعدہ پریزنٹیشن کی تھی۔

''اور ہاں......'' اس سے پہلے کہ تیمور اس کی بات کا جواب دے پاتا، وہ دوبارہ بولا۔ ''وہ خبر میرے کام کی ہونی چاہیے کیونکہ میں یوں کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ اپنے پاس اتنا ٹائم ہے ہی نہیں...... تم نے ملاقات کی جو قیمت ادا کی ہے، مجھے وہ طریقہ اچھا لگا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے

کہ تم اصل کام چاہتے ہو...... تو بولو بات ہے کیا؟" وہ میرے پیچھے کھڑے گارڈ کو کمرے سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ گارڈ اشارہ پاتے ہی کمرے سے نکل گیا تھا اب وہ اور تیمور کمرے میں اکیلے تھے۔

مشن نے اس ملاقات کے لیے جادوگر کو پانچ لاکھ روپے ایڈوانس دیے تھے اور اس سے بزنس میٹنگ کا وقت مانگا تھا۔ مچھلی نے چارا نگل لیا تھا اور جواب میں ملاقات کے لیے وقت اور جگہ سے مطلع کر دیا تھا۔ اب اس کے آگے کام کو سنبھالنے کی ذمے داری تیمور کی تھی۔ وہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ دو جگہ تلاشی کے باوجود وہ اپنے 45. کو اس کمرے میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"بات تو بہت اہم ہے......" تیمور کے تصور میں بچوں کی نچی ہوئی لاشیں گھوم رہی تھیں جو اس نے اس کے ریکارڈ فائل میں دیکھی تھیں۔ "میں یہاں اصل میں تمہیں تمہارے مستقبل کے بارے میں بتانے آیا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، اسے اندازہ تھا کہ جادوگر اس کی اس حرکت پر سیخ پا ہو جائے گا اور یہی اس کا مقصد تھا۔ وہ اسے اتنا غصہ دلا دینا چاہتا تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔

"تمہارا مستقبل پتھر پر تحریر ہو چکا ہے جادوگر۔" اس بار اس نے اسے اس کی عرفیت سے پکارا، اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ جادوگر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "تمہیں معلوم ہے آج کی رات تمہارے گناہوں کی سزا کی رات ہے۔"

اس سے پہلے کہ تیمور کا جملہ مکمل ہوتا، جادوگر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس کا رخ تیمور کی جانب تھا۔ تیمور اس کی جانب سے ایکشن کا ہی منتظر تھا۔ اس لیے اس نے مڑتے ہوئے 45. کا ٹریگر دبایا۔ پہلا بلٹ جادوگر کے ہاتھ پر لگا جس سے ریوالور دور جا گرا جبکہ دوسرا بلٹ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ لمحے بھر کو ساکت ہوا پھر اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے اپنی کرسی پر گرا، کرسی اس کے بھاری وجود کا وزن سہہ نہیں پائی تھی وہ الٹے منہ زمین پر جا کر گرا تھا۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔ تیمور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ لپکا۔ جادوگر نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں تیمور نے اپنا 45. اس کی گردن پر رکھ دیا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے تیمور کو گھورا۔ تیمور دوبارہ گولی چلانے سے قبل تھوڑا جھکا، اس کے کان میں دھیرے سے بولا۔ "جہنم کا ٹکٹ مبارک ہو۔" اور پھر گولی چلا دی۔

☆☆☆

صالحہ سیف بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔

وہ بہت خوب صورت تھی اور اس وقت نائٹ بلب کی انتہائی مدھم روشنی میں اس کا سرخ و سپید چہرہ دمک رہا تھا۔

طارق اس کے سامنے کھڑا اسے محویت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہی ائر ہوسٹس تھی جو اسے فلائٹ پر ملی تھی۔ اس فلائٹ کے بعد اس کی دو دن کی چھٹیاں تھیں۔ اس نے خود ہی طارق کو اپنے اپارٹمنٹ چلنے کی دعوت دی تھی جسے اس نے اس کے اصرار پر بہ خوشی قبول کر لیا تھا۔ طارق اس وقت خاصا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

صالحہ کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں اس نے طارق کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے والد اسٹیٹ ایجنٹ تھے۔ والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر خود وہ کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ ایف اے کے بعد اس نے والدین سے لڑ جھگڑ کر ائرلائن جوائن کر لی تھی۔ ملک کی نامور اداکارہ بننا اس کا خواب تھا۔

"خوابوں کی تعبیر اکثر الٹی ہوتی ہے۔" طارق نے سوچا۔ "لیکن ہر تعبیر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کا خواب بھی ہوتی ہے۔" وہ آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ صالحہ کی میٹھی نیند میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خاموشی سے اس کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔

رات ہو چکی تھی مگر باہر زندگی ابھی جوان تھی۔ طارق کو اپنے اندر وہی درندہ جاگتا محسوس ہو رہا تھا جس کی پیاس صرف خون ہی بجھا سکتا تھا۔ اسے اپنے اردگرد آتے جاتے لوگ خود سے بہت چھوٹے اور کیڑے مکوڑوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ "وہ جب چاہے انہیں کچل سکتا تھا۔" اس نے سوچا۔ طاقت کے اس احساس نے اس میں ایک عجیب سا تفاخر پیدا کر دیا۔

عموماً طارق جیسے لوگ باڈی گارڈ کی فوج کے بغیر حرکت نہیں کرتے تھے۔ اس سے ان کی دہشت بڑھتی تھی مگر اسے اکیلا رہنا پسند تھا۔ "وہ چیتا تھا اور چیتا اکیلا شکار کرتا ہے۔" اس نے سوچا اور مسکرایا۔

پھر جیب سے موبائل نکال کر اپنے لیے گاڑی منگوائی۔ ایسے کاموں کے لیے اس کے پاس ایسے کئی فیک اکاؤنٹ موجود تھے جہاں سے اس تک کسی صورت پہنچا نہیں جا سکتا تھا۔ کار آنے کے بعد اس کا رخ شہر کے ایک

بہترین ہوٹل کی طرف تھا۔

وہ کار کی کھڑکی سے اردگرد گزرتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ گاؤں میں ان کی زندگی اس زندگی سے بہت مختلف تھی۔ وہ ضرورت کے وقت ہی لالٹین جلا پاتے تھے اور یہ لوگ کس طرح بیدردی سے روشنی کو برت رہے ہیں۔ اس نے ناک سکیڑ کر سوچا اور سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

بھیڑ، بکریوں، گائے اور دیگر جانوروں کے بعد اس کا پہلا شکار گاؤں کا ایک نوجوان بنا تھا۔ اس رات وہ کسی مویشی کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا تاکہ اپنی بے چینی دور کر سکے مگر گاؤں والے مسلسل نقصان کے بعد بہت محتاط ہو گئے تھے۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر کھیتوں کے درمیان سے واپس جا رہا تھا کہ اسے وہاں وہ لڑکا نظر آیا۔ وہ غالباً کسی ضرورت کے تحت گھر سے نکلا تھا۔ طارق نے ایک لمحے سوچا پھر کسی چیتے کے مانند اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنے پاس ایک تیز دھار چاقو رکھتا تھا۔ اس نے اس لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک ہی وار میں اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی تھی۔ وہ زمین پر گر کر چند لمحے تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ یہ اس کے لیے ایک الگ ہی تجربہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد پہلی بار اسے تین روز تک شکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس دن کے بعد سے اسے مویشیوں کا خون بہانے میں لطف آنا بند ہو گیا تھا۔ یہ لطف اب ایک پیاس میں ڈھل گئی تھی جو اسے بے تاب کر دیتی تھی۔

''سر! ہوٹل آ گیا ہے۔'' ڈرائیور کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور دوبارہ حال میں واپس آ گیا۔

ہوٹل میں اس نے اپنے لیے کونے کی میز پسند کی اور اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا ابھی سرو بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے دو لڑکیوں کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ فیشن ایبل ملبوسات میں ملبوس لڑکیوں کے انداز، ان کے قماش اور ذریعہ معاش دونوں کا پتا دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک قدرے طویل القامت اور سانولی سلونی تھی جبکہ دوسری گوری چٹی اور درمیانی قامت کی تھی۔

''کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟'' سانولی لڑکی نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ آل ریڈی بیٹھ چکی ہیں۔'' طارق نے سپاٹ لہجے میں کہا وہ اس وقت تنہا رہنا چاہتا تھا۔ ''فرمایئے؟''

''فرمانا کیا ہے......'' گوری لڑکی نے مسکرا کر ایک ادا سے کہا۔ ''آپ تنہا اور اداس لگ رہے تھے۔ ہم نے سوچا شاید آپ کو اچھی کمپنی کی ضرورت ہو۔''

''او کے......'' طارق نے مسکرا کر گہری سانس لی۔ ''اگر دو خوب صورت لڑکیاں اس تنہا اور اداس شخص کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے مگر ہمیں اس ملاقات کے اصول پہلے سے طے کر لینا چاہئیں۔''

لڑکیاں اس کی بات پر آنکھیں مٹکا کر مسکرائیں۔

''پہلی بات تو یہ...... ہمیں اچھا وقت گزارنے کے لیے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے جس طرح تم لوگ آئی ہو ویسے ہی واپس چلی جاؤ گی یعنی تنہا اور میرے اصول توڑنے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

ان دونوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا پھر گوری لڑکی شوخی سے بولی۔ ''اگر ہم آپ کے ان اصولوں کو توڑ دیں...... پھر......؟''

''پھر......؟'' طارق نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ ''پھر مجھے تم دونوں کو قتل کرنا پڑے گا۔''

اس کی بات پر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں مگر وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

طارق شہریار کو مذاق کرنے کی عادت نہیں تھی۔

☆☆☆

اسد خان ائرپورٹ سے باہر نکلا۔ گاڑی کرائے پر لینے کے بعد اس نے اپنی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ اس کی یہ گھڑی خاص تھی۔ ایک بٹن دبانے سے اس کی اسکرین پر وقت کی جگہ ایک نقشہ سا آ جاتا تھا جس پر ایک سرخ دھبا جل بجھ رہا تھا۔ اس کی گھڑی میں چمکتا یہ سرخ دھبا درحقیقت طارق کی لوکیشن بتا رہا تھا۔ اس کی ٹریکنگ ڈیوائس کی چپ اس کے والٹ میں لگائی گئی تھی۔

اس چپ کے مطابق وہ اس وقت شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے کی عمارت میں تھا۔ اسد اسے ٹریس کرتا ہوا ایک چار منزلہ عمارت کے باہر اتر گیا تھا۔ عمارت سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور اس میں ہر منزل پر کئی فلیٹس موجود تھے۔ سرخ نقطے کے مطابق طارق پہلی منزل کے دوسرے فلیٹ میں موجود تھا۔

رات خاصی ڈھل چلی تھی۔ بلڈنگ کے فلیٹس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف بیرونی روشنیاں جل رہی تھیں۔ اسد چیتے کی سی تیزی سے سیڑھیوں سے گزرتا ہوا فلیٹ کے سامنے پہنچا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وہ اندر جا کر حالات کا جائزہ لیتا یا پھر اس کے باہر نکلنے کا

انتظار کرتا۔ اصولاً تو اسے دوسرا راستہ اختیار کرنا تھا مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے ڈور ناب کو چھوا اور دروازہ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، یہ کوئی اچھی نشانی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ فلیٹ میں موجود واحد بیڈ روم میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ وہ بیڈ روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ بیڈ پر ایک خوب صورت عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اسد کو یہ سب کچھ بہت غیر حقیقی اور کسی حد تک عجیب لگ رہا تھا۔ اس کے پاس اس کا پولیس کارڈ موجود تھا جو مشن محافظ نے اسے بھجوایا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے بیڈ روم کی لائٹ جلائی۔ بستر پر موجود لڑکی نے اب بھی حرکت نہیں کی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ بستر کے اوپر دیوار پر پڑی جہاں سیاہ مارکر سے ایک عبارت لکھی ہوئی تھی۔

''تم اسے کھیل سمجھ رہے ہو ڈی ایس پی؟''

اسد ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس نے مایوسی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی ہے اسے یقین تھا کہ طارق کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے مگر دیوار پر لکھا پیغام کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور بستر پر لیٹی لڑکی کی جانب توجہ دی۔ اس کے بدترین اندیشے صحیح ثابت ہوئے تھے۔ وہ مر چکی تھی۔ یہ ایک شاندار پھندا بھی ہو سکتا تھا۔ اسد تیزی سے مڑا اور فلیٹ سے نکلتا چلا گیا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد وہ ڈور ناب سے اپنے ہاتھ کے نشان صاف کرنا نہیں بھولا تھا۔ نیچے اتر کر وہ پیدل ہی کمرشل ایریا کی جانب چل پڑا۔ اگلی گلی میں اسے فون کی سہولت دینے والی دکان نظر آئی۔ پہلے یہ شاپس بہت زیادہ ہوتی تھیں مگر موبائل کی آمد کے بعد ان کی ضرورت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے فون اپنی جانب کر کے ایمرجنسی نمبر ملایا۔

''جی فرمایئے۔'' دوسری جانب سے جواب ملتے ہی اس نے ایک جملے میں قتل اور بلڈنگ کا ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ اس علاقے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''میں یہ سب جاننا چاہتا تھا اسی لیے میں پہلے تم سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ اب میری بات کان کھول کر سن لو۔ مجھے یہ چاروں آئل ریفائنریز درکار ہیں ہر قیمت پر......'' طارق ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ اس کے سامنے میز کی دوسری جانب بزنس سیکٹر کا ایک مشہور شخص براجمان تھا۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔

''یہ اتنا آسان کام نہیں ہوگا۔ حکومت نے اس کی اجازت تو دے دی ہے مگر شاید اس شعبے میں مونو پلی بننا ممکن نہ ہو۔ آپ کو اس منصوبے کے لیے بہت کام کرنا پڑے گا۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ ''اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ شاید آپ اپنے نام سے یہ کام نہ کر پائیں...... میرا مطلب ہے کہ آپ کو کور لینا پڑے گا۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہوں...... میں اس کا حل سوچ چکا ہوں۔'' طارق نے کہا۔

''بس پھر تو یقیناً ہم اس پروجیکٹ میں آگے جا سکیں گے۔ ہماری طرف سے آپ کو جلد ہی خوش خبری ملے گی۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

ان کے جانے کے بعد طارق چند لمحے سوچتا رہا۔ تیل آج کی دنیا کی بڑی طاقت تھی۔ اگر وہ ملک میں چار ریفائنریز کا مالک بن جاتا تو پھر وہ حکومت کے ساتھ بات کرنے کی سطح پر آسکتا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ تنویر کی فلائٹ میں ابھی وقت تھا اس نے دیوار پر لگی اسکرین کو آن کیا۔ پہلے ہی نیوز چینل پر اسے اپنے چرچے نظر آئے تھے۔ وہ چینل بدلتا جا رہا تھا مگر ہر نیوز چینل ایک ہی خبر مختلف الفاظ میں بریکنگ نیوز کے دھماکوں کے ساتھ سنا رہا تھا۔

شہر میں ایک ہی دن میں تین عورتوں کا قتل، اُن میں ایک ائر ہوسٹس تھی جسے گلا گھونٹ کر اس کے اپنے گھر میں قتل کیا گیا اور دوسری دو لاشیں دو کال گرلز کی تھیں۔ یہ لاشیں بہت بُری حالت میں ایک کچرے دان سے ملی تھیں۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ کسی ایک ہی سیریل کلر کا کام ہو سکتا ہے۔ ماہرین اس قاتل کے نفسیاتی مسئلوں پر روشنی ڈال رہے تھے اور تمام ہی چینل بحیثیت مجموعی پولیس ڈپارٹمنٹ کی نالائقیاں گنوا رہے تھے۔

طارق نے بور ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔

اسے اپنے پلان پر غور کرنا تھا۔ آنے والے دن اس کے لیے بہت اہم تھے۔

☆☆☆

طارق ائرپورٹ پہنچا تو اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ اس کا آج کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ وہ تقریباً ایک سال بعد اپنے بھائی سے ملنے والا تھا۔

''بھائی......'' اس نے دہرایا اور پھر مسکرایا۔

تنویر شہریار اس کا بڑا بھائی تھا۔ اس سے صرف دو سال بڑا۔ جب اسے قتل اور اسی قسم کے دوسرے معاملات کے چھوٹے کنٹریکٹس کو چھوڑ کر بڑے کیس ملنا شروع ہوئے

تو آنے والے بے حساب کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے اس نے کاروبار کا فیصلہ کیا۔ تنویر اس کے اس کاروبار کو سنبھالتا تھا۔ آج وہ کاروبار بھی اس کے لیے کروڑوں کما رہا تھا۔

تنویر دیکھنے میں بالکل اس جیسا تھا مگر ان دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کے گھر کے ماحول اور باپ کے رویے نے جہاں طارق کو خونخوار چیتا بنا دیا تھا وہاں تنویر دبتا چلا گیا تھا مگر کاروبار میں اس کا ذہن خوب چلتا تھا اور طارق نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ باہر نکلتے ہی اسے تنویر نظر آ گیا۔

''طارق تمہیں بہت دن بعد دیکھا۔ تم بالکل میرے جیسے لگ رہے ہو۔'' وہ اس سے ملنے کے بعد بولا۔

''ہاں، یا یہ کہ تم میرے جیسے لگ رہے ہو۔'' طارق مسکرایا۔ ''تمہاری فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی۔''

''ہاں، میں ہوٹل بک کرا لیتا مگر تم نے منع کیا تھا۔''

''ہاں وہ میں کرا چکا ہوں، باہر کار ہماری منتظر ہے، ہم ہوٹل ہی چل رہے ہیں۔''

''مگر طارق بات کیا ہے؟ تم نے مجھے اس طرح یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''کچھ کاروباری معاملات طے کرنے ہیں اور کچھ سلجھانے ہیں مگر تم اپنے دماغ کو اتنی زحمت کیوں دے رہے ہو؟ میں ہوں نا......'' طارق نے پوچھا۔

''ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔ میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

''تم نے یہاں آنے کے بارے میں کسی سے بات تو نہیں کی؟'' کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں...... جیسا تم نے کہا تھا، ویسا ہی کیا ہے۔ میرے یہاں آنے کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے یوں بھی اب تمہارے علاوہ میرا کون ہے۔ دوست تو میں ویسے بھی نہیں بناتا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

وہ تھوڑی سی دیر میں طارق کے ہوٹل پہنچ گئے۔

''تم لابی میں بیٹھو اور جب میں تمہیں کال کروں خاموشی سے کمرے میں آ جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' تنویر نے کہا۔ ''مگر مسئلہ کیا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں، تم جانتے ہو کہ میرے کتنے دشمن ہیں۔'' طارق نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد دونوں کمرے میں تھے۔

''تنویر تمہیں یاد ہے کہ ہم بچپن میں بطخ پکڑنے تالاب پر جایا کرتے تھے؟'' طارق نے اچانک پوچھا۔

''ہاں۔'' تنویر اس کے اس سوال پر حیران سا ہو کر بولا۔

''ہم تالاب کے ٹھنڈے پانی میں گھس کر بطخ کے قریب آنے کا انتظار کرتے تھے؟''

''ہاں، مگر ہم کبھی بطخ کو پکڑ نہیں پائے تھے۔'' وہ بولا۔

''نہیں...... ایسا نہیں تھا۔'' طارق ترچھی نظروں سے بھائی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم انتظار کرتے تھے پھر تم تھک کر گھر چلے جاتے تھے مگر میں وہیں انتظار کرتا رہتا تھا...... میں اس وقت تک تالاب میں چھپا رہتا جب تک میرے ہاتھ کوئی موٹی بطخ نہیں لگ جاتی۔ پھر جانتے ہو میں کیا کرتا تھا؟ میں اسے وہیں ذبح کر کے آگ جلا کر بھون کر کھا جاتا...... کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب میں ساری محنت کرتا تھا تو اسے پورا کھانا میرا ہی حق تھا...... ہے نا؟''

تنویر جواب میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طارق یہ سب کیوں کہہ رہا ہے پھر یک دم اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں...... طارق کے ہاتھ میں 22. ریوالور تھا جس میں سائلنسر فٹ تھا۔ ریوالور کا رخ اس کی پیشانی کی جانب تھا۔

''یہ کک...... کیسا مذاق ہے......؟'' وہ بمشکل بولا۔

''یہ مذاق نہیں ہے بھائی...... کھیل میں تمہارا کردار ختم ہو گیا ہے۔'' طارق مسکرایا اور اس سے قبل کہ وہ جواب دے پاتا یا کچھ بھی کر پاتا، اس نے ٹریگر دبا دیا۔

تنویر کی آنکھوں میں خوف گویا ساکت ہو گیا تھا۔ گولی نے اس کی پیشانی کا کچھ حصہ ہی اُڑا دیا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ خون میں تر ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کو لہرایا پھر کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین پر آ گرا۔

طارق نے جھک کر بھائی کی لاش پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ اس کے گال تک آ گیا تھا۔ وہ دنیا میں شاید اس سے سب سے زیادہ قریب تھا مگر اب اسے سب کچھ اکیلے سنبھالنا تھا اور اپنا مقصد حاصل کرنا تھا۔ اپنی بقا اور فائدے کے لیے وہ اپنے بھائی کی لاش سے گزرنے کو تیار تھا۔

اس نے تنویر کا بٹوا نکال کر اپنا بٹوا اس کی جیب میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے جیب سے چاقو نکالا اور اپنی انگلیوں اور انگوٹھوں کے.... پوروں کی جلد اتارنے لگا۔ یہ

آسان کام نہیں تھا مگر وہ طارق شہر یار تھا۔ اس کا جنون اس سے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ تکلیف کی شدت اسے کراہنے پر مجبور کر رہی تھی مگر وہ اپنے فنگر پرنٹس نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اتاری ہوئی جلد اس نے فلش میں بہادی تھی۔ ضروری بینڈیج کے بعد اس نے اپنی گھڑی، انگوٹھی اور دیگر تمام شناختی چیزوں کو تنویر کی چیزوں سے بدل لیا تھا۔

تنویر کا چہرہ پہلے ہی گولی کی وجہ سے مسخ ہو چکا تھا۔ طارق شہر یار اپنا بریف کیس نکالتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے ذہن میں اگلے روز کے اخبارات کی سرخیاں لہرا رہی تھیں۔

مافیا ڈان طارق شہر یار کا پُراسرار قتل۔

ڈان مارا گیا۔

طارق شہر یار کو اس کے کمرے میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

ایک قصہ ختم ہوا...... وہ مسکرایا...... مگر ابھی ایک کام نمٹانا باقی تھا۔ اس نے فون اٹھا کر اپنی کراچی کی ٹکٹ کی تصویر اتاری اور اسے اپنے ہی دوسرے نمبر پر سینڈ کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا عام واٹس ایپ ڈی ایس پی نے ٹیگ کر رکھا تھا، یہ تصویر لمحے بھر میں اس کے پاس پہنچ گئی ہوگی۔ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ کیسے اور کہاں پہنچنے والا تھا، یہ صرف طارق ہی جانتا تھا۔

وہ بریف کیس اٹھا کر عقبی زینوں کی جانب بڑھ گیا، اس کا سوٹ کیس اس سے پہلے ہی ائر پورٹ پہنچ چکا تھا۔

سیاہ لمبی کار ریسٹورنٹ لولاز کے سامنے رکی تھی۔ یہ شہر کے پوش علاقے کے چند مشہور اور بہترین ریسٹورنٹس میں سے ایک تھا۔ شام کے اس پہر وہاں کافی رش تھا۔ کار رکتے ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور چھوٹے قد کا موٹا سا شخص باہر نکلا۔ اس نے ڈرائیور کی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے لپک کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور ایک دبلا پتلا لمبا سا شخص باہر نکلا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے اور چہرے پر تکبر کی گہری چھاپ تھی۔ اس کا نام شمس الدین تھا۔ وہ ملک کی سب سے بڑی آئل ریفائنری کے سب سے زیادہ شیئرز کا مالک تھا۔ ڈرائیور کے واپس اندر بیٹھنے سے قبل ہی پسنجر سیٹ سے شمس الدین کا باڈی گارڈ باہر نکل آیا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا، کسرتی جسامت اور عقابی نگاہوں کا مالک نظر آ رہا تھا۔ وہ لپک کر شمس الدین سے آگے بڑھا اور ریسٹورنٹ کا دروازہ کھول کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

طارق ان سے کچھ پیچھے اپنی کار میں بیٹھا انہیں ریسٹورنٹ میں داخل ہوتا دیکھ رہا تھا۔ طارق ان کے لیے امتیاز شاکر بنا تھا۔ شمس الدین سے طارق کو بہت کچھ درکار تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی قسم کے لوگوں سے ملنے کے لیے وجہ بھی بہت خاص ہونی چاہیے۔ اس کے لیے وہ چارا ڈال چکا تھا اور مچھلی لالچ کے جال میں پھنس چکی تھی۔ اس کا ایجنٹ ان سے سارا معاملہ طے کر چکا تھا۔ آج انہیں صرف ڈیل فائنل کرنی تھی۔

طارق اس وقت قدرے مختلف گیٹ اپ میں تھا۔ اس کے بال لمبے اور پشت سے ربر بینڈ میں جکڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی جبکہ اس کی بھوری آنکھیں اس وقت نیلی نظر آ رہی تھیں۔ اس حلیے میں وہ کوئی اطالوی باشندہ نظر آ رہا تھا۔

چند لمحے انتظار کے بعد وہ بھی کار سے نکلا، اس کے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس تھا اور جسم پر ارمانی کا سیاہ سوٹ...... وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا اور شاہانہ انداز میں چلتا ہوا شمس الدین کے سامنے جا بیٹھا۔

”ہیلو“ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”آپ بہت بہترین لگ رہے ہیں، میں نے آپ کی بہت تعریف سن رکھی تھی۔“

شمس الدین ہونٹ کے ایک کونے سے ہلکا سا مسکرایا مگر جب وہ بولا تو اس کا چہرہ.... اور آواز دونوں بے تاثر تھے۔

”آپ نے مزید کہا تھا کہ آپ کے پاس میرے لیے شاندار ڈیل ہے اور آپ کے ایجنٹ کے مطابق وہ وہی ہے جو مجھے درکار ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں فوراً کام کی بات کرنا چاہیے، میں آپ کا یا اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

”وقت ضائع کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ اسے کسی بھی صورت میں دوبارہ کمایا نہیں جا سکتا۔“ طارق مسکرایا اور اس نے جھک کر اپنا بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھا۔ شمس الدین کا گارڈ چوکس انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”مجھے اس معاہدے کے مطابق آپ کی ریفائنری کے تمام شیئرز اور اکاؤنٹس میں موجود رقم درکار ہے۔ اس کے بدلے میں آپ کو وہ طاقت ملے گی جو آپ چاہتے ہیں۔“

شمس الدین اس کی بات پر ہنس پڑا، اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ”یہ سب تمہیں اسی صورت میں مل سکتا ہے جب تمہارا سودا مجھے پسند بھی آئے؟“

”اس کا مجھے یقین ہے۔“ طارق اعتماد سے بولا اور

بریف کیس سے ایک موٹا سا فولڈر نکالا۔ بارہ نیوکلیئر پاور پلانٹس کی ملکیت کا معاہدہ اس فولڈر میں موجود تھا۔ اس نے وہ معاہدہ شمس الدین کی طرف بڑھایا۔ ”اس کے ہر صفحے پر دستخط کیجیے اور آپ کے پاس دنیا کو اُڑا دینے کی طاقت آ جائے گی۔“

شمس الدین معاہدے کے تفصیلی مطالعے کے بعد مطمئن انداز میں مسکرایا۔ ”وہ نیوکلیئر بم بنانا چاہتا تھا اس کے پاس اس کے گاہک موجود تھے اور جو کچھ اس کے سامنے تھا، وہ واقعی اس کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ اس کی آنکھ کے اشارے پر ڈرائیور نے ہاتھ میں پکڑا لیپ ٹاپ میز پر رکھ کر آن کیا اور اکاؤنٹ کھول کر ٹائپ کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر میں رقم اور شیئرز آن لائن طارق کے مختلف ناموں سے بنائے گئے پانچ اکاؤنٹس میں ٹرانسفر ہو گئے تھے۔ ٹرانسفر مکمل ہونے کے بعد طارق نے فون پر کنفرمیشن کی۔ اس کا کام ہو گیا تھا۔

”آپ سے کاروبار کر کے اچھا لگا۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

شمس الدین مسکرایا۔ اس نے غالباً اپنے کسی ماتحت کو معاہدے کے حوالے سے ہدایات دینے کے لیے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

طارق نے اچانک جیب سے 9 ملی میٹر لوگر پسٹل نکالا اور موٹے ڈرائیور کو شوٹ کر دیا۔ اس نے یہ کام اتنی تیزی سے کیا تھا کہ ڈرائیور کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ وہ وہیں تڑپ کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ طارق نے رکے بغیر اسی لمحے گارڈ کو نشانہ بنایا جو دو قدم پیچھے الٹ کر گرا تھا پھر طارق مڑا اور شمس الدین ..... کے چہرے پر دو گولیاں چلائیں۔ ہال میں اب فائرنگ کی ہلکی ہلکی آواز اور لوگوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ طارق مڑا، اس نے ہوائی فائر کیا اور سرسراتی ہوئی سرد آواز میں چلّایا۔ ”ہر ایک...... سب کے سب نیچے بیٹھ جاؤ ورنہ آج تم میں سے کوئی زندہ نہیں جا سکے گا۔“ کمرے میں موجود تمام افراد نے اس کی ہدایات پر فوراً عمل کیا تھا۔

”گڈ ...... میں جا رہا ہوں۔ پانچ منٹ تک کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔“ اچانک اس کی نظر کونے میں کھڑے بیس بائیس برس کے لڑکے پر پڑی جس کے ہاتھ میں موبائل تھا وہ غالباً اس منظر کی ویڈیو بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ طارق اس کی جانب مڑا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک تیز چیخ کے ساتھ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

”کیا کوئی اور مرنا چاہتا ہے؟“ طارق نے غرا کر پوچھا۔ ”کسی کو کسی بھی قسم کی مزید ہیروگیری کرنی ہے؟“
ہال میں مکمل سکوت طاری تھا۔

”ہوں......“ وہ مسکرایا پھر اس نے زمین پر پڑے معاہدے کو اٹھا کر بریف کیس میں ٹھونسا اور بولا۔ ”اگر تم میں سے کسی نے پولیس، میڈیا یا کسی سے بھی آج کے واقعے کے بارے میں کچھ بھی کہا تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا اور اس کو اور اس کے خاندان کے ساتھ ختم کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے اور میرا مشورہ یہ ہے کہ مجھے آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ اسے اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہونے میں چند لمحے ہی لگے تھے۔

☆☆☆

جادوگر کے خاتمے کے بعد آج تیمور کا دفتر میں پہلا دن تھا۔ وہ سلیمان صاحب کے کمرے میں ان کے سامنے موجود تھا۔

”تم ٹھیک ہو......؟“ انہوں نے ناک کی پھننگ پر رکھی عینک کے اوپر سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ان کے سامنے میز پر ایک موٹا سا فولڈر رکھا تھا جس پر طارق شہریار لکھا ہوا تھا۔

”جی بالکل۔“ تیمور بولا۔

”تیمور! اسد خان آج کل طارق کے کیس پر کام کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ طارق بہت بڑا عفریت ہے اور جو کچھ معلوم ہو رہا ہے اس کے مطابق وہ روز بروز خطرناک اور طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ آج کل نیوکلیئر اور آئل کے سیکٹر کی جانب متوجہ ہے اور یقیناً کچھ بڑا اور بہت بُرا کرنے کے چکر میں ہے، تمہیں اس کو روکنا ہے۔“

”میں نے اخبارات میں ایک بڑے آئل ٹائیکون کے قتل کی خبر پڑھی تھی، کیا اس میں طارق کا ہاتھ ہے؟“

”ہاں، وہ زیادہ تر بڑے کام خود کرتا ہے اور بہت بے خوف ہے تمہیں اس کیس میں اسد کے علاوہ کوئی اور پارٹنر درکار ہے؟“

”پارٹنر......؟“ تیمور چند لمحے سوچتا رہا، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسد خان بہت دلیر اور قابل افسر تھا مگر وہ بہت ضدی اور اڑیل بھی تھا۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں شیبا کا خیال آیا۔ شیبا، اسد کے ساتھ کام کر چکی تھی اور اس کے لیے شاید اسے کنٹرول کرنا کچھ آسان ہو سکتا تھا۔

''شیبا......'' وہ بالآخر بولا۔
''ٹھیک ہے، سچ پوچھو تو میں خود بھی یہی چاہ رہا تھا۔'' سلیمان صاحب نے کہا۔ ''وہ تمہارے ساتھ ہوگی۔ تم تینوں اس کیس پر کام شروع کرو۔ یاد رکھنا کہ وہ عام مجرموں سے زیادہ سفاک اور خطرناک ہے۔'' وہ گویا میٹنگ ختم کرتے ہوئے بولے۔

اسد خان کراچی ائرپورٹ پر کھڑا تھا۔
ائرپورٹ پر اترتے ہی اس کی گھڑی میں موجود ڈیوائس نے کام کرنا شروع کر دیا تھا، یہ ٹریکنگ ڈیوائس طارق شہریار کی لوکیشن بتاتی تھی۔ ڈیوائس کے اس طرح اچانک کام کرنے نے اسد کو کچھ تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔
اس کے حساب سے طارق اس سے دو گھنٹے پہلے کراچی پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ اب تک ائرپورٹ پر کیا کر رہا تھا؟ کیا وہ اس کا منتظر تھا؟
اس نے ٹریکنگ کے جلتے بجھتے سرخ دھبے کی جانب دیکھا وہ بیگیج کلیم کے بیلٹ کی طرف اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ چند لمحوں میں وہاں پہنچ گیا۔ طارق اس کی توقع کے عین مطابق وہاں نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد بیگیج ٹریک پر آتا اور جاتا ایک سیاہ سوٹ کیس اس کی نظر میں آ گیا۔ اس سوٹ کیس کے سامنے آنے پر ڈیوائس کا سرخ دھبا روشن ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس نے وہ سوٹ کیس اٹھا لیا۔ سوٹ کیس خاصا بھاری تھا۔ اسد نے اسے ایک خالی کاؤنٹر پر رکھا۔ یقیناً وہ اس میں اس کے لیے کچھ چھوڑ گیا تھا۔ شاید ایک اور لاش...... اسد نے سوچا اور گہری سانس لیتے ہوئے سوٹ کیس کو کھولا، اس میں اوپر چند کپڑے رکھے تھے، ان کے نیچے اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ اسد نے کپڑوں کو ایک طرف کیا اسے جو نظر آیا اسے دیکھ کر وہ ساکت سا رہ گیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک بڑا بم تھا جس پر موجود ٹائمر پر کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔
''بم...... بم...... بم...... بھاگو۔'' اسد بے اختیار چیختا ہوا دروازے کی جانب دوڑا۔
اس کے اس طرح چلانے نے وسیع و عریض ہال میں دہشت سی پھیلا دی تھی۔ ہر کوئی دروازے کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اسد بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ ہال انسانوں سے خالی ہو جائے مگر دس سیکنڈ میں یہ ناممکن تھا۔ دس سیکنڈ گویا سلوموشن میں گزر رہے تھے۔ آسد کو اپنا دل کانوں میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے لوگ بھاگ رہے تھے، گر رہے تھے، کچل رہے تھے۔ وہ خود پوری طاقت سے دروازے کی جانب دوڑ رہا تھا۔
انسان کو اگر معلوم ہو جائے کہ وہ اگلے لمحے مرنے والا ہے تو اس آخری وقت میں وہ کیا سوچ سکتا ہے؟ شاید اپنا خاندان، اپنے پیارے یا پھر گزری ہوئی زندگی، محبتیں...... اسد اس لمحے ہال میں موجود بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
اس نے ہال کے بیرونی دروازے کے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ بم انتہائی شدید دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ آگ کا بڑا سا گولا اپنے راستے میں آتے والی ہر چیز کو نگلتا ہوا باہر تک آ پہنچا تھا۔ دھماکے کی شدت نے سب کے ساتھ اسد کو بھی ہوا میں اچھال دیا تھا۔ وہ باقاعدہ اُڑتا ہوا پارکنگ ایریا کے قریب گرا تھا۔ اس کے اردگرد دھماکوں اور چیخ و پکار کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ائرپورٹ کا مکمل جنوبی حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ دو فیول ٹینکس نے بھی آگ پکڑ لی تھی، وہ خود پورے بم بن گئے تھے۔
''شاید اس کا وقت پورا ہو گیا ہے۔'' اسد نے سوچا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اچانک نیچے زمین گویا تڑخ سی گئی اور اس نے خود کو نیچے گرتا محسوس کیا۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا جو آخری چیز اسے نظر آئی وہ ایک بڑا ٹرک تھا جو آسمان سے عین اس کے اوپر گر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے کمرے سے نکلا۔ اس کا رخ سلیمان کے کمرے کی طرف تھا۔
''تم نے درست سنا ہے۔'' سلیمان اسے دیکھ کر بولے۔ ''ائرپورٹ پر بم دھماکا ہوا ہے۔ خاصی شدت کا بم دھماکا، اسد اسی فلائٹ سے آیا تھا۔ اچھا ہوا تم آ گئے ورنہ میں تمہیں بلانے ہی والا تھا۔ شیبا بھی پہنچ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اسے تلاش کرو...... اگر اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ٹھاک ہوگا۔''
''جی سر......'' تیمور نے جواب دیا۔ ''ہم ابھی نکلتے ہیں۔''
''مجھے یقین ہے کہ اس دھماکے کے پیچھے طارق کا ہی ہاتھ ہے۔'' تیمور نے مزید کہا۔
''ہو سکتا ہے مگر نقصان بہت زیادہ ہوا ہے...... اس کو اس کا پورا حساب دینا پڑے گا۔''

☆☆☆

اُسے تنہا کام کرنے کی عادت تھی۔
بچپن سے ہی وہ تنہا رہی تھی اور اب جبکہ وہ دنیا میں تنہا

رہ گئی تھی تب بھی یہ عادت فطرت بن کر اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

وہ اس وقت شہر کے سب سے بڑے مال میں تھی۔ یہ مال نیا نیا بنا تھا اور لوگ یہاں ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کے پانچ بج رہے تھے۔ فوڈ کورٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سیاہ جیکٹ کا ہڈ اس کے سر پر تھا۔ اس کے ہاتھ میں براؤن پیپر بیگ تھا جس پر معروف فوڈ کمپنی کا لوگو اور نام موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس میں کھانے کے بجائے موت کا سامان تھا۔ اس نے ایک ٹریش کین (کچرے کے ڈبے) میں لفافہ ڈال دیا۔

مال بہت بڑا تھا۔ اسے تیز تیز قدم چلنے کے باوجود سڑک تک پہنچنے میں دس منٹ لگ گئے تھے۔ اس نے ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھتے ہوئے مال پر آخری نظر ڈالی پھر اپنی گھڑی کو دیکھا اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ زندگی سے موت تک کے سفر میں اب صرف 10 منٹ رہ گئے تھے۔

☆☆☆

''تیمور...... جلدی یہاں آؤ...... مجھے لگ رہا ہے اسد ہے یہاں۔'' شیبا کی آواز پر تیمور نے گہری سانس لی۔ وہ دونوں گزشتہ دو گھنٹوں سے ائرپورٹ پر تھے۔ ہر طرف اب بھی دھواں پھیلا ہوا تھا جس سے نہ صرف صاف دیکھنا مشکل لگ رہا تھا بلکہ سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ دھوئیں کے ساتھ ربڑ لکڑی وغیرہ کے جلنے کی تیز بُو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لوگ دیوانہ وار اپنے پیاروں کو تلاش کر رہے تھے، ان کے نام لے لے کر پکار رہے تھے۔ رونے اور چلانے کی آوازیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ پولیس، ایمبولینس، رضا کار اپنا کام کر رہے تھے۔

شیبا اور تیمور اسد خان کی تلاش میں مصروف تھے۔ مشن کی ایک ٹیم اسپتالوں میں پہنچنے والی لاشوں اور زخمیوں میں اس کی تلاش کر چکی تھی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

''کہاں...... کہاں ہے وہ......'' تیمور تیزی سے دوڑتا ہوا شیبا کے قریب پہنچا۔ قدرے تلاش کے بعد وہ اس کے ہلتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر آگے بڑھا۔ وہ پارکنگ سے پہلے دوسری گاڑیوں سے ذرا دور پڑے منی ٹرک کے نیچے گھسی ہوئی تھی۔

''کیا وہ یہاں ہے ٹرک کے نیچے......'' تیمور نے مایوسی سے پوچھا۔ اس صورت میں اس کے زندہ بچنے کے امکانات بہت ہی کم نظر آ رہے تھے۔

''نہیں......اس سے بھی نیچے......'' شیبا کی آواز آئی۔

چند منٹوں میں انہوں نے کچھ افراد کی مدد سے اس ٹرک کو دھکا دے کر کھسکایا۔ زمین میں دھماکے کی وجہ سے چار پانچ فٹ گہرا اور تین چار فٹ چوڑا ایک گڑھا سا بن گیا تھا۔ اسد وہاں تھا۔ اس کا چہرہ اور جسم خون میں تر بتر تھا۔ تیمور اور شیبا نے ہر ممکن احتیاط سے اسے باہر نکالا۔ تیمور نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا، وہ زندہ تھا۔

☆☆☆

شہر سوگ اور اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔

چند گھنٹوں کے فرق سے دو بڑے بم دھماکوں نے ہر ایک کو ہلا ڈالا تھا۔ ائرپورٹ دھماکے میں 70 افراد جاں بحق ہوئے تھے جبکہ شہر کے مشہور مال میں ہونے والے دھماکے نے 64 افراد کی جانیں لے لی تھیں جس میں 4 بچے بھی شامل تھے۔ نیوز چینل ہر دوسرے لمحے نئی بریکنگ نیوز دے رہے تھے۔

طارق اسکرین کو دیکھ کر مسکرایا......اس کا کام کلاسک تھا مگر یہ دوسرا دھماکا...... خیر جو ہے کام اچھا کیا ہے۔ ایک بھرے پُرے مال کے فوڈ ایریا میں رش ٹائم میں بم لگانے والے یہ لوگ ہیں کون...... وہ بھی اتنا ہی جاننا چاہتا تھا جتنا پولیس یا میڈیا مگر فی الحال کسی خبر میں اس بات تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ریموٹ اٹھایا اور ٹیلی اسکرین اندھیری ہوگئی۔

وہ اس وقت اپنے گھر میں تھا۔ یہ شہر کے بہترین علاقے میں موجود سب سے مہنگی عمارت کے روف ٹاپ پر بنا پینٹ ہاؤس تھا۔ وہ کچھ دیر سستی سے بیٹھا رہا پھر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اب وہ نہا کر اپنی نیند پوری کرنے والا تھا۔

☆☆☆

وہ تیز اور تیز بھاگ رہا تھا، ہر جانب آگ ہی آگ تھی۔ موت کا رقص پورے زور و شور سے جاری تھا۔ گہرا دھواں رفتہ رفتہ اس کے پھیپھڑوں میں جگہ بنا رہا تھا۔ وہ بھاگ رہا تھا مگر یہ منظر ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''اسد...... اسد خان...... کیا تمہیں میری آواز آ رہی ہے؟'' ایک نرم آواز کہیں دور سے اسے پکار رہی تھی۔ ''تم اب ٹھیک ہو، محفوظ ہو...... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اسد کی آنکھیں کھلیں تو ایک لمحے کو اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا پھر بالآخر اسے سب کچھ دکھائی دینے لگا...... اس

کے سامنے شیبا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔
''ویلکم بیک اسد۔''
اسد نے مسکرانا چاہا مگر اس سے اس کے گالوں میں یک دم درد پھیل گیا تھا۔
''ہلنے کی کوشش مت کرو۔'' شیبا بولی۔ ''اچھی خبر یہ ہے کہ تم بچ گئے بس تھوڑا ڈینٹ پڑ گئے ہیں وہ چند دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے۔''
اسد کو اس کا سینس آف ہیومر اچھا لگا۔ اگلے ہی لمحے مارفین کے جسم میں جانے کے بعد کمرا اس کی نظروں کے سامنے ڈولنے لگا تھا اور پھر وہی بھیانک اندھیرا ہر طرف چھا گیا تھا۔
''اسد کب تک ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر......'' تیمور نے کمرے سے باہر کھڑے ڈاکٹر سے پوچھا۔
''بہت جلد، وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ زمین پر اس جگہ گڑھا بن گیا یوں وہ ٹرک اور کسی بھی بھاری چیز سے لگنے والی چوٹ سے بچ گئے۔ ان کی دو پسلیاں متاثر ہوئی ہیں۔ کندھا اتر گیا ہے، کٹ اور چھوٹے موٹے زخم ہیں جو زیادہ وقت نہیں لیں گے فی الحال ایک پورا دن انہیں ذہنی سکون کی ضرورت ہے اسی لیے انہیں زیادہ سونا چاہیے۔ کل آپ انہیں یہاں سے لے جا سکتے ہیں۔''
تیمور نے سر ہلایا۔ اسد کو جلدی ٹھیک ہو ہی جانا چاہیے۔ اب ان کے پاس بہت وقت نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔

☆☆☆

وہ اس ویران سڑک پر کسی کی منتظر تھی۔
کچھ دیر بعد وہ کار سے اتری، اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس پر ہُڈ والی جیکٹ تھی۔ بالآخر کچھ دیر بعد سامنے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں پر تھے۔ چند لمحوں بعد ایک کرولا اس کے سامنے آ کر رک گئی پھر اس میں سے ایک قدرے بھاری جسامت والا ڈھیلا ڈھالا شخص باہر نکلا۔
''تم دیر سے آئے ہو؟'' وہ سخت لہجے میں بولی۔
''وہ...... وہ اصل میں ٹریفک بہت تھا۔'' وہ ہکلایا۔
''چلو خیر...... وہ لائے ہو جو مجھے درکار ہے؟''
''جی...... جی بالکل......'' اس نے فوراً کہا پھر مڑ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور ایک موٹا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔
''ٹھیک ہے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیا۔
''تم میرے پیسے......'' وہ بولا۔
''او ہاں...... تمہارے پیسے......'' وہ مڑی پھر اس نے کار کی پچھلی نشست سے ایک بریف کیس نکالا۔ ''لو...... اب انہیں یہاں گننے مت بیٹھ جانا۔''
''جی بالکل......'' وہ بریف کیس کو سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔
''تمہیں یاد ہے نا کہ تمہیں اس ملاقات کو اور اس سب کو اس طرح بھول جانا ہے جیسا کہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔
''آپ مطمئن رہیں......'' وہ مڑا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ یہاں سے کچھ آگے جاتے ہی بریف کیس ضرور کھولے گا۔ آخر اسے اپنا انعام دیکھنا تو تھا ہی۔
وہ اس لمحے کا انتظار اس لیے کر رہی تھی کہ اسے بھی کچھ دیکھنا تھا۔ چند لمحوں میں دھماکے کی آواز بلند ہوئی اور پھر آگ کا شعلہ آسمان کی طرف بلند ہوا۔ وہ مسکرائی اور کار کی طرف بڑھ گئی۔ اسے اپنے پیچھے نشانات چھوڑنا پسند نہیں تھا۔

☆☆☆

اسد کی نظریں شہر کے سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والے اخبار کے بیک پیج پر جمی ہوئی تھیں جہاں سیاہ حاشیے میں ایک خبر موجود تھی۔
''سپر مال کے بمبار کا پیغام۔''
تفصیلات کے مطابق مال میں بم رکھنے والے نے اخبار کے مدیر کو یہ پیغام بھجوایا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر یہ خبر اگلے دن کے اخبار میں بیک پیج پر نہیں لگائی گئی تو وہ شہر کے کسی اسکول کو بم سے اُڑا دے گا۔ پیغام یہ ہے۔
''مال میں پھٹنے والا بم اس شہر کی تباہی کا پہلا قدم ہے، اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو مجھے روک کر دکھا دیں۔ میرا نام تباہی ہے اور میرا کام اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ کوئی محافظ مجھے اس سے نہیں روک سکتا لہٰذا اپنی تباہی کے لیے تیار ہو جائیں۔''
''یہ کیا بکواس ہے......'' وہ بڑبڑایا۔ ''اب کیا مجرم دھمکیاں دے کر دہشت پھیلائیں گے؟'' اس نے اخبار کو میز پر پٹخ دیا۔

وہ ابھی سو فیصد فٹ نہیں ہوا تھا۔ اس کی پسلیوں میں اب بھی خاصی تکلیف تھی۔ جسم میں بھی جگہ جگہ درد تھا مگر سب سے زیادہ تکلیف اس اذیت ناک منظر سے تھی جو آنکھیں بند کرتے ہی اس کے تصور پر چھا جاتا تھا۔

اسے دو گھنٹے میں مشن کے دفتر پہنچنا تھا جہاں ایک اہم میٹنگ میں اس کی شرکت ضروری تھی۔ اسے وہاں اس خبر پر بھی بات کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ پھر ایک بار اخبار کو اٹھا کر خبر کو پڑھا۔ اس بار وہ ٹھٹک کر آخری سطر پر رک گیا۔ اسی لمحے ایک خیال بجلی کے مانند اس کے دماغ میں جگمگایا۔

یہ پیغام کسی اور کے لیے نہیں بلکہ مشن محافظ کے لیے ہی تھا۔

☆☆☆

طارق شہریار اس وقت شمس الدین کی ریفائنری سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ اب وہ قانونی طور پر اس کے 64 فیصد شیئرز کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ عزیز تھا۔ عزیز برسوں سے اس کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ ایک بہترین پائلٹ تھا اور طارق کا ذاتی چوپر وہی اُڑایا کرتا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ ہی ریفائنری آیا تھا۔ ہیلی کاپٹر سے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ جیپ موجود تھی۔ ریفائنری کا ایک سینئر منیجر اس کے استقبال کے لیے آیا ہوا تھا ان کے لیے وہ تنویر شہریار تھا۔ طارق جیپ میں پورے علاقے اور ریفائنری کا جائزہ لے کر دفتر پہنچا۔ یہ بہت عمدہ اور بہت بڑی ریفائنری تھی۔ اس کا ایک بڑا پلانٹ زیرِ تعمیر تھا جس کے بعد اس کی اہمیت و وقعت میں دگنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ وہ دفتر میں پہنچا وہاں فیروز الدین اس کا منتظر تھا۔

فیروز، شمس الدین کا پارٹنر تھا، کمپنی میں اس کے 36 فیصد کے شیئرز تھے۔ وہ انتظامی معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔ فیروز کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور وہ دبلا پتلا عام قد و قامت کا مالک تھا۔

"خوش آمدید شہریار صاحب...... آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔" وہ طارق سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو یہاں آنا ہی تھا۔ میں یوں بھی رسمی باتیں پسند نہیں کرتا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ فیروز کی آنکھوں میں اس کے انداز کی وجہ سے اُلجھن سی تیر رہی تھی۔

"میں اس پروجیکٹ کے 64 فیصد کا مالک ہوں اور بقیہ کے حصے دار تم ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں میرے لیے کام کرو اور اس پروجیکٹ کو مکمل کرو...... اس کے لیے جتنے فنڈز کی ضرورت ہے، وہ بھی تم ہی فراہم کرو گے...... مجھے یہاں تم جیسے شخص کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" فیروز کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ "جہاں تک فنڈز کا تعلق ہے......" وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر طارق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس سے پہلے کہ تم کچھ کہو میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں، دراصل فوٹوگرافی میرا مشغلہ ہے، میرا خیال ہے کہ یہ تصویریں تمہیں پسند آئیں گی۔" وہ مسکرایا۔

اس کے خاموش ہوتے ہی عزیز آگے بڑھا، ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کو اس نے میز پر رکھا اور اندر سے ایک فولڈر نکال کر فیروز کی طرف بڑھا دیا۔ فیروز نے تصویروں پر نظر ڈالی، لمحہ بھر میں اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ جیسے اس کے جسم کا سارا خون خشک ہو گیا ہو۔

"نہیں...... نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے...... پلیز نہیں......" وہ گھگیایا۔

طارق شیطانی انداز میں مسکرایا۔ "اب تم یہ تو غلط کہہ رہے ہو کیونکہ میں یہ کر چکا ہوں...... یہ تمہارا اکلوتا بیٹا میرے آدمیوں کے قبضے میں ہے۔ وہ فی الحال بالکل ٹھیک ہے جیسا کہ تم تصویر میں دیکھ رہے ہو...... یہ تھوڑے بہت نشان اس لیے ہیں کہ شروع میں اس نے میرے آدمیوں سے تعاون نہیں کیا تھا مگر اب وہ ٹھیک ہے۔ تمہاری بیوی بھی اس کے ساتھ ہے تاکہ وہ خود کو اکیلا محسوس نہ کرے۔ اسے تم دوسری تصویروں میں دیکھ ہی رہے ہو۔ جیسے ہی یہ پلانٹ مکمل ہوگا، تم ان سے مل سکو گے...... اگر تم نے ذرا بھی غلطی کی تو ان کی لاشیں میں خود تمہارے پاس بھجوا دوں گا۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

فیروز کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ انہیں ساتھ لے کر آنے والا منیجر دہشت زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں...... میں وہی کروں گا جو تم کہہ رہے ہو، پلیز میرے بیٹے اور بیوی کو کچھ مت کہنا۔" وہ بالآخر بولا۔

"تم بہت سمجھ دار ہو۔" طارق نے سر ہلایا۔ "اب جب ہمارے درمیان سب طے ہو گیا ہے تو کوشش کرنا سب کچھ جلد اور اچھی طرح ہو اور جو کچھ ہمارے درمیان ہوا ہے، اس کا ذکر اس کمرے سے باہر نہ جانے پائے۔"

فیروز نے سر ہلایا۔ "منیجر زمین کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس نے کچھ سنا یا دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ نہ تو اپنی جانب اٹھتے ریوالور کو دیکھ پایا اور نہ ہی اس بلٹ کو جو اس کے سر میں پیوست ہو گئی۔ گولی لگنے کے بعد اس نے حیران اور

دہشت بھری نظروں سے طارق کی جانب دیکھا اور ڈھے گیا۔

"یہ...... یہ تم نے کیا کیا......؟" فیروز کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔

"تم جانتے ہو کہ اس کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اب ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں صرف تم جانتے ہو۔ اگر یہ بات باہر نکلی تو میں تمہارے خاندان کو ختم کردوں گا۔ تمہاری باری سب سے آخر میں آئے گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غرایا۔

"ایسا نہیں ہوگا تم مطمئن رہو۔" فیروز بولا۔

"تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔" طارق بولا اور باہر کی جانب مڑ گیا۔

☆☆☆

مشن میں ہونے والی میٹنگ کا آغاز شمس الدین کے قتل سے ہوا تھا۔ بھرے پُرے ریسٹورنٹ میں ہونے والی اس واردات کا ایک بھی گواہ میسر نہیں ہوا تھا۔ جو نہایت حیران کن تھا حتیٰ کہ ریسٹورنٹ انتظامیہ اور ویٹرز بھی کچھ نہیں بتا پائے تھے۔

"واردات کا یہ انداز طارق شہریار کی جانب نشاندہی کررہا ہے۔" سلیمان نے کہا جو میٹنگ کی سربراہی کررہے تھے۔

"مگر طارق شہریار تو دو دن پہلے قتل ہو چکا تھا۔ اس کے ہوٹل سے اس کی لاش ملی تھی۔" شیبا بولی۔

"لاش ضرور ملی تھی مگر وہ طارق کی نہیں تھی۔" اسد سنجیدگی سے بولا۔ "وہ زندہ ہے اور میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔"

"کیسا ثبوت......؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں نے اس کے جس پیغام کے بعد فلائٹ کا ٹکٹ لیا تھا اس کا وقت قتل کے بعد کا تھا پھر اس کے سامان میں موجود ٹریکر جس کی وجہ سے میں اس کے سوٹ کیس کے قریب پہنچا، اس کے بارے میں اس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا...... وہ زندہ ہے......"

"اسد ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سلیمان نے کہا۔ "وہ لاش اس کی نہیں ہو سکتی...... شمس الدین نے اپنے ریفائنری کے شیئرز اسی دن تنویر شہریار کے نام کیے تھے اور اس کے بعد اس کا قتل ہو گیا۔ یہ تنویر شہریار ہی دراصل طارق شہریار ہے۔ تنویر غالباً اس کا بھائی تھا اور پولیس کو اس کی ہی لاش ہوٹل سے ملی تھی۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ خونخوار چیتا زندہ ہے۔" شیبا بولی۔ "انڈر ورلڈ میں اسے اس نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔"

"ہاں، اور وہ یقیناً کسی بہت بڑے چکر میں ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے، یہ کوئی بھی نہیں جانتا...... اگر ہم اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمیں فوری اقدامات کرنے ہوں گے۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"میں ایک چیز اور آپ کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں۔" اسد نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مال میں بم لگانے والے قاتل کی خبر ہے۔" سلیمان نے کہا۔ "اس کا نوٹس لے لیا گیا ہے اسد......"

"اگر اس کے لفظوں پر دھیان دیا جائے تو اس میں مشن اور محافظ کا باقاعدہ استعمال کیا گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ تباہی نامی شخص ہم سے بات کرنے کی کوشش کررہا ہے۔"

سلیمان نے اخبار کو اٹھا کر خبر کو دوبارہ پڑھا پھر ایک مختصر سی فون کال کی اور اسد کی طرف دیکھا۔

"بہت اعلیٰ اسد، تم درست کہہ رہے ہو۔ ہم اسے دیکھتے ہیں مگر تمہاری اور تیمور کی ترجیح اب طارق شہریار ہے۔ وہ جہاں بھی ہے، اسے وہاں سے نکالنا اور اس معاملے سے نمٹنا تم لوگوں کا کام ہے۔ شیبا اس پروجیکٹ میں تم دونوں کی مدد کرے گی۔" سلیمان کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ اس کا لایا ہوا اخبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ میٹنگ ختم ہونے کا اعلان تھا۔

☆☆☆

طارق اپنے کمرے میں نیم دراز تھا۔ اُس کی نگاہیں دیوار پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اچانک بجنے والے فون نے اسے گویا ڈسٹرب کردیا۔ اس نے ایک نظر فون کی جانب دیکھا۔ اسکرین پر چمکنے والے نام کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یس......" وہ فون ریسیو کرکے بولا۔

"ڈیل کا وقت شروع ہو گیا ہے۔" دوسری جانب سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

"میں جانتا ہوں۔ بہت جلد تمہارا پیکٹ تم تک پہنچ جائے گا۔" وہ بولا۔

"ہمیں اس بات کا یقین ہے مگر وقت اس کھیل میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو تم نہیں جانتے کہ تم کہاں پہنچ سکتے ہو...... میں تمہیں دنیا کے ہر ملک کے طاقتور ترین شخص سے ملوا سکتا ہوں اور تم اپنی منہ مانگی رقم پر

ڈیل بنا سکتے ہو۔‘‘

’’میں جانتا ہوں۔‘‘ طارق مسکرایا۔

’’رقم تمہارے دیے ہوئے اکاؤنٹ میں روانہ کر دی گئی ہے۔‘‘

’’یہ بھی جانتا ہوں، اس کے بغیر میں کسی کو اتنا وقت نہیں دیا کرتا۔‘‘ وہ بولا اور پھر اس نے فون بند کر دیا۔

وہ دنیا کا طاقتور ترین انسان بننے والا تھا۔ اس کے پاس وہ طاقت آنے والی تھی جب وہ لوگوں، ملکوں اور آبادیوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر سکتا۔

ایک ایسا ہتھیار جو جنگ کے میدان کو تبدیل کر دے گا۔

’اس کے بعد اسے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دنیا اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگی۔‘ اس نے سوچا۔ ’وہ احمق اسے جن سے ملوانے کا لالچ دے رہا تھا وہ ان سے اپنی ہر بات منوانے پر قادر ہوگا۔‘

وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یہ بھی کہ درحقیقت اس کی کیا منزل ہے؟‘‘ وہ مسکرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

’’تباہی‘‘ کا دوسرا پیغام اخبار میں آ چکا تھا۔

اس بار اس نے بھرے ہوئے سینما گھر کو اڑانے کی دھمکی دی تھی۔

اس پیغام کی سرخی ’’اگر بکو پیے بو......‘‘ تھی۔

پیغام یوں تھا۔

’’اب سب کچھ ٹھیک کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تمہاری ساری ایجنسیاں مجھے ڈھونڈنے کی ناکام کوششیں کر رہی ہیں۔ اب میری بات سنو...... اگر نہ سنی تو موت کے لیے تیار رہو، تم جو پیتے ہو وہ زندگی کا پانی ہے...... کیا ہو اگر یہ موت کی گرفت بن جائے۔ اس بار گلاس یا بوتل کو منہ سے لگاتے ہوئے ایک بار سوچ ضرور لینا۔ محافظ جاگیں گے تو ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ ورنہ......

اسی نوے پورے سو...... یا پتا نہیں کتنے......‘‘

اس پیغام کے بعد شہر کی واٹر سپلائی روک دی گئی تھی۔ تمام پلانٹس پر چیکنگ کی جا رہی تھی۔ ڈر تھا کہ پانی میں زہر یا کوئی اور کیمیکل نہ ملا دیا گیا ہو۔ ہر برانڈ کی بوتل دکانوں سے ہٹا دی گئی تھیں۔ لوگوں کو موجود پانی احتیاط سے استعمال کرنے کی ہدایات جاری کی گئی تھیں۔ شہر میں ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

پیغام کا مقصد گویا حاصل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سلیمان مشن محافظ کے ایگزیکٹیو بورڈ روم میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ سجاد خان، صفدر حسین اور مشن کے دفتر میں ہر ایک کے لیے بڑے بھائی کی حیثیت رکھنے والے بگ بی موجود تھے۔ بگ بی مشن میں چیف آپریٹنگ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سجاد خان پہلے کمانڈو تھے اور اب دو سال سے مشن کے ساتھ تھے جبکہ صفدر حسین کا شمار ٹاپ ایجنٹس میں ہوتا تھا۔

’’مجھے یقین ہے کہ یہ پیغام ہمارے لیے ہی بھیجے جا رہے ہیں۔‘‘ سلیمان نے کہا۔ ’’مال کا وہ دھماکا ساٹھ افراد کی جانیں لے کر گیا تھا اور اب ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔‘‘

’’آخر وہ ہمیں کیا بتانا چاہ رہے ہیں؟‘‘ سجاد خان نے پوچھا۔

’’جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں کچھ بتانا نہیں چاہ رہے۔‘‘ بگ بی نے گلا صاف کیا پھر بولے۔ ’’وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کا پیچھا کریں، یہ شاید ان کے لیے کوئی کھیل ہے۔‘‘ وہ ایک کیم شحیم آدمی تھے۔ کرسی ان کے بوجھ سے چرچرا رہی تھی۔

’’مجھے ایک خوف ہے۔‘‘ سلیمان نے کہا۔ ’’یوں لگتا ہے جیسے وہ شہر بھر میں بم دھماکے یا ایسے جرائم کر کے ہمارا نام استعمال کریں گے اور ان پیغامات کی مدد سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس سے قبل ان سے بات کر لیں۔‘‘

انہوں نے 3D ہولوگرام پروجیکشن سسٹم کو آن کیا۔ میز کے عین درمیان میں ہوا میں ایک اسکرین سی نظر آنے لگی۔ ’’یہ دیکھیے......‘‘ وہ بولے۔ ’’یہ ہمیں ابھی ملی ہے شاید اس کی مدد سے ہم اس ’’تباہی‘‘ کو پکڑ سکیں۔‘‘

اسکرین پر نظر آنے والی تصویر ایک دبلے پتلے شخص کی تھی، اس نے سیاہ جینز کے ساتھ سیاہ لمبی جیکٹ سی پہن رکھی تھی جس کا ہڈ اس کے سر پر تھا۔ دیکھنے میں یہ ایک دبلے پتلے چھوٹی قامت والے مرد یا کسی خاتون کی تصویر لگ رہی تھی۔ تصویر میں اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ ’’یہ ہے وہ شخص جس نے مال پر بم رکھا تھا۔ یہ تصویر مال کے کیمرے کی ہے۔ دھماکے سے چند لمحے قبل یہ شخص مال سے باہر نکلا تھا۔ ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔‘‘

صفدر اس دوران اپنے سامنے رکھے کاغذ پر مسلسل لکیریں بنا رہا تھا۔

’’تم کچھ سوچ رہے ہو؟‘‘ سلیمان نے اس کی جانب

دیکھا۔

''جی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم ان کے ساتھ ان کی پچ پر ہی کیوں نہ کھیلیں؟''

''کیا مطلب......؟'' سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے اس دوست کی طرف سے اخبار کو ایک پیغام بھیجیں پھر دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں۔ اخبار اس خبر کو چھاپ دے گا اور ہمارے اور ''تباہی'' کے سوا کوئی نہیں جانتا ہوگا کہ یہ پیغام اس کی جانب سے نہیں ہے وہ البتہ سمجھ جائیں گے کہ ہم نے ان کا پیغام ڈی کوڈ کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سلیمان ایک لمحے بعد بولے۔ ''ہمیں اس سچویشن کو کنٹرول کرنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے کوئی غلطی کر بیٹھیں...... ہمیں اب چوہے کو بل سے نکالنا ہی ہوگا۔''

☆☆☆

غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اس کے سامنے آج کا اخبار تھا جس کے بیک پیج پر وہ خبر موجود تھی۔ اس کا عنوان ''سو میں نکلا دھاگا'' تھا۔

پیغام کچھ یوں تھا۔

''تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بہت اسمارٹ ہو...... مگر ایسا ہے نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ تم وہ سب حاصل نہیں کر سکو گے...... کل کا دن، آخری گھنٹا اور جیوگرافیکل پارک تینوں کو ملا دو تو سوالوں کے جواب مل سکتے ہیں۔ آؤ ورنہ موت تعاقب میں ہوگی...... اور لوگ کہیں گے۔ چور نکل کر بھاگا...... ہاہاہا۔''

تفصیل کے مطابق اس بار بمبار نے اسکول اُڑانے کی دھمکی کو دہرایا تھا۔ اس نے غصے سے اخبار کو میز پر پٹخا۔ کافی کے مگ کو زور سے دھکا دیا جس سے وہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا تھا۔

''انہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''وہ کس طرح یہ کر سکتے ہیں؟ انہوں نے سمجھا کیا ہے؟''

اس نے گہری سانس لی پھر اٹھ کر گیلری تک گئی۔ سامنے دور تک سبز لان تھا۔ اس کے گرد لوہے کی خاردار تاریں تھیں اور پھر ان کے قلعے نما گھر کی دیوار تھی۔ اسے یہاں کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھنا اچھا لگتا تھا۔

''ریلیکس شاہانہ...... ریلیکس......'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ ہی تو تم چاہتی تھیں، تم ان سے ملو گی تب ہی اپنی منزل تک پہنچ سکو گی۔ اس نے چند اور گہری سانسیں لیں اور پھر کمرے میں واپس آ گئی۔ اسے کل کے لیے تیاری کرنا تھی۔

☆☆☆

سلیمان جیوگرافیکل پارک کے درمیان ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مشن ایجنٹس نے پورے پارک کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ پارک کے دائیں جانب اگائے گئے گھنے جنگل میں صفدر اور سجاد خان اپنے جدید ترین ہتھیاروں کے ساتھ پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی مشن کے بہترین نشانہ بازوں میں سے ایک تھے۔ بگ بی اس آپریشن کے ہیڈ تھے اور وہ داخلی راستے کے قریب موجود تھے بقیہ ایجنٹس مختلف جگہوں پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ وہ سب بظاہر الگ الگ اور ایک دوسرے سے دور تھے مگر ان کے کانوں میں موجود ائرفون نے سب کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اور کہیں بھی ہونے والی گفتگو سب سن سکتے تھے۔

''اٹینشن آل، میں ایک مشکوک ٹارگٹ کو پارک میں داخل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔'' بگ بی کی آواز نے سب کو چوکنا کر دیا۔

سامنے سے ایک خاتون ٹہلتی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں جوس تھا اور دوسرے میں برگر تھا۔

''میں نے دیکھ لیا ہے۔'' سجاد کی آواز گونجی۔

وہ عورت آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی سلیمان کی بینچ تک پہنچی اور پھر وہیں بیٹھ گئی۔

وہ سب کے سب چوکنا تھے۔ سب کی نظریں اس پر تھیں اور سب سلیمان کے اشارے کے منتظر تھے جبکہ وہ خاتون آرام سے اپنا لنچ کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے جینز اور کرتہ پہن رکھا تھا، پیروں میں جاگنگ شوز تھے۔ اب وہ سکون سے جوس پی رہی تھی جبکہ سلیمان ہوا میں گھور رہے تھے۔ ماحول میں تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ صفدر کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا۔

یہ عورت ان کی مطلوبہ شخصیت تھی بھی کہ نہیں؟

اس کا مقصد آخر کیا تھا اور کہیں وہ اپنا وقت برباد تو نہیں کر رہے؟ یہ سوال ان کے ذہنوں میں چکر کھا رہے تھے۔

بالآخر اس عورت نے جوس ختم کیا پھر سلیمان کی طرف دیکھا۔ مسکرائی اور صاف، واضح اور پُرسکون آواز

میں بولی۔ ''ہیلو سلیمان...... کیسے ہیں آپ......؟''

☆☆☆

وہ طارق کا سراغ کھو چکے تھے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے آسمان نگل گیا ہو یا زمین کھا گئی ہو۔ وہ کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ انہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اردگرد اندھیرے کی دیوار کھڑی ہو۔

''تم نے کہا تھا کہ وہ لیپ ٹاپ بہت استعمال کرتا ہے۔'' شیبا نے اسد سے پوچھا۔

''ہاں یہ تو ہے...... جب میں نے اس ولا میں کیمرا لگایا ہوا تھا تو وہ ہر تھوڑی دیر بعد لیپ ٹاپ پر نظر آتا تھا۔''

''کیا وہ کسی خاص سائٹ پر جاتا تھا؟'' اس نے مزید کُریدا۔

''ہاں......'' اسد نے ایک قدرے کم معروف ممبر شپ سائٹ کا نام لیا۔

''یہ تو خاصی مہنگی سائٹ ہے۔ یہاں ممبران کو ان کے اپنے چیٹ روم الاٹ کر دیے جاتے ہیں اور اس کی سیکیورٹی بھی بہت ہائی پروفائل ہوتی ہے، اگر وہ یہ استعمال کرتا ہے تو پھر ہمیں اس کی کچھ نہ کچھ معلومات یہاں سے ضرور مل سکتی ہیں۔'' شیبا نے کہا۔ ''تمہیں اس کا پاس ورڈ تو معلوم نہیں ہوگا؟''

''نہیں، مگر اس کا پروفائل نام ضرور معلوم ہے۔'' اسد نے بتایا۔

''پھر تو ہمیں اس کام کے لیے ثاقب کی ضرورت پڑے گی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ثاقب کون؟'' تیمور نے شیبا کی جانب دیکھا۔

''وہ ہیکر ہے بلکہ ہیکنگ ماسٹر کہیں تو غلط نہ ہوگا اگر وہ اس سائٹ میں نہ گھس پایا تو پھر کوئی بھی ہماری مدد نہیں کر سکے گا۔''

''تو پھر چلیں...... دیر کیسی؟'' تیمور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''اس کے لیے ہمیں دو گھنٹے سفر کرنا ہوگا۔'' شیبا نے کہا۔

ڈھائی گھنٹے بعد وہ اس کے تہ خانے میں موجود تھے۔

''اس سائٹ پر بہت زیادہ سیکیورٹی ہوتی ہے اور جو پروفائل تم لوگوں کو درکار ہے، اس پر مزید ایکسٹرا سیکیورٹی موجود ہے، میں کوشش شروع کرتا ہوں۔ اگر یہ 20 سیکنڈ تک نہ کھل پایا تو پیج بھی آٹومیٹک بند ہو جائے گا۔'' اس نے ڈیجیٹل پاسپورڈز ڈال کر ٹائمر کھولا۔ چند لمحے بعد ہی وہ اچھل پڑا۔ ''ہو گیا۔''

ہم تینوں اسکرین پر جھک گئے۔ طارق شہر یار کے چیٹ روم کا بیک گراؤنڈ سرخ تھا۔ ایک جانب ان لوگوں کے نام تھے جو اس چیٹ روم میں رجسٹرڈ تھے۔

''اس وقت وہ لاگ آن نہیں ہے۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں طارق بن کر لاگ آن ہونا چاہیے۔'' تیمور نے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر اس میں خطرہ یہ ہے کہ اگر اس دوران وہ لاگ آن ہو گیا تو وہ جان جائے گا کہ اس کا پیج ہیک ہو گیا ہے اور وہ تمام سیکیورٹی بدل دے گا۔'' ثاقب بولا۔

''ہمیں یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ ہمیں کوئی نہ کوئی لیڈ درکار ہے۔'' اسد نے کہا۔ ثاقب پیج پر لاگ آن ہوا ہی تھا کہ ایک اسکرین نام ''پُراسرار طاقت 255'' کا پیغام آیا۔

''تم بہت دیر سے نہیں آئے......؟''

''اسد تم بات کرو...... تمہیں طارق کے مزاج کا کچھ اندازہ ہے۔'' تیمور بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا پھر لکھا۔ ''میں لیٹ نہیں ہوا تم جلدی آ گئے ہو۔''

''او کے میں اگلی بار خیال رکھوں گا۔'' جواب ملا۔

''میرا پارسل کب تک مل جائے گا؟''

''جلد......'' اسد نے جواب لکھا۔ ''کیا تم اس میں کچھ تبدیلی چاہتے ہو؟''

''نہیں......'' اس نے جواب دیا اور لاگ آف ہو گیا۔

''کیا ہم اس میں دیگر کچھ تفصیلات بھی دیکھ سکتے ہیں؟'' شیبا نے ثاقب سے پوچھا۔

''ہاں، اگر وہ اس کے ذریعے ای میل استعمال کرتا ہے تو آپ اس کے اِن باکس تک میں جا سکتے ہیں۔'' شیبا کے اشارے پر ثاقب نے کچھ مزید صفحے کھولے۔

''اِن باکس تو نہیں ہے مگر یہاں کچھ ڈاکومنٹ موجود ہیں۔'' وہ کچھ فولڈر کھولتے ہوئے بولا۔

وہ تینوں کمپیوٹر پر جھک گئے۔ وہاں تین فولڈر موجود تھے۔ اسد نے ایک ایک کر کے فولڈرز کھولے۔ ان فولڈرز میں جو کچھ تھا، اس نے انہیں دہلا دیا تھا۔

☆☆☆

سلیمان نے اپنے برابر میں بیٹھی خاتون کو غور سے دیکھا، وہ زیادہ سے زیادہ پینتیس سال کی لگ رہی تھی۔ اس کی عمر، چہرہ، انداز، کہیں سے اسے ایک سفاک قاتلہ ثابت نہیں کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ''تباہی'' ہو، کیا میں تمہیں اس نام سے پکاروں یا تمہارا کوئی اصل نام بھی ہے؟'' انہوں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''تم مجھے شاہانہ بھی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ تم نے مجھے یہاں بلایا ہے۔ مطلب کی بات کرو ورنہ میں جا رہی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ پوچھنا تو بیکار ہے کہ تم یہ سب کیوں کر رہی ہو مگر تم یہ تو بتا ہی سکتی ہو کہ تم یہ سب کس طرح بند کر سکتی ہو یعنی تمہیں کیا چاہیے؟''

''کیوں کا جواب تو خود تمہارے پاس ہونا چاہیے اور مجھے کیا چاہیے تو اس کا جواب صرف ایک ہے...... مجھے تیمور احمد چاہیے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

اس کے جواب نے سلیمان کو حیرت زدہ کر دیا۔

''میری بات غور سے سنو۔ تم تیمور احمد کو میرے حوالے کر دو میں چپ چاپ واپس چلی جاؤں گی۔ دوسری صورت میں نہ جانے کتنے افراد کو مرنا پڑے گا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

سلیمان چند لمحے خاموش رہے پھر بالآخر بولے۔

''اور اگر میں انکار کر دوں تو پھر کیا ہوگا؟''

''تو......؟ میں ہر روز ایک بلڈنگ کو بم سے اُڑاؤں گی اور اس میں تمہارا نام استعمال ہوگا یعنی مشن محافظ کا...... میں تمہاری اس تنظیم کو دنیا میں سب سے زیادہ وانٹڈ بنا دوں گی...... تمہارا مشن اس آگ میں جل کر ختم ہو جائے گا۔'' وہ مسکرائی۔

سلیمان چپ چاپ اس کی بات سنتے رہے۔ شاہانہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس طرح آسانی سے اس کا مطالبہ تسلیم نہیں کریں گے اور یہ بھی کہ یہ ملاقات چال ہو سکتی ہے۔ وہ پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ اس نے جیب میں رکھی ایک ڈیوائس کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں میں اس کے یہاں سے جانے کا انتظام ہونے والا تھا۔

''مجھے افسوس ہے شاہانہ مگر میں یہ نہیں کر سکتا۔'' سلیمان بالآخر بولے۔ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا ورنہ میرے آدمی تمہیں پلک جھپکتے میں بھون ڈالیں گے۔'' انہوں نے شاہانہ کا بازو پکڑ لیا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ پائے مگر یہ دیکھ کر وہ قدرے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ شاہانہ ذرا بھی نہیں گھبرائی تھی۔

عین اسی وقت دو چیزیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ پارک کی دوسری جانب ایک زوردار دھماکا ہوا تھا اور ایک سیاہ ہیلی کاپٹر ان کے قریب آ گیا تھا۔ کاپٹر سے کسی قسم کا مواد گرایا جا رہا تھا جس سے چاروں جانب دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا۔ سلیمان خود بھی کچھ دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ شاہانہ نے جیب میں رکھا خصوصی ماسک چہرے پر پہن لیا تھا۔ اب اس نے سلیمان کا بازو پکڑا۔ لمحے بھر میں انہیں کاپٹر میں کھینچ لیا گیا تھا۔ وہ باقاعدہ مزاحمت کر رہے تھے اس لیے کاپٹر میں پہنچتے ہی انہیں بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا گیا تھا۔

''مجھے میری لیب میں پہنچاؤ۔'' اس نے پائلٹ سے کہا اور نیچے شہر میں ہونے والے دھماکے سے اٹھنے والے دھوئیں کا منظر دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سلیمان اب اس کے قبضے میں تھا۔ اسے چھڑانے کے لیے تیمور احمد اس کے پاس ضرور آئے گا۔ اسے آنا ہی ہوگا...... مرنے کے لیے۔

☆☆☆

شہر کے گنجان علاقے میں پھٹنے والے اس بم نے بے حد تباہی پھیلائی تھی۔ کتنے گھر، دکانیں، گاڑیاں تباہ ہو گئے تھے۔ سو سے زائد لوگ موت کے منہ میں چلے گئے تھے اور اتنے ہی زخمی تھے۔ مشن کے دفتر میں اس وقت موت کا سا سکوت طاری تھا۔ سلیمان کے اس طرح ان سب کی موجودگی میں اغوا نے ان سب کو ہلا دیا تھا۔ تیمور شہر میں نہیں تھا مگر وہ کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا۔ مشن میں سب شاہانہ کے مطالبے سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی تیمور، سلیمان کو بچانے کے لیے اس کا مطالبہ پورا کر دے گا اور یوں مشن کا دوسرا اہم پلر بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ مشن محافظ کو آج تک ایسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

دوسری طرف آئی جی آفس میں ہنگامہ برپا تھا۔ اس دھماکے نے ان سب کو صدمے اور مشکلات میں ڈال دیا تھا۔ آئی جی آفس کو دھماکے کے دو گھنٹے بعد ایک خط موصول ہوا تھا جس کے مطابق اس دھماکے کی ذمے داری مشن محافظ نے لے لی تھی۔

☆☆☆

سلیمان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک کرسی پر بندھے ہوئے

بیٹھے تھے۔ انہیں اپنے اردگرد عجیب سی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں ایک ہی بلب تھا جس کی روشنی کمرے میں ناکافی تھی۔

''کیا حال ہیں سلیمان......'' شاہانہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ یہ جگہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے مگر مجھے تمہیں ایسی جگہ رکھنا تھا جہاں کوئی تمہیں ڈھونڈ نہ سکے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''تمہیں لگ رہا ہوگا کہ شاید میں پاگل ہوں یا پھر نفسیاتی مریض...... حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔''

شاہانہ اتنا کہتی ہوئی مڑی اور پھر اس نے ایک ٹرائی پوڈ سلیمان کے سامنے رکھا۔ اس پر کیمرے کو فٹ کیا اور شرارت سے بولی۔ ''اب تم زیادہ سپرہٹ ہونے والے ہو۔''

کیمرے کی لائٹ جلی۔ وہ کسی پروفیشنل رپورٹر کی طرح بولنا شروع ہوگئی۔ ''میرا نام ''تباہی'' ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ سب کے محبوب لیڈر سلیمان اس وقت میرے قبضے میں ہیں......'' اس نے کیمرے کو سلیمان کی جانب موڑ دیا۔ ''مجھے صرف اور صرف تیمور احمد درکار ہے۔ سلیمان کی جان کے بدلے تیمور احمد کی زندگی...... اگر تم میں سے کوئی بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہاں آکر اس کو بچالے گا تو وہ اس کی غلط فہمی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے قریبی میز پر موجود چاقو اٹھایا اور سلیمان کے بازو پر ایک تیز کٹ لگا دیا...... سلیمان کے منہ سے بے ساختہ ہلکی سی چیخ نکلی۔

''تم لوگوں کے پاس اڑتالیس گھنٹے ہیں اس کے بعد سلیمان کی زندگی کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ میں چوبیس گھنٹوں میں لوکیشن اور دوسری تفصیلات بتادوں گی۔'' اتنا کہہ کر اس نے کیمرا بند کردیا۔

☆☆☆

طارق شہریار سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اندر موجود طاقت اسے مجبور کر رہی تھی۔ اسے خون کی بُو محسوس کیے اور اپنے ہاتھ رنگین کیے بہت دن ہوگئے تھے۔ لوگ خونخوار چیتے کی دہشت کو بھولتے جا رہے تھے۔ بالآخر رات کے بارہ بجتے ہی وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا، اسے اپنے شکار کی تلاش تھی۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی۔

''آپ کہاں جائیں گے؟'' ٹیکسی والے نے پوچھا۔

''کہیں بھی...... کسی اچھے کلب میں لے چلو جہاں بہت سے لوگ ہوں اور جو مہنگا ہو۔ آج کی رات میں پیسے اُڑانے کے موڈ میں ہوں۔'' اس نے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب پانچ ہزار کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم رات بھر میرے ساتھ رہو گے۔ میں تمہیں ہر اسٹاپ پر پانچ ہزار روپے دوں گا شرط یہ ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر نہیں بھاگو گے۔''

ٹیکسی ڈرائیور کی باچھیں کھل گئی تھیں، اس نے پانچ ہزار کے نوٹ کو لالچی نظروں سے دیکھتے ہوئے بٹوے میں رکھا۔ ''میں نہیں بھاگوں گا سر۔'' وہ پورے خلوص سے بولا۔ ''آج کے دور میں لوگ پرائیویٹ گاڑیوں والی ٹیکسیوں میں سفر کرتے ہیں اس مندے کاروبار میں ایسا گاہک تو نصیبوں والے کو ملتا ہے۔'' اس نے سوچا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سودا اسے کتنا مہنگا پڑنے والا ہے۔

☆☆☆

''کیسے......؟ یہ کیسے ہوگیا بگ بی...... سب کی موجودگی میں وہ سلیمان کو لے گئی...... ایک عورت......'' تیمور کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا واپس آتے ہی یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔

''سب کچھ ایسے ہوا کہ کوئی بھی کچھ نہ کرسکا۔ اس پر بم کا دھماکا الگ تھا۔'' بگ بی کی آواز بھرا رہی تھی۔

''مگر وہ سلیمان کو کیوں لے کر گئی ہے؟'' تیمور نے پھر پوچھا۔

''تیمور ہمیں ابھی اس کی طرف سے ایک ویڈیو موصول ہوئی۔ ہم اسے کانفرنس روم میں چلا رہے ہیں تم بھی وہیں آجاؤ۔'' بگ بی اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے خود بھی کافی چوٹیں آئی تھیں۔ کانفرنس روم میں سجاد خان موجود تھا۔ صفدر کو بم دھماکے کی وجہ سے قدرے زخم آئے تھے اور وہ اسپتال میں تھا۔

''ایک دن میں اس قدر گڑبڑ ہوگئی؟'' تیمور بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگ خود کو سنبھالیں۔''

''ہاں، اس تباہی عرف شاہانہ نے پورے شہر میں آگ لگادی ہے۔'' بگ بی بولا۔ ''ہم سمجھ رہے تھے کہ سلیمان بھی شاید زندہ نہیں ہے مگر اس کی بھیجی ہوئی ویڈیو سے کم از کم یہ اطمینان ہوا ہے کہ وہ خواہ ٹھیک نہیں ہے مگر زندہ ہے۔''

اسد اور شیبا بھی اسی لمحے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ شاہانہ کی بھیجی ہوئی ویڈیو نے ان سب کو بہت تکلیف

پہنچائی تھی۔ سب کی آنکھیں نم تھیں اور بے بسی نے انہیں اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں سلیمان کو اپنی خاطر مرنے نہیں دوں گا۔'' تیمور نے کہا۔

''نہیں تیمور، یہ عقلمندانہ فیصلہ نہیں ہے۔'' شیبا بولی۔ ''وہ پاگل عورت تم دونوں کو مار ڈالے گی۔''

بگ بی اور باقی سب سلیمان کو بچانا چاہتے تھے مگر تیمور کے وہاں اکیلے جانے کے خلاف تھے۔

''دیکھیے میں بھی سلیمان کو بچانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ہمیں اس وقت اس کی بات ماننا ہوگی، میرا یقین کریں میں سلیمان کو ساتھ لے کر آؤں گا انشاء اللہ۔'' تیمور نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس ابھی وقت ہے جب تک وہ ہم سے رابطہ کرتی ہے...... شیبا تم اس کے بارے میں جتنی معلومات ہو سکیں جمع کرو، اسد جو کچھ ہم طارق کے بارے میں پڑھ کر آئے ہیں اس معاملے کو بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے...... مجھے سلیمان کو دیکھنا ہے تم اور شیبا میرے جانے کے بعد طارق کے مشن پر کام کرو گے۔''

''ٹھیک ہے مطمئن رہو اور جلدی واپس آؤ......'' اسد بولا۔

ان کے پاس کوشش کے لیے 24 گھنٹے تھے جس کے بعد سلیمان یا تیمور میں سے کسی ایک کو موت کے منہ میں جانا تھا۔

☆☆☆

ایس ایس پی کرائم برانچ سیف احمد کی مصروفیات آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ میں بہادری اور ایمانداری کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کو کئی مرتبہ ان صفات کی وجہ سے مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا مگر وہ ان افسران میں شامل تھا جو ملازمت کو ذمے داری سمجھتے تھے۔

گزشتہ کچھ دنوں سے شہر میں دہشت گردی کی لہر سی آئی ہوئی تھی۔ ایک کے بعد ایک بم دھماکے اور قتل نے خوف و ہراس پھیلا رکھا۔ سب کی نگاہیں پولیس ڈپارٹمنٹ پر تھیں۔ میڈیا کا دباؤ الگ تھا اور افسران بالا کا الگ۔ اس وقت وہ ہیڈ آفس سے ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ سے لوٹا تھا جہاں شہر کے حالات اور مشن محافظ کے حوالے سے بات ہوئی تھی۔

وہ اس تنظیم سے واقف تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا ہی ایک بازو تھا جو بڑے اور خطرناک مجرموں کی بیخ کنی کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ ان کا اب تک ریکارڈ بھی یہی بتاتا تھا۔ اسی لیے حالیہ بم دھماکے میں ان کی جانب سے آنے والے مبینہ خط کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان سے رابطہ ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں سخت آرڈر تھے کہ اس خط اور مشن کے بارے میں کوئی بات میڈیا تک لیک نہیں ہونی چاہیے۔

وہ کرسی پر گر پڑا۔ آج صبح سے وہ کافی نہیں پی پایا تھا، اس نے کافی منگوائی اور ایک اہم کال کے لیے موبائل اٹھایا۔ وہاں چند مس کالز موجود تھیں مگر ان میں ایک نام دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ڈی ایس پی اسد خان اس کا قریبی دوست تھا۔ مزاجوں کی یکسانیت انہیں قریب لے آئی تھی۔ وہ چار سال قبل ایک کیس میں ہونے والے بم دھماکے میں مر چکا تھا۔ آج اس کے نام سے آنے والی کال نے سیف کو چونکا دیا تھا۔

چند لمحے حیرت کے عالم میں اسکرین کو دیکھنے کے بعد اس نے نمبر پر کال بیک کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

ٹیکسی اس وقت شہر کے پوش علاقے کی فوڈ اسٹریٹ سے گزر رہی تھی۔ روڈ سائڈ ہوٹلز اور ڈھابوں پر اب بھی لوگوں کا بہت رش تھا۔ طارق نے ٹیکسی رکوا کر کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ کھانے کے ساتھ وہ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''صاحب آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں؟'' ایک نسوانی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ ایک تیس بتیس سال کی خوش شکل عورت تھی۔ اس کی آنکھوں سے چالاکی ٹپک رہی تھی۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے اور حلیے سے وہ بھکارن نہیں لگ رہی تھی۔

''جاؤ یہاں سے، صاب کو تنگ مت کرو۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کھانے سے انصاف کرتے ہوئے اسے گھرکا۔

''ارے نہیں اسے بات کرنے دو...... کیوں بھئی کیا چاہیے تمہیں؟''

''صاب یہ پیشہ ور فقیر ہیں۔ لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں...... کاروبار ہے یہ ان کا۔'' ٹیکسی والے نے اپنا خلوص دکھانا چاہا۔

''تم...... تمہیں اس سے کیا تکلیف ہے...... تم اپنا کام کرو۔'' طارق نے اسے گھورا تو وہ چپ ہو گیا۔ ''آؤ تم کھانا کھاؤ۔'' طارق اب اس کی جانب متوجہ تھا۔

''نن، نہیں صاب مجھے تو آپ پانچ سو' ہزار کا ایک نوٹ دے دیجیے میرے لیے وہی کافی ہے۔'' وہ ادا سے مسکرائی۔

''تمہیں پانچ ہزار ملیں گے ہم تھوڑا آگے تک جائیں گے، گپ شپ کریں گے پھر میں تمہیں یہاں چھوڑ دوں گا۔'' شکار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک جاگ اٹھی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''مگر میرے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔''

''ٹھیک ہے، ایک گھنٹے میں تم یہاں ہوگی۔'' وہ بولا۔

کچھ دیر بعد ٹیکسی ساحلِ سمندر کی جانب جا رہی تھی۔ عورت اس دوران مسلسل بول رہی تھی۔

''تم کبھی مشہور ہوئی ہو؟'' طارق نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، ہماری ایسی قسمت کہاں؟'' وہ منہ لٹکا کر بولی۔

''تمہاری قسمت بُری نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم بہت مشہور ہونے والی ہو؟''

''واقعی......'' وہ اچھل سی پڑی۔ ''آپ کہیں نجومی تو نہیں، کب تک مشہور ہوں گی؟''

''بہت جلد...... شاید کل ہی۔'' اس نے کہا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن کو شکنجے میں لے کر اس کا چہرہ سیٹ میں دبا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر تڑپ گئی مگر سیٹ میں چہرہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے خوف کے عالم میں اچانک بریک لگایا۔

طارق اس کے لیے تیار تھا، اس نے دوسرے ہاتھ میں موجود پسٹل اس کے سر پر رکھ دیا۔ ''تم گاڑی چلاؤ...... ایک بھی غلط حرکت تمہیں موت کے منہ میں لے جائے گی، سمجھے۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے خوف کے عالم میں گردن ہلائی۔

''میں تمہیں منہ مانگے سے زیادہ پیسے دے رہا ہوں، اور بھی دوں گا مگر تمہیں ڈیل کے مطابق چپ چاپ اپنا کام کرنا ہے دوسری صورت میں، میں تمہیں گولی مارنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' وہ غرایا۔

''مجھے مت مارنا...... میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' وہ گڑگڑایا اور ٹیکسی دوبارہ چل پڑی تھی۔

عورت ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر وہ زندہ تھی۔ چند لمحوں بعد طارق نے اس کی گردن سے ہاتھ ہٹالیا۔

''مم' مجھے مت مارنا......'' وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ ''میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''مشہور ہونا بھی نہیں چاہتیں؟'' طارق مسکرایا۔

''نن، نہیں...... مجھے تمہارے پیسے بھی نہیں چاہئیں۔'' وہ بمشکل بول رہی تھی۔ ''مجھے یہیں اتار دو۔''

طارق نے اس دوران موزے میں لگا چاقو نکال لیا۔ وہ اس چاقو سے بے شمار بھیڑوں کو ذبح کر چکا تھا۔ عورت کو مزید کچھ کہنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ اس نے ایک لمحے سے بھی کم وقت میں اس کی شہ رگ پر وار کر دیا تھا۔ خون کا فوارہ ڈرائیور کی سیٹ کی پشت کی جانب اچھلا۔ وہ خود بھی اچھل کر رہ گیا تھا مگر اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس کا چہرہ البتہ پیلا پڑ گیا تھا۔ طارق خود کو انتہائی طاقتور محسوس کر رہا تھا۔ خون کی یہ بُو اسے نہایت پسند تھی۔

''ڈرائیور ٹیکسی کو اسی فوڈ اسٹریٹ پر لے چلو۔''

''جج...... جی......'' وہ بمشکل بولا۔

''فوڈ اسٹریٹ کے قریب پہنچ کر اس نے عورت کی لاش کو ایک قدرے سنسان فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

ٹیکسی اس کے حکم کے مطابق ساحلِ سمندر کی جانب چل پڑی تھی۔ طارق پچھلی سیٹ پر بکھرے خون کے درمیان بیٹھا گنگنا رہا تھا۔

☆☆☆

''اسد تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔'' تمہاری آواز سن کر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تم ہو...... کیا ڈپارٹمنٹ کو معلوم ہے کہ تم واپس آ گئے ہو؟ کیا کر رہے ہو آج کل؟'' سیف اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گیا تھا۔

''میں مزے میں ہوں۔'' اسد مسکرایا۔ ''اور ڈپارٹمنٹ کیا کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں بچ گیا ہوں اور نہ ہی میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔''

''اچھا، اب مجھے بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ تم نے اتنے عرصے بعد میرے ساتھ صرف یہ کافی پینے کے لیے تو رابطہ نہیں کیا ہوگا؟'' سیف کافی کا سپ لیتے ہوئے بولا۔ ''وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ دن کے اس وقت ریسٹورنٹ قدرے خالی تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا مگر پہلے تم بتاؤ کہ تم مشن محافظ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس کے سوال پر سیف نے حیرت سے اسے

دیکھا۔
''تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''
''میرے تعلق کی بات بعد میں آئے گی سیف، پہلے تم میری بات کا جواب دو۔''
''میں تم سے سچ ہی بولوں گا تم جانتے ہی ہو...... یہ تنظیم برسوں سے جرائم اور وہ بھی نہایت سفاک مجرموں کی بیخ کنی کا کام کر رہی ہے مگر اب یہ کچھ مسائل میں ہیں، ان پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں خاص طور پر تازہ بم دھماکے کے بعد...... ہمیں ایک خط موصول ہوا جس میں اس تنظیم نے اس دھماکے کی ذمے داری قبول کی ہے۔'' سیف بولا۔
''بم دھماکا...... ارے نہیں۔'' اسد نے جواب دیا۔
''اس بم دھماکے سے مشن محافظ کا کوئی تعلق نہیں ہے...... اس تنظیم نے کبھی بے گناہوں کو نشانہ نہیں بنایا۔ اس کا تو مشن ہی بے گناہوں کی مدد اور سفاک مجرموں سے جنگ ہے۔ یہ سب اس ''تباہی'' کا کیا دھرا ہے۔ مشن محافظ کا تو اس دن خود بڑا نقصان ہوا ہے۔''
''یہ تو ہم بھی کہہ رہے ہیں کہ مشن کا ریکارڈ اس معاملے میں صاف ہے تم اس بارے میں اتنا کیسے جانتے ہو؟''
''اس لیے کہ میں ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ میں ان کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں، کسی حد تک مجھے شروع میں ان سے اختلاف رہا ہے مگر اب میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ بھی ملک کے سپاہی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اس ''تباہی'' کو وہی شکست دے سکتے ہیں۔ مجھے اسی معاملے میں تمہاری مدد درکار ہے۔''
''تم، بولو......''
''میں چاہتا ہوں کہ اپنی تفتیش کو اس ''تباہی'' کی طرف موڑ دو میں تمہیں اس عورت کے بارے میں مزید اطلاعات دیتا رہوں گا۔''
''وہ ایک عورت ہے؟ تمہیں یہ کیسے معلوم ہے، کیا وہ شہر میں ہے...... کہیں تم مجھے اس معاملے میں الجھا کر غائب تو نہیں ہو جاؤ گے؟'' سیف نے سوالوں کی بارش کر دی۔
''ایک منٹ، میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔ تمہیں تفتیش کا رخ ''تباہی'' کی جانب موڑنا ہے۔ اس کا مشن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس کے بعد وہ بیس منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ رخصت ہوتے ہوئے اسد کو یقین تھا کہ سیف ایمانداری سے اس معاملے سے نمٹے گا۔

☆☆☆

شاہانہ اپنے خوب صورتی سے سجے دفتر نما کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر لگی بڑی ایل ای ڈی پر چھوٹی چھوٹی مختلف اسکرینز بنی ہوئی تھیں جس سے وہ باہر اور دوسرے کمروں کے مناظر دیکھ سکتی تھی۔ ان ہی میں سے ایک اسکرین پر سلیمان کرسی پر نڈھال بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بازو کے زخم سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔
وہ جانتی تھی کہ تیمور احمد اس کی خاطر یہاں ضرور آئے گا اور ایک بار وہ یہاں آ گیا تو پھر زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔ اسے تیمور احمد سے سخت نفرت تھی۔ اتنی کہ وہ اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہی تھی۔ شدید محبت ہو یا سخت نفرت، دیکھا جائے تو دونوں میں انسان کے جذبات ایک جیسی شدت رکھتے ہیں بس ان کا رخ ہی تو مختلف ہوتا ہے۔
ایسی ہی شدید محبت اسے اپنے بڑے بھائی جواد سے تھی جسے تیمور احمد نے قتل کیا تھا۔ پہلے اس کے دو بھائی مارے جا چکے تھے۔ ان کے بعد دنیا میں اگر اس کا کوئی اپنا تھا تو وہ جواد ہی تھا۔ جواد کو انڈر ورلڈ میں دہشت کا دوسرا نام کہا جاتا تھا اور اس تیمور نے اسے قتل کرنے کے لیے مچھر کا استعمال کیا تھا۔ انہیں پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ جواد کے جسم میں ایک خاص قسم کا زہر داخل ہوا تھا جو اس کی موت کی وجہ بنا تھا۔ باقی کام گیلری میں لگے کیمرے کی فوٹیج نے کر دیا تھا۔ شاہانہ ہزاروں بار اسے زوم کر کے بھائی کو کاٹنے والے مچھر کو دیکھ چکی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے وسائل جواد کے قاتل کو ڈھونڈنے پر لگائے۔ وہ مشن اور بالآخر تیمور تک پہنچ گئی تھی اور اب اسے وہ ملنے والا تھا۔ اس سب کو کرنے کے پیچھے اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو تیمور احمد سے انتقام اور دوسرے مشن کو اس قدر بدنام کرنا کہ خود اس کی مدد کرنے والے ادارے اسے مٹانے پر مجبور ہو جائیں۔
آج اُس کے لیے بڑی کامیابی کا دن تھا۔
اس مشن کا دماغ اس کے ایک کمرے میں بے بسی سے پڑا تھا۔ اس کا سلیمان کو زندہ چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اسے تیمور کے سامنے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی تھی، وہ بھی اس کے بھائی کی موت میں برابر کا شریک تھا اور پھر تیمور...... اس کے لیے اس نے ایک اذیت ناک موت کا انتظام کیا تھا۔
اس نے اسکرین پر نظریں جمائیں اور کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

☆☆☆

تیمور اس وقت راستے میں تھا۔ اس کی نظریں سڑک پر جمی تھیں۔ اس کے تصور میں بار بار سلیمان کا سُتا ہوا چہرہ آ رہا تھا۔

شاہانہ نے اسے جہاں پہنچنے کو کہا تھا، وہ آبادی سے دور ایک ویران مکان تھا۔ وہاں ان کے ٹریکنگ سسٹم کام نہیں کریں گے، یہ وہ پہلے ہی بتا چکی تھی اور یہ بھی کہ اگر کسی نے تیمور کے پیچھے آنے کی کوشش کی تو وہ سلیمان کو فوراً ختم کر دے گی۔

اس دوران شیبا نے اس کے بارے میں کچھ معلومات کی تھیں۔ اس کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں تھا۔ اس نے بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ کراٹے کی ماہر تھی اور نشانہ بازی کے کئی مقابلے جیت چکی تھی۔ تیمور کے نکلنے سے صرف دو لمحے قبل انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ جواد کا دہشت گردی کا نیٹ ورک اب وہ چلا رہی تھی۔ بگ بی اور مشن کے سائنٹیفک انوویشن ڈپارٹمنٹ نے اس دوران تیمور کے لیے کچھ کام کیا تھا مگر اب یہ حالات اور قسمت پر منحصر تھا کہ اسے کچھ کرنے کا موقع ملتا ہے یا اچانک موت اسے نشانہ بنا لیتی ہے۔

فون کی بیل نے اچانک اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ پرائیویٹ نمبر سے آنے والی یہ کال یقیناً اسی کی تھی۔

”تمہیں یہاں سے سیدھا آگے آنا ہے، چند میل بعد ایک پیٹرول پمپ آئے گا، وہاں تمہیں ایک پیکٹ ملے گا جس میں ایک فون ہوگا، اپنا فون تم وہیں پھینک دو گے۔ وہاں سے آگے کی ہدایات تمہیں اسی فون پر دی جائیں گی۔“ دوسری جانب ایک ریکارڈ شدہ پیغام تھا۔

تیمور نے کندھے اچکائے۔ شاہانہ اس کی سوچ سے زیادہ چالاک اور شاطر ثابت ہو رہی تھی۔ پیٹرول پمپ سے فون کا ڈبا حاصل کرنے کے بعد تیمور نے اپنے فون کو کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ چند ہی لمحات بعد نئے فون پر آنے والے پیغام نے اسے سڑک سے اتر کر اندر آنے کا حکم دیا۔ اندازاً ایک میل اندر آنے کے بعد اسے سامنے ایک عمارت نظر آئی۔ اس ویرانے میں وہ واحد عمارت تھی۔ عمارت کے قریب جا کر اس نے گاڑی روک دی۔ اسے اب نئی ہدایت کا انتظار تھا۔

☆☆☆

بگ بی اور مشن کے تین دوسرے ساتھی ایک سیاہ بڑی جیپ میں موجود تھے۔ تیمور کے منع کرنے کے باوجود بگ بی نے اسے تنہا چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تیمور کی گاڑی میں سینسر موجود تھا، اسے ٹریکر سے جوڑ لیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کے لیے کافی فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنا آسان ہو گیا تھا۔ مشن کا کاپٹر بھی پوری طرح تیار تھا اور ان کے ایک اشارے پر یہاں پہنچ سکتا تھا۔ سلیمان اور تیمور دونوں ہی مشن کے لیے بہت قیمتی تھے اور ان کے لیے وہ کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھے۔ تیمور کی گاڑی کے سڑک سے اتر کر اندر جانے کے کچھ لمحوں بعد انہوں نے بھی گاڑی اندر موڑ لی۔

☆☆☆

چند لمحوں بعد اسے گاڑی سے نیچے اتر کر گیٹ کی جانب جانے کا حکم ملا۔ دروازے پر ایک پہلوان اس کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر پرانے زخموں کے نشانات موجود تھے اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ تیمور اس کے ساتھ خاموشی سے چلتا ہوا مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک گارڈ اور موجود تھا جس نے اس کی مکمل تلاشی لی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ اسے اندر لے جا نہیں پائے گا اس لیے وہ اپنا ریوالور بھی گاڑی میں چھوڑ آیا تھا۔ مشن کے سائنٹیفک انوویشن کے لوگوں نے اس کے ہاتھوں پر جِلد نما بالکل باریک دستانے چڑھائے تھے جو عام حالات میں جِلد کے مانند ہی محسوس ہوتے تھے مگر انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کو ایک خاص انداز میں جوڑنے سے ان سے ایک کیمیکل نکلتا تھا جو سامنے والے کو ایک لمحے سے بھی کم وقت میں بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ فی الحال تیمور کو اسے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں اسے ایک ہال نما کمرے سے گزار کر ایک دوسرے کمرے کے دروازے پر لے کر گئے۔ اس دروازے کے قریب آ کر وہ خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں بعد دروازے میں ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔ انہوں نے اسے اندر کی جانب دھکا دیا۔

دروازہ تیمور کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ بند ہو گیا تھا۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد اسے وہ نظر آئے۔ سلیمان ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں کو کرسی سے باندھا گیا تھا۔ ان کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشانات تھے جس سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں زندگی کی چمک ماند ہو رہی تھی۔ تیمور کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی اور ساتھ ہی ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' وہ مدھم سی آواز میں بولے۔

''میں نہ آتا، یہ کیسے ممکن؟'' تیمور ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''واہ......'' تالی کی ہلکی سی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ آج اس کے سر پر سکارف نہیں تھا۔ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر پھیلی سفاکی نے اس کے خدوخال کا حسن چھین لیا تھا۔ ''کیا فلمی انداز اور ڈائیلاگ ہیں، لگ ہی نہیں رہا کہ تم دونوں قاتلوں کی اس انجمن کے کرتا دھرتا ہو۔''

''مشن محافظ قاتلوں کی انجمن نہیں ہے، یہ قاتلوں اور دہشت گردوں کو ختم کرنے کا ہتھیار ہے۔'' تیمور دانت بھینچ کر بولا۔ ''اور میں جانتا ہوں کہ تم جواد کی بہن ہو اور شاید اس کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہو مگر وہ سیکڑوں کا قاتل تھا، خیر میں تمہیں یہ کیا بتا رہا ہوں تم تو اس کی وراثت کی صحیح امین ثابت ہوئی ہو...... سیکڑوں کی قاتل تو اب تم بھی ہو۔''

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔'' وہ ہنسی۔ ''انسانیت کے ٹھیکیدار شاید تم بھول گئے ہو کہ تم اور تمہارا یہ باپ اس وقت میرے رحم و کرم پر ہیں۔'' وہ زور سے بولی۔

''تم نے کہا تھا کہ میں آجاؤں گا تو تم سلیمان کو چھوڑ دو گی۔ اب انہیں جانے دو۔''

''میں نے کہا اور تم نے یقین کر لیا، بہت بھولے ہو تیمور...... جانتے ہو نا کہ مجھے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینا ہے اور اس میں تمہارے ساتھ یہ بھی تو شامل تھا...... ہے نا؟''

''تم سلیمان کو چھوڑ دو......'' تیمور ایک قدم آگے بڑھا، وہ شاہانہ کو غصہ دلانا چاہتا تھا۔ غصہ ہی ایک ایسا ہتھیار تھا جس کی وجہ سے وہ کوئی غلط قدم اٹھا سکتی تھی۔

''تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟'' وہ غرائی اور اس نے ہاتھ میں پکڑے چاقو سے سلیمان کے کندھے پر وار کیا۔ تیمور کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اسے بالکل یہ لگا تھا جیسے برسوں پہلے شاپنگ مال میں ہونے والا دھماکا دوبارہ ہوا ہے، اس کی نینا اور پریسا اسے آوازیں دے رہی ہیں۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے شاہانہ کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تیری یہ جرأت......'' اس نے چاقو کو جھکائی دے کر تیمور پر حملہ کیا۔ تیز چاقو کی نوک اس کے ہاتھ سے لگتی ہوئی گزر گئی تھی مگر تیمور نے شاہانہ کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ یہ اس کے پاس واحد موقع تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو انگوٹھے سے ٹکرایا اور اس ہاتھ سے شاہانہ کے بازو کو تھام لیا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر تیمور کی طرف دیکھا اور پھر زمین پر ڈھے گئی۔

''تیمور......'' سلیمان کی مدھم آواز پر وہ ہاتھ جھٹک کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور جلدی جلدی ان کی رسی کھولنے لگا۔ اس کے بعد اس نے وہاں موجود ایک کپڑا اٹھا کر ان کے زخم پر باندھا۔ مسئلہ اب ان دونوں کو باہر لے کر جانا تھا۔ اس نے رسی سے شاہانہ کے ہاتھ اور پیروں کو باندھ دیا۔ سامنے میز پر دروازے کا ریموٹ موجود تھا مگر اسے اس سے پہلے باہر موجود گارڈز سے نمٹنے کی تیاری بھی کرنا تھی۔

☆☆☆

ٹیکسی ڈرائیور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''کیوں؟ کیا تم میرے ساتھ سمندر میں نہیں چلو گے؟'' طارق نے اسے گھورا۔

''آپ...... آپ جائیے، میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' وہ بمشکل بولا۔

''اور اگر تم بھاگ نکلے......؟ تو ہماری ڈیل ختم ہو جائے گی، تمہارے پچاس ہزار ڈوب جائیں گے۔'' وہ مسکرایا۔

''م میں نہیں بھاگوں گا...... قسم سے انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے...... تم انتظار کرو......'' وہ بولا اور آگے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ ساحلِ سمندر کا بالکل ویران حصہ تھا ویسے بھی رات کے اس پہر وہاں کسی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ طارق پانی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے اور پھر تیر کے مانند آگے بڑھنے کی آواز سنی...... اسے اندازہ تھا کہ وہ یہی کرے گا اس نے جیب سے فون نکال کر کسی سے ایک لمحے میں بات کی اور پانی میں اتر گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ باہر آیا تو وہ بُری طرح بھیگا ہوا تھا مگر اس کے جسم پر خون کا کوئی دھبا موجود نہیں تھا۔ وہ سڑک پر آیا تو ایک سیاہ لمبی کار وہاں اس کی منتظر تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی کار اسٹارٹ ہوئی اور پھر سڑک پر پھسلتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

ایس پی کرائم برانچ سیف کی نظریں کمپیوٹر پر تھیں اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اسد کی بھیجی گئی

معلومات کے مطابق ''تباہی'' کا نام شاہانہ تھا اور وہ مشہور ڈان جواد کی بہن تھی۔ جواد کی موت کے بعد وہی اس کا دھندا چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے متعلق دیگر معلومات اور پارک میں اس کی سلیمان سے گفتگو کا ٹیپ بھی موجود تھا۔ اسے اب بہت سارا کام کرنا تھا۔ ''تباہی'' کی تباہی میں اب صرف چند گھنٹے ہی باقی تھے۔ اس نے یہ ساری چیزیں اپنی رپورٹ کے ساتھ آئی جی صاحب کو بھیجتے ہوئے سوچا۔ یہ اہم کامیابی اس کے لیے یقیناً انعام اور پروموشن لانے والی تھی۔

☆☆☆

بگ بی نے مکان سے کافی دور گاڑی روک لی تھی اور وہ چاروں پیدل اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ انہیں بہت محتاط رہنا تھا۔ تیمور سے رابطہ ناممکن تھا اور انہیں اندر کی صورتِ حال کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ گیٹ سے ہٹ کر مکان کی دیوار کے ساتھ کچھ فاصلے پر چل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر جدید مونوکولر نائٹ ویژن گاگلز تھے جس سے انہیں دور کے مناظر بھی صاف نظر آرہے تھے۔ بگ بی کو گیٹ کے پاس دو تین گارڈز نظر آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلز تھیں۔ بگ بی ان سے نمٹ سکتا تھا اس کے ساتھ موجود اسنائپرز انہیں دور سے ٹھکانے لگا سکتے تھے مگر اسے خوف یہ تھا کہ کیمرے ان کی موجودگی کو ظاہر کر دیں گے جس سے تیمور اور سلیمان کے لیے مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ عین اسی وقت اس کے موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اسکرین کی جانب دیکھا اور چونک گیا۔ اس پر پرائیویٹ نمبر سے کال آرہی تھی۔ ''کیا وہ ٹریس ہوگئے ہیں؟'' اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔

''ہیلو......'' بالآخر اس نے فون اٹھایا۔

''بگ بی میں تیمور ہوں۔'' دوسری جانب سے آنے والی آواز نے اسے اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ ''یہاں سب کنٹرول میں ہے، سلیمان کافی زخمی ہیں۔ ہم اندر ہیں اور محفوظ ہیں باہر گارڈز ہیں...... ہمیں مدد مل سکتی ہے؟ میں تم کو جگہ کے بارے میں تفصیل بھیج دیتا ہوں۔''

بگ بی کا دل رقص کرنے کو چاہ رہا تھا۔

''گریٹ...... تیمور میں باہر موجود ہوں اور کاپٹر چند منٹ میں آجائے گا...... دل خوش کر دیا یار...... باہر سب کلیئر ہوتے ہی تمہیں کال کرتے ہیں تم سلیمان کو لے کر باہر آجانا۔''

''صرف سلیمان نہیں......تباہی بھی ساتھ ہے۔''

''وہ مارا پاپڑ والے کو...... میرے چاند...... شاباش۔'' بگ بی ہنسا اور کال بند کر دی۔ اس نے کاپٹر کو پہنچنے کی ہدایت دی اور ساتھ موجود اسنائپر کو ایکشن کا اشارہ دیا۔ ان کے پاس آٹومیٹک ہتھیاروں کے ساتھ آٹومیٹک فیٹ گنز بھی موجود تھیں جس سے فائر ہونے والی سوئیاں بلٹ کے مانند شکار کو نشانہ بناتی تھیں اور لمحہ بھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی تھیں۔ چند لمحوں میں تینوں گارڈز زمین پر گرے پڑے تھے۔ انہیں اندر داخل ہونے اور تیمور سے رابطہ کرنے میں صرف پانچ منٹ لگے تھے۔ جب تک کاپٹر وہاں پہنچا، وہ سلیمان کو باہر لا چکے تھے۔

''شاہانہ کو بھی ہمیں ساتھ لے جانا ہے۔'' بگ بی نے کہا۔

''نہیں۔'' سلیمان بولے۔ وہ اب پہلے سے قدرے بہتر تھے اگرچہ کہ کمزوری کی وجہ سے ان کے لیے اٹھ کر بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ''شاہانہ اور اس کے آدمیوں کو کرائم برانچ کے حوالے کیا جانا چاہیے۔ وہ بم دھماکوں کے کیس کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کی گرفتاری ہی مشن پر لگنے والے الزامات کا جواب ہوگی۔''

ایس ایس پی کرائم برانچ سیف کے لیے مشن محافظ کی کال غیبی مدد بن کر آئی تھی۔ وہ اسد کی فراہم کردہ معلومات پہلے ہی ہائی کمان تک پہنچا چکا تھا۔ فون ملتے ہی وہ میڈیا سمیت وہاں پہنچا تھا۔ وہاں مشن محافظ کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا مگر شاہانہ اور گارڈز بے ہوشی کی حالت میں مل گئے تھے۔ ان کے اڈے سے ہی ان کے خلاف کافی ثبوت ملے تھے۔ ''تباہی'' بالآخر اپنے انجام تک پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

طارق شہریار کا آج اپنے نئے گھر میں یہ پہلا دن تھا۔ اس کا یہ اپارٹمنٹ شہر کے بہترین علاقے کے وسط میں ایک نئی اور جدید عمارت کا ٹاپ فلور تھا۔ اس نے اپنے حساب سے بنوایا تھا۔ اس خوب صورت اپارٹمنٹ کو مکمل سیکیور بنایا گیا تھا۔ دیکھنے میں یہ ایک عام جدید گھر تھا مگر جیسے ہی اسے سیکیورٹی کنٹرول پر کر دیا جاتا اس کا ہر دروازہ اور کھڑکی تک کسی اور چیز سے نہیں کھولی جاسکتی تھی۔ گھر میں لگے مختلف خفیہ کیمرے ہر وقت کام کرتے تھے۔ اپارٹمنٹ میں ایک خاص کمرا کنٹرول روم کی طرح بنایا گیا تھا جہاں بیٹھ کر طارق اپنے کسی بھی گھس آنے والے دشمن کو سامنے آئے بغیر صرف ریزز کی مدد سے ختم کر سکتا تھا۔

"یہ اس کا قلعہ تھا۔" اس نے فخر سے اردگرد دیکھا، مسکرایا اور پھر کمرے کی بالکونی کے قریب جا کر کھڑا ہوا۔ اس کے عین سامنے مشن محافظ کی کلائمنٹ چینج تنظیم اور رسالے کے دفتر کی عمارت تھی۔

وہ جو اسے پورے شہر اور ملک میں تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ ان کے بالکل سامنے آ بیٹھا تھا۔ اسے اپنے اس خیال پر خود ہنسی آ گئی۔ اس نے چیلنج بھری نظروں سے سامنے موجود عمارت کو دیکھا اور پھر اندر آ گیا۔ آج کی رات مشن کے کچھ اہم افراد کی آخری رات ہونے والی تھی اور اس کے لیے اس نے اپنے پرانے گھر کی قربانی دی تھی۔

☆☆☆

"شیبا..... کیا تمہیں اس اطلاع پر یقین ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"بالکل یہ بہت معتبر ذریعہ ہے۔ اس سے ہمیشہ صحیح لیڈز ملی ہیں۔ طارق اس اپارٹمنٹ میں ہے۔ اگر ہم اسے ختم کرنا چاہتے ہیں تو آج کی رات اس کے لیے بہترین ہے کیونکہ وہ بیمار ہے۔" شیبا نے یقین سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" بگ بی بولا۔ "تیمور کل سے واپس آ رہا ہے کیا آج کے آپریشن کے لیے تم دونوں کو اس کی ضرورت ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم یہ کام کر لیں گے۔" اسد نے شیبا کی جانب دیکھا۔ "بالکل......"

وہ آدھی رات کے بعد "آپریشن طارق شہریار" کے لیے نکلے تھے۔ ان کے ایک ایجنٹ نے طارق کے ملازم کو ٹریپ کیا تھا اور اب وہی ان کے لیے اس کے گھر کا دروازہ کھولنے والا تھا۔

"نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہی ہے۔" اسد بولا۔

"کیونکہ تم وہمی ہو رہے ہو۔" شیبا نے کہا۔

"طارق اتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ کیسے لگ سکتا ہے؟" اسد اب بھی اُلجھن میں تھا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے اسد..... جب انسان اپنے تکبّر میں اندھا ہو جاتا ہے تو پھر ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب وہ خود سر کے بل زمین پر آ گرتا ہے۔" شیبا بولی۔

"اب تم پریشان مت ہو، اس کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے اور بُرے وقت کے لیے ہمارے پاس کئی ہتھیار موجود ہیں۔"

چند لمحوں میں وہ اس اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ چکے تھے جس میں طارق رہائش پذیر تھا۔ اسد نے دروازے کی ناب کو گھمایا۔ دروازہ توقع کے مطابق کھلتا چلا گیا۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار چھوٹی رائفلز تھیں۔ اندر ہر طرف ملگجا سا اندھیرا تھا۔ کچن میں اور درمیانی راہداری میں کم پاور کے بلب روشن تھے۔ باقی سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ راہداری کے تیسرے کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اسد تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ سامنے کوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت ان کی طرف تھی۔ اسد نے اس کی گردن پر ڈارٹ گن سے فائر کیا۔ چند لمحے وہ اس کے کسی ری ایکشن کے منتظر رہے پھر تیزی سے گھوم کر اس کے سامنے آ گئے۔

کرسی پر بندھا ہوا شخص پہلے ہی زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ یہ ان کا وہی ایجنٹ تھا جس نے انہیں طارق کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ شیبا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے تشدد کا نشانہ بنا کر مارا گیا تھا۔

"کیا صورتِ حال ہے؟" ان کے کانوں میں موجود ایئر پیس میں بگ بی کی آواز گونجی۔

"ایجنٹ سیون کی لاش ہے یہاں......" شیبا دھیرے سے بولی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بہرحال تم لوگ نکلو وہاں سے فوراً......" بگ بی نے کہا۔

"اوکے۔" شیبا نے کہا اور مڑی۔ اسد اب بھی سامنے گھور رہا تھا۔ "اسد آ جاؤ......" اس نے کہا۔

"وہ دیکھو......" اسد نے سرسراتی آواز کے ساتھ سامنے دیوار کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دیوار پر خون سے لکھا ہوا تھا۔ "کھیل ختم......اسد"

"بھاگو......" اسد جیسے اچانک ہوش میں آ گیا تھا۔ اس نے شیبا کا ہاتھ تھاما اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر لپکا...... وہ لاؤنج سے ملحق لمبی شیشے والی کھڑکی تک پہنچے ہی تھے کہ ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی اور پھر لاش والے بیڈ روم سے آگ کے شعلے لپک کر پورے گھر میں پھیلنے لگے۔ ان دونوں کے سامنے کھڑکی سے چھلانگ لگانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

"گھبراؤ نہیں اسد...... تمہیں بس دیوار کو ہاتھ سے تھام کر اترتے جانا ہے۔" شیبا اتنا کہہ کر کھڑکی سے باہر نکل

گئی۔

اسد نے چاروں جانب بھڑک اٹھنے والے شعلوں کو دیکھا۔ نہ جانے کس لمحے یہاں کوئی اور دھماکا بھی ہو جائے موت تو ہر طرف تھی۔ اس نے دل کڑا کیا اور شیبا کے مانند کھڑکی کی بیرونی سمت والی دیوار سے سیڑھیوں کے مانند اترنے لگا۔ ان جوتوں اور دستانوں کی مدد کی وجہ سے دیوار سے اترنا آسان تھا مگر اسد بار بار پھسل رہا تھا اور بالآخر ایک بار اس کے ہاتھ پھسل گئے، وہ تیزی سے نیچے کی جانب پھسلا تھا مگر زمین سے بارہ چودہ فٹ کی بلندی پر اس نے پھر خود کو سنبھال لیا تھا۔ شیبا اس سے پہلے نیچے پہنچ چکی تھی۔

''ہم باہر آگئے ہیں فائر بریگیڈ اور ایمبولینس کو اطلاع کر دیں۔ یہ آگ پھیل گئی تو جانی نقصان ہوگا۔'' وہ بگ بی سے رابطے میں تھی۔

''ایمبولینس، پولیس اور فائر بریگیڈ راستے میں ہیں اطلاع کر دی گئی ہے۔ تم دونوں ٹھیک ہو......؟ وہاں سے نکل آؤ۔'' بگ بی نے کہا۔

شیبا اور اسد چند لمحے اس کو دیکھتے رہے پھر وہ کچھ دور کھڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

طارق شہریار، شمس الدین کی ریفائنری کے نئے بلاک میں موجود تھا۔ ریفائنری کے اس بلاک کے تہ خانے میں اس کی طاقت کا خزانہ موجود تھا۔ وہ اب کامیابی کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے وہ وائرس حاصل کر لیا تھا جسے کسی بھی چیز میں ایک خاص مقدار میں انجیکٹ کر کے ایک الگ ہی قسم کی تباہی پھیلائی جا سکتی تھی۔ مخصوص سائنس دانوں کی ایک چھوٹی سی ٹیم اس پر دن رات کام کرتی آئی تھی۔ اس وائرس کو تیار کرنے کے لیے کروڈ آئل اور ریفائنری کی ضرورت تھی جسے شمس الدین..... کی ریفائنری نے پورا کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس اس کا یہ نیا ہتھیار تیار تھا جو دنیا میں طاقت کے توازن کو الٹ پلٹ کر سکتا تھا۔

''اس کا اثر کتنی دیر میں ہوتا ہے؟'' اس نے چیف سائنٹس سے پوچھا۔

''سر! ہم اسے کسی بھی چیز میں انجیکٹ کر کے اسے اپنے شکار تک بھیج سکتے ہیں۔ یہ تین گھنٹے بعد ایکٹو ہو جاتا ہے اور جیسے ہی وہ پیکٹ کھولا جائے گا تو وائرس اس پورے علاقے میں پھیل جائے گا اور وہاں موجود ہر شخص حتیٰ کہ پودوں اور جانوروں کو بھی اپنا نشانہ بنا لے گا۔ تین دن بعد اس کے اثرات شروع ہوں گے۔ جسم پر دانے اور گھبراہٹ اور پھر ان کے اندرونی اعضا کام کرنا بند کر دیں گے۔ یہ سارا عمل تکلیف دہ ہوگا مگر شکار کو موت کے منہ میں جانے میں پھر بھی ایک ہفتہ تو ضرور لگے گا۔ اس طرح یہ کوئی وبا نظر آئے گی، اسے ایک عمارت، محلہ، شہر یا ملک سب پر آزمایا جا سکتا ہے۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

''بہت اعلیٰ...... تم لوگ اپنا کام کرتے رہو...... ہماری ڈیلیوریز شروع ہونے والی ہیں مگر سب سے پہلے میں کہیں ایک پیکٹ بھجوانا چاہوں گا۔'' وہ دانت بھینچ کر بولا۔

''تم ایک پیکٹ فی الحال میرے اس آدمی کے پتے پر بھیج دو، اسے تاکید کر دینا کہ اسے کھولنا نہیں ہے اور میرے حکم کا انتظار کرنا ہے۔''

☆☆☆

''ہم نے طارق کے اکاؤنٹ میں موجود فولڈر میں جو ڈاکومنٹس دیکھے تھے، ان کے مطابق اس کے پاس کوئی ایسا ہتھیار آنے والا ہے جس سے وہ اربوں روپے کما رہا ہے۔'' تیمور بڑبڑایا۔

''ہاں اور یہ بھی کہ اس کے ذریعے وہ دنیا کا سب سے طاقتور شخص بن سکتا ہے۔'' شیبا نے کہا۔

''ویسے تو یہ ہر مجرم اور دہشت گرد کا خواب ہوتا ہے۔'' اسد نے کہا۔ ''مگر طارق شہریار بہت سفاک اور شیطانی ذہن کا مالک ہے۔''

''دیکھو، ان ہی ڈاکومنٹس میں یہ بھی تھا کہ اس نے حال ہی میں شمس الدین کی ریفائنری کے شیئرز حاصل کیے ہیں اور یہ وہی شخص ہے جسے ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں شروع سے یہ شک کیا جا رہا ہے کہ یہ طارق کا کام ہے۔'' تیمور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ہاں اگر ان دونوں ڈاکومنٹس کو ملا کر دیکھا جائے تو ایک دھندلی سی تصویر بن جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے ڈانڈے اسی ریفائنری سے ملتے ہوں۔'' اسد نے کہا۔

''بالکل ممکن ہے بلکہ یہی عین ممکن ہے۔'' تیمور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم اسی وقت وہاں جائیں گے۔''

چند گھنٹوں میں مشن کے کاپٹر نے انہیں وہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ فیروز الدین کے دفتر پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر ہراساں سا ہو گیا۔

''ہم ریفائنریز پر معلومات حاصل کر رہے ہیں۔'' شیبا نے اسے کلائمنٹ چینج ایجنسی کا کارڈ دکھاتے ہوئے

پوچھا۔ ''ہمیں آپ کی ریفائنری کے بارے میں کچھ سوال کرنا ہیں۔''

''مگر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''آپ کو یہاں آنے سے قبل مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ میں آپ کو کچھ خاص نہیں بتا سکتا۔''

''آپ ہمیں ریفائنری کے نئے مالک کے بارے میں تو کچھ بتا سکتے ہیں نا؟'' اس سوال کے جواب میں وہ چونک گیا۔

''میں نے آپ سے کہا نا کہ میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ اب میں گھر جا رہا ہوں آپ جا سکتے ہیں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

وہ تینوں چند لمحے خاموش رہے پھر اسد نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور تیمور نے ریوالور نکال کر فیروز الدین کے سر پر رکھ دیا۔ وہ بھونچکا سا رہ گیا تھا۔

''ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔'' اسد نے اپنا کارڈ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور ہمیں یہ معلومات چاہئیں۔''

''م...... میں نہیں بتا سکتا۔'' وہ بمشکل بولا۔

''کیوں؟'' شیبا غرائی۔ ''نہ بتانے کی صورت میں تم بھی پھنسو گے اور ابھی نہیں تو کچھ دیر بعد تکلیف اٹھا کر بتانا پڑے گا تو بہتر نہیں کہ ابھی منہ کھول دو۔''

''وہ...... وہ میری بیوی اور بیٹے کو مار ڈالیں گے۔'' وہ بمشکل بولا۔

''کون......؟'' اسد نے پوچھا۔

''تنویر...... تنویر شہریار اور اس کے لوگ......''

''تنویر......'' اس نے دہرایا۔ ''یعنی طارق شہریار...... تم گھبراؤ مت...... اس کو اس بات کا علم نہیں ہو گا...... مگر پہلے تمہیں ہمیں بتانا ہوگا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''ہمارے نئے بلاک میں وہ لوگ کچھ کام کر رہے ہیں، مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''اس وقت وہاں کون کون ہوگا؟''

''وہ شفٹوں میں کام کرتے ہیں اب بھی شاید پانچ چھ لوگ ہوں گے اور...... اور گارڈز ہوں گے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا تو وہ میرے بیٹے اور بیوی کو مار ڈالے گا۔''

''وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔'' تیمور نے جواب دیا۔ وہ اس کی تکلیف کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ ''اور اسے اس سے روکنے کے لیے پکڑنا ہوگا۔''

''اس کا ایک ساتھی یہاں سب معاملات دیکھتا ہے...... عزیز نام ہے اُس کا...... وہ ہوگا ابھی وہاں......'' فیروز الدین اب کچھ ہمت پکڑ رہا تھا۔

''تم اسے یہاں بلا سکتے ہو؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہاں، بلا سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

ان تینوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور فیروز الدین کو فون کرنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

عزیز کا چہرہ ان تینوں کو دیکھ کر پیلا پڑ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی موت کو دیکھ لیا ہو۔ تیمور نے اس کے سر پر ریوالور رکھ دیا۔ ''اب تم ہمیں ساری تفصیل بتاؤ گے کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور طارق شہریار کہاں ہے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' وہ بولا۔

''بکواس نہیں...... اگر تم چاہتے ہو تو ہم منہ کھلوانے کا کوئی اور راستہ اختیار کریں۔'' اسد غرایا۔

''تم کچھ نہیں جان پاؤ گے۔'' وہ پُراسرار لہجے میں بولا۔ ''اس سے پہلے ہی موت تمہارا گریبان پکڑ لے گی...... اور تم...... تم بہت پچھتاؤ گے۔'' وہ فیروز کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''مرنے والے ہو تم سب...... سب کے سب......'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنے جبڑے کو عجیب سا جھٹکا دیا۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا......'' اسد اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا مگر اس دوران عزیز کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے نکلتا جھاگ یہ بتا رہا تھا کہ اس نے منہ میں کہیں پوشیدہ زہر نگل لیا تھا۔ فیروز پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی لاش کو گھور رہا تھا۔

''اب......؟'' تیمور نے بے بسی سے اسد اور شیبا کی طرف دیکھا۔

اب ان کے پاس خود نئے بلاک میں گھسنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

نیا بلاک ایک الگ چار دیواری کے اندر تھا۔ اس کا داخلی دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا۔ وہ جدید انداز کا سیکیورٹی ڈور تھا جس پر خاص کارڈ لگانے سے ہی دروازہ کھلتا تھا۔ انہیں یہ بات فیروز دفتر میں ہی بتا چکا تھا۔

''یہ شہر سے دور جگہ ہے...... ہمیں یہاں کوئی خاص سیکیورٹی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ بات شہریار صاحب کو بھی معلوم ہے مگر پھر بھی انہوں نے یہاں کچھ انتظامات کر

رکھے ہیں، انہیں ہمارے گارڈز پر بھروسا نہیں ہے۔''

''اس کے علاوہ اور کیا ہے سکیورٹی کے لیے......؟''

''کیمرے ہیں اور ایک خاص حصے میں ایسی شعاعیں بھی ہیں جہاں اجازت کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔ میں نے ایک بار انہیں کسی سے یہ بھی کہتے سنا ہے کہ اگر کوئی زبردستی گھسے گا یا کسی حساس چیز کو ہاتھ لگائے گا تو پوری عمارت اُڑ جائے گی۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ فیروز بہت خوف زدہ تھا مگر اب وہ ان کے ساتھ جڑنے پر محتاط تھا۔

''وہ یہاں آخر کر کیا رہا ہے؟'' شیبا نے پوچھا۔

''یہ مجھے معلوم نہیں ہے، ان سے کچھ پوچھنا ممکن نہیں کبھی بھی......'' وہ بے بسی سے بولا۔

نئے بلاک کے اردگرد تین چار گارڈ تھے مگر وہ فیروز کو دیکھ کر ایک طرف ہو گئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے عزیز کی جیب سے نکالا گیا خصوصی کارڈ دروازے پر لگایا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ چاروں اندر داخل ہو گئے۔ وہ ایک پتلی سی راہداری سی تھی جس سے گزر کر وہ ایک اور دروازے تک پہنچ گئے۔ وہ دروازہ بھی بند تھا۔ تیمور نے شیبا کی جانب دیکھا پھر اسد کو اشارہ کیا۔ اسد نے عزیز کی جیب سے نکالا گیا کارڈ دروازے پر لگایا۔ دروازہ بے آواز انداز میں کھلتا چلا گیا۔

وہ ایک خاصا وسیع و عریض ہال تھا جس میں ایک جانب قدرے مختلف کمپیوٹرز آن تھے۔ دیوار پر ایک بہت بڑی اسکرین لگی تھی۔ ساتھ ہی کئی مشینیں تھیں جن سے ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ اس طرف اس وقت کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ ہال کے ایک حصے میں لیبارٹری بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی اسکرینز جگمگا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ مختلف مشینیں اور آلات بھی منسلک تھے۔ وہاں دو افراد موجود تھے جنہوں نے لیب کوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کے چہروں پر ماسک بھی موجود تھا۔ ان کی پشت دروازے کی جانب تھی یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ پائے تھے۔

''تم یہیں ٹھہرو......'' تیمور نے فیروز سے سرگوشی میں کہا۔

''نن، نہیں...... میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔'' وہ منمنایا۔

''نہیں تم یہاں محفوظ ہو......'' شیبا نے کہا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ وہ تینوں تیزی سے لیبارٹری کی جانب بڑھے۔ شیشے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ لمحے بھر میں مشینوں و آلات پر مصروف سائنس دانوں کے سر پر پہنچ گئے۔

''کک، کک کون ہے؟'' ان میں سے ایک پہلے ہی وار پر زمین پر جا گرا تھا۔ دوسرے نے کچھ مزاحمت کی کوشش کی مگر اسد نے اسے سنبھال لیا۔ چند لمحوں میں وہ دونوں بے ہوش ہو چکے تھے۔ اسد اور تیمور نے ان دونوں کے ماسک اور کوٹ اتارے اور پہن لیے۔ شیبا اس دوران باہر نظر رکھے ہوئے تھی۔

ہال کے وسط سے سیڑھیاں نیچے کی جانب جاتی نظر آ رہی تھیں۔ تیمور اور اسد دبے قدموں اس کی جانب بڑھے۔ نیچے سے گفتگو کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہاں یقیناً دو سے زیادہ افراد موجود تھے۔ انہوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ فضا مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی تیز آواز سے گونج اٹھی۔ شیبا ان سے قدرے پیچھے تھی۔ وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رکی اور پھر پیچھے ہٹ گئی۔ تیمور اور اسد نے واپس پلٹنا چاہا مگر ان کے پیر گویا زمین سے چپک گئے۔ اسی لمحے نیچے سے تین افراد بیک وقت اوپر کی جانب آئے ان کے ہاتھوں میں جدید ساخت کی گنز تھیں۔

''تم...... تم لوگوں کے جوتے کہاں ہیں؟'' وہ غراتے ہوئے ان کی جانب بڑھے۔ وہ ان سیڑھیوں پر اطمینان سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے جس پر تیمور اور اسد چپک کر رہ گئے تھے۔ ان کے سوال پر دونوں نے ان کے قدرے عجیب جوتوں کی طرف دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔ انہوں نے لیب کوٹ اور ماسک تو پہن لیا تھا مگر یقیناً ان کے جوتوں میں ایسی کوئی چیز موجود تھی جس کی وجہ سے ان کی شناخت ممکن ہوتی تھی۔

''یہ صفدر اور منوج نہیں ہیں۔'' ان میں سے ایک گن سیدھی کرتا ہوا چلایا۔ ''کون ہو تم؟ یہاں اندر کیسے آئے؟ اپنے ماسک اتارو فوراً......'' وہ ان کی جانب دیکھ کر سفاکی سے بولا۔

چند لمحوں بعد وہ ہال کے وسط میں کھڑے تھے۔ ان کے ماسک اتارے جا چکے تھے۔ ''تمہارے پاس صرف چند لمحے ہیں۔ کون ہو تم لوگ اور اندر کیسے آئے؟'' وہ غالباً ان کا انچارج تھا۔ اس کے چہرے پر درشتگی تھی اور آنکھوں میں سفاکی نمایاں تھی۔

''کیا اس کے بعد تم ہماری جان بخش دو گے؟'' تیمور

مسکرایا۔ ''نہیں نا......؟''

''مگر اس طرح تم قدرے آسان موت مرو گے...... دوسری صورت میں تم نہیں جانتے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ بھی سفاکی سے مسکرایا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم دو سیکورٹی ڈورز کیسے عبور کر کے اندر آئے، میں تین تک گنوں گا، اس کے بعد تم میں سے ایک کی روح اس کے جسم سے پرواز کر جائے گی۔'' وہ غرایا۔

''گنتی گننے میں جلدی مت کرو۔'' شیبا اس کے عقب سے برآمد ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک گن تھی جو اس نے اس کے سر پر رکھ دی تھی۔ ''اپنے باس کی زندگی چاہتے ہو تو گنز نیچے ڈال دو۔'' وہ غرائی۔

''تم لوگ یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔'' وہ پستول زمین پر رکھتے ہوئے بولا۔ لمحے بھر میں منظر بدل گیا تھا۔ اب ان کے ہتھیار تیمور اور اسد کے ہاتھوں میں تھے۔

''تم ہماری فکر چھوڑ دو......'' تیمور نے کہا۔ ''اور یہ بتاؤ کہ یہاں اس قدر پُراسرار انداز میں ہو کیا رہا ہے اور تمہارا باس کون ہے؟''

''ہمیں یہ معلوم نہیں ہے۔'' الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ تیمور کے زوردار تھپڑ نے اس کا چہرہ گھما دیا۔

''تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس کسوٹی کسوٹی کھیلنے کا وقت نہیں ہے۔ اس لیے جو پوچھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو۔''

''ہم حقیقت میں باس کو نہیں جانتے۔ ہم تو عزیز صاحب کو جوابدہ ہیں اور وہ سب جانتے ہیں۔'' اس بار وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اور یہاں کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو جانتے ہی ہو گے نا تم......؟'' اسد نے پوچھا۔

''ہم تو جانتے ہیں مگر افسوس کہ تم نہیں جان پاؤ گے۔'' اس آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ بے ہوش سائنس دانوں میں سے ایک کو نہ جانے کب ہوش آ گیا تھا اور اب اس کا ریوالور شیبا کے سر پر تھا۔ ''مجھے گولی چلانے میں بڑا مزہ آتا ہے اور مجھے تم سے کچھ پوچھنا بھی نہیں ہے اس لیے میں آسرا بھی نہیں کروں گا۔ ایک منٹ میں ہتھیار پھینکو اور پیچھے ہٹ کر اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لو ورنہ یہ خوب صورت حسینہ لاش بن کر زمین پر پڑی ہو گی۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔

اسد اور تیمور نے بیک وقت شیبا کی جانب دیکھا۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی پھر جیسے ہی انہوں نے ہتھیار فرش پر رکھے، وہ بجلی کی سی تیزی سے لہرائی تھی۔ اس کی کہنی سائنس داں کی پسلی میں گھس گئی تھی جبکہ کراٹے کا زوردار وار اس کی گردن کی ہڈی کو ہلا گیا۔ ریوالور پہلی ضرب پر ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ شیبا ہوا میں اچھلی اور پھر اس کی زوردار کِک نے اسے اچھال کر لیبارٹری کے دروازے پر پھینکا تھا۔ شیشے کا دروازہ ہلکے سے دھماکے سے کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔

دوسری جانب وہ تینوں اسد اور تیمور پر ٹوٹ پڑے تھے۔ زمین پر پڑے ریوالور ان سب کی نگاہوں کا مرکز تھے۔ اسد نے ان میں سے ایک کے پیٹ میں زوردار مُکا رسید کیا تھا مگر اس سے قبل کہ وہ ریوالور اٹھا پاتا، دوسرے نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ ان کا انچارج تیمور سے بھڑا ہوا تھا۔ اس نے تیمور کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ رکھا تھا اور ہر لحہ دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔ شیبا تیر کے مانند اس کی طرف لپکی۔ اسد سے مُکا کھانے والا اس کے راستے میں آ گیا۔ اس نے کراٹے کے ایک زوردار وار سے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران تیمور اپنے حملہ آور پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنی گردن سے اس کے ہاتھ ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے سینے پر زوردار فلائنگ کک رسید کی۔ وہ ہوا میں گویا اُڑتا ہوا دیوار پر لگی بڑی اسکرین سے ٹکرایا اور پھر نیچے موجود مشینوں پر جا گرا۔ مشین سے ایک بڑا جھماکا ہوا اور وہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے تڑپنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سائرن گونجنے لگا۔

''یہ...... یہ کیا کر دیا......؟'' ان میں سے بچنے والا واحد شخص چیخ سا پڑا۔

''کیا......؟'' اسد نے بے اختیار پوچھا۔ جواب میں وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔

''کیا...... کیا ہوا ہے؟'' اسد نے اسے جھنجوڑا۔ ''کیا پاگل ہو گئے ہو تم......؟''

سائرن کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔

''اب کچھ نہیں بچے گا...... کچھ بھی نہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''دو منٹ میں یہ سب اُڑ جائے گا۔''

''بم...... یہاں کوئی بم موجود ہے...... باہر نکلو......''

اسد کھڑا ہوتے ہوئے چلایا اور کونے میں کھڑے تھر تھر کانپتے فیروز کو گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب لپکا۔ شیبا اور تیمور بھی اس کے پیچھے تھے۔

"دوسرے...... دوسرے بلاکس میں لوگ ہیں......؟" باہر نکل کر تیمور نے فیروز سے پوچھا۔

"ہاں کچھ تو ہوں گے۔" وہ بمشکل بولا۔

"جلدی کرو...... الارم یا کسی بھی طریقے سے سب کو اطلاع کرو......"

وہ بلاک سے نکل کر آگے میدان میں پہنچے ہی تھے کہ ایک بڑے دھماکے کے ساتھ پورا بلاک زمین بوس ہو گیا۔ ہر طرف آگ کے شعلے لہرا رہے تھے۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے مڑ کر دیکھا...... طارق کا دنیا پر حکمرانی کا پُراسرار خواب تعبیر پانے سے قبل ہی جل کر بھسم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"یہ...... یہ...... نہیں ہو سکتا...... یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ چلایا اور اس نے ہاتھ میں موجود ریموٹ سامنے رکھی شیشے کی میز پر دے مارا۔ شیشہ درمیان سے ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں چاروں جانب بکھر گئیں۔

اُس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ آنکھیں خون کے مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو الٹ پلٹ کر رکھ دے۔

اسکرین پر شمس الدین کی ریفائنری میں بھڑک اٹھنے والی آگ کی رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔ خبروں کے مطابق یہ کوئی حادثہ تھا جس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ حادثے کے بعد آگ نے پوری ریفائنری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ عمارت کا نیا بلاک مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

طارق شہریار کی سماعت پر یہ آخری جملہ بم بن کر گرا تھا۔ اس کی ساری محنت گویا اکارت ہو چکی تھی۔ اب جبکہ کامیابی اس کے قدم چوم چکی تھی۔ یوں اچانک منزل اس کے ہاتھ سے سرک کر غائب ہو گئی تھی۔ وہ کافی دیر اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے دماغ میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

"طارق شہریار" سلیمان صاحب نے کہا۔ "طارق شہریار کا پکڑا جانا انتہائی ضروری ہے۔ وہ اس راز داری سے کر کیا رہا تھا، یہ جاننا لازمی ہے۔ اس سفاک مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانا اب مشن محافظ کی ذمے داری ہے۔"

"بالکل سر۔" تیمور بولا۔ "ہم اس کو تلاش کر لیں گے۔"

"سر! ہماری ٹیم قوم کو مایوس نہیں کرے گی۔" اس بار اسد بولا۔ "مشن محافظ اپنی ذمے داری پوری کرے گا۔"

اس بار تیمور بولا، پھر وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

☆☆☆

وہ اب مزید یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔

اس کے گرد گھیرا آج نہیں تو کل تنگ ہونے ہی والا تھا۔ اس کی چارٹرڈ فلائٹ اس کی منتظر تھی۔ دنیا کے کئی ملکوں کے بینکوں میں اس کے لاکھوں ڈالرز موجود تھے۔ وہ فی الحال جا رہا تھا مگر جلد لوٹ کر آنے والا تھا۔

جانے سے قبل اسے اپنا حساب بے باق کرنا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے مشن محافظ کی عمارت تھی۔

"سمیر...... تمہارے پاس جو پیکٹ موجود ہے، وہ تمہیں اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے...... نہیں آج نہیں...... یہ پیکٹ کل شام تک اس پتے پر پہنچا دینا ہے۔" وہ پتا لکھواتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈلیوری شام تک ہو جانی چاہیے۔"

"ہو جائے گی سر...... آپ بالکل بے فکر رہیں۔" دوسری جانب سے کہا گیا جس کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے مشن محافظ کی تنظیم کا دفتر تھا۔ اگلے دو ہفتوں میں اس کے سارے دشمن اس وائرس کا شکار ہو کر تڑپ تڑپ کر اس دنیا سے رخصت ہو جانے والے تھے۔ وہ مسکرایا۔ اس سے کافی پہلے اسے یہاں سے نکل جانا تھا۔

☆☆☆

"طارق شہریار کہاں ہو سکتا ہے؟" تیمور بڑبڑایا۔ وہ تینوں اس وقت تیمور کے کمرے میں تھے۔

"اس کے لیے ہمیں اس کے دماغ کے مطابق سوچنا ہوگا۔" اسد بولا۔

"دیکھو، سب سے پہلے ہمیں اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنا ہوگا، میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم دو گھنٹے بعد اس موضوع پر کام شروع کریں گے فی الحال یہاں سے نکل کر نیچے چلتے ہیں۔ کافی شاپ میں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ تھوڑا ریلیکس کرتے ہیں پھر کام شروع کرتے ہیں۔" شیبا نے کہا۔

"گڈ آئیڈیا۔" اسد مسکرایا۔ گزشتہ چند دنوں نے اسے ذہنی طور پر شیبا کے کافی قریب کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں بھی خود کو کچھ تھکا ہوا محسوس کر رہا ہوں، تم دونوں کافی پی آؤ اور میں یہاں تھوڑا ریسٹ کر لیتا ہوں۔" تیمور بولا۔

"تم بھی ساتھ چلونا......" اسد نے کہا۔
"نہیں، میں تھوڑا آرام کروں گا۔" تیمور کے انکار پر وہ دونوں اسے واقعی آرام کرنے کی ہدایت دے کر باہر نکل گئے۔

تیمور کچھ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس دھماکے نے اسے شاپنگ سینٹر کے دھماکے کی یاد دلا دی تھی اور آج اسے نینا اور پریسا کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں بڑھتی گھٹن کو کم کرنے کے خیال سے وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سڑک کے اس پار جدید کئی منزلہ عمارت موجود تھی۔ اس نے میز پر سے دوربین اٹھا کر آنکھوں پر لگالی۔ اس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا وہ صرف اپنے ذہن کو بٹانا چاہ رہا تھا۔ سامنے موجود عمارت کی اوپری منزل پر اچانک اسے کچھ نظر آیا۔ اس نے زوم بڑھا کر دوبارہ وہاں دیکھا۔

ایک لمحے کو اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا تھا۔
یہ...... وہ ہی تھا...... طارق شہریار...... وہ اپنی بالکونی کی لمبی سی کھڑکی میں موجود کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا پھر بٹن دبا کر اس منظر کو کیمرے میں قید کر لیا۔ اس جدید دوربین میں تصویر کھینچنے کی سہولت بھی موجود تھی۔

اس نے دوربین کو میز پر رکھا، اپنے ہتھیار جیب میں رکھے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"تم درست کہہ رہی تھیں واقعی یہاں باہر بیٹھ کر کافی بہتر محسوس ہو رہا ہے۔" اسد کافی ختم کرتے ہوئے بولا۔
"مجھے تیمور قدرے الجھا ہوا لگ رہا تھا شاید اس دھماکے نے اسے ڈپریسڈ کر دیا ہے۔"
"ہاں۔" شیبا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"اس کا دکھ بہت بڑا ہے۔"
"اسی لیے میں نے اسے کچھ دیر تنہا چھوڑنا مناسب سمجھا، بس اب چلتے ہیں۔"
"میرا خیال ہے کہ اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔" شیبا دور دیکھتے ہوئے بولی۔
"کیا مطلب؟"
"وہ دیکھو...... وہ تیمور ہی ہے نا......؟" شیبا سامنے عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
"ہاں، یہ تیمور ہی ہے۔ یہ اس عمارت میں کیا کرنے جا رہا ہے؟" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"معلوم نہیں، لیکن لگ یہ رہا ہے کہ اسے طارق شہریار کا کوئی سراغ مل گیا ہے...... آؤ...... ہم دیکھتے ہیں۔" شیبا اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں اس عمارت تک پہنچے تب تک تیمور غائب ہو چکا تھا۔ وہ دونوں عمارت میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک جدید طرز کی ہائی فائی عمارت تھی جہاں نہایت امیر اور دولت مند افراد رہائش پذیر تھے۔ تیمور کس منزل پر گیا تھا؟ یہ سوال ان دونوں کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

☆☆☆

تیمور عمارت میں داخل ہوا۔ نچلی منزل پر باقاعدہ ریسپشن تھا جہاں آنے والے مہمانوں کو ریسیو کیا جاتا پھر انٹر کام کے ذریعے متعلقہ اپارٹمنٹ سے اجازت لے کر انہیں لفٹ تک پہنچایا جاتا تھا۔ تیمور نے تیزی سے چاروں جانب دیکھا۔ ریسپشن کی پچھلی جانب آفس موجود تھا اور اس کی دوسری جانب عملے کی جگہ تھی۔ تیمور تیزی سے اس طرف بڑھا۔ وہاں اس وقت ایک ہی شخص موجود تھا جو اپارٹمنٹس سے ویسٹ (کچرا) جمع کرنے والی کارٹ تیار کر رہا تھا۔ تیمور کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ تیمور مسکرا کر اس کی جانب بڑھا۔ اس کے ہاتھ پر اس کا دستانہ موجود تھا۔ اس نے اس کو بازو سے پکڑ لیا۔ لمحے بھر میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ تیمور نے اسے احتیاط سے ایک جانب لٹایا۔ اسے اپنے کپڑے پہنا کر اس کا لباس پہننے میں اسے چند لمحے لگے پھر اس نے اس کا ماسک منہ پر لگایا اور کارٹ کو دھکیلتا ہوا عملے کے لیے مخصوص لفٹ کی جانب بڑھ گیا جس پر "فار اسٹاف" تحریر تھا۔ لفٹ میں پہنچ کر اس نے ٹاپ فلور پر موجود پینٹ ہاؤس کے لیے بٹن دبایا۔ وہ اب اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ پینٹ ہاؤس کے بیرونی دروازے پر موجود بیل کو دبانے کے بعد دروازہ کھلنے میں صرف چند لمحے لگے تھے۔ وہ غالباً کوئی ملازم تھا جو معمول کے مطابق باسکٹ ساتھ لایا تھا۔ تیمور نے باسکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے باسکٹ کو پکڑنے کے بجائے ملازم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ تیمور نے تیزی سے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور خود اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

وہ طارق شہریار کی پناہ گاہ میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا اسے یقین تھا کہ اب بھی اس تک پہنچنا آسان کام ثابت نہیں ہوگا۔

وہ اس وقت اس کے اپارٹمنٹ کی راہداری میں کھڑا تھا۔ اس کے اردگرد موجود تمام کمرے نیم اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صرف ایک کمرا روشن تھا۔ تیمور اس کمرے کی جانب بڑھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ طارق

کمرے میں موجود نہیں تھا مگر کمرے کے وسط میں ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ یعنی وہ بھاگنے کی تیاری میں تھا۔ تیمور نے ہونٹ سکیڑے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کھٹکے کی آواز پر وہ سامنے موجود دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اس کمرے میں داخل ہو کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ یہ ایک مکمل کنٹرول روم تھا جس میں موجود ڈھیر ساری اسکرینز پر گھر کا ہر کمرا اور عمارت کے تمام فلورز کے داخلی راستے نظر آرہے تھے۔ اسے نیچے ریسپشن کے قریب اسد اور شیبا نظر آئے۔

"یہ...... یہاں کیسے آگئے؟" وہ بڑبڑایا پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر اسد کا نمبر دبایا۔

"تم......تم کہاں ہو تیمور......؟" بیل بجتے ہی اس نے فون اٹھایا۔

"ٹاپ فلور...... پینٹ ہاؤس میں طارق شہریار موجود ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا یہاں لیزر اور دیگر ٹیکنالوجیز سے لیس آلات موجود تھے یعنی اگر وہ چاہتا تو اس کمرے میں بیٹھ کر آنے والے ہر شخص کو مار سکتا تھا۔ تیمور نے کنٹرول روم کے تمام سسٹم کو آف کر دیا۔ اب یہاں موجود اس کی معلومات میں موجود اور نہ موجود کوئی بھی ہتھیار کارآمد نہیں رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا۔ دروازے کے کی ہول میں لٹکتی چابی سے اس نے کمرے کو لاک کر دیا۔ تاکہ وہ کسی طرح ان سسٹمز کو دوبارہ آن نہ کر سکے۔ اب وہ طارق کی آواز سن رہا تھا۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے اب تک خطرے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"سلطان......" اس نے ملازم کو آواز دی۔ "فوری طور پر ایک کپ کافی...... سلطان...... واٹ دی ہیل......" وہ غصے میں کمرے سے باہر نکلا اور ساکت کھڑا رہ گیا۔

اس کے سامنے تیمور کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی سیاہ نال اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"تیمور ٹاپ فلور پر ہے...... طارق شہریار یہاں موجود ہے۔" اسد، شیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کی کال آئی ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ جیسے اسے معلوم ہے کہ ہم لوگ اس عمارت میں آگئے ہیں۔"

"کیسے؟" شیبا نے بے اختیار پوچھا۔ "چلو پھر ہم کیوں اور کس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ دونوں لفٹ کی جانب بڑھے تھے مگر ریسپشنسٹ کی آواز نے انہیں روک لیا۔ "سر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"ہم خود چلے جائیں گے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" شیبا کے جواب پر ریسپشنسٹ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔" وہ بولی۔

اسد نے اس کی بات سن کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا پولیس کارڈ اس کے سامنے کر دیا۔ "ہم ڈیوٹی پر ہیں۔"

"پھر تو آپ کو منیجر سے بات کرنا ہو گی۔" وہ فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس وقت ریسپشن ایریا میں ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"ایک منٹ......" شیبا مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ وہ لمحے بھر میں ہوش کھو بیٹھی۔ شیبا نے آرام سے اس کا سر ریسپشن کاؤنٹر سے ٹکا دیا۔ ریسپشنسٹ سے فارغ ہو کر وہ لفٹ کی جانب لپکے۔

☆☆☆

جو کچھ اس کے سامنے تھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ تیمور اس کے قلعے میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ طارق شہریار نے گردن کو جھٹکا دیا۔

"تو تم یہاں پہنچ گئے۔" وہ لمحہ بھر بعد بولا۔ اس کے مضبوط اعصاب اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔

"ہاں......تو تم نے کیا سمجھا تھا؟" تیمور مسکرا کر بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم آج یہاں سے زندہ بچ کر واپس جا سکو گے۔" طارق غرایا۔

"شاید تم بھول رہے ہو کہ ریوالور میرے ہاتھ میں ہے۔" تیمور بولا۔

"تب بھی......تم طارق شہریار کو نہیں جانتے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور یک دم گھوم کر تیمور کے ریوالور والے ہاتھ پر زوردار کک رسید کی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا تیمور نے جھک کر خود کو اس کے اگلے وار سے بچایا اور پھر اس کے پیٹ میں زوردار مکا رسید کیا۔ طارق ایک لمحے کو دوہرا ہو گیا مگر پھر وہ کھڑا ہوا اور اس نے تیمور پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ چند لمحوں میں وہ دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے فرش پر جا گرے تھے۔ طارق کی کوشش تھی کہ تیمور کو دور پھینک کر کنٹرول روم میں داخل ہو سکے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا مگر دروازے کا مقفل ہونا اس کے لیے دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔ وہ پلٹ کر زمین پر دور پڑے ریوالور کی جانب بڑھا مگر تیمور

اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کی فلائنگ کک نے طارق کو ہوا میں اچھال کر مخالف سمت میں پھینک دیا تھا۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' طارق غرایا۔ وہ کسی سانڈ کے مانند بپھرا ہوا تھا۔ تیمور نے اس کا بازو موڑ کر اسے زمین پر گرا دیا اسی لمحے تیمور کو اپنے بائیں کاندھے میں آگ سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''تم یہاں سے زندہ نہیں جاؤ گے......'' طارق مجنونانہ انداز میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا جو ہمیشہ اس کی پنڈلی پر بندھا ہوتا تھا۔ اس چاقو نے تیمور کے کندھے پر گہرا زخم لگایا تھا۔

''میں زندہ بچوں یا نہیں...... یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں تم یہاں سے نہیں جا سکو گے۔'' تیمور اس کے چہرے پر گھونسا مارتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں ایک بار پھر زمین پر جا گرے تھے۔ اس بار چاقو تیمور کی ران پر لگا تھا اور طارق کا گھونسا اس کے پیٹ میں تکلیف کی لہر دوڑا گیا۔ طارق نے اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ کر راہداری میں پھینک دیا پھر وہ لہراتا ہوا آگے بڑھا اور تیمور کو بالوں سے پکڑ کر اونچا کیا اور اس کے کان میں بولا۔ ''یہ آخری وار تمہیں دنیا سے چھٹکارا دلا دے گا...... موت کے لیے تیار ہو جاؤ......'' اس کا چاقو تیمور کی شہ رگ کی طرف بڑھا۔ تیمور نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اللہ کا نام تھا۔ موت سے اسے اب نہ ڈر لگتا تھا اور نہ ہی زندگی سے عشق مگر طارق کو ختم نہ کرنے کا افسوس البتہ ضرور تھا۔

یک دم فضا میں تین بار ڈچ ڈچ کی آواز گونجی۔ تیمور نے آنکھیں کھول دیں۔

طارق کے چہرے اور گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ تیمور نے پلٹ کر دیکھا، سامنے اسد کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کے پیچھے شیبا کھڑی تھی جس کے ساتھ طارق کا ملازم سلطان تھا جو تھر تھر کانپ رہا تھا۔

طارق شہریار زمین پر گر گیا مگر وہ اب بھی زندہ تھا۔

''تم لوگ نہیں بچو گے۔'' وہ بمشکل بولا۔ ''سب کے سب...... سب کے سب مرو گے تڑپ تڑپ......'' وہ مسکرایا اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔

☆☆☆

تیمور کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر بالکل خاموش تھا۔

''تمہیں زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔'' اسد اس کے کمرے میں آنے کے بعد اس کے ساتھ ہی تھا۔

''نہیں......''

''پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''کیا تم نے طارق کے آخری جملے نہیں سنے...... اور ہم اس راز تک بھی نہیں پہنچ سکے......'' وہ افسوس سے بولا۔

''ارے مرتے مرتے بھی دھمکی دے کر اپنی روایت دہرا گیا اور کیا...... ہاں راز والی بات ٹھیک ہے مگر یار یہ فتنہ اور ممکنہ خطرہ دونوں تو ختم ہو گئے نا...... اب جو ہوگا، وہ بھی دیکھ لیں گے اللہ کے حکم سے......'' اسد بولا۔ ''مگر تم نے اکیلے جا کر خطرہ کیوں لیا؟''

''وقت بالکل نہیں تھا، وہ بھاگنے کی تیاری میں تھا مگر تم لوگ عین وقت پر ہیرو بن کر آ گئے۔'' وہ مسکرایا۔

''اس کے دروازے کے خودکار سسٹم بند تھے اس لیے ملازم کے سر پر پستول رکھی تو اس نے باہر سے دروازہ کھول لیا ورنہ تمہارا تو قصہ پاک ہو جاتا۔ وہ جو بگ بی کہتے ہیں کہ ٹیم ورک کرو...... اسے یاد رکھا کرو۔''

''سچ کہتے ہو......'' تیمور مسکرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کیوں اس کا دل مطمئن نہیں تھا، اس کے ذہن میں خطرے کا سگنل مسلسل بج رہا تھا۔

☆☆☆

وہ مشن محافظ کی عمارت میں شام گئے داخل ہوا تھا۔ ریسپشن پر ریسپشنسٹ کے علاوہ دو لڑکے موجود تھے۔

''کلائنٹ چینج آرگنائزیشن......'' اس نے سوال کیا۔

''بالکل...... یہی ہے......'' ریسپشنسٹ مسکرائی۔

''آپ کا کوریئر ہے یہ پیکٹ آیا ہے، دستخط کر کے وصول کر لیں۔'' وہ بھی مسکرایا۔

یہ ریسپشنسٹ کا روز کا معمول تھا، اس نے دستخط کر کے پیکٹ وصول کیا۔ اسے کھول کر اندر سے کاغذات نکالے، انہیں لفافے کے ساتھ پن اپ کیا اور میلنگ ٹرے میں ڈال دیا۔ اگلی صبح دفتر کھلنے پر لڑکے اسے متعلقہ فرد تک پہنچا دیتے۔ یہ بھی ان کا معمول تھا مگر یہ لفافہ معمولی نہیں تھا۔ ان کاغذات میں موجود وائرس کی بڑی تعداد خاموشی سے ان کے اردگرد پھیلتی جا رہی تھی۔

دفتر بند ہونے کے چند گھنٹوں بعد ہی عمارت میں موجود تمام پودے مرجھانا شروع ہو گئے تھے۔

طارق شہریار کا آخری تحفہ مشن محافظ تک پہنچ چکا تھا اور موت کے وائرس نے اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔

❖❖❖❖